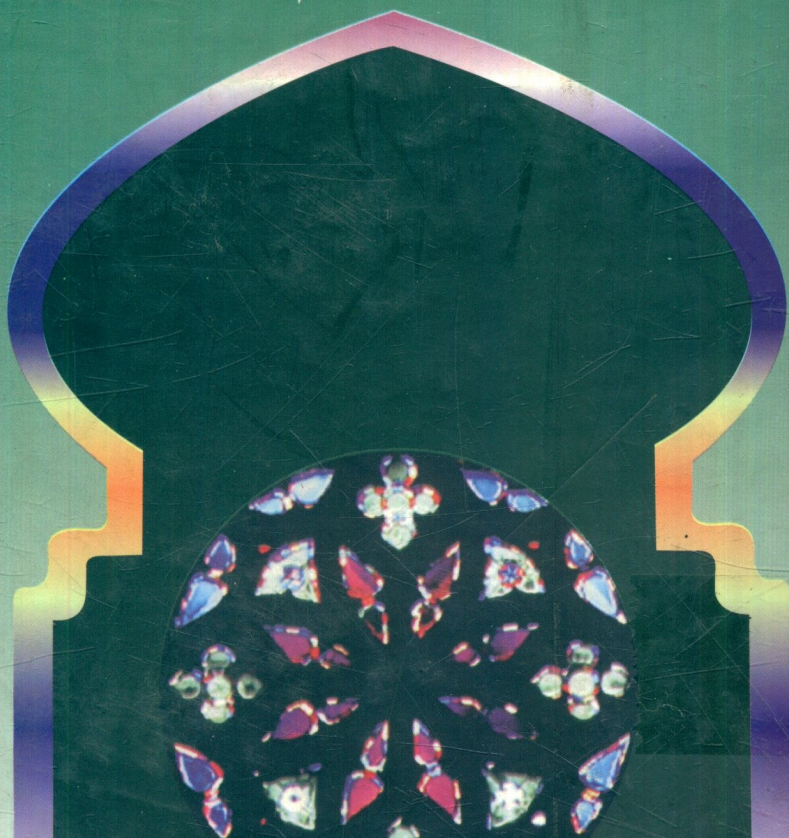


نگارشات

www.KitaboSunnat.com

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

گرد آورده: محمد عالم مختار حق



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

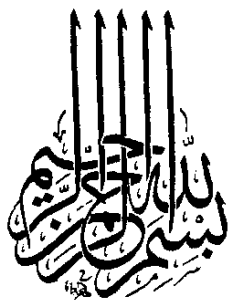
اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com



اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ
الْأُمِّيِّ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

نگارشاتِ ڈاکٹر محمد حمید اللہ

www.KitaboSunnat.com

مصنف:

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

گرد آورده:
محمد عالم مختار حق

بیکن بکس



• قذافی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون: 7351662 - 042
• گلگت، ملتان فون 6520791، 6520790 - 061

E-mail: beaconbooksPakistan@hotmail.com

اشاعت دوم : 2006ء

عبدالجبار نے

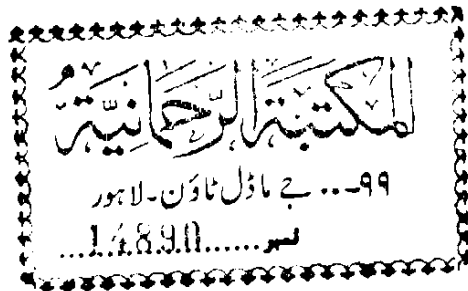
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس لاہور

سے چھپوا کر نیکین بکس ملتان - لاہور

سے شائع کی۔

قیمت : 480/- روپے

ISBN: 969 - 534 - 032 - 6



فہرست

صفحہ نمبر

9

حرف مدعا

(i) قرآن

1. تاریخ قرآن مجید 17
2. قرآنی تصور مملکت 38
3. قرآن مجید اور عورت 65
4. قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے 73
5. ایلاف - جاہلیت میں عربوں کے معاشی و سفارتی تعلقات 82
6. تراجم قرآن مجید تازہ بہ تازہ نو بہ نو 108
7. قرآن مجید کی سالگرہ مبارک 120

(ii) سیرت

8. سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت 125
9. عہد نبویؐ کی سیاست خارجہ کا شہکار 149
10. عہد نبویؐ کے اصول سیاسیات 160
11. عہد نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات 173
12. آنحضرتؐ کا نامہ مبارک کسری کے نام ”ایک نئی دریافت“ 191
13. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط قیصر روم کے نام 199
14. سیرت طیبہ کا پیغام عصر حاضر کے نام 213

(iii) فقہ

15. فقہ کی تشکیل اور آغاز کا معہ 253

صفحہ نمبر

16. اسلام اور علم ہیئت کے نئے مسائل 286
17. اسلام میں انسانی خون کا احترام 302
18. اسلامی جہاد 306

(iv) اکابرین

19. امام محمد کی بارہ سو سالہ یادگار وفات ترکی میں 313
20. مولانا روم کی سات سو سالہ برسی 324
21. شمس الائمہ السرخسی 327
22. امام سرخسی کی نو سو سالہ برسی 349
23. مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ یادگار ولادت 361
24. ابو حنیفہؒ دینوری کی کتاب النبات 370
25. ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی 383
26. کتاب النبات دینوری 397
27. القاضي الرشید 401

(v) تاریخ

28. علم تاریخ میں مسلمانوں کا حصہ 417
29. فتح مکہ ۸ھ کی چودہ سو سالہ یادگار 439

(vi) قانون

30. سیر یا قانون بین الممالک 447
31. علم قانون میں مسلمانوں کا حصہ 461
32. تاریخ قانون میں مسلمانوں کا حصہ 477
33. رومی قانون اور اسلامی قانون کے تعلقات پر چند ملاحظات 487

صفحہ نمبر

(vii) خطہ عرب

34. عربوں کی جہاز رانی پر استدراک 505
35. آٹھویں صدی ہجری میں مصر و شام میں ڈاک کا نظام 526
36. پٹرول، گیس اور ابتدائے اسلام 536

(viii) مستشرقین

37. استانبول کی موتمر مستشرقین عالم 545
38. کیسبرج کی موتمر مستشرقین عالم 558
39. موتمر مستشرقین عالم کا اجلاس میونخ ۱۹۵۷ء 565
40. موتمر مستشرقین عالم کا 25 واں اجلاس ماسکو 573
41. موتمر مستشرقین عالم امریکہ میں 585
42. اٹھارہویں موتمر مستشرقین لائڈن 599

(ix) ادب

43. گارساں دتاسی 607
44. دانٹے کی نظم طریبہ ربانی 619
45. فرانسیسی زبان کی پیدائش میں عربی کا حصہ 624
46. ادیبوں سے دہائی 633
47. حیدرآباد کی ایک تعلیمی جوہلی 638

(x) سود

48. انجمن ہائے قرضہ بے سودی 645
- (xi) مکاتیب (۱۹) 655
49. مآخذ و مراجع 687

حرفِ مدعا

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے سانچہ ارتحال کے بعد جو ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ء کو وقوع پذیر ہوا، غالباً سب سے پہلے ان کی بہترین تحریریں ٹیکن بکس اردو بازار لاہور/گلگشت ملتان نے ۲۰۰۳ء میں چھاپ کر اقلیت کا اعزاز حاصل کیا۔ راقم کے دل میں قدرت نے تب ہی سے داعیہ پیدا کر دیا کہ میں موصوف کی نگارشات کو یکجا کرنے کا کام بسم اللہ کہہ کر شروع کر دوں۔ چنانچہ اسی نقطہ نظر سے جب موصوف کے علمی ورثہ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ آپ کا سب سے پہلا مضمون ”مدراس کی سیر“ لاہور کے ہفت روزہ ”نونہال“ میں 8 جنوری 1924ء کو چھپا تھا (مدیر ”تکبیر“ صلاح الدین کے انٹرویو میں سہو قلم سے 1928ء چھپ گیا ہے)۔ یہ بھی عجیب اتفاق کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا آخری مضمون ”ایک شرارت“ بھی ”نونہال“ ہی میں چھپا (کراچی 1989ء)۔ ڈاکٹر صاحب نے مظہر ممتاز قریشی صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب محررہ یکم جمادی الآخر 1410ھ میں اپنے مقالات کی تعداد ایک ہزار سے زائد بتائی ہے اور یہ وہ مضامین ہیں جو 41 سالہ قیام فرانس کے دوران لکھے گئے (البتہ حیدرآباد دکن میں لکھے گئے مضامین اس سے الگ ہیں۔ مکتوب بنام مظہر قریشی صاحب مورخہ 5 صفر 1410ھ)۔ ان مضامین میں بیشتر فرانسیسی اور انگریزی میں لکھے گئے اور کمتر اردو میں مگر اس ”کتر“ کا دور بھی 65 سالوں پر محیط ہے اور ظاہر ہے کہ اس طویل عرصہ کے ریکارڈ کی تلاش خاصا صبر آزما اور وقت طلب معاملہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی حین حیات دو اداروں نے موصوف کے ایماء سے ان کے مضامین کے دو مجموعے شائع کیے پہلا مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی نے 1944ء میں ”عہد

نبوی میں نظام حکمرانی“ کے عنوان سے شائع کیا جس میں بارہ مضامین شامل ہیں (تیسرا ایڈیشن اردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے 1987ء میں اشاعت پذیر ہوا)۔ دوسرا مجموعہ مضامین جو ”رسول اکرم کی سیاسی زندگی“ کے عنوان سے دارالاشاعت کراچی سے 1950ء میں چھپا، وہ 33 مقالات پر مشتمل ہے۔ ایک مضمون ”رسول اکرم کی سیرت کا مطالعہ کس لیے کیا جائے“ دونوں مجموعوں میں معمولی ترمیم و اضافہ کے بعد مشترکہ طور پر شامل ہے۔ راقم کو ان دو مجموعوں کے علاوہ کسی تیسرے باقاعدہ مجموعے کا علم نہیں ہو سکا۔ ایسی صورت حال میں راقم کو جو کچھ میسر آ سکا (اور اس ”جو کچھ“ میں سلفیہ لائبریری شیش محل روڈ لاہور کے مہتمم جناب حافظ احمد شاہ صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے لائبریری سے بھرپور استفادہ کا موقع فراہم کیا)۔ خواندگان گرامی کی خدمت میں ”جہاں ہے، جیسا ہے“ کے اصول کے تحت یہ مضامین بغیر کسی مناسب ترتیب کے مختلف جلدوں میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ تکمیل پر خدا نے توفیق رفیق کی تو ان شاء اللہ العزیز ”نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول“ کے مصداق طبع ثانی مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کریں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

اب چند باتیں مصنف محترم کے بارے میں۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے یہ بات زور دے کر لکھی ہے کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو یہ بات قطعاً پسند نہ تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے۔ وہ کسی زندہ شخص پر کام کرنے کو پسند نہ کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے آزادی فکر نہیں رہتی۔ اس لیے ان کی زندگی کے بعض اہم گوشے اہل علم سے مستور ہیں۔ تاہم ہم نے موصوف پر لکھے گئے مضامین اور بعض دیگر مستند ذرائع سے ان کی زندگی کے متعلق جو کچھ اخذ کیا وہ ہدیہ قارئین کرام ہے:

ڈاکٹر محمد حمید اللہ 16 محرم الحرام 1326ھ / 19 فروری 1908ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے (مظہر ممتاز قریشی صاحب کے نام اپنے مکتوب محررہ 11 ربیع الانور 1410ھ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی تاریخ ولادت 19 جنوری بتائی ہے جسے سہو قلم ہی کہا جاسکتا ہے کیونکہ وہ پیشتر ازیں اپنے خودنوشت حالات میں 19 فروری تحریر کر چکے ہیں (ڈاکٹر

محمد حمید اللہ از راشد شیخ)۔ اور تعلیم و تربیت کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبہ دینیات میں شرکت کی اور ایم اے ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آپ یورپ کو روانہ ہو گئے۔ بون یونیورسٹی (جرمنی) سے ۱۹۳۲ء میں صرف دس ماہ کے عرصہ میں اسلام کے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی فل کی ڈگری حاصل کی اور سوربون یونیورسٹی پیرس سے ۱۹۳۳ء میں عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری کا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصہ تک جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پروفیسر رہے۔ یورپ جانے کے بعد جرمنی اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ فرانس کے نیشنل سنٹر آف سائنٹیفک ریسرچ سے تقریباً بیس سال تک وابستہ رہے۔ علاوہ ازیں یورپ اور ایشیا کی کئی یونیورسٹیوں میں آپ نے توسیعی خطبات بھی دیے۔ ڈاکٹر صاحب السنۃ شرقیہ یعنی عربی، فارسی، ترکی اور اردو کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی وغیرہ زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ نے اہل مغرب کو اسلام کی حقیقی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ سے متعارف کرانے کے لیے مختلف یورپی زبانوں میں سیکڑوں مقالات اور متعدد کتابیں لکھیں۔ فرانسیسی زبان میں آپ کے ترجمہ قرآن مجید اور اسی زبان میں دو جلدوں پر مشتمل سیرت پاک کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں آپ کی کتاب ”محمد رسول اللہ“ بہت مقبول ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب ستمبر ۱۹۴۸ء میں دولت آصفیہ کے پاسپورٹ پر ایک ماہر قانون بین الممالک کی حیثیت سے سیکورٹی کونسل کے وفد میں شریک ہو کر نیویارک پہنچے۔ اسی دوران ستوڑ حیدرآباد کا سانحہ پیش آگیا۔ پھر ان کی غیرت نے بھارت جانا گوارا نہ کیا اور پیرس (فرانس) میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی اور بقیہ عمر وہیں بتا دی۔ آپ کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۱۷۵ ہے جن میں سے دو درجن کے قریب اردو کتابیں ہیں۔ ان اردو کتابوں میں سے بعض کے اسماء درج ذیل ہیں:

۱۔ عہد نبوی کے میدان جنگ

- ۲۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی
 - ۳۔ عہد نبوی کا نظام تعلیم
 - ۴۔ امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی
 - ۵۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی
 - ۶۔ قانون بین الممالک کے اصول اور نظریں
 - ۷۔ خطبات بہاولپور
 - ۸۔ ترجمہ مقالات گارسان دتاسی
- آپ کی بعض تصانیف کے اردو تراجم:

- ۱۔ سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ الوثائق السیاسیہ للعہد النبوی والخلافتہ الراشدہ از ابویحییٰ امام خاں نوشہروی)
(ڈاکٹر صاحب اس ترجمہ کو ناقص قرار دیتے ہیں)
(بحوالہ رسالہ معارف اسلامی)
- ۲۔ محمد رسول اللہ (اردو ترجمہ Muhammad Rasul Allah از
نذیر حق) (ڈاکٹر صاحب کو یہ ترجمہ بھی ”وفادارانہ معلوم نہ ہوا“
بحوالہ مکتوب بنام راقم مورخہ ۲۵ صفر ۱۴۰۴ھ۔
- ۳۔ سیرۃ ابن الحنفی (مرتبہ)۔ (اردو ترجمہ از نور الہی ایڈیٹ)
- ۴۔ صحیفہ ہمام بن منبہ (مرتبہ) اردو ترجمہ و تشریح پروفیسر مولانا
محمد رفیق چودھری۔

روزنامہ ”منصف“ حیدرآباد دکن مورخہ ۱۷ ستمبر ۲۰۰۳ء کا مبصر آپ کے آثار پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں بلا کی سادگی تھی۔ ان کی وضع قطع مشرقی اور طرز رہائش اور بود و باش قدیم عالموں کی طرح سادہ اور منکسرانہ تھا۔ وہ صاف اور سادہ لباس پہنتے، استری اور کلف کے قائل نہ تھے۔ برہنہ سر کبھی نہ ہوتے اور ہمیشہ با وضو رہتے۔ ان کے عادات و اطوار بزرگان دین اور صحابہ کرام کا نمونہ تھے۔ انہیں دیکھنا گویا علم کو مجسم شکل میں دیکھنا تھا۔ وہ ایک کھلی کتاب تھے۔ سرتاپا انہماک اور

سرتاپا صداقت۔ وہ سچے علم دوست اور عالم باعمل تھے۔ وہ علم و تقویٰ، قناعت اور سادگی میں سلف کی مثال تھے۔ قناعت کا یہ عالم کہ شاہ فیصل ایوارڈ سے معذرت کر لی اور پاکستان کے ہجرہ ایوارڈ کے دس لاکھ روپے ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے کتب خانہ کو عطیہ کر دیے۔ اب یہ کتب خانہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح سیرت ابن احنق پر نقوش ایوارڈ برائے 1985ء قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ ان کی قناعت پسندی کی اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

یہ منحنی سا اور دبلا پتلا شخص اتنا سخت جان واقع ہوا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کی تحقیق میں پایادہ، گھوڑے اور اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس راستے پر عملاً سفر کیا جس راستے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تھی۔

بلند اخلاقی کا یہ مقام کہ اپنے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے بھی ناشر کی اجازت ضروری گردانتے چنانچہ ”رسول اکرم کی سیاسی زندگی“ کی ”عرض مولف“ میں رقم طراز ہیں کہ ”جن رسالوں میں یہ مضامین نکلے ہیں ان کی اجازت حاصل کرنی اخلاقی طور پر ضروری ہے۔ حالات نے اس کا موقع نہ دیا لیکن مجھے امید ہے کہ نیک کام اور ازاد نفع عام کو وہ بھی خوشی سے منظور کرتے ہیں۔

صابر ایسے تھے کہ ایک روز وہ بینک سے رقم لینے گئے تو معلوم ہوا کہ ان کا اکاؤنٹ خالی ہے کسی شخص نے ان کے دستخطوں میں مہارت حاصل کی اور جعلی دستخط کر کے ساری رقم نکلوالی۔ ڈاکٹر صاحب نے کسی سے اس بات کا ذکر نہ کیا۔ روزمرہ کی ضروریات کے لیے بھی ان کے پاس رقم نہیں تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگلے ماہ پنشن آنے تک وہ کچھ نہیں کھائیں گے اور محض پانی وغیرہ پر گزارہ کریں گے۔ ایک روز مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ان پر نقاہت کا غلبہ ہوا اور وہ گر پڑے۔ ہسپتال پہنچایا گیا تو معلوم ہوا کہ کئی روز سے فاقہ سے تھے۔ بعد ازاں ان کے بھتیجے عطاء اللہ کی صاحبزادی سدیدہ انہیں اپنے ہمراہ فلاؤلفیا لے گئی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ تمام زندگی اشاعتِ علم نافع میں مصروف رہنے کے بعد 17 دسمبر 2002ء کو امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر Jackson Vill میں صبح گیارہ بجے نیند کی

حالت میں انتقال کر گئے۔ آپ نماز فجر کے بعد سوئے تھے اور اسی حالت میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت آپ کی عمر 95 برس تھی۔ آپ کی نماز جنازہ امریکی نژاد دانشور ڈاکٹر یوسف ضیاء کو اک جی نے پڑھائی جو شمالی ٹیکساس کے اسلامک ایسوسی ایشن کے امام ہیں۔ 18 دسمبر 2002ء کو ڈیڑھ بجے دن Chapal Hill قبرستان میں انکی تدفین ہوئی۔ ان گزارشات کے بعد جی چاہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ذکر خیر ان کے اس زریں قول پر ختم کیا جائے جو علم کے حوالے سے ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے:

”انسان کی بیشتر زندگی علم سیکھنے میں گزر جاتی ہے جب علم کو سمجھنے کا وقت آتا ہے تو وہ اس خاکداں سے چلا جاتا ہے۔“

(مجلہ عثمانیہ صفحہ: 55)

فقط۔ وما علی الا البلاغ

محمد عالم مختار حق

۲۵ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

۱۱ ستمبر ۲۰۰۴ء

قرآن

تاریخ قرآن مجید

محترم صدر، محترم وائس چانسلر برادران و خواہران محترم!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

قرآن مجید ایک ایسا موضوع ہے جس کے بہت سے پہلو ہیں اور ایک گھنٹے کے مختصر وقت میں یہ ممکن نہیں کہ ان سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکے۔ اس لیے صرف اس کے ایک پہلو یعنی تدوین قرآن مجید کی تاریخ کو چند الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

مسند احمد بن حنبل میں ایک حدیث ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ”اللہ نے حضرت آدم سے لے کر مجھ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے، جن میں سے تین سو پندرہ صاحب کتاب تھے۔“ تین سو پندرہ صاحب کتاب نبیوں کے نام نہ تو قرآن مجید میں ہیں اور نہ احادیث میں ان کا ذکر ہے، لہذا ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان کی تفصیل معلوم کر سکیں۔ صرف چند اشارے ملتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل ہوئے تھے۔ لیکن یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کس زبان میں تھے۔ چہ جائیکہ ان کی مندرجات کا علم ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام بھی پیغمبر تھے۔ ان کے متعلق بعض روایات میں ذکر ملتا ہے کہ ان پر بھی چند کتابیں نازل ہوئی تھیں۔ لیکن ان کا بھی دنیا میں اب کوئی وجود نہیں۔ قدیم ترین نبی، جن کی طرف منسوب کتاب کا کچھ حصہ ابھی حال ہی میں ہم تک پہنچا

ہے، حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ فلسطین میں بحر مردار کے پاس بعض غاروں میں کچھ مخطوطے ملے ہیں۔ ان مخطوطوں میں سے ایک کتاب حضرت اخنوخ یا انوخ یعنی حضرت ادریس علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کے کچھ ترجمے انگریزی زبان میں شائع ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس بات کا کوئی حتمی قطعی ثبوت نہیں، لیکن اب تک تحقیق کے مطابق ہم اسے قدیم ترین نبی کی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں آخری نبی کی بشارت بھی ہے جس کو بعد میں عہد جدید (انجیل) کے باب ”مکتوب یہود“ نے بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بھی ہمیں کچھ اشارے ملتے ہیں۔ عراق میں ”صابیہ“ کے نام سے ایک چھوٹا سا گروہ پایا جاتا ہے، جس کا ایک مستقل دین ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ”حضرت نوح علیہ السلام کی کتاب اور ان کے دین پر عمل پیرا ہیں“ ان کا کہنا ہے کہ ایک زمانے میں حضرت نوح علیہ السلام کی پوری کتاب ہمارے پاس موجود تھی لیکن امتداد زمانہ کے سبب سے اب وہ ناپید ہے۔ اس کے مندرجات صرف چار پانچ سطروں میں ہمارے پاس موجود ہیں جن میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک اور نبی آئے ہیں جن کی کتاب کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ صحف ابراہیم و موسیٰ دو مرتبہ قرآن مجید (37:53 تا 41) اور (19:87) میں اس کا ذکر آیا ہے۔ ان کی کتاب کے مندرجات یہودی اور عیسائی ادبیات میں تو نہیں، قرآن مجید میں چند سطروں کی حد تک محفوظ ملتے ہیں۔ اسی طرح بعض ایسے انسان بھی ہیں جن کو صراحت کے ساتھ نبی تو تسلیم نہیں کیا جاسکتا، لیکن ان کی نبوت کے امکان کو رد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے ایک شخصیت ”زردشت“ کی ہے۔ پارسی انہیں اپنا نبی مانتے ہیں۔ ان کی نبوت کا امکان اس بنا پر بھی ہے کہ قرآن مجید میں مجوس قوم کا ذکر آیا ہے۔ مجوسیوں کا مذہب زردشت کی لائی ہوئی کتاب ”آوستا“ پر مبنی ہے۔ آوستا کے متعلق ہم تک کچھ معلومات پہنچی ہیں۔ جب ہم اس کا قرآن مجید سے موازنہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کس کو کیا برتری حاصل ہے؟ زردشت کی کتاب اس وقت کی ”زند“ زبان میں تھی۔ کچھ عرصے بعد ایران پر دوسری قوموں کا غلبہ ہوا اور

فاتحین کی زبان وہاں رائج ہوئی۔ پرانی زبان متروک ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ کہ ملک بھر میں مٹھی بھر علماء اور محققین کے سوا زند زبان جاننے والا کوئی نہ رہا۔ اس لیے زردشتی مذہب کے علماء نے نئی زبان پازند میں اس کتاب کا خلاصہ اور شرح لکھی۔ آج کل ہمارے پاس اس نسخے کا صرف دسواں حصہ موجود ہے، باقی غائب ہو چکا ہے۔ اس دسویں حصہ میں کچھ چیزیں عبادات کے متعلق ہیں اور کچھ دیگر احکام ہیں۔ بہر حال دنیا کی ایک قدیم دینی کتاب کو ہم آوستا کے نام سے جانتے ہیں لیکن وہ مکمل حالت میں ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ یہاں ایک چیز کا میں اشارۃً ذکر کروں گا۔ آوستا میں دوسری باتوں کے علاوہ زردشت کا یہ بیان ملتا ہے۔ میں نے دین کو مکمل نہیں کیا۔ میرے بعد ایک اور نبی آئے گا جو اس کی تکمیل کرے گا اور اس کا نام رحمۃ للعالمین ہوگا یعنی ساری کائنات کے لیے باعثِ رحمت۔

ہندوستان میں بھی کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے الہام شدہ کتابیں ہیں۔ ان مقدس کتابوں میں وید، پران، اپنشد اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ایک ہی نبی پر نازل ہوئی ہیں۔ ممکن ہے متعدد نبیوں پر نازل ہوئی ہوں بشرطیکہ وہ نبی ہوں۔ ان میں بھی خصوصاً ”پران“ نامی کتابوں میں کچھ دلچسپ اشارے ملتے ہیں۔ ”پران“ وہی لفظ ہے جو اردو میں پرانا یعنی قدیم ہے۔ اس کی طرف ہمیں قرآن مجید میں ایک عجیب و غریب اشارہ ملتا ہے وَأَنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ (196:26) (اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے) میں نہیں جانتا کہ اس کا پران سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ بہر حال دس پران ہیں، ان میں سے ایک میں یہ ذکر ہے کہ آخری زمانے میں ایک شخص ریگستان کے علاقے میں پیدا ہوگا۔ اس کا نام، قابلِ اعتماد اور باپ کا نام اللہ کا غلام ہوگا۔ وہ اپنے وطن سے شمال کی طرف جا کر بسنے پر مجبور ہوگا اور پھر وہ اپنے وطن کو متعدد بار دس ہزار آدمیوں کی مدد سے فتح کرے گا۔ جنگ میں اس کی رتھ کو اونٹ کھینچیں گے اور وہ اونٹ اس قدر

۱۔ یہ ایک عدد ہے جس کا اردو میں مترادف نہیں۔ بہر حال متعدد بار دس ہزار کا اشارہ شاید حجتہ الوداع کی طرف ہونے کے فتح مکہ کی طرف۔

تیز رفتار ہوں گے کہ آسمان تک پہنچ جائیں گے۔ اس کتاب میں مذکور الفاظ ہمیں ملتے ہیں ان سے ممکن ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ مستنبط کیا جاسکے۔

ان پرانی کتابوں کے علاوہ، وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں میں بالخصوص معروف ہیں، یعنی تورات، زبور اور انجیل۔ قبل اس کے کہ قرآن مجید کا آپ سے ذکر کروں بطور تمہید ان کا بھی چند الفاظ میں ذکر کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب نازل ہوئی وہ ”توریت“ کہی جاتی ہے۔ لیکن دراصل توریت اس کتاب کا ایک جزء ہے۔ توریت کے معنی ہیں ”قانون“۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف پانچ کتابیں منسوب کرتے ہیں۔ پہلی کتاب ”کتاب پیدائش“ کہلاتی ہے۔ دوسری ”خروج“ جو مصر سے نکلنے کے حالات پر مشتمل ہے۔ تیسری کتاب ”قانون“ ہے۔ چوتھی کتاب کا نام ”اعداد و شمار“ ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ یہودیوں کی قبیلے وار مردم شماری کی جائے۔ پانچویں ”تھیہ“ کے نام سے موسوم ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ پرانی چیزوں کو دوبارہ دہرایا جائے۔ ان کو Up to date کیا جائے یا ان کی تشریح کی جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں یہ پانچویں کتاب (تھیہ) نہیں پائی جاتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوئی چھ سو سال بعد ایک جنگ کے زمانے میں ایک شخص ملک کے اس وقت کے یہودی بادشاہ کے پاس ایک کتاب لایا اور کہا کہ مجھے یہ کتاب ایک غار سے ملی ہے۔ معلوم نہیں کس کی ہے۔ مگر اس میں دینی احکام نظر آتے ہیں۔ بادشاہ نے اپنے زمانے کی ایک نبیہ عورت کے پاس اس نسخے کو بھیجا، یہودیوں کے ہاں عورتیں بھی نبی رہی ہیں (یا کم از کم وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں) اس نبیہ نے جس کا نام Huldah بیان کیا جاتا ہے یہ کہلا بھیجا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی کتاب ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چند سو سال بعد اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔ اس کتاب کو ”تھیہ“ کا نام اس لیے دیا گیا کہ اس میں پہلی چار کتابوں کے احکام میں سے کچھ احکام خلاصے کے طور پر اور کچھ اضافے کے ساتھ دہرائے گئے ہیں۔ بہر حال ان پانچ کتابوں کی سرگزشت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا شاید معراج مبارک کی طرف اشارہ ہو۔

السلام کی وفات کے بعد آنے والے انبیاء کے زمانے میں یہودیوں نے فلسطین کا کچھ حصہ فتح کیا۔ وہاں حکومت شروع کی تو کچھ عرصے بعد عراق کے حکمران بخت نصر (بنو کد نوصور) نے فلسطین پر حملہ کیا۔ چونکہ اس کا دین یہودیوں کے دین سے مختلف تھا اس لیے اس نے صرف ملک فتح کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ ان دشمنوں کے دین کو بھی دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے توریت کے تمام قلمی نسخوں کو جمع کر کے آگ لگا دی۔ حتیٰ کہ توریت کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہا۔ یہودی مورخوں کے مطابق اس کے ایک سو سال بعد ان کے ایک نبی ”حضرت عزرا Esdra نے (جو شاید حضرت عزیر (Uzair) علیہ السلام ہوں) یہ کہا کہ مجھے توریت زبانی یاد ہے۔ انہوں نے توریت املا کروائی۔ توریت کے اس اعادے کے کچھ عرصے بعد روما کے ایک حکمران نے فلسطین پر حملہ کیا۔ سپہ سالار کا نام انٹیوکس Antiochus تھا اس نے بھی وہی کام کیا جو بخت نصر نے کیا تھا۔ یعنی یہودیوں کی کتابیں جمع کر کے جلا دیں۔ اس طرح دوسری مرتبہ یہ نابود کر دی گئیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور رومی حکمران نے ٹیٹس (Titus) نامی کمانڈر کی ماتحتی میں ایک فوج بھیجی اور اس نے تیسری مرتبہ فلسطین میں دستیاب شدہ یہودیوں کی تمام کتابوں کو جلا دیا۔ اب ہمیں توریت کے نام سے جو کتاب ملتی ہے وہ بائبل کے حصہ عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب پانچ کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں تین چار مرتبہ کی آتش زدگی کے بعد اعادہ شدہ شکلیں ہیں۔ ان کا اعادہ کس طرح ہوا اور کس نے ان کا اعادہ کیا، اس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔ البتہ جو شخص ان کتابوں کو پڑھتا ہے تو اسے دو چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض اوقات اسے ایسی چیزیں نظر آتی ہیں، جو کھٹکتی ہیں اور اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ اصل میں نہ ہوں گی بلکہ بعد کا اضافہ ہیں۔ بعض مقامات پر کمی محسوس ہوتی ہے اور تشنگی باقی رہتی ہے۔ چنانچہ بعض چیزیں جو زیادہ ہو گئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں کہ جو کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اس میں وہ باتیں ہیں جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیماری، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تدفین اور اس کے بعد کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ بعد کا اضافہ ہے مگر یہ تو ایسی باتیں ہیں

جنہیں ہر پڑھنے والا فوراً محسوس کر لیتا ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے اس میں دیگر کتنی چیزوں کا اضافہ ہوا جو غیر محسوس ہوں۔ اسی طرح جن چیزوں کی کمی نظر آتی ہے یا جن کا وہاں ہونا ضروری تھا مگر نہیں ہیں وہ ایسی ہیں کہ کم از کم بیس مرتبہ اس طرح کے الفاظ ملتے ہیں کہ اس حکم کی تفصیلیں فلاں باب میں ملیں گی، جن ابواب کے حوالے دیے گئے ہیں ان میں سے ایک باب کا نام ”خدا کی جنگیں“ اور ایک اور باب کا نام مخلص اور نیک لوگوں کی کتاب ہے اور وہ باب سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ کچھ باتیں توریت کے متعلق تھیں جو میں نے آپ سے بیان کیں۔ توریت ضخیم صورت میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

توریت کے بعد مسلمانوں میں عام طور پر زبور کا نام لیا جاتا ہے اور ہمارا تصور یہ رہا ہے کہ یہ بھی توریت اور انجیل ہی کی طرح ایک مستقل کتاب ہے۔ لیکن عہد نامہ عتیق (Old Testament) میں جو چیز حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اور جس کو وہ سام Psalm یعنی زبور کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس میں صرف خدا کی حمد و ثنا کی نظمیں ہیں، کوئی نیا حکم نہیں ہے۔ ہمارا یہ تصور ہے کہ ہر رسول یا نبی ایک نئی شریعت لاتا ہے لیکن اس کتاب میں ایسی کوئی نئی شریعت نہیں ملتی۔ تاہم جس طرح پرانی کتابوں میں (کتاب اوریس سے لے کر ایران کے آوستا تک) ایک آخری نبی علیہ السلام کی بشارت ملتی ہے اس طرح زبور میں بھی ایسی چیزیں ملتی ہیں۔ نیز جو سرگزشت توریت کی رہی، وہی زبور کی بھی رہی ہے۔ اس لیے میں اس کو چھوڑ کر اب انجیل کا ذکر کرتا ہوں۔

انجیل کے متعلق مسلمانوں کا تصور عام طور پر یہ ہے کہ وہ ایک مستقل کتاب تھی جو خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ لیکن ہمارے پاس عیسائیوں کے توسط سے جو انجیل پہنچی ہے، وہ ایک نہیں بلکہ چار انجیلیں ہیں، جو یہ ہیں: متی (Matthew)۔ مرقس (Mark)، لوقا (Luke)، یوحنا (John)۔ ہر انجیل ایک الگ آدمی کی طرف منسوب ہے۔ یہ چار کتابیں بھی ساری انجیلیں نہیں ہیں۔ بلکہ خود عیسائی مؤرخوں کے مطابق ستر سے زیادہ انجیلیں پائی جاتی تھیں۔ جن میں سے ان چار کو قابل اعتماد اور باقی کو مشتبہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کو پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے

ہوئے الہام یا وحی پر مشتمل نہیں بلکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ چار شخصوں نے یکے بعد دیگرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری لکھی اور ہر ایک نے اس کو انجیل کا نام دیا۔ لفظ انجیل کے معنی ہیں ”خوشخبری“ اور اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو حالات زندگی انجیل میں ملتے ہیں، ان کے مطابق عام طور پر وہ کسی گاؤں میں جایا کرتے تھے اور وہاں کے لوگوں سے کہتے تھے کہ میں بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی حکمرانی اب جلد آنے والی ہے۔ شاید اس اساس پر کتاب کا نام بھی یہی ہو گیا۔ لیکن اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کوئی کتاب نازل ہوئی تھی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسے لکھوایا نہیں اس لیے آج دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ اب جو انجیلیں موجود ہیں، ان کی حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے مختلف زمانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں لکھیں اور ان سوانح عمریوں کو ہر مولف نے انجیل کا نام دیا۔ ان میں سے چار کو کلیسا نے قابل اعتماد قرار دیا ہے اور باقی کو رد کیا ہے۔ ان چار انجیلوں کے انتخاب کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں کہ ان کو کس نے انتخاب کیا کب انتخاب کیا اور کن معیارات کو سامنے رکھ کر انتخاب کیا؟ فرانس کا ایک مشہور مؤرخ ”والٹیر (Voltaire) کے نام سے گزرا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کلیسا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ جو ستر سے زائد انجیلیں ہیں اور ان کے مندرجات میں اختلافات بھی ہیں، ان میں سے صرف ان انجیلوں کا انتخاب کیا جائے جو قابل اعتماد ہوں۔ انتخاب کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ کلیسا میں ساری انجیلوں کو عبادت گاہ کے مقام کے پاس ایک میز پر جمع کیا گیا۔ پھر اس میز کو ہلایا گیا جو کتابیں نیچے گر گئیں ان کو ناقابل اعتماد اور ہلانے کے باوجود جو کتابیں میز پر باقی رہیں ان کو قابل اعتماد قرار دیا گیا۔ یہ والٹیر کا بیان ہے۔ اس نے کس بنیاد پر یہ بات کہی ہے یہ بتانا میرے لیے دشوار ہے۔ ظاہر ہے عیسائی لوگ اس کی تردید کرتے ہیں اور ایسی بات کہنے والا ان کے نزدیک جھوٹا اور بد معاش تھا۔ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لکھوائی ہوئی کتاب دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جو چیز اس وقت ہمارے پاس انجیل کے نام سے ملتی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ انہیں

ہم سیرت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہہ سکتے ہیں، بعینہ جس طرح مسلمانوں کے ہاں سیرت نبوی کی کتابیں پائی جاتی ہیں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ پر نازل شدہ احکام کو لکھوایا کیوں نہیں تھا؟ میرے ذہن میں جو جواب آتا ہے (ممکن ہے غلط ہو) وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان سے پہلے کے نبی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو توریت نازل ہوئی تھی اس کی کیا درگت بنی۔ دشمن حملہ کرتے ہیں، اس کی توہین کرتے ہیں، اسے جلا دیتے ہیں اور نیست و نابود کرتے ہیں۔ غالباً انہوں نے یہ سوچا کہ کہیں میری کتاب کا بھی وہی حشر نہ ہو۔ لہذا بہتر ہے کہ اسے لکھوایا ہی نہ جائے۔ اس طرح یہ کتاب لوگوں کے ذہنوں میں رہے گی۔ عبادت گزار نیک لوگ اسے ادب سے یاد رکھیں گے اور اپنے بعد کی نسلوں تک پہنچائیں گے۔ شاید یہی تصور ہو جس کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی انجیل کو نہ لکھوایا۔

دوسرا مسئلہ یہ کہ خدا چونکہ ازلی اور ابدی علم کا مالک ہے اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ حضرت آدم کو ایک حکم دے اور بعد کے نبی کو کوئی دوسرا اس کے بالکل برعکس حکم دے۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کو کچھ احکام اور بعد کے نبی کو کچھ اور احکام اضافے کے ساتھ دیے جائیں۔ فرض کیجیے کہ حضرت آدم علیہ السلام پر نازل شدہ کتابیں آج دنیا میں صحیح حالت میں موجود ہوتیں تو (میرا تصور یہ ہے) کہ خدا کو کوئی نئی کتاب بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وہی کتاب آج بھی کارآمد ہوتی۔ لیکن جس طرح ابھی ہم نے اس مختصر مطالعے میں دیکھا کہ پرانے انبیاء کی کوئی کتاب بھی، بلا استثناء ہم تک، من و عن کامل صورت میں نہیں پہنچی ہے اس لیے خدا نے چاہا کہ ایک مرتبہ انسان کو ایسی مکمل کتاب دی جائے جس میں تمام احکام ہوں اور اس کی مشیت بھی ہوئی کہ یہ کتاب محفوظ رہے۔ وہ کتاب قرآن مجید ہے۔

اب ہم دیکھیں گے کہ قرآن مجید کس طرح محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اولاً میں اس کی زبان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ یہ عربی زبان میں ہے۔ اس آخری نبی کی کتاب کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیوں ہوا؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے

کہ زبانیں رفتہ رفتہ بدل جاتی ہیں۔ خود اردو زبان کو لیجیے۔ اب سے پانچ سو سال پہلے کی کتاب مشکل سے ہمیں سمجھ میں آتی ہے۔ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے انگریزی میں پانچ سو سال پہلے مؤلف چاسر (Chaucer) کی کتاب کو آج کل لندن کا کوئی شخص، یونیورسٹی کے فاضل پروفیسروں کے سوا، سمجھ نہیں سکتا۔ یہی حال دوسری قدیم زبانوں کا ہے۔ یعنی وہ بدل جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔ اگر خدا کا آخری پیغام بھی کسی ایسی ہی تبدیل ہونے والی زبان میں آتا تو خدا کی رحمت کا اقتضاء یہ ہوتا کہ بیسویں صدی کے لوگوں کو پھر ایک نئی کتاب دے تاکہ ہم اسے سمجھ سکیں کیونکہ گزشتہ صدیوں کی کتاب اب تک ناقابل فہم ہو چکی ہوتی۔ دنیا کی زبانوں میں سے اگر کسی زبان کو یہ استثناء ہے کہ وہ نہیں بدلتی تو وہ عربی زبان ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم عصر عربی یعنی قرآن مجید اور حدیث شریف میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اور جو عربی آج ریڈیو پر آپ سنتے ہیں یا جو آج عربی اخباروں میں پڑھتے ہیں ان دونوں میں بہ لحاظ مفہوم الفاظ، گرامر (صرف نحو، ہیجے اور تلفظ) کوئی فرق نہیں ہے۔ آج رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوں اور میں ایک عرب کی حیثیت سے اپنی موجودہ عربی میں آپ سے گفتگو کروں تو آپ اس کا ہر لفظ سمجھیں گے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے جواب مرحمت فرمائیں تو آپ کا ہر لفظ میں سمجھ سکوں گا۔ کیونکہ ان دونوں زبانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں اس سے استنباط کرتا ہوں کہ آخری نبی پر بھیجی ہوئی آخری کتاب ایسی زبان میں ہونی چاہیے جو غیر تبدیل پذیر ہو۔ لہذا عربی کا انتخاب کیا گیا۔ عرض کرنا یہ ہے کہ اس عربی زبان میں دیگر خصوصیات مثلاً فصاحت، بلاغت، ترنم وغیرہ کے علاوہ ایک خصوصیت ایسی ہے جس کا ہم سب مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ عربی غیر تبدیل پذیر اور اس کے لیے ہمیں عربوں کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کی بولیوں کو اپنی زبان نہیں بنایا بلکہ اپنی علمی اور تحریری زبان وہی رکھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے آپ سب واقف ہیں کہ بیک وقت نازل نہیں ہوا جیسا کہ توریت کے متعلق یہودیوں کا بیان ہے کہ اسے خدا نے تختیوں پر لکھ کر ایک ہی

مرتبہ دے دیا۔ اس کے برخلاف قرآن مجید تیس سال تک جتہ جتہ، (نجماً نجماً) نازل ہوتا رہا اور یہ ان مختلف زمانوں میں نازل شدہ اجزاء کا مجموعہ ہے جو قرآن مجید کی صورت میں ہمارے پاس ہے۔ اس کا آغاز دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں معکف تھے۔ وہاں حضرت جبریل علیہ السلام آتے ہیں اور آپ تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ وہ پیغام بہت ہی اثر انگیز ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک امی ہیں۔ ”اِقْرَأْ“ یعنی پڑھ اور پھر قلم کی تعریف کی گئی ہے۔ پڑھنے کا حکم دے کر پھر قلم کی تعریف کیوں کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ قلم ہی کے ذریعے سے خدا انسان کو وہ چیز بتاتا ہے جو وہ نہیں جانتا یا دوسرے الفاظ میں قلم ہی وہ چیز ہے جو انسانی تمدن اور انسانی تہذیب کی حفاظت گاہ (Depository) ہے۔ اس کا وجود اس لیے ہے کہ پرانی چیزوں کو محفوظ رکھا جاسکے۔ آنے والے اس میں نئی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راز یہی ہے اور اس وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات پر تفوق حاصل ہے۔ ورنہ آپ غور کریں کہ کوا آج سے بیس لاکھ سال پہلے جس طرح گھونسل بناتا تھا آج بھی اسی طرح بناتا ہے۔ اس نے کوئی ترقی نہیں کی۔ لیکن انسان وہ جانور ہے جو چاند تک پہنچ چکا ہے۔ اس نے اتنی ترقی کی کہ آج وہ ساری کائنات پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ ساری ترقیاں انسان نے اس لیے کی ہیں کہ اس کو اپنے سے پہلے کے لوگوں کے تجربات کا جو علم حاصل ہوا اس کو محفوظ رکھا اور ان میں اس نے اپنے ذاتی تجربوں سے روز افزوں اضافہ کیا اور اس سے استفادہ کرتا رہا اور یہ سب قلم کی بدولت ممکن ہوا آیت، علم بالقلم، علم الانسان ما لم يعلم (-) میں اس حقیقت کی طرف قرآن مجید نے بہت ہی بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے۔ جب ”سورہ اقرء“ (یعنی سورہ العلق) کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں تو رسول کریم غار کو چھوڑ کر گھر واپس آئے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتایا کہ مجھے آج یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ شاید کسی دن مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تسلی دی اور کہا کہ خدا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضائع نہیں کرے گا۔ ورقہ بن نوفل میرا چچا زاد بھائی ہے جو ان معاملات (یعنی فرشتے، وحی وغیرہ) سے واقف ہے۔

کل صبح جا کر ہم اس سے گفتگو کریں گے۔ وہ آپ کو بتائے گا۔ میں ان چیزوں سے واقف نہیں ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ شیطان کبھی آپ کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔ ایک روایت کے مطابق صبح کو وہ اپنے ساتھ ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے ان کے عزیز دوست ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو یہ قصہ سنایا اور کہا کہ انہیں اپنے ساتھ لے جا کر ورقہ سے ملاؤ۔ ورقہ بن نوفل بہت بوڑھے تھے۔ ان کی بصارت زائل ہو چکی تھی، مذہباً نصرانی تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے اور یہ قصہ سنایا تو ورقہ نے بے ساختہ یہ الفاظ کہے ”اے محمد صلی اللہ علیک وسلم جو چیزیں تم نے ابھی بیان کی ہیں اگر صحیح ہیں تو یہ ناموس موسیٰ علیہ السلام سے مشابہ ہیں ”ناموس“ کا لفظ اردو میں عام طور پر عزت کے لیے مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ بعض لکھتے ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو ناموس کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلامی ادبیات میں وہ ”روح الامین“ ہیں مگر یہ معنی بھی یہاں کام نہیں دیتے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ”ناموس“ اصل میں ایک اجنبی لفظ ہے، جو معرب ہو کر عربی زبان میں مستعمل ہوا۔ یہ یونانی زبان کا لفظ ”نوموس“ (Nomos) ہے۔ یونانی زبان میں لفظ توریت کو نوموس یعنی قانون کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ورقہ بن نوفل کا بیان ہے کہ یہ چیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت سے مشابہ ہے اور یہی معنی زیادہ قرین قیاس نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق قدیم ترین ذکر ابن اسحاق کی کتاب المغازی میں ملتا ہے اور حکومت مراکش نے اس کو شائع بھی کیا ہے۔ اس میں ڈیڑھ سطر کی ایک بہت دلچسپ روایت ہے جسے ابن ہشام نے اپنی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں معلوم نہیں کس بنا پر یا سہواً چھوڑ دیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کی کوئی عبارت نازل ہوتی تو آپ سب سے پہلے اسے مردوں کی جماعت میں تلاوت فرماتے پھر اس کے بعد عبارت کو عورتوں کی خصوصی محفل میں بھی سناتے۔ اسلامی تاریخ میں یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کی تعلیم سے بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی مردوں کی تعلیم سے۔ یہ قدیم ترین اشارہ

ہے جو قرآن مجید کی تبلیغ کے متعلق ملتا ہے۔ اس کے بعد کیا پیش آیا، یہ کہنا مشکل ہے لیکن بالکل ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ایک نئی چیز کا پتا چلتا ہے وہ یہ کہ قرآن مجید کو لکھوایا جائے اور غالباً حفظ کرنا بھی اسی ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پہلی وحی کے موقع پر قرآن مجید کی سورہ اقرء کی پہلی پانچ آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائیں تو ایک حدیث کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دو کام اور کیے۔ ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو استنجاء اور وضو کرنا سکھایا کہ نماز کے لیے کس طرح اپنے آپ کو جسمانی طور پر پاک کریں۔ دوسرے یہ کہ نماز کا طریقہ بھی بتایا۔ خود جبرائیل علیہ السلام امام بنے اور پیغمبر مقتدی کی حیثیت سے پیچھے کھڑے دیکھتے رہے کہ پہلے کھڑے ہوں، پھر رکوع میں جائیں، پھر سجدہ کریں وغیرہ اور ساتھ ساتھ خود بھی وہی کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ نماز میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔ لہذا ابتدائی زمانے ہی سے جب لوگ مسلمان ہونے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا ہوگا کہ قرآن مجید کو حفظ بھی کرو اور روزانہ جتنی نمازیں پڑھنی ہیں، ان نمازوں میں اس کا اعادہ بھی کرتے رہو۔ گویا اس وقت ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید حفظ کرنا اور اس کا لکھنا۔ آدمی کو کسی نئی چیز کے ازبر کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی تحریری عبارت ہو تو اسی کو بار بار پڑھتا ہے بالآخر وہ حفظ ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن حفظ کرنا اور لکھنا دونوں ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ ہمارے مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اپنے صحابہ میں سے کسی ایک شخص کو جسے لکھنا پڑھنا آتا ہوتا یاد فرماتے اور اس کو املا کراتے تھے۔ اہم بات یہ بیان ہوئی کہ لکھنے کے بعد اس سے کہتے کہ ”جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر سناؤ“ تاکہ اگر کاتب نے کوئی غلطی کی ہو تو اس کی اصلاح کرا سکیں۔ یہ قرآن مجید کی تدوین کا آغاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ لکھوانے کے بعد اپنے صحابہ کو حکم دیتے کہ اسے ازبر کر لو اور روزانہ دو وقت نمازوں میں پڑھو۔ اس وقت دو نمازیں تھیں۔ معراج کے بعد پانچ نمازیں ہوئیں تو دو کے بجائے پانچ مرتبہ اس کو لوگ نماز میں دہرانے لگے۔ اس کا ایک

عملی فائدہ یہ ہے کہ اگر آدمی کا حافظہ اچھا نہ ہو اور سال بھر میں مثلاً صرف عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن قرآن مجید کو حافظے کی مدد سے پڑھے تو ممکن ہے کہ اس کو بھول جائے لیکن اگر کوئی آدمی روزانہ پانچ مرتبہ دہراتا رہے تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید اس کے حافظے میں رہے گا اور وہ اسے نہیں بھولے گا۔

الغرض قرآن مجید کو لکھنے اور اسے حفظ کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ اس سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ اس سے بڑھ کر ایک اور کام بھی ہوا۔ وہ یہ کہ فرض کیجیے میرے پاس ایک تحریری نسخہ موجود ہے جس میں کسی نہ کسی وجہ سے کتابت کی کچھ غلطیاں موجود ہیں۔ اس غلط نسخے کو میں حفظ کر لیتا ہوں۔ اس طرح میرا حفظ بھی غلط ہوگا۔ اس کی اصلاح کس طرح کی جائے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف بھی توجہ فرمائی اور حکم دیا کہ ہر مسلمان کو کسی مستند استاد سے قرآن مجید پڑھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑھ کر قرآن مجید سے کون واقف ہو سکتا ہے؟ اس لیے ہر مسلمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سیکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ اگر اس کے پاس تحریری نسخہ موجود ہے تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلاوت کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر فرمائیں کہ ہاں یہ نسخہ ٹھیک ہے تب اسے حفظ کیا جائے۔ جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو ظاہر ہے کہ ایک آدمی سارے لوگوں کو تعلیم و تربیت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ایسے صحابہ کو، جن کی قرآن دانی کے متعلق آپ کو پورا اعتماد تھا، یہ حکم دیا کہ اب تم بھی پڑھایا کرو۔ یہ وہ مستند استاد تھے جن کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سند دیتے تھے کہ تم پڑھانے کے قابل ہو اور اس کا سلسلہ آج بھی دنیا میں قائم ہے۔ اگر کوئی شخص کسی استاد سے قرآن مجید پڑھتا ہے تو قرات کی تکمیل کے بعد استاد کی طرف سے اسے جو سند ملتی ہے، اس میں وہ استاد لکھتا ہے کہ ”میں نے اپنے شاگرد فلاں کو قرآن مجید کے الفاظ، قرآن مجید کی قراءت کے اصولوں کو ملحوظ رکھ کر یہ تعلیم دی ہے۔ یہ بالکل وہی ہے جو میرے استاد نے مجھ تک پہنچائی تھی اور اس نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ اس کو اس کے اپنے استاد نے اسی طرح

پڑھایا تھا۔“ اس کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔

اسلامی روایات (Traditions) کے سوا دنیا کی کسی قوم نے اپنی مذہبی کتاب کو محفوظ کرنے کے لیے یہ اصول کبھی اختیار نہیں کیے تھے۔ یہ چیزیں قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں عہد نبوی میں ہی پیش آئیں مگر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ ایک اور چیز کی بھی شروع ہی سے ضرورت تھی۔ قبل اس کے کہ میں اس کا ذکر کروں، قرآن مجید کے تحریری نسخوں کے متعلق بھی کچھ آپ کو بتانا چلوں کہ ان کا کب سے پتا چلتا ہے۔ غالباً نبوت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ ان کے واقعہ سے آپ واقف ہوں گے۔ وہ اس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت جانی دشمن تھے۔ ایک دن یہ طے کر کے گھر سے نکلے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) قتل کر ڈالوں۔ راستے میں انہیں ان کا ایک رشتہ دار ملا جس نے اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن اسے چھپا رکھا تھا۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ ہتھیار سے لیس ہو کر کہاں جا رہے ہو؟ چونکہ وہ رشتہ دار تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بتا دیا کہ محمد کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے جا رہا ہوں کہ اس نے ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس رشتے دار نے کہا کہ اے عمر، اپنے قبیلے کو بنی ہاشم کے قبیلے سے جنگ میں الجھانے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ بھی مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا شوہر بھی مسلمان ہو چکا ہے۔ پہلے اپنے گھر کی خبر لو بعد میں دنیا کی اصلاح کرنا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حیران ہوئے اور سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ دروازے کے پاس انہوں نے اندر سے کچھ آواز سنی، جیسے کوئی شخص گارہا ہے یا خوش الحانی سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ انہوں نے بہت زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر سے ایک شخص نکلا اور یہ اندر پہنچے۔ وہاں بہن اور بہنوئی سے جو سخت کلاہی ہوئی اس سے آپ لوگ واقف ہیں۔ میں مختصر ذکر کر رہا ہوں کہ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہن کو اس پر آمادہ کر لیا کہ جو چیز وہ پڑھ رہی تھیں وہ ان کو دکھائیں۔ انہوں نے غسل کرانے کے بعد آپ کو وہ چیز پیش کی۔ یہ قرآن مجید کی چند سورتیں تھیں۔ ان کو پڑھ کر حضرت عمر رضی

اللہ تعالیٰ عنہ متاثر ہوئے اور مسلمان ہو گئے۔ اس واقعے سے میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کم از کم چند سورتوں کی تحریری صورت میں پائے جانے کا ذکر ۵۰ نبوی ہی سے یعنی قبل ہجرت سے ملتا ہے۔ اس کے بعد جس تحریری نسخے کا پتا چلتا ہے اس کا ذکر بھی دلچسپ ہے۔ یہ غالباً بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ ہے۔ مدینے سے کچھ لوگ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، ان میں سے بنی زریق کے ایک شخص کے بارے میں مؤرخین نے صراحت سے لکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی اس وقت تک نازل شدہ سورتوں کا مکمل مجموعہ ان کے سپرد کیا۔ یہ صحابی مدینہ منورہ پہنچ کر اپنے قبیلے میں، اپنے محلے کی مسجد میں اسے روزانہ با آواز بلند پڑھا کرتے تھے۔ گویا قرآن مجید مدون ہونے یا تحریری صورت میں پائے جانے کا یہ دوسرا واقعہ ہے جس کا مؤرخوں نے صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قرآن کو کسی مستند استاد سے پڑھنا پہلی خصوصیت تھی۔ دوسری خصوصیت تحریری صورت میں محفوظ رکھنا، تاکہ اگر کہیں بھول جائے تو تحریر دیکھ کر اپنے حافظے کو تازہ کر لیا جائے اور تیسری خصوصیت اسے حفظ کرنا تھا۔ ان تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی اس طرح پیدا ہو گئی تھی کہ قرآن مجید کامل حالت میں بہ یک وقت نازل نہیں ہوا تھا بلکہ جستہ جستہ ۱۳ سال کے عرصے میں نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو میکانیکی طور پر مدون نہیں کیا کہ پہلی آیت شروع میں ہو اور بعد میں نازل شدہ دوسرے نمبر پر رہے بلکہ اس کی تدوین الہام اور حکمت نبوی کے تحت ایک اور طرح سے کی گئی۔ قرآن مجید کی اولین نازل شدہ آیتیں، جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے عرض کیا، سورہ اقرآء کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں۔ آیتیں سورہ نمبر ۹۶ میں ہیں جب کہ قرآن مجید کی کل سورتیں ۱۱۴ ہیں۔ ان میں نمبر ۹۶ ابتدائی سورہ ہے۔ قرآن مجید میں اب جو بالکل ابتدائی سورتیں ملتی ہیں، مثلاً سورہ بقرہ وغیرہ وہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں قرآن مجید زمانی ترتیب کے لحاظ سے مدون نہیں ہوا بلکہ ایک دوسری صورت میں مرتب ہوا۔ اس کی وجہ سے لوگوں کو دشواریاں پیش آ سکتی تھیں۔ یعنی آج

ایک سورہ نازل ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ اس کو فلاں آیت سے قبل لکھو یا فلاں آیت کے بعد لکھو یا فلاں سورہ میں لکھو۔ اس لیے ضرورت تھی کہ وقتاً فوقتاً نظر ثانی ہوتی رہے۔ لوگوں کے ذاتی نسخوں کی اصلاح اور نظر ثانی کا ذکر ہجرت کے بعد سے ملتا ہے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے مہینے میں دن کے وقت قرآن مجید کو، جتنا اس سال تک نازل ہوا تھا، با آواز بلند دہرایا کرتے تھے اور ایسے صحابہ جن کو لکھنا پڑھنا آتا تھا، وہ اپنا ذاتی نسخہ ساتھ لاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت پر اس کا مقابلہ کرتے جاتے، تاکہ اگر ان سے کسی لفظ کے لکھنے میں یا سورتوں کو صحیح مقام پر درج کرنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ اس کی اصلاح کر لیں یہ چیز ”عرضہ“ یا پیشکش کہلاتی تھی۔ مؤرخین مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ آخری سال، وفات سے چند ماہ پہلے جب رمضان کا مہینہ آیا تو آپ نے پورے کا پورا قرآن مجید لوگوں کو دو مرتبہ سنایا اور یہ بھی کہا میں سمجھتا ہوں کہ میری وفات قریب آگئی ہے کیونکہ قرآن حکیم کے متعلق جبرائیل علیہ السلام نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں دو مرتبہ پڑھ کر سناؤں تاکہ اگر کسی سے غلطیاں ہوئی ہوں تو وہ باقی نہ رہیں۔ یہ تھی تدبیر جو آخری نبی نے آخری پیغام ربانی کی حفاظت کے لیے اختیار فرمائی۔ اس طرح قرآن مجید کے ہم تک قابل اعتماد حالت میں پہنچنے کا اہتمام ہوا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو شروع میں قرآن کی طرف کسی کی توجہ مبذول نہ ہوئی۔ لوگوں کے پاس جو کچھ موجود تھا اس کو نماز میں پڑھا کرتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ تمام مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ قرآن مجید کی طرف فوری توجہ دیں۔ اس زمانے میں قرآن مجید کا کوئی سرکاری نسخہ موجود نہیں تھا اور غالباً کسی ایک شخص کے پاس بھی کامل قرآن مجید لکھا ہوا موجود نہیں تھا۔ یہ واقعہ حضور اکرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ملک کے چند لوگ مرتد ہو گئے اور مسیلہ کذاب نے نہ صرف ارتداد کیا بلکہ نئے نبی ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ وہ چونکہ ایک طاقتور قبیلے کا سردار تھا، اس لیے بہت سے لوگ اس کے حامی بھی ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے جنگ کی۔ یہ جنگ بہت شدید تھی اور جنگ بھی دشمن کے علاقے میں، یمامہ کے مقام پر ہوئی۔ میں جب وہاں گیا تھا تو وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ یہ جنگ موجودہ شہر ریاض کے مضافات میں ہوئی تھی۔ اس جنگ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ ان شہید ہونے والوں میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو قرآن مجید کے بہترین حافظ سمجھے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ مدینے کے مسلمانوں کو فتح پر خوشی ہوئی لیکن یہ اطلاع پا کر کہ بہت سے برگزیدہ اور بہترین حافظ قرآن مسلمان اس جنگ میں شہید ہو گئے ہیں رنج ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر قرآن مجید کے تحفظ پر حکومت نے توجہ نہ کی اور حافظ قرآن رفتہ رفتہ آئندہ جنگوں میں شہید ہوتے رہے یا طبعی موت سے اس دنیا سے رخصت ہوتے رہے تو پھر قرآن مجید کے لیے بھی وہی دشواری پیش آئے گی جو پرانے انبیاء علیہم السلام کی کتابوں کے سلسلے میں پیش آئی تھی۔ اس لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے امیر المؤمنین قرآن کے تحفظ پر توجہ فرمائیے۔ یمامہ کی جنگ میں چھ ہزار مسلمان شہید ہو چکے ہیں جن میں بہت سے حافظ قرآن بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تجویز پر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جواب، ان کی سیرت کے ایک خاص پہلو کا مظہر ہے۔ وہ فدائے رسول تھے اور فدائے رسول کا جواب ایسا ہی ہونا چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بحث کرتے ہیں۔ بالآخر دونوں اس بات پر رضامند ہوئے کہ کسی تیسرے شخص کو حکم بتائیں اور وہ جو فیصلہ کر دے اس پر عمل کریں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا حکم بتایا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتبِ وحی تھے حضرت زید کا فوری جواب بھی وہی تھا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ دوبارہ بحث ہوئی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے کہا اے زید! اگر لکھیں تو اس میں حرج کیا ہے۔ روایت میں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ واقعی حرج تو مجھے بھی نظر نہیں آتا یہ ایک جذباتی رویہ تھا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تو ہم کیسے کریں لیکن اگر کریں تو اس سے کوئی مانع نظر نہیں آتا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے حکم دیا کہ یہ کام میں سرانجام دوں تو مجھے یہ اتنا مشکل معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تدوین کے مقابلے میں اگر مجھے جبل احد کے سر پر اٹھانے کا حکم دیا جاتا تو وہ میرے لیے آسان ہوتا۔

قرآن مجید کی تدوین کے سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے احکام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے شہر مدینہ میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جس شخص کے پاس قرآن مجید کا کوئی حصہ تحریری صورت میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ”عرضہ“ کے موقع پر جو تلاوت تھی، اس میں موجود ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا نسخہ موجود ہے تو وہ لا کر اس کمیشن کے سامنے پیش کرے۔ کمیشن کے صدر حضرت زید بن ثابت تھے لیکن کئی اور مددگار بھی تھے جن میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ اس کمیشن کو حکم دیا گیا تھا کہ قرآن مجید کے جو نسخے پیش کیے جائیں، قابل اعتماد ہوں، عرضہ میں پیش کیے ہوئے نسخے ہوں۔ اگر کوئی آیت کم سے کم دو تحریری نسخوں میں موجود ہو تو اسے لکھا جائے ورنہ رد کر دی جائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اس طرح قرآن مجید کی تدوین ہوئی اور اس کو ایک کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔ یہ بات بھی نہ بھلائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کم از کم بیس پچیس حافظ موجود تھے، جن میں سے کچھ انصار تھے اور کچھ مہاجرین جنہیں سارا قرآن مجید زبانی یاد تھا۔ ان میں ایک خاتون حافظہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی تھیں خود اس کمیشن کے صدر، زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حافظ تھے، اس لیے انہوں نے جو کچھ لکھا، اس یقین کے ساتھ لکھا کہ یہ ان کے ذہن میں بھی اسی طرح موجود ہے۔ یہاں ایک اور چھوٹی سی بات کا ذکر کرتا ہوں جب لوگ نسخہ لا کر پیش کرتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں حکم دیتے تھے کہ قسم کھا کر بتاؤ کہ یہ نسخہ جو تم پیش کر رہے ہو، وہی ہے جس کی تصحیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوئی ہے۔ وہ قسم کھا کر یقین دلاتے تو پھر اس سے استفادہ کیا جاتا۔ جب پورا قرآن لکھا جا چکا تو

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اسے شروع سے آخر تک پڑھا، اس میں مجھے ایک آیت نظر آئی یہ آیت میرے حافظے میں موجود تھی مگر کسی تحریری نسخے میں موجود نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے شہر کے چکر لگائے ہر گھر میں داخل ہوا۔ اولاً مہاجرین کے گھر میں، کسی کے پاس تحریری صورت میں موجود نہیں تھی۔ پھر انصار کے گھروں کو گیا۔ بالآخر ایک شخص کے پاس ایک تحریری نسخہ ملا۔ وہ نسخہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھا ہوا تھا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہدایت تھی کہ جب تک دو تحریری نسخے نہ ملیں اس وقت تک اس کو قرآن کے طور پر قبول نہ کیا جائے جبکہ یہ آیت ایک تحریری نسخہ میں ملی تھی۔ لیکن یہاں مشیت خداوندی اپنا اثر دکھاتی ہے اتفاق سے یہ وہ شخص تھا جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اس کے کسی کام سے خوش ہو کر کہا تھا کہ آج سے تمہاری شہادت دو شہادتوں کے مساوی سمجھی جائے گی۔ غرض یہ کہ قدرت کی طرف سے پیشگی انتظام تھا۔ اس طرح اس آیت کو انہوں نے صرف ایک شخص سے لے کر نقل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد میں نے قرآن کو دوبارہ پڑھا تو ایک اور آیت کی بھی کمی نظر آئی۔ ممکن ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ ہو اور آیت کے متعلق راویوں میں اختلاف ہو، بہر حال وہاں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس نام والے ایک شخص نے وہ چیز بیان کی۔ یہ آیتیں، جن کا ہمارے پاس صراحت سے ذکر موجود ہے، کہ کون سی آیتیں تھیں، فرض کیجیے کہ اگر آج ہم ان کو قرآن سے خارج بھی کر دیں تو کوئی اہم چیز خارج نہیں ہوتی۔ قرآن مجید کی جن آیتوں کی طرف یہ اشارہ ہے ان کا مفہوم قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی موجود ہے۔ لیکن بہر حال جس احتیاط سے قرآن مجید کی تدوین عمل میں آئی اس کا مقابلہ تاریخ عالم کی دینی کتابوں میں کوئی کتاب بھی نہیں کر سکتی۔

ایک اور نکتہ بیان کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا اور اسی پر یہ تقریر ختم کرتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے، جرمنی کے عیسائی پادریوں نے یہ سوچا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں آرامی زبان میں جو انجیل تھی وہ تو اب دنیا میں موجود نہیں۔ اس وقت قدیم ترین انجیل یونانی زبان میں ہے اور یونانی سے ہی ساری زبانوں میں اس کے

ترجمے ہوئے ہیں۔ لہذا یونانی مخطوطوں کو جمع کیا جائے اور ان کا آپس میں مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ یونانی زبان میں انجیل کے نسخے جتنے دنیا میں پائے جاتے تھے کامل ہوں کہ جزئی ان سب کو جمع کیا گیا اور ان کے ایک ایک لفظ کا باہم مقابلہ (Collation) کیا گیا اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس کے لفظ یہ ہیں ”کوئی دو لاکھ اختلافی روایات ملتی ہیں“ اس کے بعد یہ جملہ ملتا ہے ان میں سے 1/8 اہم ہیں۔ یہ ہے انجیل کا قصہ۔ غالباً اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد کچھ لوگوں کو قرآن کے متعلق حسد پیدا ہوا۔ جرمنی ہی میں میونخ یونیورسٹی میں ایک ادارہ قائم کیا گیا ”قرآن مجید کے قدیم ترین دستیاب نسخے خرید کر، فوٹو لے کر، جس طرح بھی ممکن ہو جمع کیے جائیں۔ جمع کرنے کا یہ سلسلہ تین نسلوں تک جاری رہا۔ جب میں 1933ء میں پیرس یونیورسٹی میں تھا تو اس کا تیسرا ڈائریکٹر پریٹزل Pretzl پیرس آیا تاکہ پیرس کی پبلک لائبریری میں قرآن مجید کے جو قدیم نسخے پائے جاتے ہیں ان کے فوٹو حاصل کرے۔ پروفیسر نے مجھ سے شخصاً بیان کیا کہ اس وقت (یہ 1933ء کی بات ہے) ہمارے انسٹی ٹیوٹ میں قرآن کے بیالیس ہزار (42000) نسخوں کے فوٹو موجود ہیں اور مقابلے (Collation) کا کام جاری ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اس ادارے کی عمارت پر ایک امریکی بم گرا اور عمارت، اس کا کتب خانہ اور عملہ سب کچھ برباد ہو گیا۔ لیکن جنگ کے شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے ایک عارضی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں کہ قرآن مجید کے نسخوں میں مقابلہ کا کام ہم نے شروع کیا تھا، وہ ابھی مکمل نہیں ہوا لیکن اب تک جو نتیجہ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ ان نسخوں میں کہیں کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن اختلافات روایت ایک بھی نہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتابت کی جو غلطی ایک نسخے میں ہوگی وہ کسی دوسرے نسخوں میں نہیں ہوگی۔ مثلاً فرض کیجیے بسم اللہ الرحیم میں الرحمن کا لفظ نہیں۔ لیکن یہ صرف ایک نسخے میں ہے باقی کسی نسخے میں ایسا نہیں ہے۔ سب میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ ہے باقی نسخوں میں نہیں ہے، تو اسے کاتب کی غلطی قرار دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیزیں کہیں کہیں سہو قلم یعنی کاتب کی غلطی سے ملتی ہیں۔ لیکن اختلاف روایت یعنی ایک ہی فرق کئی نسخوں

میں ملے، ایسا کہیں نہیں ہے۔ یہ ہے قرآن مجید کی تاریخ کا خلاصہ، جس سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں خدا کا جو فرمان ہے ”انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون“ (ہم ہی اسے نازل کرتے ہیں اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے)۔ یہ تمام واقعات جو میں نے آپ سے بیان کیے، اس آیت کی حرف بہ حرف تصدیق کرتے ہیں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

(عزم نو۔ قرآن پاک نمبر۔ گورنمنٹ ڈگری کالج شکر گڑھ)
ماخوذ ”خطبات بہاولپور“۔ خطبہ نمبر (۱)

قرآنی تصورِ مملکت

لاؤق مضمون نگار جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الممالک کے استاذ ہیں اور دنیا کی مختلف قوموں کے تصورِ مملکت اور دستورِ حکومت پر ان کی نگاہ ہے۔ اس مضمون میں اسی نقطہ نظر سے اسلامی تصورِ مملکت کو انہوں نے پیش کیا ہے، موجودہ زمانہ میں اسلامی تعلیمات اور اس کے نظام کو جدید طرز میں اس طرح پیش کرنا جو دوسری قوموں اور جدید طبقہ کے لیے بھی قابلِ توجہ ہو، ایک مفید خدمت ہے۔ یہ مضمون چونکہ اسی نقطہ نظر سے اور ایک خاص طبقہ کو پیش نظر رکھ کر انگریزی میں لکھا گیا تھا، اس لیے زبان اور طریقہ تعبیر میں اس کے ذوق کا لحاظ رکھا گیا تھا، جس کی کچھ جھلک اس اردو مضمون میں بھی موجود ہے۔

جزیرہ نماے عرب اسلام سے پہلے کبھی ایک اقتدار کے تحت متحد نہیں ہو سکا تھا اور یہ ایک انوکھا اور عجیب و غریب واقعہ تھا کہ پورے ملک نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو متحدہ طور سے اپنا روحانی اور سیاسی سردار تسلیم کر لیا۔ جس ملک میں نزاج کا دور دورہ ہو وہاں تیسریں سال کی کوشش میں ایک مرکزیت اور نظام قائم کر دینا رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو آسمانی وحی کا تابع قرار دیتے تھے، جو وقتاً فوقتاً آتی تھی اور جس کا مجموعہ اب قرآن کے نام سے دنیا میں موجود و مشہور ہے۔ اگر کوئی شخص سیرۃ نبویہ کا قریب سے مطالعہ کرے، تو اسے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے اس قول کی صحت کو باور کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوگی کہ قرآن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آئینہ ہے۔ (كَانَ خَلْقَهُ الْقُرْآنَ) اسی لیے یہ معلوم کرنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں مملکت کا تصور کیا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ قرآن کو دیکھنے سے ممکن ہے۔

یہ چیز قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف ازمنہ سابقہ کے پیغمبروں کے حالات بیان ہوئے ہیں، بلکہ ان کی سیرتوں کو جو قرآن میں ہیں اب بھی ماخذ تسلیم کیا گیا ہے، بجز اس کے کہ صراحت سے قرآن اُسے یا اس کے کسی جز کو منسوخ قرار دے، دوسرے الفاظ میں انبیاء سابقہ کی سنت مسلمانوں پر اب بھی واجب التعمیل ہے بجز اس کے کہ اس کے کسی معین جز کے نسخ کا کوئی حکم قرآن مجید میں یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال میں صراحت سے ملتا ہو۔ ایک آیت ملاحظہ ہو:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبُوءَةَ ۖ

یہی وہ لوگ ہیں جنکو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی،
اگر کوئی لوگ اس کو نہ مانیں تو ہم یہ امانت ایسے لوگوں کے سپرد
کریں گے، جو اس سے انکار نہ کریں، یہی وہ لوگ ہیں، جن کی
خدا نے ہدایت کی ہے، اس لیے تو ان کی رہنمائی کی پیروی کر۔

(قرآن ۶/۸۹ تا ۹۰ نیز دیکھیے ۱۳/۴۲)

امام بخاری اور ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ جب کبھی کسی معاملہ میں براہ راست آسمانی وحی نہیں آتی، تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام معاملہ جات میں

۱۔ اس سے اوپر کی آیتوں میں (۱۸) پیغمبروں کے نام لیے گئے ہیں جن میں نوح علیہ السلام، اسحاق، یسوع، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام شامل ہیں اور انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

اہل کتاب کے طریقوں کی پیروی فرمایا کرتے تھے۔
یہ چیز سیاسی معاملات کی حد تک بھی اسی طرح صادق آسکتی ہے جس حد تک معاشی و معاشرتی معاملات میں۔

معاشرۂ انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا قیام بڑے عرصہ کے بعد ہو سکا۔ قرآن مجید میں واقعات کی جو ترتیب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے جن کو خدا نے زمین پر نائب یا خلیفہ مقرر کیا۔ وہ نسل انسانی کے باپ تھے اور بزرگ خاندان ہونے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا تھا، ان کی وفات کے بعد کئی نسلوں تک انکی اولاد میں مختلف قسم کے اختلافات اور بُرائیاں کم یا زیادہ مقدار میں ساری رہیں، اسی لیے قرآن مجید کے مطابق پیغمبر بھیجے گئے، جو خدا اور عام انسانوں کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے اور انسانوں کو یہ بتاتے تھے کہ ان کے خالق کی مشیت اور اسکا حکم کیا ہے اور نیکی کی ترغیب دیتے اور بُرائی سے روکتے تھے۔ ان پیغمبروں نے خلوص کے ساتھ جو بے غرضانہ نصیحتیں کیں اور ان کی باتوں کو کچھ لوگوں نے مانا بھی تو اس جماعت کی حیثیت کسی مملکت کی قرار دینی مشکل ہے۔ بظاہر قدیم ترین زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کے باوجود سیاسی نظام اور اقتدار کی ضرورت نہیں پائی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں بھی بار بار ذکر ہے کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو سرفرازی عطا ہوئی، مگر ایک مملکت کو دوسری مملکت کی جگہ قائم کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان قومی وحدتوں کے غیر سیاسی وجود کے باوجود ان لوگوں کی معاشی اور سماجی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، لیکن ان چیزوں کا ذکر صرف اس طور سے ہوا ہے کہ لوگ ان کو خدا کی نعمتیں سمجھ کر یاد رکھیں اور خدا کی اطاعت کا فریضہ بجالائیں۔

بادشاہی کے ذکر کا آغاز قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ملنے لگتا ہے، جب کہ ایک شخص اپنے ملک کے تمام لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار چلاتا ہوا نظر آتا ہے (دیکھیے قرآن مجید ۲/۲۵۸ نمرود کا قصہ)۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے ادارہ مملکت میں زیادہ استحکام و ترقی نظر آتی ہے، چنانچہ ان کے

زمانہ کے حالات میں (دیکھیے قرآن مجید ۱۲/۳۰) بادشاہوں اور وزیروں اور سرکاری قید خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ (سورہ یوسف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو حالات قرآن مجید میں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ان مقدس رہنما کی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ ارض موعود میں ایک مملکت قائم کریں، مگر قوم نے نااہلی کے مظاہرے (عدم اطاعت احکام الہی) سے مایوسی کا سامان کر دیا، آخر ان کی قوم کو چالیس سال تک انتظار کرنے کی ضرورت پیش آئی، کہ ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو، جس کی بچپن ہی سے ان کی نگرانی میں تعلیم و تربیت ہو اور پھر اس نئی نسل کی مدد سے وہ ارض موعود کو فتح کریں، گو اسی اثنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وفات پائی اور ان کی چہل سالہ تربیتی اسکیم ان کے بعض فیض یافتوں نے مکمل کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو فرعون مصر تھا، وہ قرآنی تذکرے کے مطابق ایک خاصا باقاعدہ حکمران تھا، جس کا ایک وزیر تھا اور جس کے مشورے کے لیے معمرین اور اہل الرائے لوگوں کی ایک مجلس بھی پائی جاتی تھی، اس مجلس کے اجلاسوں کی جو تعداد قرآن مجید میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور عاجلانہ فیصلے نہیں کیا کرتی تھی، بلکہ اس کے مشورے مناسب اور قابل عمل ہی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام سے ان کی جدت طرازیوں کے باعث کیا برتاؤ کرنا چاہیے؟ جب فرعون نے یہ سوال پیش کیا، تو مجلس شوریٰ نے نرمی اور اعتدال کا مشورہ دیا تھا، اس زمانہ میں عوام الناس تک ایک حد تک سیاسی شعور رکھتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ (قرآن مجید ۱۹/۲۸) جب ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی سخت گیری کے باعث ملامت کرنی چاہی تو اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ:

”ان ترید اَلَا اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ الْخ

تُو تو زمین میں ایک جبار بن جانا چاہتا ہے اور صلاح و فلاح کا کام کرنے والوں میں سے نہیں ہونا چاہتا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مجلس دو گانہ یا مرکب بادشاہت کا زمانہ

نظر آتا ہے۔ ا۔

طاہلوت یعنی بادشاہ ساول کا قصہ قرآن مجید میں ایک خصوصی دلچسپی کا حامل ہے۔ بنی اسرائیل کو ان کے دشمن نے شکست دیکر ان کے گھروں سے جلاوطن کر دیا تھا۔ انتقام کی خواہش نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پیغمبر سے یہ خواہش کریں کہ ان پر ایک بادشاہ نامزد کیا جائے جو ان کو ساتھ لیکر دشمنوں سے لڑ سکے۔

اِذْ قَالَ الْاِنْسِي لَهُمْ اَبْعَثْ لَنَا مَلِكًا فَقَالَ بَلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الْخ
یاد کرو جب موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم
پر ایک بادشاہ کو مامور کرتا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑ سکیں، اُس (نبی)
نے کہا اگر تم لڑنا فرض ہونے کے بعد لڑنے سے انکار کرو تو؟
انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جب
کہ ہمیں ہمارے گھروں اور ہمارے بچوں سے نکال باہر کر دیا گیا
ہے۔ اس کے باوجود جب لڑنا ان پر فرض کیا گیا تو انہوں نے
روگردانی کی، بجز چند لوگوں کے، اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔
ان کے پیغمبر نے ان سے کہا: دیکھو اللہ نے تم پر طاہلوت کو بادشاہ
مقرر کیا ہے، انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارا بادشاہ
بنے؟ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں کیونکہ وہ مالدار
نہیں ہے۔ اس (نبی) نے کہا اللہ نے اسی کو تم پر فوقیت دی ہے
اور علم اور جسم میں اس کو وافر حصہ دیا ہے۔ اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا
ہے، دیتا ہے، اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو جانتا
ہے۔“ (قرآن مجید ۲/۲۳۶ تا ۲۳۷)

علاوہ اور اہمیتوں کے اس اقتباس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مال و دولت یا حسب و

ا۔ قرآن مجید ۲/۳۲ چنانچہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کے متعلق خدا سے دعا کی
تھی کہ وَأَشْرِكْهُ فِیْ اٰمْرِیْ (اس کو میرے کام میں شریک بنا)۔

نسب نہیں بلکہ علم و جسم یعنی سیاست دانی۔ اور بہادری بادشاہت کی اولین ضرورتیں ہیں۔ اس اقتباس سے یہ اہم چیز بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں نے مذہب اور سیاست کو الگ چیزیں ہونا تسلیم کر لیا تھا اور نبی کے علاوہ بادشاہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ بادشاہ فرائض نبوت بجا نہیں لاسکتا تھا اور نہ نبی فرائض بادشاہت، البتہ یہ چیز قابل ذکر ہے کہ طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کے فوری جانشین حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام دونوں بادشاہت اور نبوت ہر دو حیثیتوں کے حامل بنے، ان کا کچھ تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

حضرت داؤد علیہ السلام کا قرآنی تذکرہ بے حد اہم ہے کیونکہ اس میں فرائض بادشاہت کا (جن میں عدل گستری سب سے اہم ہے) ذکر کیا گیا ہے:

(الف) وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاتَّهَ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ الْخ

اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، پھر خدا نے اس کو بادشاہت اور حکمت عطا کی۔ (قرآن مجید: ۲۵۱/۲)

(ب) وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ وَفَصَّلَ الْخُطَابِ ۝ الْخ

ہم نے اسکی حکومت کو مضبوط بنا دیا اور اس کو حکمت اور فیصلہ کرنے والی زبان عطا کی۔ (قرآن مجید: ۲۸/۲۰)

(ج) يٰدَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ الْخ

داؤد! بیشک ہم نے تجھ کو زمین پر ایک نائب مقرر کیا ہے، اس لیے لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کیا کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر ورنہ وہ تجھے خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے اور جو کوئی خدا کی راہ سے بھٹکے تو اس کا انجام بُرا ہوتا ہے، کیونکہ وہ قیامت کے حساب و کتاب کو بھول جاتا ہے۔ (قرآن مجید: ۲۸/۲۶)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ”اور سلیمان

۱۔ معارف: قرآنی اصطلاح میں علم کا مفہوم معرفت حق ہے۔

داؤد کا وارث بنا اے، اگرچہ بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا لیکن اس قرآنی تذکرے کا منشاء یہ بالکل نہیں ہے کہ بیٹا بطور حق کے بادشاہ بنا ہو بلکہ یہ محض خدا کی عنایت تھی کہ باپ کی جگہ بیٹے کو بھی حکومت ملی اور اقتدار کا اصلی سرچشمہ خدا ہی کی مشیت ہے۔ حکمرانی کے کل پرزوں کی حرکت کا سب سے دلچسپ منظر قرآن مجید میں ملکہ سبا کے تذکرہ میں ملتا ہے، چنانچہ:

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي
أَمْرِي مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا حَتَّى تَشْهَدُونِ ۝

”اُس (ملکہ) نے کہا اے سردارو مجھے میرے اس معاملہ میں مشورہ دو میں تمہاری موجودگی کے بغیر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی، انہوں نے کہا ہم بڑے طاقتور اور بہادر لوگ ہیں، حکم دینا تیرا کام ہے، اس لیے تو سوچ کر فیصلہ کر، اُس (ملکہ) نے کہا جب کبھی بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں، تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل بنا دیتے ہیں اور وہ ایسا ہی کریں گے، البتہ میں اُن (حضرت سلیمان کے ملک والوں) کو ایک تحفہ بھیجوں گی اور دیکھو گی کہ سفیر کیا واپس لاتے ہیں۔ چنانچہ جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ تم مجھے مال کے ذریعہ سے کچھ مدد دینی چاہتے ہو، جب کہ وہ چیز جو خدا نے مجھے دے رکھی ہے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے، جو اس نے تمہیں دی ہے۔ تمہیں تو اپنے تحفے ہی پر ناز ہے، ان کے پاس واپس جاؤ، ہم بیشک ان کے پاس ایسی فوجیں لیکر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ پست ہو جائیں گے۔ (قرآن مجید: ۲۷/۳۲ تا ۳۷)

ہر زمانہ میں اس امر کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی ہے، کہ ملت کی رہنمائی کے لیے ایک قوانین کا مجموعہ بھی موجود ہو۔ قرآن مجید میں اکثر اس کا ذکر آیا ہے کہ پیغمبروں کو کتابیں یا صحیفے دیے گئے۔ کتاب کے لفظی معنی حکم دینے کے بھی آتے ہیں اور صحیفہ سے مراد دستور العمل ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلہ میں خاص طور سے اس کا ذکر ہوا ہے کہ جو نبی وہ فرعون کی سرزمین سے نکل کر باہر آگئے تو خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکام لکھی ہوئی تختیاں (الواح) عطا کیں، جن کی تعمیل بنی اسرائیل پر فرض قرار دی گئی۔

ظالم بادشاہوں کے ظالمانہ اور نامناسب افعال کی قرآن مجید میں بار بار بُرائی کی گئی ہے (دیکھیے قرآن مجید ۸۰/۱۸، ۴/۲۸ وغیرہ)۔ ایک چیز جو قرآنی تذکروں میں خاص طور سے قابل ذکر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ مملکت سے زیادہ حکمران مملکت کو نمایاں کیا گیا ہے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مملکت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے اور سیاسی وحدت میں بادشاہ کا ذکر ہی سب سے نمایاں ہے، کیونکہ قدیم زمانوں میں یہی صورت حال تھی۔

اسلامی مملکت:

اب تک ہم نے اپنی تحقیقات کو زمانہ قدیم کی مملکت تک محدود رکھا تھا، اس کے معنی یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی مملکت قائم کی تھی، اس کے لیے کوئی خصوصی احکام قرآن مجید میں نہیں دیے گئے، ہمارے تذکرہ کا منشا یہ تھا کہ چونکہ انبیاء سلف کی سنت بھی مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل قرار دی گئی ہے، اس لیے ان کے زمانہ کے احکام کا تذکرہ نہ صرف اسلامی مملکتی تصور کے لیے ایک پس منظر کا کام دیتا ہے بلکہ واقعہً وہ اسلامی قانون سیاسی و انتظامی کا جز بن جاتے ہیں۔ وہ احکام جو قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر دیے گئے ہیں، ان کا موضوع وار تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے ربانی ماخذ کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور قیامت کے حساب و کتاب بار بار زور دیا گیا ہے تاکہ بادشاہ میں کسی دنیاوی ذمہ داری کے نہ ہونے کے باعث استبداد نہ پیدا ہو جائے، اگرچہ قرآن مجید

میں علاقے یا زمین کا ذکر بعض وقت حکمرانی کے ساتھ آیا ہے، لیکن وہ بڑی حد تک ضمنی ہے، بنیادی نہیں مثلاً:

(الف) قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ۚ

کہہ اے خدا ملک کے مالک! تو ہی جس کو چاہتا ہے، ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک واپس لے لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تو ہی ذلیل کرتا ہے، بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(قرآن مجید: ۲۶/۳)

(ب) هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب مقرر کیا اور تم میں سے چند کو دوسروں پر رتبے میں فوقیت دی تاکہ تمہیں اس چیز کے ذریعہ سے آزمائے، جو اس نے تمہیں دی ہے۔

(ایضاً: ۶/۱۶۵)

(ج) وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝

اور ہم نے تم کو زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمہارے لیے وہاں روزی مہیا کی بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

(ایضاً: ۱۰/۷)

جامعہ روما کے پروفیسر نالینو کو یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں معلوم ہوتی کہ اسلامی حکمران کی تخت نشینی کے وقت جو بیعت لی جاتی ہے، وہ ایک طرح سے معاہدہ معاشرتی کہلا سکتا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

”کسی شخص کو خلافت کا رتبہ عطا کرنا فقہاء کے نزدیک ایک معاہدہ ہوتا ہے، جس کا ایک فریق وہ شخص ہوتا ہے جو اس عہدے کو قبول کرے اور دوسرا فریق جماعت اسلامی ہوتی ہے، یہ معاہدہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ بیعت یعنی اظہار وفاداری امت کے اصحاب حل وعقد کی طرف سے نہ عمل میں آجائے“۔

لفظ بیعت کے معنی خود ایک معاہدہ کے ہوتے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وفاداری اور اطاعت کی ایک طرف سے پیشکش کی جائے اور دوسرے فریق کی طرف سے اُسے قبول کیا جائے، (دیکھیے قرآن مجید ۴۸/۱۷، ۶۰/۱۲) دوسرے الفاظ میں حکمران کا اقتدار چاہے مشیتِ عامہ سے پیدا نہ ہوتا ہو لیکن اسی پر مبنی ہوتا اور اسی کا محتاج ضرور رہتا ہے۔ اگرچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مسلمانوں میں یہ چیز جزء عقیدہ ہے کہ پیغمبر معصوم ہوتے ہیں اور اگرچہ خلفاء پیغمبروں کے سیاسی جانشین سمجھے گئے لیکن معصومیت کا یہ اعزاز ان کے لیے کبھی تسلیم نہیں کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ بعض دیگر قوموں میں ”بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا“ کا جو سیاسی نظریہ یا کلیہ پایا جاتا ہے، وہ مسلمانوں میں کبھی جگہ نہ پاسکا، اسکے برخلاف مسلمانوں کو اسی پر تازہ ہے کہ نہ صرف عام حکمران بلکہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی حقوق العباد کے معاملے میں انہی عام قوانین کے پابند ہیں جن کے عام مسلمان اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی خود اپنی ذات کے خلاف مقدمات سنے اور منصفانہ فیصلہ کیا، پیغمبروں کی معصومیت کا منشاء اسلامی علم کلام میں صرف یہ لیا جاتا ہے کہ وحی کی تبلیغ اور خدا کے احکام پہنچانے میں ان سے کوئی غلطی یا سہو سرزد نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ دیگر معاملات میں پیغمبر کی حیثیت بھی ایک انسان ہی کی ہوتی ہے اور احادیث میں متعدد مرتبہ بیان ہوا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیاوی معاملات میں میں بھی تمہارے ہی طرح ایک انسان ہوں، سیاسی حیثیت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جماعت اسلامی کے ایک فرد تھے اور ان قوانین کے جن کو آپ نافذ کرتے تھے، خود بھی پوری طرح پابند تھے۔

غرض جملہ مخلوقات کی طرح کرۂ ارض اور انسانی بستی کا بھی اصل مالک اور بادشاہ خدا ہی کی ذات ہے اور وہی صلاحیتوں کو دیکھ کر کسی انسان کو اپنی نیابت سے سرفراز کرتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ وہ عمل کیسا کرتا ہے۔ (ان الارض یرثھا عبادی

۱۔ فرانیسی رسالہ موسومہ خلافت کی عام نوعیت اور سلاطین عثمانیہ کے دعوے خلافت پر تبصرہ، مطبوعہ روما، ص: ۱۱

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۴۴۴، کمال ابن الاثیر ج ۲: ص ۱۴۱ نیز سیرۃ شامی میں آٹھ دس ایسے واقعات درج ہیں۔

الصَّالِحُونَ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً لِّيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَغَيْرِهِ) خدا کا خلیفہ برحق تو نبی ہوتا ہے جس کا براہ راست وحی سے تقرر ہوتا ہے اور وحی ہی سے اسکی رہنمائی ہوتی ہے، اس کے باوجود بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اطاعت اور پیروی کی بیعت لیتے رہے، نبی کے دنیا سے پردہ فرمانے پر احکام شریعت سے ناواقفوں کو واقف کرانے کی حد تک حدیث شریف میں ہے کہ العُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ لیکن سلطنت رانی اور سیاست مدن کے لیے ماوردی، ابن خلدون وغیرہ کے الفاظ میں ”اصحاب حل وعقد“ کسی کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ انتخاب بمصدق حدیث شریف يَذُ اللَّهُ عَلَى الْجَمَاعَةِ منشاء ربانی کا اظہار اور باعث خیر و برکت ہوتا ہے اور یہی اصحاب حل وعقد انتخاب اور بیعت کے بعد بھی حکمرانی میں مرجع کا کام دیتے ہیں اور ضرورت ہو تو اسے معزول بھی کر سکتے ہیں ۲، حکمران کے حق اجتہاد کے حدود، مصالح ملکی اور نظم و نسق میں شوری کا موقف، اصحاب حل وعقد کی دستوری حیثیت، وغیرہ پر تفصیل سے بحث یہاں ممکن نہ ہو گی البتہ اس سوال کا جواب شاید ضروری ہے کہ اصل دنیاوی اقتدار کے استعمال کا حق کس کو حاصل ہوتا ہے، اس کا جواب حضرت امام اعظمؒ کے الفاظ میں:

ان نواحی دارالاسلام اسلامی سرزمین کے جملہ حصے اسلامی
تحت ید إمام المسلمین بادشاہ کے اقتدار میں ہوتے ہیں اور
ویدہ ید جماعۃ المسلمین۔ اسکا اقتدار مسلمانوں کی جماعت کا
(مبسوط شرحی ج ۱۰ ص ۹۳) ہی اقتدار ہوتا ہے۔

۱۔ معارف: سند یہ حدیث ثابت نہیں۔

نوٹ: یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل اور ابن ماجہ میں موجود ہے۔ حدیث سند صحیح اور ثابت ہے۔ ملاحظہ ہو المولود المشہور فی الاحادیث المشہورہ امام محمد الزرکشی (م ۷۹۷) ص ۱۲۰ فتح الباری عسقلانی ص ۱۴۰ نیز اس روایت کو امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور طبرانی نے معجم میں نقل کیا ہے۔ (مرتب)

۲۔ بدائع الصنائع للکاسانی ج: ۷ ص: ۱۶۔

امام ابو حنیفہؒ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی نے مزید وضاحت سے کہا ہے کہ کسی ملک کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا امتیاز یہ ہے کہ وہاں غلبہ اور محافظ قوت کس قوم کو حاصل ہے، تعداد سے بحث نہیں ”لہما - الدار انما تنسب الی اہلہا لثبوت ید ہم القاہرۃ علیہا و قیام ولا یتہم الحافظۃ فیہا (محیط رضی الدین سرخسی مخطوطہ استانبول، ورق نمبر ۶۰۵ ب) اور حنفی علماء متفق ہیں، کہ اسلامی مملکت کا انتظام امام پوری امت مسلمہ کے نائب کے طور پر کرتا ہے چنانچہ شارح شیبانی کے الفاظ میں الامام بمنزلۃ جماعۃ من المسلمین فی استیفاء هذا الحق“ (مبسوط سرخسی ج ۹ ص ۲۰۴) یعنی اس حق کے نفاذ میں امام کی حیثیت امت مسلمہ کے قائم مقام کی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ اسلامی تصور اقتدار اعلیٰ ہے کہ مقتدر اعلیٰ خداوند خلاق کی ذات کبریائی ہے اور حکمرانی شریعت کو حاصل ہوتی ہے۔ اور ”خليفة الله في الارض“ یا شریعت کے نفاذ کے افسر کا انتخاب بھی خدا ہی کرتا ہے اور اس بارے میں خدا کی مشیت کا اظہار ”يُذِ اللّٰهُ عَلَى الْجَمَاعَةِ“ اور ”لَا يَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى الضَّلَالَةِ“ وغیرہ احادیث شریفہ کے بمصداق اور عہد خلافت راشدہ کے نظائر کے مطابق اصحاب حل و عقد کی بیعت کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

دین و دنیا کا ملاپ:

قدیم زمانوں میں جب انسانی تمدن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی اور تقسیم کار کی اتنی زیادہ ضرورت پیش نہ آئی تھی، کسی ملک میں مرکزی حکومت کے اختیارات یا تو عدل گستری کے متعلق ہوتے تھے (جس میں دشمن سے جنگ بھی شامل ہے اور فقہ کی کتابوں میں باب الجہاد کا ذکر ”حدود“ یعنی سزاؤں کے سلسلہ ہی میں ملتا ہے) یا قومی معبود کی پرستش و عبادت کے متعلق۔ دیگر سلطنتی نظم و نسق کے مسائل اٹھتے ہی نہ تھے بلکہ وہ عوام کے انفرادی معاملات سمجھے جاتے تھے اور عبادت ہی نہیں عدل گستری اور جنگ بھی مذہبی مراسم کے تابع تھی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کثوری اور مذہبی فرائض میں

دوری پیدا ہوتی جاتی تھی۔ چنانچہ رومیوں نے بُس (Gus یا دنیاوی قانون) کو ہمہ گیر فاس (Feas یا مذہبی قانون) سے ایک الگ چیز کے طور پر ایجاد کیا۔ یہودیوں نے

قَالُوا لَنَبْعَثَ لَنَا مَلِكًا نُفَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
(قرآن ۲: ۲۳۶)

اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر جس کے ساتھ ہم خدا کی راہ میں جنگ کریں۔

اور نبوت و بادشاہت یا مذہب و سیاست کو جدا کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی یہ قول انجیل میں منسوب ملتا ہے کہ قیصر کی چیزیں قیصر کو دید و اور کلیسا کی کلیسا کو۔ بدھ متیوں اور ہندوؤں کے ہاں بھی ترک دنیا ہی انسانیت کا کمال قرار پایا۔

غرض قدیم اہل مذہب نے دنیائے ناپائدار کو دل لگانے کے قابل چیز نہ سمجھا لیکن اس میں دو بنیادی مسائل نظر انداز ہو کر خالی پیدا ہو گئی، ایک تو گنتی کے چند فرشتے صفت انسانوں کے سوا باقی جو لاکھوں کروڑوں عامۃ الناس تھے، ان کے معاملات مادیت پسندانہ ہو گئے اور دوسرے سیاست کی اخلاقی بنیاد نہ رہی اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ سابقہ تمام مذاہب اکائیوں یا دہائیوں میں ختم ہو جانے والے فرشتہ صفت انسانوں کے لیے ہوتے تھے اور اسلام نازک کر سکتا ہے کہ وہ اُمیوں اور اوسط درجہ انسانوں کے لیے ایک قابل عمل دستور لایا، یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں ایسوں ہی کی بہت بڑی اکثریت ہوتی ہے، انسان نما فرشتے اور انسان نما شیطان دونوں کی تعداد ہمیشہ بہت محدود ہی ہوتی ہے۔

مذہب اور سیاست دو بالکل الگ چیزیں ہیں۔ مذہب خدا اور بندے کے تعلقات کا نام ہے اور سیاست بندے اور بندے کے معاملات کا۔ ان دونوں کو ایک کہنے والا گویا ہاتھ اور پاؤں کو ایک کہتا ہے لیکن جس طرح ایک زندہ اور تندرست انسان میں ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی ایک مشترکہ اور مرکزی قوت مثلاً عقل یا ارادے کے تابع ہوتے ہیں بالکل اسی طرح دین اسلام نے مذہب اور سیاست کو ایک مشترکہ دستور العمل

کے تابع کر دیا جو قرآن یا ربانی کلام تھا اور دونوں ہی کی رہنمائی کے لیے احکام کا ماخذ ایک ہی قرار دیکر سیاست میں اخلاقی اساس اور اخلاق میں حقیقت پسندی باقی رکھی۔ کوئی شخص ہاتھوں کے بل تھوڑی دُور ضرور چل سکتا ہے اور پاؤں سے بُرا بھلا کچھ لکھ بھی ضرور سکتا ہے، اسی طرح عبادت کو سیاست اور سیاست کو عبادت بنا کر انسان چند روز گزار ضرور سکتا ہے لیکن یہ غیر فطری عمل نہ تو سہولت بخش ہوگا اور نہ مفید۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک بزرگ سیرت نگار نبوت کے الفاظ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لیکر آئے۔ آپ نے صرف آسمانی بادشاہت کی خوشخبری نہیں سنائی بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی بے خوف و خطر کیجا سکے اور خدا کی بادشاہی دنیا میں قائم ہو:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ الْخ

”خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائیگا (جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے) اور اُن کے لیے ان کے اس دین کو جو اُس نے اُن کے واسطے پسند کیا ہے جمادیکا۔“ (قرآن: ۲۴: ۵۵)

قرآن نے محی اور سب سے اچھی دعا انسانوں کے لیے یہ بتائی ہے:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

”اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے (دوزخ) سے بچا۔“ (قرآن: ۲: ۲۰۱)

اور ایک جگہ فرمایا:

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ

وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ

”اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے! (قرآن ۱۶:۳۰)

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے:

قَاتِلْهُمْ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنِ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۖ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۷﴾

”تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ (قرآن ۳:۱۷۸)

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں:

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا ۗ

”اور جنہوں نے (ہمارے لیے) ستائے جانے کے بعد گھر چھوڑا ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور بیشک آخرت کا اجر سب سے بڑا ہے۔ (قرآن ۱۶:۴۱)

(اور اولیاء و اتقیاء یعنی فرشتہ صفت مسلمانوں کو ترک دنیا کی ہدایت نہ کی بلکہ دنیا داری اور دین داری دونوں کے ملاپ کا حکم دیا):

الَّذِينَ إِنْ مَكَانَهُمْ فِي الْأَرْضِ أَحَقُّوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ ۗ

”وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں اور اچھے کاموں کو کہیں اور بُرے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔ (قرآن ۲۲:۴۱)

ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون

کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیے اور یہ اشارہ بھی کہ دین کا امتزاج یا ملاپ ہی انسان کو انسان بناتا ہے اور ”احسن تقویم“ کا مظاہرہ ہو سکتا ہے ورنہ وہ یا تو فرشتہ ہو جائے گا یا شیطان اور ان دونوں اصناف سے جدا ایک خاص مخلوق یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جائیگا۔

ایسی آیتیں قرآن مجید میں بکثرت ملتی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا نے اپنی ہر مخلوق انسان کی خدمت یا استفادے کے لیے پیدا کی ہے اور انسان اپنے خالق کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے مگر اس کی تفصیل یہاں طول بحث سمجھی جائیگی۔

بیعت:

حکمران کی اطاعت کو جیسی کچھ اہمیت حاصل ہے، ظاہر ہے، قرآن مجید میں بھی اس پر کچھ کم زور نہیں دیا گیا، مثلاً

(الف) **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ**

وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ الخ

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے افسرانِ حکومت ہوں، اگر تم میں کسی معاملہ میں آپس میں جھگڑا ہو تو اُسے اللہ اور رسول سے رجوع کرو، اگر تمہیں خدا اور یومِ آخرت پر سچا ایمان ہو، یہی بہتر اور مآل کار اچھا طریقہ ہے۔“
(قرآن ۵۹:۳)

(ب) **إِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذْأَعُوا بِهِ** الخ

”اگر امن یا خوف کی ان کو کوئی خبر ملتی ہے، تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، بہتر ہوتا کہ وہ اسکی اطلاع رسول کو اور اپنے افسروں کو دیتے تو سمجھدار لوگ اس کو سمجھ جاتے۔“
(قرآن ۸۳:۳)

یہ تو افسروں کی اطاعت کا ذکر تھا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی اطاعت پر تو اس سے بھی زیادہ مواقع پر زور دیا گیا ہے۔ کہیں صرف حکم ہے تو کہیں اس

کے فوائد بتا کر ترغیب دی گئی ہے۔ رسول کی اطاعت اور پیروی کے ان احکام پر یہ ناگزیر نتیجہ تھا کہ بعد کے زمانہ میں آپ کے ہر قول اور فعل کا تذکرہ محفوظ کرنے کی اتنی عظیم الشان کوششیں اہل علم کی جانب سے عمل میں لائی گئیں۔ ایسی بعض آیات حسب ذیل ہیں:

(الف) وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا

جو کچھ رسول تمہیں دیں اُسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رُک جاؤ، (قرآن ۵۹: ۷)

(ب) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

”بیشک اللہ کے رسول میں تمہارے لیے ایک اُسوہ حسنہ پایا جاتا ہے۔ (قرآن ۳۳: ۲۱)

(ج) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ

وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ وَانْتُمْ تَسْمَعُونَ ۝ الخ

”اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جب وہ کچھ کہے تو سن کر روگردانی نہ کرو..... اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں تاکہ تم کمزور نہ پڑ جاؤ اور تمہاری ہوانہ اکھڑ جائے! اسکے برخلاف صبر سے کام لو، اللہ صبر سے کام لینے والوں کیساتھ ہوتا ہے۔

(قرآن مجید ۸: ۲۱ و ۳۶)

(د) وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۖ

”وہ (یعنی رسول خدا) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، بلکہ وہ وحی ہی ہوتی ہے۔ (قرآن مجید ۵۳: ۳-۴)

۱۔ ایک بحری محاورہ ہے، بادبانوں سے ہوا نکل جائے تو طراح بے بس ہو جاتا ہے، اس محاورے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قدیم عربوں کو سمندر سے کتنا لگاؤ تھا۔

آرنلڈ نے اپنی کتاب خلافت میں بالکل ٹھیک رائے ظاہر کی ہے کہ اس طرح رعیت کے فریضہ اطاعت پر زور دیا گیا، مگر اس کے ساتھ ہی حکمران کے لازمی فرائض کا اتنا ذکر نہیں ہوا، اس سے اسلامی حکمران جابر اور استبداد پسند نہیں بن گیا کیونکہ حشر و نشر اور حساب و کتاب کا عقیدہ نیز حکمران کا بھی قانون اسلامی کے ماتحت ہونا اس پر گرفت رکھنے کے لیے کافی ثابت ہوئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حکمران کے فرائض پر قرآن مجید نے زور نہ دیا ہو۔

(الف) فَلِذَلِكَ فَادِّعْ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۚ

اس کے لیے بلا اور (اے محمد) استقامت سے رہ جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر بلکہ کہہ: میں ایمان لاتا ہوں ہر اس کتاب پر جو اللہ نے اتاری ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تم میں انصاف کرتا رہوں، اللہ ہمارا اور تمہارا آقا ہے، ہم کو ہمارے کام اور تم کو تمہارے کام، ہم میں اور تم میں کوئی حجت نہیں، اللہ ہمیں سچا کرے گا اور ہمیں اسی کی طرف جانا ہے۔

(قرآن مجید ۴۲: ۱۵)

(ب) فَكَسَبْنَاكَ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَكَسَلْنَا الْمُرْسَلِينَ ۝

تب ہم یقیناً ان لوگوں سے دریافت کریں گے جن کے پاس ہمارا پیغمبر بھیجا گیا تھا اور ہم پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔

(قرآن مجید ۷: ۶)

متعدد آیتوں میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ اجتماعی اور حکومتی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دی جائے۔ مثلاً قرآن مجید (۸: ۲۷ تا ۲۸ و ۹: ۲۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ الْخ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ جان بوجھ کر اپنی باہمی امانتوں میں خیانت کرو۔

وَاَعْلَمُوا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فَتْنَةٌ، الْخ

اور یہ جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہے اور خدا ہی کے پاس اجر عظیم پایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ذاتی مفاد کے لیے یا بیوی بچوں کی خاطر بھی ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو نامناسب ہو اور عالم آخرت کے حساب و کتاب کے لیے اپنے ہر فعل میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

ضمناً اس چیز کی طرف بھی اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ حب ملی اسلام میں ایک نیم مذہبی نیم سیاسی وحدت کے تصور پر مبنی ہے، جغرافیائی یا لسانی یا نسلی وحدت سے اُسے کوئی سروکار نہیں، چنانچہ:

(الف) يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ

شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا الْخ

اے انسانو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے بنایا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا، تاکہ تم پہچانے جا سکو، لیکن اصل میں تم میں سے سب سے زیادہ بزرگ خدا کے پاس وہی ہوتا ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہو، علم اور خبر خدا ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

(قرآن مجید ۱۲:۴۹)

(ب) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ

ایمان والے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (قرآن مجید: ۱۰:۴۹)

(ج) وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ

عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ الْخ

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ نہ کرو اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے اور (ایمان لانے کے

باعث) اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور اس کی عنایت سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور اسی نے تم کو بچایا۔ اس طرح اللہ اپنی آیتیں تم کو بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاسکو اور تم میں سے ایک ایسی قوم پیدا ہو جو بھلائی کی طرف بلائے، اچھی بات کا حکم دے اور بُری بات سے روکے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب ہونگے۔

(قرآن مجید ۱۰۲:۳)

یہ بیان کرنے کی شاید ہی کچھ ضرورت ہو کہ ایمان اور عمل صالح کی فوقیت کے سوا اسلام حسب و نسب کی کسی برتری کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا، انبیاء کی اولاد تک ”عمل غیر صالح“ کے باعث عذاب میں گرفتار ہوئی۔

عدل گستری:

یہ حکمران کا اولین فریضہ ہے کہ اُسے نا طرفدار ہونا چاہیے اور انصاف کے ساتھ حسب موقع و ضرورت رحم بھی کرنا چاہیے، (دیکھیے قرآن مجید ۱۶:۹۰، ۴:۵۸ و ۱۳۵، ۸:۱۶، ۴۰:۵)۔

غیر مسلم ذمی رعایا کو عدالتی خود مختاری دینے کا قرآن مجید میں حکم ہے جہاں ان کے ساتھ ان کے شخصی قوانین کے مطابق فیصلے انجام پائیں گے، اگر غیر مسلم رعایا اسلامی عدالت میں اپنی مرضی سے مقدمہ یا مرافعہ پیش کرے تو اس کے ساتھ بھی انصاف کیا جانا چاہیے (دیکھیے قرآن مجید ۵:۴۲ تا ۵۰) اس بارے میں مزید تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے ۲ البتہ اتنا اور اشارہ کیا جاسکتا ہے کہ قیامت کی جزائے اعمال، حساب و کتاب، چشم دید گواہ، تحریری شہادت، کرانا کاتین کی ڈائری وغیرہ کی جو تفصیل قرآن میں آئی ہے وہ عہد نبوی کے مروجہ امور ہوں گے جن کے ذریعہ سے عالم آخرت

۱۔ قرآن مجید ۱۱:۴۶

۲۔ ”عدل گستری ابتدائے اسلام میں“ کے عنوان سے ایک مضمون مجلہ عثمانیہ حیدرآباد مارچ ۱۹۳۸ء میں چھپا ہے جس کے حوالے فرانسیسی مؤلفین سے بھی دیے ہیں۔

کا خاکہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شورائیت:

قرآن مجید میں حکم ہے کہ حکمران اپنے فیصلے مشورہ لیکر کیا کرے، چنانچہ:

(الف) **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ** الخ

اور اُن سے معاملات میں مشورہ کر پھر جب تو عزم کر لے تو خدا پر توکل کر، بیشک خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(قرآن مجید ۳: ۱۵۹)

(ب) **فَمَا أَوْتِيتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَّاعٌ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا**

وَمَاعِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَى الخ

جو کچھ تمہیں دیا گیا وہ دنیاوی زندگی کا ایک حق تمتع ہے اور بس ورنہ خدا کے پاس جو چیز ہے، وہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے، یہ ان لوگوں کو ملے گی جو اپنے رب پر ایمان لاتے اور اس پر توکل کرتے ہیں اور جن کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں اور جو اس چیز کو خرچ (خیرات) کرتے ہیں جو ہم نے اُن کو عطا کی۔

(قرآن مجید ۲۲: ۳۶-۳۸)

(ج) **طَاعَةُ وَقَوْلٌ مَعْرُوفٌ**

فَإِذَا عَزَمْتَ الْأَمْرَ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ

(مشیروں وغیرہ کے لیے فیصلے کے بعد) اطاعت اور فیصلے کے وقت قول معروف ہونا چاہیے اور پھر جب کسی کام کا عزم کر لیا جائے تو اگر وہ لوگ خدا سے اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کریں تو انہی کے لیے اچھا ہے۔

(قرآن مجید ۴: ۲۱)

غرض اگر مشورہ لینے کی ایک طرف پابندی عائد کی گئی ہے تو دوسری طرف مشورہ

کے بعد جو بھی چیز قرار پا جائے اسکی تعمیل کرنا بلا لحاظ اس کے کہ وہ اپنی رائے اور مشورے کے مطابق تھی یا مخالف ضروری قرار دیا گیا ہے، ساتھ ہی اس کا بھی ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آخری ذمہ داری چونکہ حکمران پر ہوتی ہے اس لیے اس کو مشورے کے متعلق حق تنسیخ دیا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید ۶: ۱۱۷ میں بیان کیا گیا ہے۔

قانون سازی:

قرآن مجید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کو اُسوۂ حسنہ اور قانون کی حیثیت دی ہے: (دیکھیے قرآن مجید ۵۳: ۳ تا ۴، ۵۹: ۷ وغیرہ) اس حکم کے باعث اسلامی فقہاء یا قانون سازوں کا کام آسان تر ہو گیا کیونکہ ایک طرف تو جن چیزوں کا ذکر قرآن مجید میں نہ تھا ان کے لیے حدیث نبوی میں کافی مواد مل گیا اور دوسری طرف یہ بھی دیکھا گیا کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ قیاس اور استنباط سے کام لیا، بلکہ اسکی صراحت کے ساتھ اجازت بھی دی تھی جیسا کہ معاذ بن جبلؓ گورنر یمن کے تقرر نامے وغیرہ میں مذکور ہے، اگرچہ قرآن اور حدیث کی قیاس کے ذریعہ سے تنسیخ نہیں ہو سکتی، لیکن قیاس اور تعبیر کی اجازت سے علماء و فقہاء کو انفرادی رائے سے کام لینے کی خاصی گنجائش مل گئی حتیٰ کہ یہاں تک تسلیم کیا گیا کہ مجتہد سے غلطی ہونے کے امکان کے باوجود اسکو اس کام سے نہیں روکا جاسکتا، چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ ”اجتہاد کرنے والا خطا بھی کر سکتا ہے، صواب کو بھی پہنچ سکتا ہے اور صحیح فیصلہ کی صورت میں اسے دو ثواب ملیں گے اور خطا کی صورت میں ایک ثواب۔“ اس طرح اس کا بھی موقع نکل آیا کہ ایک مجتہد کے بعد دوسرا مجتہد بھی اجتہاد کرے اور کسی بہتر نتیجہ پر پہنچنے کے باعث سابقہ مجتہد کا فیصلہ منسوخ قرار پائے اور خود اجماع کے متعلق بھی فقہاء نے ایسی ہی سہولت تسلیم کی ہے جب تک ان اجازتوں سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا، اسلامی قانون میں زمانہ کا ساتھ دینے کی گنجائش رہی اور وہ ترقی کرتا رہا اور جب سے قدیم فقہاء کے فیصلوں کے خلاف اجتہاد کا دروازہ چند لوگوں نے بند کر دیا تو اس سے قانون اسلامی کو بے حد نقصان پہنچا، لیکن یہ مسئلہ یہاں دائرہ بحث سے خارج ہے۔

جہان بانی کے قواعد:

قرآن مجید میں اندرونی و بیرونی سیاست کے قواعد خاصی تفصیل سے ملتے ہیں جن سے حالت امن و صلح و غیر جانبداری میں حکمران کی رہنمائی مقصود تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک مملکت قائم کی اور اس ملک میں جہاں ہمیشہ سے نزاج سا چلا آ رہا تھا، ایک مرکزیت اور ایک مملکت قائم کی اور عربوں کو خانہ جنگیوں کے ذریعہ اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے روک کر انہیں اپنے زمانہ میں دنیا کی سب سے بڑی فلاح اور نوآباد کار قوم بنا دیا اور ان کے ذہنوں سے احساس کمتری کو کلی طور پر دور کر کے ان میں وہ صحت و جذبہ بھر دیا، جسے احساس برتری یا احساس خود شناسی کہا جاسکتا ہے اور جو کسی ترقی پذیر قوم کے لیے اس قدر ضروری ہوتا ہے، چنانچہ:

(الف) كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ

بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم وہ بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لیے پیدا کی گئی، تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بُری بات سے روکتے ہو۔

(قرآن مجید ۳: ۱۱۰ نیز ۱۹: ۳ و ۸۵)

(ب) اٰذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتُلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوْا ۚ الْخ

ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا تھا (برابر کا جواب دینے کی) اجازت دیدی گئی، کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا تھا..... یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ خدا کی عبادت کو قائم کر دیں اور زکوٰۃ دیں، اچھی بات کا حکم دیں اور بُری بات سے روک دیں۔

(ایضاً ۲۲: ۳۹ و ۴۱)

(ج) قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ

ان سے اس وقت تک لڑتے رہو تا آنکہ فتنہ باقی نہ رہے اور خدا ہی کا دین چھا جائے۔

(ایضاً ۸: ۳۹)

(د) وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ

اے محمد ہم نے تجھے صرف اس لیے بھیجا ہے کہ تمام لوگوں کے لیے
بشیر و نذیر بنے، گوا کثر لوگ اسے نہیں جانتے۔ (ایضاً ۳۲: ۲۸)

غالباً یہی وہ یقین یا احساسِ فرض تھا جس نے انہیں دنیا میں حکومتِ الہیہ قائم کرنے کے لیے اپنی ہر چیز کو قربان کر دینے کے لیے آمادہ کر دیا۔ جہاد کا جو حکم مذکورہ بالا اور دیگر آیات قرآنی میں ملتا ہے اس کا منشاء یہ بالکل نہ تھا کہ دوسروں کی جائیداد لوٹی جائے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ایک مقدس ترین اور بڑا ایثار طلب فریضہ تھا کہ اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر دوسروں کی رہنمائی کریں اور ان کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ یہ بار جو محض خدا کی راہ میں تھا اسے انہوں نے ہنسی خوشی برداشت کیا۔

قانون بین الممالک کے خاصے تفصیلی احکام ہمیں قرآن مجید میں ملتے ہیں جن پر مختلف مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں، یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ قرآن مجید میں انتقامی جنگ (۲: ۱۹۰ تا ۱۹۵) معاہدات کی تعمیل (۷: ۹) مدافعت (۴: ۷۵، ۲۲: ۳۹ تا ۴۱) ہمدردانہ جنگ (۸: ۷۲) فریقِ ثانی کی طرف سے معاہدہ شکنی کا خوف (۸: ۵۸) مذہبی رواداری (۲: ۲۵۶، ۱۰۹: ۶، ۱۰۰: ۱۰) غیر مسلم رعایا سے برتاؤ (۹: ۲۹) قیدیوں سے برتاؤ (۴: ۷۵، ۸: ۷۲) پناہ جویوں کو امن دینا (۶: ۹) مفتوحہ اراضی کا انتظام (۷: ۱۰) صلح کرنا (۸: ۶۱) غیر جانبداری (۳: ۸۸، ۹۱، ۵۹: ۱۱ تا ۱۲، ۶۰: ۹ تا ۸) وغیرہ وغیرہ امور کا اصولی ذکر ملتا ہے۔

قومی دولت:

كُ لَا يَكُونُ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ

تاکہ وہ تم میں سے صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رہے۔

(قرآن مجید ۵۹: ۷)

۱۔ چنانچہ اسلامک کلچر حیدرآباد میں جنوری ۱۹۴۱ء و مابعد کے پرچوں میں کئی سو صفحوں کا ایک طویل مقالہ چمپا ہے، اسکی کتابیات میں سابقہ اہل علم کی کوششوں کی بھی تفصیل ہے۔

یہ اسلامی اصولِ دولتِ عامہ کا خلاصہ ہے جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، اسلامی معاشیات کے پیش نظر یہ چیز رہی ہے کہ دولت کی ملک کے ہر طبقہ میں تقسیم عمل میں آئے اور وہ یکجا اکٹھی نہ ہو بلکہ گردش کرتی رہے، معیار سے زائد دولت پر لازمی محصول (یعنی زکوٰۃ) وصیت کرنے کے اختیارات کی تحدید اور کسی شخص کی جائیداد سے اسکی وفات پر اس کے قریبی رشتہ داروں کو لازمی طور سے حصہ ملنا، نیز غربا اور محتاجوں کے لیے حکومت کی آمدنی میں لازمی طور سے حصہ مقرر کیا جانا، یہ اور اس کے مماثل قاعدے قرآن مجید نے مقرر کیے ہیں جن سے تقسیم و گردش دولت کا مقصد پورا ہوتا ہے اور ساتھ ہی انفرادی ملکیت پر کوئی قید عائد نہ ہونے سے ہر شخص کو اپنے قوائے فطری سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ترغیب ہوتی رہتی ہے اور سود کی ممانعت اور قرضہ ہائے حسنہ کا انتظام جو قرآن مجید نے کیا ہے، وہ اسلامی قواعدِ معاشیات کو ایک مکمل نظام کی حیثیت دیدیتے ہیں، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ اشتراکیت، بلکہ اس میں ان دونوں کی خوبیاں ہیں اور ساتھ ہی دونوں کی بُرائیوں سے اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اخلاقِ عامہ:

میرے نزدیک مذہب اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے ممتاز عمل ہیں ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے، مذہب انسان اور خالق کے تعلق کا نام ہے اور سیاست بندوں کے باہمی تعلقات کے لیے برسرکار ہوتی ہے، لیکن اگر ان دونوں میں کوئی رابطہ اور حلقہٴ اتصال نہ پیدا کیا جائے تو انسانیت کو لامحدود نقصان پہنچ جاتا ہے، اسلام نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا اور اس کو کامیابی سے عمل میں لا کر بھی دکھا دیا اور وہ یہ تھا کہ اگرچہ مذہب اور سیاست دونوں کے دائرہ ہائے عمل بالکل جدا جدا ہیں لیکن دونوں کے قواعد کا ماخذ ایک ہی چیز کو قرار دیا گیا، چنانچہ مسلمانوں کا مذہب اور مسلمانوں کی سیاست دونوں کی رہنمائی قرآن و حدیث، اصولِ انصاف و استحسان اور ہم آہنگی ضمیر سے ہوتی ہے۔

سیاسی اصطلاحات:

اسلامی ادارہ ہائے سیاست نے اپنی بہت سی اصطلاحیں قرآن مجید ہی سے لی

ہیں، چنانچہ امت اور ملت سے سیاسی جماعت مراد ہوتی ہے، خلیفہ اور امام اس جماعت کے سردار کا نام ہوتا ہے، (دیکھیے قرآن مجید ۸:۴۲ نیز سیرۃ ابن ہشام ص ۳۴۱ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے لیے ہجرت کے بعد جو دستور مملکت نافذ فرمایا تھا اور جس کا پورا متن خوش قسمتی سے ہم تک پہنچ چکا ہے، اس کی دفعہ ۲ میں بھی انہی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے، لفظ خلیفہ کے لیے دیکھیے قرآن مجید ۲۷:۳۸ اور لفظ امام کے لیے ۱۲۴:۲)۔

جانشینی:

لفظ خلیفہ کے ساتھ ہم جانشینی کے خاوردار مسئلہ سے دوچار ہو جاتے ہیں، یہی وہ مسئلہ ہے جس نے تیرہ سو سال سے مسلمانوں کو دو بڑی متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو اسلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے لائے تھے اور جس کی آپ عمر بھر تبلیغ کرتے رہے، اس کے بنیادی اصولوں میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ آپ کی جانشینی کے لیے کیا اصول ہو اور اس اصول کا ماننا اس سے بھی کم ایک جز عقیدہ امر بن سکتا ہے لیکن بد قسمتی سے اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہو گئی اور ہر دو فریقوں کے ہاں غلو رکھنے والے خیالات بھی پھیلنے لگے، حالیہ زمانہ میں ایک حل جو اس کے لیے سوچا گیا ہے وہ سنجیدہ غور کا مستحق ہے، وہ یہ کہ سنی اور شیعہ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ تاریخی واقعہ کی حیثیت سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؑ پہلے خلیفہ نہیں ہوئے، اسی طرح شیعہ اور سنی دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ روحانی امور میں حضرت علیؑ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ بلا فصل ہیں، چنانچہ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ وغیرہ قریب قریب تمام صوفی سلسلے اس کو مانتے ہیں۔

۱۔ معارف: ”خلیفہ بلا فصل“ کے معنی گویا یہ ہوئے کہ جس نے براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے فیض پایا ہو، اس معنی کے لحاظ سے تمام اکابر صحابہ خلفائے بلا فصل تھے اور عالم روحانی میں تعدد خلفاء بلا فصل ممنوع نہیں۔

۲۔ اور یوں بھی عالم مادی میں ”دو شاہان در اقلیمہ نہ گنجہ“ صحیح ہو تو عالم روحانی میں ایک سے زیادہ خلیفہ بلا فصل ہونے میں کوئی مانع نہیں۔

ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ حضرت علیؓ کو سیاسی جانشینی کا بھی استحقاق تھا یا نہیں، یہ ایک خالص علمی مسئلہ رہ جاتا ہے، جس کو آئے دن کی روزمرہ سیاسی زندگی پر اب تیرہ سو سال بعد اثر انداز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

جس طرح ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کے آنے تک اوّل الذکر ہی کی شریعت باقی رہتی ہے، اسی پر قیاس کر کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک حکمران کی وفات کے باوجود اس کے جانشین کے انتخاب تک اوّل الذکر ہی کا اقتدار جاری رہتا ہے اور اسی کے مقرر کردہ افسر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہنے کے پابند ہیں، چنانچہ:

كَانَ أَبُو حَنِيفَةَ يَقُولُ إِذَا مَاتَ الْخَلِيفَةُ فَالْقَاضِي عَلَى قَضَائِهِ وَالْوَالِي عَلَى وِلَايَتِهِ حَتَّى يَغْيِرَ لَهُ الْقَائِمُ بَعْدَهُ۔
(مناقب ابی حنیفہ للموفق ج ۱ ص: ۸۷-۸۸)

امام ابو حنیفہ فرماتے تھے، اگر خلیفہ کا انتقال ہو جائے، تو قاضی اپنی قضاآت پر اور والی اپنی حکومت پر باقی رہتا ہے، جب تک خلیفہ کا جانشین اسے بدل نہ دے۔

اسی مسئلہ کو قاتل حضرت عمرؓ کے بعض بے گناہ ہم وطنوں کی شہادت اور ان شہداء کی عدم وارد گیر کے افسوسناک تاریخی واقعہ کے باعث تھوڑی سی اہمیت تھی، اس لیے اس کا بھی ذکر کر دیا گیا۔

یہ سرسری خاکہ زیادہ قابل اہل علم کے لیے دعوت ہے، کہ اس اہم موضوع پر توجہ کر کے ملک و ملت کی رہنمائی کریں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

(معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۴۱ء)

قرآن مجید اور عورت

نزول قرآن کی جوہلی:

سب سے پہلے ایک حقیر عرض ہے۔ قرآن مجید کی پہلی وحی ۲۷ رمضان ۱۳ھ قبل ہجرت کو عارِ حرا میں ہوئی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۳۸۸ھ میں اس پر چودہ صدیاں گزر چکیں گی۔ ضرورت ہے کہ دنیا میں ہر جگہ اس تقریب کو شایانِ شان طور پر منانے کی تیاریاں ابھی سے شروع کی جائیں۔ علمی نمائش ہو سکتی ہیں (قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ نسخے، تراجم قرآن، تفاسیر قرآن و دیگر علوم قرآن کی کتابیں) تقریر میں، مشاعرے میں غرض منصوبہ بندی کے تحت کام ہو تو نتیجہ مفید ہو سکتا ہے۔

عہد نبویؐ میں زمانہ تعلیم قرآن:

ابن اسحاق کی لکھی ہوئی سیرت النبیؐ شہرہ آفاق ہے ان کی وفات ۱۲۸ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ ان کی تالیف ناپید سمجھی جاتی تھی۔ مگر اتفاق سے اس کا ایک ٹکڑا فاس (مراکش) میں اور ایک دوسرا ٹکڑا دمشق میں ملا ہے، مراکشی ٹکڑے میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے لکھا ہے کہ:

”جب کبھی رسول کریمؐ پر کوئی وحی نازل ہوتی تو پہلے آپ اسے مردانہ اجتماع میں سناتے پھر زنانہ اجتماع میں خاص عورتوں کو سناتے بار بار عورتیں سوال کرتیں اور جوابات سمجھ میں نہ آتی اس کی

وضاحت چاہتیں۔“

حافظ قرآن صحابہ: www.KitaboSunnat.com

قرآن مجید کو حفظ کرنے کا رواج عہد نبوی ہی سے چلا آ رہا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ حضرت ام ورقہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کا ذکر حدیث کی کئی مستند کتابوں میں ہے۔ لکھا ہے کہ:

یہ حافظہ تھیں اور رسول اکرم نے ان کو ان کے محلے کی مسجد کا امام مقرر فرمایا تھا۔ راوی کہتے ہیں:

میں نے اس بوڑھے مؤذن کو دیکھا ہے جو اس مسجد میں پنج وقتہ اذان دیا کرتا تھا۔ (اور ظاہر ہے کہ وہ بھی اقتداء کرتا تھا)۔

اس بارے میں فقہانے بڑی بحثیں کی ہیں کہ عورت کی امامت جائز ہے یا نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ:

”ام ورقہ کا واقعہ ابتدائے اسلام سے ہے بعد میں منسوخ ہو گیا۔“
مگر ایسی کوئی حدیث نہیں ملتی جس میں بی بی کو بعوض میں امامت سے ممانعت کر دی گئی ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ:

”یہ انفرادی اور خصوصی اجازت ہے۔“

ابھی گزشتہ ہفتے کی بات ہے یہاں اس کی ضرورت پیش آئی۔ ایک افغان لڑکی نے ڈنمارک کے ایک طالب علم سے شادی کر لی اور اس کی کوشش سے شوہر بھی مسلمان ہو گیا۔ وہ مجھ سے پوچھنے آئی۔ میرے شوہر کو ابھی سورہ فاتحہ تک یاد نہ ہو سکا۔ تشہد ثانی وغیرہ بہت دور ہیں۔ کیا میں اس کی امامت کر سکتی ہوں۔ میں نے کہا کہ فقہانے تو اجازت نہیں دیتے۔ لیکن جب تک تمہارے میاں کو دو تین سورتیں یاد نہ ہو جائیں حضرت ام ورقہ کی طرح سے تم ہی نماز پڑھا دیا کرو۔ کہنے لگی:

”صدقے جاؤں اس نبی کے جو ہمارے فقہاء سے

زیادہ وسیع النظر ہے۔“

امہات المؤمنین:

رسول اکرم پر سب سے پہلی وحی سورہ اقرآء کی جن آیتوں سے ہوئی ان میں سب سے پہلا لفظ ہے ”پڑھ“ اور پھر قلم کی تعریف ہے کہ اس کی مدد سے انسان وہ ساری چیزیں سیکھتا ہے جو دوسروں کو تو معلوم تھیں لیکن خود اسے معلوم نہیں تھیں۔ رسول کو پڑھ کا حکم ہوا اور وہ تعمیل نہ کرے! آپ کی ساری عمر یہی کوشش رہی کہ ملک و ملت میں علوم کا رواج ہو۔ اس نعمت خداوندی سے عورتیں کیسے محروم رکھی جاسکتیں۔

حضرت عمرؓ کی رشتہ دار شفاء بنت عبد اللہ رضی اللہ عنہا کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت ہی میں لکھنا، پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ حدیث کی کتابوں میں ذکر ہے کہ:

”بی بی نے ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو لکھنا پڑھنا

سکھایا۔ اور اس پر رسول اکرمؐ بہت خوش تھے.....

متعدد دیگر ازواج مطہرات کے متعلق بھی بلاذری وغیرہ مورخوں نے صراحت کی ہے کہ انہیں پڑھ آتا تھا۔ اور وہ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول رہا کرتی تھیں۔ بلاذری نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق خاص کر یہ لکھا ہے کہ انہیں پڑھنا آتا تھا۔ لکھنا نہیں آتا تھا۔ اور یہ کہ وہ ہمیشہ قرآن مجید خود بھی پڑھتیں اور لڑکیوں کو بھی اس کی تعلیم دیا کرتیں۔ بعض وقت تو مرد بھی ان سے مسئلے مسائل پوچھنے آیا کرتے۔

قرآن میں عورت کا ذکر:

دیگر ادیان کی کتابوں میں عورت کا ذکر نہیں آتا اور اگر آئے بھی تو ان کی بُرائی کرنے کے لیے۔ عورتوں میں برائیاں ہوں گی تو کیا مردوں میں نہیں؟ اچھے اور بُرے دونوں صنفوں میں ہیں۔ بہر حال قرآن مجید میں ایک پوری ہی سورت سورہ نساء ہے اور ایک اور سورہ مریم بھی ہے! اچھی عورتوں کی مثالوں میں۔ ”امراة فرعون“ (فرعون کی ملکہ آسیہ) اور مریم بنت عمران کا صراحت سے ذکر ہے۔

بُری عورتوں میں دو پیغمبروں کی بیویوں (امراة نوح و امراة لوط) اور آنحضرت

کی چچی امراۃ ابی لہب کی مثال دی گئی ہے۔

حضرت حوا کا قرآنی ذکر خالص کر سبق آموز ہے۔ توریت کے پیروؤں کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت آدم کو بہلا پھسلا کر شجر ممنوعہ کے کھانے پر آمادہ کیا۔ جس کی پاداش میں جنت سے نکلنا پڑا۔ گویا سارے بنی نوع انسان کی مصیبتوں کی ذمہ دار وہی ہیں۔ انجیل پرستوں کے ہاں عام طور سے یہ مانا جاتا ہے کہ اس حادثے کی بناء پر یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان اپنی فطرت ہی سے گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ کہ حضرت مسیح اس کا کفارہ بنے۔ لیکن فرقہ لوگوں میں نے حد کر دی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ:

”حضرت حوا کا بیٹا قابیل (قین) حضرت آدم کے نطفے سے نہ تھا۔ بلکہ اس کا باپ شیطان تھا۔“

(”جن لوگوں کو اپنی دادی پر اتنی بڑی تہمت لگانے کی جسارت ہوئی ہے انہیں حرام زادہ نہیں تو کیا کہا جائے“)

لیکن قرآن نے اس قصہ کا کیا ذکر کیا ہے۔ وہاں بی بی حوا کا کوئی قصور نہیں ہے۔ شیطان نے حسد سے حضرت آدم کو بہکایا۔ شیطان نے ان دونوں کو گمراہ کیا۔ ان دونوں نے اس شجرہ ممنوعہ کا پھل کھایا وغیرہ۔

توریت و قرآن دونوں میں اس کا ذکر ہے کہ حضرت آدم کے نہ باپ تھا نہ ماں۔ خدا نے انہیں براہ راست مٹی میں روح بھر کر پیدا کیا۔ حضرت عیسیٰ کا زمانہ متاخر ہے۔ اس لیے تورات میں ان کا ذکر نہیں۔ انجیل اور قرآن کے مطابق ان کی صرف ماں تھی۔ اور وہ بن باپ کے بطور معجزہ پیدا ہوئے۔

ایک خاص مذہب والے اس سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ خدا تھے اور خدا کے بیٹے تھے۔ لیکن قرآن نے کیا میٹھا جواب دیا ہے:

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم۔
عیسیٰ کی مثال اللہ کے ہاں آدم کی مثال کی طرح ہے۔ عیسیٰ کے باپ نہ تھے تو آدم کا باپ تو کیا ماں بھی نہ تھی۔

جب آدم اس طرح خدا نہ بن گئے تو حضرت عیسیٰ کو یہ رتبہ کیوں

دیتے ہو؟

قرآن مجید کے ۲۸ ویں پارے کا آغاز بھی دلچسپی سے خالی نہیں:

قد سمع اللہ - اللہ نے اس کی بات سن لی جو اے محمد تجھ سے
اپنے شوہر کے متعلق جھگڑتی اور اللہ سے فریاد کرتی ہے۔

یہاں بھی عورت کی کوئی بُرائی نہیں ہے۔ بلکہ عورت ہی پر اللہ کو رحم آتا ہے اور مرد کے خلاف اسکی شنوائی کرتا ہے۔

دو قرآنی محاورے بھی قابل ذکر ہیں:

نوشتہ تقدیر کو نام دیا گیا ہے۔ ”ام الکتاب“ (کتاب کی ماں) یا
(احکام کی ماں) باپ پر ماں کو ترجیح دی گئی ہے۔ اس سے بھی
زیادہ دلچسپ اور معنی خیز لفظ ”ام القرئی“ (شہروں کی ماں) جو شہر
مکہ کا لقب ہے۔

خدا کی ذات ماورائے ادراک ہے۔ اس کی قدرت کو سمجھانے کیلئے اس کا ذکر اسی طرح
کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی جانی بوجھی اور اس کے ماحول کی چیزوں سے ماخوذ ہو۔ اسلئے
قرآن کہتا ہے کہ خدا بادشاہ ہے۔ اس کے پاس فوجیں ہیں، خزانے ہیں، تخت ہے، یہ
تو خیر معمولی باتیں ہیں۔

ضرورت تھی کہ ان تفصیلوں کو اور آگے بڑھایا جائے۔ بادشاہت کیلئے پایہ تخت
کی ضرورت ہے اور پایہ تخت ام القرئی ہی میں ہو سکتا ہے۔ پھر اس ام القرئی میں جو
انگریزی کے مٹروپولس (METROPOLIS) کا لفظی مترادف ہے، قصر شاہی ہونا چاہیے اس کا
نام بیت اللہ سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ اظہار اطاعت کیلئے انسان کو قصر شاہی پر حاضری کی
ضرورت ہوتی ہے۔ (حج کیلئے)

آخر میں حضرت بلقیس کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ یہ
یمن میں ریاست سبا کی حکمران تھیں اور مجلس شوریٰ کی مدد سے حکومت کرتی تھیں۔
حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت پر ان سے ملنے بیت المقدس گئیں۔ اور وہاں ان
کے ہاتھ پر اسلام بھی لے آئیں۔ غرض قرآن مجید کے مطابق عورت سماج کے بلند ترین

مرتبے یعنی بادشاہت تک پہنچ سکتی ہے۔ اور قرآن اسے بُرا نہیں قرار دیتا۔
عورت کے متعلق احکام:

پرانے زمانے میں عورت کی کوئی مستقل شخصیت نہ تھی۔ دھرم شاستر میں اب تک عورت کو اپنے شوہر کی وراثت تک میں کوئی مستقل حصہ نہیں ملتا۔ وہ اس ترکے کے ایک حصے سے تاحیات استفادہ کر سکتی ہے اور بس۔

اسلام سے قبل مدینہ منورہ کے عربوں میں یہ رواج تھا کہ کسی شخص کی وفات پر اس کی بیوی بیٹی تو کیا نابالغ بیٹے کو بھی کوئی حصہ نہ ملتا۔ قریبی رشتہ داروں میں جو بالغ مرد ہوتے وہ ساری جائیداد کے وارث بن جاتے۔

اس طرح کا ایک واقعہ آنحضرت کے علم میں آیا۔ کسی غزوے میں ایک صحابی شہید ہو گئے۔ یہ کھاتے پیتے شخص تھے۔ بیوہ اور کم عمر بچوں کی پرورش تھی کہ اس کیلئے ایک پیسہ تک ہاتھ میں نہ تھا۔ رسول اکرم بے چین ہو گئے اور خدا سے دعا فرمائی۔ اس پر وہ آیتیں نازل ہوئیں جن پر قرآن مجید کا قانون وراثت مبنی ہے۔ اس میں بیوی، بیٹی اور ماں کو ہمیشہ بہن، نانی، دادی، بھتیجی کو متعدد حالتوں میں حصہ ملتا ہے اور یہ حصہ قطعی ہوتا ہے۔

قرآن کیلئے عورت ایک مستقل شخصیت ہے۔ بیٹی ہو کہ بیوی ہو یا ماں۔ اس کی حیثیت ایک مستقل فرد کی ہوتی ہے کہ نہ باپ کے نہ شوہر نہ بیٹے کے وہ دست نگر ہوتی ہے۔ اسے وراثت اور بے میں بھی کوئی جائیداد حاصل ہو سکتی ہے۔ اور وہ خود بھی کچھ کما سکتی ہے۔ اسے مہر بھی ملتا ہے۔ اس کی پرورش کیلئے قانون حکماً باپ، شوہر، بیٹے، بھائی وغیرہ سے نفقہ بھی دلاتا ہے۔ اس نفقے کے باوجود بھی اسے وراثت دلائی جاتی ہے۔ قرآن کے مطابق بعد میں اس سے کوئی بھی یہ جائیداد اس کی رضامندی کے بغیر لے نہیں سکتا۔

اس کی شخصیت کے مستقل ہونے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ نکاح میں اسکی رضامندی بھی لازمی ہے۔ عقد نکاح میں وہ شرطیں بھی شامل کر سکتی ہے کہ میرا یہ شوہر

میری موجودگی میں کسی اور عورت سے نکاح نہ کرے گا۔ یا یہ کہ مجھے بھی شوہر کو طلاق دینے کا حق ہوگا وغیرہ۔

تعدد ازواج کی قرآن نے اجازت ضرور دی ہے۔ لیکن یہ عورت کی رضامندی پر منحصر ہے۔ اگر کسی کے پاس پہلے سے ایک بیوی ہے تو نئی دلہن ہی پر منحصر ہے کہ ایسے نکاح کو منظور کرے یا نہیں!

میاں بیوی میں جھگڑے ہوں تو قرآن مجید نے تحکیم کا ادارہ قائم کر دیا ہے۔ عورت کی عزت و عفت پر الزام لگانے کو قرآن نے انتہائی سنگین جرم قرار دیا ہے۔ کہ مجرم کو نہ صرف سو کوڑے مارے جائیں بلکہ ساری عمر اس کو عدالت میں ناقابل شہادت قرار دیا جائے۔

ایک ہی جرم پر مرد کو جو سزا دی جاتی ہے بعض صورتوں میں اسی پر عورت کو نصف سزا دی جاتی ہے۔ عبادات میں بھی اس کو رعایتیں ہیں۔

نقاب:

قرآن مجید نے خمار اور جلباب دو قسم کے برقعوں کا ذکر کیا ہے، خمار صرف چہرے کو چھپاتا ہے اور جلباب سارے لباس کو ڈھانپ لیتا ہے۔ ایک دن پیرس میں ایک زنانہ انجمن نے (جس میں سفیروں کی بیویاں وغیرہ صرف طبقہ اعلیٰ کی خواتین رکن ہیں) مجھے اس موضوع پر تقریر کی دعوت دی۔ میں نے کہا:

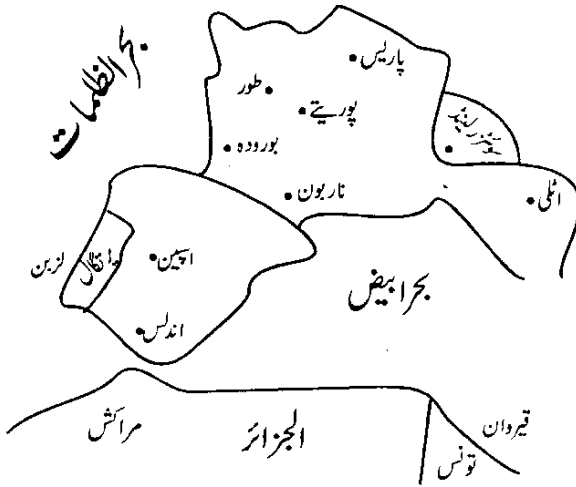
”نقاب عورت پر پابندی کیلئے نہیں بلکہ خود اسی کے فائدے کے لیے ہے (قرآن سے پہلے عہد جدید یعنی انجیل نے سینٹ پال نے بھی یہی حکم دیا ہے)۔ عورت فطرۃً بن ٹھن کر رہتی ہے کہ خوبصورت نظر آئے نقاب اسی حسن کی حفاظت کیلئے ہے۔ آپ دیہات میں دھوپ میں کام کرنے والی

عورتوں کے ہاتھ کا اپنے نازک ہاتھ سے مقابلہ کیجیے۔ اپنے چہرے اور ہاتھ کے چمڑے اور رنگ کا اپنے ہی جسم کے ہمیشہ ڈھکے ہوئے رہنے والے اعضاء کے چمڑے اور رنگ سے مقابلہ کیجیے۔ کسی جانور کو لیجیے اور اس کی پیٹھ اور پیٹ کے چمڑوں کا مقابلہ کیجیے۔ کسی پرندے کو لیکر اس کے بیرونی اور دھوپ کھانے والے پروں کا مقابلہ ان پروں سے کیجیے جو پکوٹھوں کے اندر ڈھکے رہتے اور دھوپ کی مار نہیں کھاتے ہیں۔ جو عورت عادتاً نقاب برتے گی اس کی ملاحظت اور اس کے جسم کی ملامت کا مقابلہ وہ عورت کبھی نہیں کر سکتی جو نقاب کو وبال جان سمجھتی ہے۔“

میں نے دیکھا چہروں پر خفگی کی جگہ مسکراہٹ تھی۔ اور جب میں جانے لگا تو غالباً میکسیکو کے سفیر کی بیوی نے کہا اب میں نقاب شروع کروں گی۔

(خاتون پاکستان - قرآن مجید نمبر ۱۳۸ھ)

قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے



مسلمانوں کی یورپ میں آمد:

قسنطنیہ (حال استانبول) کے بادشاہ ہرقل کے نام بھیجا ہوا مکتوب نبویؐ کے کچھ کی چیز ہے۔ امام بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق یہ تبلیغی خط جس میں قرآن مجید کی بعض آیتیں بھی ہیں، ہرقل کو اس وقت پہنچا جب وہ حمص میں تھا اور سفیر سے اس نے بیت المقدس پہنچنے پر ملاقات کی۔

تاریخ طبری کے بیان کے مطابق ۲۶ھ، ۶۴۶ء میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلامی فوجیں اندلس (جنوبی اسپین) میں پہنچ گئیں اور ملک نہ ملنے کے

باوجود وہیں حاکمانہ و قابضانہ مقیم رہیں تا آنکہ اس کے ستر سال بعد طارق اور موسیٰ بن نصیر نے اس آغاز کو انجام تک پہنچایا۔

فاطمی دور کے ممتاز مورخ القاضی الرشید ابن الزبیر نے اپنی کتاب الذخائر والتحف میں بیان کیا ہے کہ طارق نے اربونہ (حال ناربون، فرانس) پر بھی قبضہ کیا تھا، اس کے کچھ ہی دن بعد عبدالرحمن الغافقی نے بورڈو فتح کیا اور وہاں کے حکمران کی لڑکی سے شادی کی۔ اس کے بعد شمال کی طرف کسانوں اور دیگر نوآبادکاروں کی امن پسند مہم کے ساتھ روانہ ہوا لیکن پوریتے اور طور کے درمیان ایک غیر آباد مقام پر جسے اب خندق الملک (نوسے روا) کہتے ہیں شارل مارٹل سے مڈبھیڑ ہوئی اور بظاہر کسی جاسوس یا کسی غدار نے رات کو عبدالرحمن الغافقی کو شہید کر دیا، اس لیے دوسرے دن بے سری فوج اندلس واپس ہو گئی۔ نئے امیر اندلس نے دوسرے ہی سال دوبارہ طور جانے کی تیاری کی، لیکن خوارج نے بغاوت کر دی، اس لیے مجبوراً فرانس کی نوآبادکاری ملتوی کرنی پڑی۔ میں نے دو تین مرتبہ ان مشاہدہ شداء پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی ہے۔

چند نسلوں بعد تونس کے اعلیٰ حکمرانوں نے پروانس (جنوبی فرانس)، سویٹزرلینڈ اور اٹلی تک اپنا اقتدار پھیلایا۔ اس دور یعنی دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کی فرانس میں کافی یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ مثلاً قلعوں کے کھنڈر، ہتھیار، سکے وغیرہ۔

قرآن مجید کا ترجمہ:

مجربط (میڈریڈ) کے کتب خانوں میں قرآن مجید کے چار ترجمے اب تک محفوظ ہیں، جو اسپینی زبان میں عربی خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ پولینڈی اور لتھوانی زبانیں بھی ایک زمانے میں وہاں کے مسلمان عربی خط میں لکھتے تھے۔ ایسے پولینڈی اور لتھوانی (عربی خط والے) تراجم قرآن کے مخطوطے بھی اب تک باقی ہیں۔ حال میں اسی طرح کا ایک یوگوسلاوی (عربی خط والا) ترجمہ قرآن کا قلمی نسخہ بھی ملا ہے، ان حالات میں یہ گمان کرنا بے جا نہیں کہ اموی اور عباسی (اعلیٰ) دور میں جب فرانس کے تقریباً ایک تہائی رقبہ پر کم و بیش سو سال تک مسلمانوں کا قبضہ رہا تو نو مسلموں کی ضرورت کے لیے

عربی خط میں فرانسیسی ترجمہ قرآن کی اشاعت ضروری ہوگئی، لیکن اب تک کوئی دستاویزی ثبوت ایسے فرانسیسی ترجمے کا نہیں ملا ہے۔ قدیم ترین جس فرانسیسی ترجمہ کا ذکر ملتا ہے وہ اس سے دو صدی بعد کا ہے جیسا کہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

فرانسیسی تراجم قرآن مجید:

(۱) قسطلیہ کے حکمران الفونسو دہم (حکمرانی ۱۶۵۰ھ تا ۱۶۸۳ھ) کے حکم سے طلیطلہ کے ایک عالم دون ابراہام نے (جو غالباً یہودی تھا) قرآن مجید کے سورۃ المعارج کا اپنی میں ترجمہ کیا اور پھر اس اپنی سے بونا ونٹور ادیب (Bonnaventura de seve) نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا، (جیسا کہ جولیش انسائیکلو پیڈیا میں بعنوان ”قرآن“ ذکر ہے) لیکن بظاہر اب اس کا کوئی وجود باقی نہیں۔

(۲) پھر چار سو سال تک سکوت رہا۔ اس کے بعد ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں سیور دوریے (Sieur du ryer) پارلیس نے مکمل قرآن مجید کا ایک ترجمہ - Lal Coran de Mahomet کے نام سے شائع کیا، جس کے سوا سو سال میں کم از کم اکیس ایڈیشن چھپے اور اس کی اساس پر متعدد یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

(۳) ساواری (M. Savary) کا ترجمہ دو جلدوں میں پہلی مرتبہ پارلیس میں ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں Lekoran کے نام سے چھپا، اس کے بعد اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اب بھی یہ بازار میں آسانی سے ملتا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے بہت عمدہ لیکن صحت کے لحاظ سے ناقابل اعتماد ہے۔

(۴) رینو (Reinaud) فرانس کے ممتاز ترین عربی دانوں میں گزرا ہے۔ اس کی مشہور تالیف ”عربوں کا حملہ فرانس پر اور پھر وہاں سے سوئزر لینڈ اور اٹلی پر“ حال میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کے انگریزی ترجمے کے ذریعہ کافی معروف ہو چکی ہے۔ اسی مستشرق نے ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں دو جلدوں میں ایک کتاب شائع کی جس میں ڈیوک De blacas اور بعض دوسرے لوگوں کے

ذخیروں کی عربی، فارسی اور ترکی چیزوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسکی دوسری جلد میں متعدد آیتوں اور سورتوں کا ترجمہ ہے۔

(۵) گارنیشن دتاسی کے نام سے اردو داں اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کی متعدد تالیفوں کے مندرجات سے گمان ہوتا ہے کہ وہ مخفی طور سے مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے فرانسیسی میں ”قرآن سے ماخوذ اسلامی عقائد و فرائض“ کے نام سے ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں ایک کتاب شائع کی جس میں بکثرت قرآنی سورتوں کا ترجمہ ہے۔ مولف نے صراحت کی ہے کہ یہ ساواری (نمبر ۳) سے ماخوذ ہے۔ لیکن نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ پھر نظر ثالث کے بعد یہی مواد ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں (Isalmisme D apresle Coran) کے نام سے شائع ہوا۔

(۶) کازیمیرسکی (Kasimirsi) اصل میں پولینڈ کا باشندہ تھا۔ پھر جامعہ پیرس میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں مکمل قرآن مجید کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا۔ اس کے کم از کم پچیس ایڈیشن ہو چکے ہیں اور اب تک مقبول ہے اور دوسرے ترجموں کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔

(۷) کازیمیرسکی کے ترجمہ پر نظر ثانی کر کے پویتیے (G. Pauthier) نے ایک ایڈیشن شائع کیا۔

(۸) ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں مارسل (J.J. Marcel) کے ترجمے کرنے کا ذکر ملتا ہے مگر اشاعت کا پتا نہیں چلتا۔

(۹) اسی طرح ایک اور مارسل (Citoyen Marcel) نے مختلف آیات اور سورتوں کا منظوم ترجمہ کیا۔ یہ بھی میری نظر سے نہیں گزرا۔

اس کے علاوہ بعض اور ترجموں کے حوالے ملتے ہیں، مثلاً
(۱۰) گالان (Gallant) نے ایک ترجمہ کیا۔ لیکن اس کی اشاعت سے پہلے فوت ہو گیا۔ اس کا مسودہ لاپتا ہے۔

(۱۱) لبلوا (Le leblois) نے اپنی فرانسیسی کتاب ”قرآن اور عبرانی بائبل“ میں نمبر ۵

تا ۶۵ کی سورتوں کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

(۱۲) سینٹ ایلیر (St. Hilaire) نے بھی اقتباسات شائع کیے (جیسا کہ امریکی مشنری رسالہ مسلم ورلڈ نے ۱۹۲۷ء میں بیان کیا ہے)۔

(۱۳) پارلیس کے کتب خانہ عام میں مخطوطہ نمبر ۴۶۸ بھی قرآن مجید کا فرانسیسی ترجمہ کہا جاتا ہے۔ مگر اس کی تحقیق میں نہ کر سکا اور ذیل کے جدید تراجم سے میں خود واقف ہوں۔

(۱۴) ثربوت (CH. Gillotte) کے الجزائر کے شہر عنایہ میں ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں فقہ اسلامی پر جو کتاب چھاپی ہے اس میں قرآن مجید کے اقتباس بھی ہیں۔

(۱۵) فاطمہ زاہدہ (Zaida) نے Lakoran کے نام سے فرانسیسی میں ایک کتاب لڑبن (پرنگال) میں ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں شائع کی ہے۔ مولفہ اپنے کو مسلمان کہتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس فرضی نام سے بعض مکاروں نے گپ شپ پر مشتمل ایک کتاب چھاپی ہے۔ سوائے سورہ فاتحہ کے اس میں کوئی اور قرآنی سورت مجھے نظر نہ آئی۔

(۱۶) جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کی یونیورسٹی کے قیم (رکٹر) دوامونتے (Edouard Montet) نے پارلیس میں ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں ایک ترجمہ شائع کیا، اگرچہ یہ ترجمہ اب تک تین بار چھپ چکا ہے لیکن اتنا ناقص ہے کہ ناقابل اعتنا ہے۔

(۱۷) ماردرس (J.C. Mardrus) نے ۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) میں باسٹھ سورتوں کو پارلیس میں Chapitres Du Coran کے نام سے شائع کیا۔

(۱۸) دو الجزائری مسلمانوں احمد الاعمش اور ابن داؤد نے دهران (الجزائر) میں ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) میں ایک ترجمہ چھاپا جو بہت مقبول ہے۔

(۱۹) پیل (D. Peste) جو غالباً نو مسلم تھے اور احمد تیجانی نے مل کر پارلیس میں ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) میں ایک ترجمہ شائع کیا جس کے تین اڈیشن نکل چکے ہیں، یہ ترجمہ بُرا نہیں ہے۔

(۲۰) ریڈی بلاشیر (Regis Blachere) آجکل جامعہ پارلیس میں عربی کے پروفیسر

ہیں، انہوں نے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) تا ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں ایک ترجمہ شائع کیا جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں شائع ہوا ہے۔

(۲۱) آں ری بے ریس (Henri Peres) نے الجزائر میں ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کا ترجمہ طلبہ کی تدریسی ضرورتوں کے لیے چھاپا ہے۔

(۲۲) ترکی عالم محمود مختار پاشا نے حکمت قرآنی (Sagesse Coranique) کے نام سے پاریس میں منتخبات قرآنی کا ترجمہ شائع کیا ہے۔

(۲۳) قدیرہ (Ghedira) ایک تونسسی مسلمان نے فرانس کے شہر لیون میں ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۶ء) میں ایک ترجمہ اہتمام سے آرٹ پیپر پر چھاپا ہے۔

(۲۴) آں ری مرسیے (Henri Mercier) نے مراکش کے شہر رباط میں ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۶ء) میں منتخبات قرآنی مع ترجمہ شائع کیے ہیں۔ اس میں عربی متن کو

عربی خط کے علاوہ لاطینی خط اور موسیقی کی صوتی علامات میں بھی نقل کیا ہے اور چند مہمل اور بھونڈی تصویریں بھی ایک بد بخت مسلمان کی طرف منسوب کر کے درج کی ہیں۔

(۲۵) بشیر الدین محمود احمد امیر جماعت قادیان نے بھی ایک ترجمے کا اعلان کیا تھا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ چھاپا یا نہیں۔

(۲۶) راقم الحروف ناچیز کا ترجمہ، پاریس ۱۳۷۹ھ (۱۹۵۹ء)۔

آخر الذکر ترجمے کی سرگزشت:

۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) کی بات ہے کہ ایک دن کسی اجنبی نے دروازے پر گھنٹی بجائی، معلوم ہوا کہ ریتنے نامی نشریات کے مالک ہیں، کہنے لگے کہ میں قرآن مجید کا عربی متن اور ترجمہ چھاپنا چاہتا ہوں اور پروفیسر مسینیوں نے آپ کا پتا دیا ہے اور یہ فرمائش کی کہ میں ساواری (مذکورہ صدر نمبر ۳) کے ترجمہ کی نظر ثانی کر دوں۔ دو ہفتوں کے بعد اس کا نمونہ لے گیا اور آج تک پھر اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی۔

اس کے چند ماہ بعد ایک اور کمپنی Club Francais Du Livre کے ڈائریکٹر نے

پروفیسر ماسینیوں کے ہی حوالہ سے ملاقات کی اور کہا، ہم نے حال ہی میں بائبل کا ایک نیا ترجمہ شائع کیا ہے، جو مقبول ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کا بھی ایک نیا فرانسیسی ترجمہ شائع کریں۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی فرانسیسی ایک اجنبی کے ترجمے میں ”بوائے کچوری ی آید“ کہنے لگے، معیاری ترجمہ تو وہی ہوتا ہے جو کوئی ایسا فرانسیسی ادیب کرتا جو عربی پر بھی عبور رکھتا اور مسلمان بھی ہوتا۔ مگر یہ چیز عقدا ہے۔ اس لیے اس کا حل یہی ہے کہ ایک عربی دان مسلمان اور ایک فرانسیسی ادیب اشتراک عمل سے ترجمہ کریں اور ہم آپ کو ایسا آدمی مہیا کریں گے۔

میرے لیے یہ بڑی سعادت تھی۔ اس کا معاوضہ بھی کافی ملا، مگر میں نے یہ پوری رقم یہاں کی اسلامی انجمن ”مرکز ثقافت اسلامی“ کو دیدی، صفر ۱۳۷۷ھ میں معاہدے پر دستخط ہو گئے اور یہ شرط قرار پائی کہ اٹھارہ مہینوں میں ترجمہ پورا کر دیا جائے۔

میں نے پارلیس اور استانبول میں کام جاری رکھا اور میرے مسودے پر ”تمت بحمد اللہ“ پارلیس ۲۰ صفر ۱۳۷۸ھ اور ٹائپ شدہ مہیضے پر ایک ماہ بعد کی تاریخ ۷ ستمبر ۱۹۵۸ء درج ہے۔

جیسے جیسے کام ہوتا گیا اپنے رفیق کار موسیو لیتوری کو بھیجتا رہا، وہ ترمیم کر کے واپس کرتے رہے۔ نظر ثانی میں بھی اسی طرح ان کو بھیجتا رہا، اس کے بعد ان کے مسکن شہر رو بے (Roubaix) میں جا کر دسمبر ۱۹۵۸ء اور جنوری ۱۹۵۹ء میں چند ہفتوں تک ان کے پاس قیام کر کے شروع سے آخر تک مکرر تصحیح کر کے ناشر کے سپرد کر دیا گیا اور انتظامی مراحل کے گزرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں کمپوز ہونا شروع ہو گیا اور سات سو صفحے کے پروف ایک ماہ میں مل گئے۔ اکتوبر میں طباعت اور جلد بندی ہوئی اور یکم نومبر کو شائع ہو گیا۔ بعون اللہ و فضلہ۔

اس ترجمہ کی بعض خصوصیتیں یہ ہیں:

اس کی طباعت دو رنگی ہے، ترجمہ الگ رنگ میں ہے اور حواشی الگ رنگ میں، تاکہ باطنی تقدس کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہو، حواشی میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ جہاں کہیں توریت، انجیل، زبور کے حوالے ہیں یا قرآنی قصے ان کتابوں میں

ہیں، ان کے مکمل حوالے دیے گئے ہیں۔ حجاب اور تعدد زوجات وغیرہ کے احکام میں تورات و انجیل کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ ”وانہ لفی زبر الاولین“ کے سلسلے میں حضرت ادریس سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہا السلام تک کے اقوال اور پارسی اور ہندو کتب مقدسہ کے مکمل حوالے ہیں اور دوسرے جو فوائد ذہن میں آئے وہ بھی درج کیے گئے ہیں۔

شروع میں پچاس ساٹھ صفحوں کا ایک مقدمہ ہے، اس کی اہم ذیلی سرخیاں یہ ہیں:

قرآن کا مولف۔

الہام ربانی کا مفہوم مختلف ملتوں میں۔

نزول وحی کی کیفیت۔

قرآن وحدیث کا فرق۔

قرآن کا اسلوب بیان اور اس اسلوب کا مقصد۔

مندرجات قرآنی۔

قرآن میں یہودیوں سے زیادہ خطاب کیوں ہے۔

قرآنی تصویر حیات اور اقسام احکام۔

عورت کا ذکر قرآن میں۔

غلامی اور قرآن۔

سیرت نبویہ قرآن کی روشنی میں۔ اس سے قرآنی اشاروں کا تاریخی پس

منظر سمجھ میں آ جاتا ہے۔

قرآن مجید کی تدوین کی تاریخ۔

ترتیب آیات وسورت ہائے قرآنی۔

عربی خط اور اعراب اور دیگر علامات تحریری۔

قرآن کے نسل بہ نسل تحفظ کا دہر طریقہ یعنی تحریر وحفظ۔

صحیح متن کے لیے استاذ سے سماع اور اجازت۔

اختلاف روایات۔

مسئلہ تنسیخ و تبدیلی۔

تجوید و تلاوت۔

تراجم قرآنی، جن کا آغاز صحابہ کرام نے فرمایا۔

تاریخ (مسلمان مترجمین اور غیر مسلم مترجمین)۔

ایک نئے فرانسیسی ترجمے کی ضرورت۔

یورپی زبانوں میں تراجم قرآنی کی مکمل فہرست۔

کتاب میں جغرافیہ قرآنی اور مشاعرِ حج کے متعدد نقشے بھی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

(معارف اعظم گڑھ - دسمبر ۱۹۵۹ء)

ایلاف

جاہلیت میں عربوں کے معاشی و سفارتی تعلقات

کلیۃ ادبیات، جامعہ استنبول
 عرصہ ہوا سورۃ ایلاف کی تفسیر میں نے فرانسیسی میں شائع کی تھی، اب اس کا اردو
 ترجمہ جو میں نے ہی کیا ہے، کراچی کے موثر رسالہ ”البلاغ“ کی خدمت میں پیش کر رہا
 ہوں تاکہ اگر پسند آئے تو شائع فرمادیں۔
 محمد حید اللہ ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

شہر مکہ کی تاسیس اور آغاز:

اہل مکہ کی روایتیں کہتی ہیں کہ اس شہر کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوا،
 (جو تقریباً اٹھارہ سو سال قبل مسیح پیدا ہوئے تھے) شخصی اسباب کی بنا پر حضرت ابراہیم
 علیہ السلام نے اپنی بیوی حاجرہ اور دودھ پیتے بچے اسماعیل علیہ السلام کو وادی بکہ
 (قرآن سورہ ۳، آیت ۹۶) میں لا چھوڑا اور وہیں رفتہ رفتہ شہر مکہ آباد ہوا، یہ مقام اس
 وقت غیر آباد تو رہا ہو سکتا ہے لیکن قطعاً بے آب و گیاہ اور ناقابل رہائش بہر حال نہ تھا
 (سیرۃ ابن ہشام، طبع یورپ، صفحہ ۷۱-۷۲) غیر آباد ہونے کے باعث وہاں زراعت نہ
 ہوتی تھی (قرآن کریم سورہ ۱۴، آیت ۳۷: ”وادی غیر ذی زرع“ مگر حضرت ابراہیم
 علیہ السلام کو وہاں آبادی کے امکانات اور انسانی زندگی کے ضروری عناصر نظر آئے
 ہوں گے جیسی تو انہوں نے (مکہ کی قدیم ترین تحریری تاریخی دستاویز یعنی قرآن مجید
 سورہ ۱۴، آیت ۳۵ تا ۳۷، نیز سورہ ۲، آیت ۱۲۶ کے مطابق) دعا فرمائی۔

”اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب، اس مقام کو پُر امن بنا، اور مجھے اور میرے بچوں کو بت پرستی سے بچا..... اے میرے رب میں نے اپنی نسل کے ایک حصے کو ایک زراعت سے خالی وادی میں لا بسایا ہے جو تیرے حرام بنائے ہوئے گھر کے پاس ہے، تاکہ اے ہمارے رب وہ نماز قائم کریں پس ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہوں اور انہیں میوؤں کا رزق عطا فرما، شاید وہ شکر ادا کیا کریں گے۔“

عربی ماخوذوں سے پتا چلتا ہے کہ اس وادی بکہ کے آس پاس کے علاقے میں عرب باشندے خانہ بدوش ہی سہی، رہتے تھے۔ ان کا تعلق بڑے اور طاقتور قبیلہ عمالقہ سے تھا (جیسا کہ ابن ہشام صفحہ ۳۹ نے ابن الزبیری کی بیت کو نقل کرتے ہوئے بتایا ہے، نیز دیکھو سہیلی کی الروض الانف جلد اول صفحہ ۵۱) یہ وہی عمالقہ ہیں جن کی ایک شاخ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصر سے خروج سے قبل فلسطین میں بس چکی تھی۔ یہودیوں نے ان کو وہاں سے ڈال کر خود بسنا چاہا، عمالقہ نے حفاظت ذاتی میں مقاومت کی اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے یہودیوں نے ان بیچاروں کو بابل میں جتنا کوسا اور بدنام کیا ہے اور ان کو اور انکی عورت، بچوں اور شیر خواروں ہی کو نہیں جانوروں تک کو جس بے دروی سے نیست و نابود کرنے کا حکم دیا ہے (دیکھو تورات کی کتاب تثنیہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کئی سو سال بعد کی تالیف ہے، باب ۲۰ جملہ ۱۶۔ نیز اشموئیل اول ۱۵/۳) وہ انسانی تاریخ کا سب سے شرمناک واقعہ کہا جاسکتا ہے، لیکن اس سے ہمیں یہاں بحث نہیں۔

مذکورہ عربی ماخوذوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے قبائل میں سے ایک یعنی جرہم کے کچھ لوگ وادی مکہ میں سے گزرے اور وہاں پینے کا پانی افرات سے چشمے کی صورت میں دیکھا..... جواب زمزم کا کنواں بن گیا ہے..... نیز ایک جنگل موجود پایا (ابن ہشام صفحہ ۷۱-۷۲) اور ممکن ہے جانوروں کے لیے چراگاہ بھی

پائی ہو، اس پر وہ وہیں ٹھہر گئے۔ اگر حضرت ہاجرہ کو اپنی تنہائی میں اس قبیلے کی آمد غنیمت معلوم ہوئی تو جرہمیوں کو بھی چشمے کی مالک حضرت ہاجرہ نے وہاں بسنے کی اجازت دی تو شکرگذاری محسوس ہوئی، چنانچہ انہوں نے بی بی اور ان کے ننھے بچے کو اپنی حفاظت اور مہمان نوازی میں لے لیا، جرہمیوں کے دوسرے رشتہ دار خاندان بھی رفتہ رفتہ وہاں آکر بسے۔ اور بہتی وفاقی دستور کا ایک شہر یا ایک شہری مملکت بن گئی۔ اس لامرکزیت کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کنہوں میں اس بات پر اتفاق نہ ہو سکا کہ شہری زندگی سب لوگ ایک ہی ادارے کے تحت گزاریں۔ ابن ہشام (حوالہ بالا) کے مطابق جرہم قبیلہ اپنے سردار مُہاض بن عمرو کے ساتھ مغلّات (بالائی رقبے) میں بسا اور ان کا رشتہ دار قبیلہ قطوراء، جس کا سردار سُمیداع تھا مسفلہ (زیرین رقبے) میں قیام پذیر ہوا۔ جو کوئی شمالی راستے سے شہر میں آتا تو اس سے مُہاض عُشر (چنگی) وصول کرتا اور جو جنوبی راستے سے آتا وہ عُشر سُمیداع کو ادا کرتا، کچھ عرصہ بعد ان دونوں قبیلوں میں برادر کشی اور جنگ کا بھی پتا چلتا ہے جس پر کسی کو حیرت نہ ہونی چاہیے۔

مگر اتنے قدیم عہد میں اس شہری مملکت کے ”سفارتی“ تعلقات کے سلسلے میں معلومات اور تفصیلات کی تلاش بے سود ہوگی۔

جو بھی ہو، کہتے ہیں چند سال بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں دوبارہ آئے، تاکہ اپنے بیٹے اسماعیل کو جو اب ایک نوجوان لڑکا تھا، دیکھیں۔ قرآن مجید (سورہ ۲، آیت ۱۲۷ و مابعد) کی شہادت کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں ایک عبادت گاہ تعمیر کی۔ یہ ایک سادہ مکعب کوٹھڑی تھی، جو اب کعبے کے نام سے مشہور ہے۔ اسے آپ نے ”بیت اللہ“ کا نام دے کر خدائے واحد کی عبادت سے مخصوص کیا، قرآن مجید (سورہ ۳، آیت ۹۶) نے اسے ”اَوَّل بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ“ (پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا) قرار دیا ہے، اور یہ بیت المقدس سے کہیں قدیم تر ہے (جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبے کے سلسلے میں حج کا بھی حکم دیا کہ لوگ ہر سال عبادت کے لیے اس کی زیارت کو آئیں۔ آس پاس کے لوگ بھی وہاں کشاں کشاں آنے لگے (کوئی عبادت

کے لیے تو کوئی تجارت کے لیے) اور اس طرح شہر کی اہمیت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

اس کا سلسلہ صدیوں جاری رہا، اس اثنا میں بڑے بھی وہاں آ کر ادب سے سر جھکاتے رہے چھوٹے بھی۔ اگر وہاں عرب کے مختلف علاقوں کے ”بادشاہ“ نظر آتے ہیں تو اجنبی بھی ملتے ہیں، عرب مورخوں (شرح بخاری للعینی ج ۷، ص ۳۶۵، نیز اخبار مکتہ للازرقی، و کتاب التیجان لابن هشام، بر موقع) کو یقین ہے ان اجنبی زاروں میں افسانہ خیز بادشاہ ذوالقرنین (یعنی دو سینگوں والا) بھی شامل تھا۔ اگر اس سے مراد سکندر اعظم ہے تو یونانی تاریخوں میں سکوت ملتا ہے، اگرچہ اس کا مصر سے ہندوستان جاتے ہوئے حجاز سے گزرنا ناممکن نہیں، خاص کر اس بت پرست اور اوہام پسند بادشاہ کے لیے مکے کی عبادت گاہ اتنی مشہور تھی کہ پرانے یونانی جغرافیہ نگار بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً بطلمیوس (جغرافیہ کتاب ۴، باب ۷، فصل ۳۲) اس کو مقریہ (MACORABA) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ خوری حلی (کی انگریزی ہسٹری آف دی عربس، طبع ۱۹۵۱ء ص ۱۰۳ میں) لکھا ہے، سبائی زبان میں اس لفظ کے معنی عبادت گاہ کے ہیں (غالباً اس لفظ کو عربی لفظ مَقْرَب سے ربط ہے جو قَرَب اور قربان گاہ کے معنی رکھتا ہے یعنی بھینٹ چڑھانے کی جگہ: کعبے کے پاس ایسا ہوا بھی کرتا تھا) اس سے اس روایت کی توثیق ہوتی ہے کہ یمنی قبیلہ جُرَہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کے زمانے میں مکہ آباد کیا تھا، جہاں تک ذوالقرنین کا تعلق ہے مقدونیہ والا سکندر اعظم ایک مینڈھے کی پوجا کیا کرتا تھا اور اس کی سینگیں بطور علامت کے ٹوپی پر لگا کر پہنتا تھا، یہ رواج مقدونیہ (یوگوسلاویہ) میں اب تک رہا ہے اور وہاں کے حکمران عیسائیت کے باوجود دو سینگوں والی ٹوپی درباری مراسم کے وقت پہنتے رہے ہیں، عربوں نے سکندر اعظم اور اس کے ساتھیوں کو اس لباس میں دیکھا تو ذوالقرنین سے بہتر نام اسے اور کیا دیا جاسکتا ہے! مصر میں سکندر اعظم کے جو کتبے ہیں ان سے اس لباس اور اس کے مفہوم کی پوری توثیق ہوتی ہے۔ عبدالمطلب کے زمانے میں کعبے کی آرائش جن قدیم اور قیمتی چڑھاؤں سے کی جاتی تھی ان میں دو سینگوں والے سنہری کیمش (مینڈھے) کے سر کا بھی ذکر آتا ہے (اخبار مکتہ للازرقی، ص ۱۱۱، سنن ابی داؤد، ۱۱/۹۵)۔

معلوم نہیں ایرانی بادشاہ ساسان کبھی شخصاً مکہ آیا تھا یا نہیں، مگر سہیلی (الروض الانف ۱/ ۹۷) نے لکھا ہے کہ جب خزاعہ قبیلے نے حملہ آوری کر کے جُرہم کو مکہ سے نکال باہر کیا تو جرہمیوں نے کعبے کے چڑھاؤں کا خزانہ زمزم کے کنوئیں میں ڈال کر اسے پاٹ دیا تھا، عبدالمطلب نے جب زمزم کا خواب میں نشان پا کر اس کو دوبارہ کھودا تو اندر سے خزانہ بھی برآمد ہوا، اس میں دو سنہری ہر نہیں اور چند ”قلعی“ تلواریں بھی تھیں جو ایرانیوں کے بادشاہ ساسان نے کعبہ کو تحفہ دی تھیں۔ بعض روایتوں میں یہ بادشاہ شاپور کی فرستادہ چیزیں ہیں۔

مختلف خانوادے:

جرہمیوں کے علاوہ جنکا اوپر ذکر آیا مورخوں کا بیان ہے کہ کعبہ پر قبیلہ ایاد نے بھی حکمرانی کی ہے (انساب الاشراف للبلذری جلد اول، ص ۵۱) پھر انہوں نے خزاعہ قبیلے کے لیے اپنی جگہ خالی کی۔ اس عہد کے متعلق زیادہ حالات معلوم نہیں، لیکن جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے قُصی نے خزاعی سردار کی بیٹی سے نکاح کیا تو یہ ایک تاریخی زمانے سے تعلق رکھتا ہے جس کا ٹھیک عصر بھی معین کیا جاسکتا ہے۔ خسر کے انتقال پر قُصی نے وہاں سرداری حاصل کر لی۔ قُصی کی ماں ثمالی عرب کے قبیلہ قضاہ سے تعلق رکھتی تھی، ابن حبیب (کتاب المثنوق، طبع حیدرآباد دکن، ص ۲۷۶) کا بیان ہے کہ اس تبدیلی حکومت کے زمانے میں قضاہ اور ان کے حلیف اسد کے قبیلوں نے مسلح فوج بھیج کر قصی کی حمایت کی تھی۔ ابن حبیب کے شاگرد ابن قتیبة (کتاب المعارف، طبع یورپ، ص ۳۱۳) کے مطابق تو قیصر روم (بیزنطینی حکمران) نے قصی کی مدد کی تھی۔ اس زمانے میں پہلا تھیوڈوس (۳۷۹ تا ۳۹۵ء) بادشاہ تھا۔ اس زمانے میں رومی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور قسطنطنیہ کے مشرقی رومیوں (بیزنطینیوں) نے روما کے مغربی رومیوں سے خود مختاری اختیار کر لی تھی، ممکن ہے قصی کی مدد سے تھیوڈوس کا منشا اپنے اقتدار کو مضبوط تر بلکہ وسیع تر کرنا بھی ہو۔

جو بھی ہوا ہو، قصی نے بلدی زندگی کی نئی تنظیم کی اور نئے کی شہری مملکت میں

متعدد ادارے کا فرمائی کرنے لگے جن میں سے بعض صراحت کے ساتھ قصی کی ایجاد ہونا بتائے گئے ہیں۔ (مثلاً باشندوں پر رفاہ کے نام سے ایک سالانہ ٹیکس عائد کیا جانا)۔
مکے کی حکومت:

ہر دیگر مملکت کی طرح مکے کی شہری مملکت بھی خود مختار تھی اور اندرونی اور بیرونی اقتدار اعلیٰ سے بہرہ ور تھی۔ چنانچہ وہ اجنبیوں سے معاہدے کر سکتی اور کسی اور اجنبی اقتدار کی ماتحتی کے بغیر ان سے امن یا جنگ کے تعلقات رکھ سکتی تھی۔

ہم یہاں صرف سفارتی اور اجنبی تعلقات سے بحث پر اکتفا کریں گے۔ اس سلسلے میں وہاں ایک موروثی عہدہ دار (وزیر) ”سفیر و منافر“ کے نام سے پایا جاتا تھا۔ اس کا پتا نہیں چلتا تھا کہ کس تاریخ سے اس ادارے کا آغاز ہوا، لیکن زمانہ ماقبل اسلام کے متعلق پرانے مورخوں نے بعض معلومات محفوظ رکھی ہیں۔ چنانچہ ابن عبد ربہ (فوت ۲۳۸ھ، ۹۲۰ء) نے العقد الفرید (طبع بولاق ۱۲۹۳ھ، جلد دوم، ص ۴۶) میں اور المقریزی (ف ۸۳۵ھ، ۱۴۳۲ء) نے الخمر عن البشر (مخطوطہ مصر جلد چہارم، ص ۲۸۸ تا ۹۰) میں اور ان میں سے اول الذکر نے ابن الکھمی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مکے میں اعیانی حکومت تھی جس میں دس موروثی سرداروں کی مجلس کا فرمائی کرتی تھی۔ وزیر خارجہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ مورخ لکھتے ہیں کہ ”اگر کوئی جنگ چھڑتی تو (حضرت) عمر بن الخطاب کو سفیر بنا کر بھیجا جاتا، اگر کسی اور قبیلے سے فضیلت اور برتری منوانے کے لیے منافرت کی ضرورت پیش آتی تو اس کے لیے بھی قریش عمر بن الخطاب کو اپنا منافر بنا کر بھیجتے اور یہ نمائندہ جو بھی کہتا قریش اسے قبول کر لیتے۔“ سارے مؤلف اس پر متفق ہیں کہ اس مجلس حکومت میں دس افسر ہوا کرتے، یہ کہ اسلام کی آمد تک اس کا سلسلہ جاری رہا اور یہ کہ سفیر و منافر کے عہدے پر اسلام سے عین ماقبل حضرت عمر مامور تھے۔

الازرقی نے اپنی مشہور تاریخ (اخبار مکہ، طبع یورپ ص ۱۰۷) میں بیرونی تعلقات کے متعلق ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک مرتبہ خانہ کعبہ میں آگ لگی

جس سے دیواریں کمزور ہو گئیں، پھر جب ایک موسلا دھار بارش ہوئی تو دیواریں گر پڑیں اور دوبارہ تعمیر کی ضرورت پیش آئی۔ اس طوفان سے سمندر بھی محفوظ نہ رہا اور ایک رومی (بیزنطینی) جہاز جو سامان لے کر (مصر سے) یمن جا رہا تھا، شعبہ (موجودہ جدہ) کے سامنے خشکی پر چڑھ گیا، خبر ملی تو مکے والے وہاں گئے اور جہاز کا جو سامان بچ سکا تھا خاص کر لکڑی کے تختے خرید لیے اور جہاز والوں کو اجازت دی کہ مکہ آئیں اور بچا کھچا سامان وہاں بیچیں اور انہیں عشر (محصول درآمد) بھی معاف کر دیا، ورنہ عادت یہ تھی کہ رومی تاجر مکہ آئے تو ان سے وہاں عشر (دس فیصد چنگی) وصول کیا جائے جس طرح کہ رومی اپنے علاقہ میں کمی تاجروں سے وصول کرتے تھے۔“ یہ ۶۰۵ء کا واقعہ ہے جبکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس (۳۵) سال کی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ: مکی قانون بین الممالک کا خاصا قدیم قاعدہ تھا۔

یہاں ایک اور واقعے کا ذکر کیا جاسکتا ہے جسے کسی قدر اہمیت حاصل ہے، وہ یہ کہ قدیم زمانے میں مکہ مشرق و مغرب کی بین الممالک تجارت کی شاہراہ پر واقع تھا۔ یمن بلکہ خود ہندوستان کی پیداوار شام اور قسطنطنیہ جانے کے لیے مکے سے گذرتی تھی۔ اس عبور و مرور کے لیے ہر مقام (بشمول مکہ) کے لوگوں کی اجازت ناگزیر تھی۔ اسی طرح عرب بھی (بشمول اہل مکہ) تجارت کے لیے بیرونی ممالک کا سفر کیا کرتے تھے، اور سربرآوردہ لوگ جہاں بھی جاتے وہاں کے اعلیٰ افسروں سے ضرور ملتے تھے۔ خاص کر شاعر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے اور مدح و ستائش کے قصیدے گاتے۔ ابن عبد ربہ وغیرہ کی کتابوں میں ”وفادات“ پر مستقل باب بھی ہیں کہ کس طرح مختلف عرب افراد بیرونی حکمرانوں کے ہاں باریاب ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں مکہ کے سربرآوردہ لوگ حبش کے نجاشی، فارس کے کسری، مصر کے گورنر، یمن، غسان (شام) اور حیرہ (عراق) کے بادشاہوں وغیرہ کے ہاں حاضر ہوتے نظر آتے ہیں۔

اس طرح کی ایک سفارت قبل اسلام کی عربی تاریخ میں بڑی مشہور ہے۔ اسے ایلاف کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر کثیر مواد کے باوجود، مشرق میں ہو کہ مغرب میں، کسی نے اب تک توجہ نہیں کی یہاں اسی کا کچھ ذکر مطلوب ہے۔

ایلاف:

سب سے پہلے یہ یاد دلانا ہے کہ قرآن مجید میں ایک چھوٹا لیکن پورے کا پورا سورہ اس موضوع پر ہے جسے کبھی سورہ قریش اور کبھی سورہ ایلاف کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے:

- ۱۔ رحمان اور رحیم اللہ کے نام سے!
قریش کے ”ایلاف“ کے باعث،
- ۲۔ ان کے ”ایلاف“ کے باعث سرا اور گرما کا کارواں چلتا ہے۔
- ۳۔ پس چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے آقا کی عبادت کریں۔
- ۴۔ جس نے بھوک پر انہیں کھانا کھلایا۔
- ۵۔ اور خوف پر انہیں امن مہیا کیا ہے۔

(سورہ ۱۰۶، آیات ۱ تا ۵)

سورے میں مذکورہ اس ”ایلاف“ سے کیا مراد ہے؟ اولاً ایک پرانے واقف کار مورخ ابن حبیب (فوت ۲۳۵ھ) کی طرف رجوع کریں، وہ اپنی کتاب المحمر، ص ۱۶۲ میں بیان کرتا ہے کہ ”ایلاف العہود“ (یعنی ایلاف کے معنی معاہدوں کے ہیں)، سہیلی نے (اپنی سیرت نبوی الروض الانف، ۱/۲۸ میں) اس کی تائید کی ہے، اور مختلف شواہد سے استناد کیا ہے۔ لغت نویسوں کو بھی اس سے انکار نہیں۔ ایلاف کا مادہ ”الف“ الفت اور دوستی کے معنی رکھتا ہے اور اس کا فعل متعدی یعنی ایلاف دوستی کرانے، اور الفت پیدا کرنے کے معنی رکھ سکتا ہے۔ لسان العرب اور تاج العروس جیسی بڑی اور مستند لغتوں میں مادہ الف کے تحت مزید برآں یہ بھی صراحت ہے کہ ”قرآن مجید میں آئے ہوئے لفظ ایلاف کے معنی معاہدوں اور سمجھوتوں کے ہیں“ لیکن بطور اسم علم کے ایلاف کا اطلاق ان معاہدوں پر ہوتا ہے جو چند سربراہوں کے درمیان ہوتا ہے جس کی تفصیل نیچے آتی ہے)۔ ایلاف کے اس مفہوم کی مزید توثیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ان ایلاف نامی معاہدوں کو بعض مورخوں نے عصم اور عہود کے نام سے اپنی کتابوں میں

ذکر کیا ہے۔ ان الفاظ کے بھی معنی ہیں معاہدے، یا اطمینان دہانیاں۔

ان معاہدوں کا قصہ :

تاریخ یعقوبی (۱/ ۲۷۰ تا ۲۸۲) میں لکھا ہے: اہل مکہ مصیبت زدہ تھے اور ان کے تاجروں کا کاروبار حدود شہر سے باہر نہ جاتا تھا۔ ایک سال قحط پڑ کر حالت اتر ہو گئی تو ہاشم (آنحضرتؐ کے دادا) نے تجارت کے لیے شام کا سفر کیا، کارواں کے سردار کے اچھے طرز عمل کی اطلاع قیصر روم تک پہنچی، وہ فیاض، مہمان نواز اور دیگر اچھے اخلاق کا حامل ہے۔ اپنے استعجاب کی تشفی کے لیے قیصر نے ہاشم کو حضور میں طلب کیا اور گفتگو کے بعد اسے اجازت دی کہ تجارتی کارواں شام لایا کرے اور وہاں اپنے ملک کی پیداوار بیچے، مثلاً حجاز کے چمڑے اور یمن کے کپڑے، سفر واپسی میں ہاشم نے شام سے مکہ تک راستے میں پڑنے والے قبیلوں سے (عبور و مرور کی سلامتی کے) معاہدے کیے یعقوبی نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ ہاشم نے ایک مماثل معاہدہ جش کے نجاشی سے بھی کیا، پھر ہاشم کی وفات پر (اس کے بھائی) عبد شمس نے جش کا سفر کیا کہ اس اجازت نامے کی تجدید کرائے۔

ایک اور مورخ ابن حبیب نے اپنی کتاب (المسئق ص ۳۱ تا ۳۰ باب ”حدیث الایلاف“) میں اس کی مزید تفصیلیں دی ہیں اور انکھی کے حوالے سے ہاشم اور قیصر کی گفتگو نقل کی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ہاشم نے قیصر سے کہا کہ اگر حجازی پیداوار خود لا کر بیچے تو (درمیانی واسطے نہ ہونے کی وجہ سے) وہ تمہیں سستی پڑے گی“ (فہو از خص عذیکم) قیصر کی اجازت ملنے پر ہاشم مکہ واپس آیا ایک بڑا تجارتی کاروان تیار کیا اور شام لے گیا۔ ابن حبیب لکھتا ہے کہ اس دوسرے سفر کی اثنا میں ہاشم نے شہر غزہ میں (جو عرب کے انتہائی شمال میں علاقہ فلسطین میں بحر متوسط پر واقع ہے) وفات پائی اور اسے وہیں دفن بھی کر دیا گیا۔ یہ کہ ایک مماثل مقصد کے لیے ہاشم کے بھائی المطلب نے یمن کا سفر کیا اور رومان (یمن) میں وفات پائی: تیسرا بھائی نوفل کارواں ملیک عراق گیا کیونکہ کسری ایران نے اسے اس کی اجازت دی تھی۔ نوفل کی وفات سلمان

(عراق) میں ہوئی: صرف چوتھا بھائی عبد شمس حبش کے کاروان سفروں کے باوجود اپنے گھر میں فوت ہوا اور مکے میں دفن کیا گیا، شاعر مطرود الخزاعی نے اس کا ذکر اپنے مرثیے میں یوں کیا ہے (ترجمہ از عربی):

ایک قبر سلمان میں، ایک قبر۔

رومان میں اور ایک قبر غزات (غزہ) میں۔

اور ایک جس کی وفات

حبون کے قریب ثنیات کے مشرق میں ہوئی۔

طبقات ابن سعد (طبع یورپ جلد اول، حصہ اول ص ۴۳ تا ۴۶) میں کئی ماخذوں کی مدد سے تفصیل دی گئی ہے، چنانچہ الکلی کے مطابق سب سے بڑے بھائی المطلب نے نجاشی حبش سے، ہاشم نے شام کے ہرقل سے (گویا ہرقل رومی شہنشاہوں کا لقب ہو)، نوفل نے کسریٰ عراق سے اجازت حاصل کی کہ ان کے علاقوں میں تجارتی کارواں لایا کریں۔ ابن عباس کی روایت کے مطابق سردیوں میں کارواں یمن جاتے اور گرمیوں میں غزہ بلکہ انقرہ تک چلے جاتے۔ آگے چل کر ابن سعد نے لکھا ہے کہ قیصر نے نہ صرف ہاشم کو رومی علاقے میں کارواں لانے کی اجازت دی، بلکہ ایک سفارشی خط نجاشی کے نام بھی دیا جس میں حبش کے بادشاہ سے سفارش کی تھی کہ وہ بھی مکی تاجروں کو مماثل اجازت دے، ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہاشم نے راستے پر پڑنے والے قبیلوں سے بھی معاہدے کیے جن میں یہ قرار دیا تھا کہ ان قبیلوں کا سامان قریش رومی منڈیوں تک خود مفت لیجائیں گے اور جو قیمت وصول ہو وہ کمیشن لیے بغیر ان کو ادا کر دیں گے (معاوضہ میں قبیلہ کارواں کی سلامتی کا ذمہ دار ہوگا) ابن سعد نے مزید برآں یہ بھی صراحت کی ہے کہ قیصر سے اجازت ملنے کے بعد ہاشم جب مکرر (آخری مرتبہ) شام کے سفر پر روانہ ہوا تو اثناء راہ میں مدینے سے گزرتے وقت وہاں ایک نوجوان بیوہ سے نکاح کیا پھر آگے روانہ ہو کر یکا یک غزہ میں وفات پائی۔ چند ماہ بعد سوگوار بیوی کو عبدالمطلب نامی لڑکا پیدا ہوا (یعنی آنحضرت کا دادا) 148

تاریخ طبری (طبع یورپ سلسلہ اول صفحہ ۱۰۸۹) میں لکھا ہے کہ یہ معاہدہ شام کے رومی اور غسانی افسروں سے طے ہوا تھا، یہ کہ ہاشم کے بھائی عبد شمس نے حبش کا سفر کیا کہ نجاشی سے مماثل معاہدہ کرے، یہ کہ ایک اور بھائی نوفل کسری ایران سے ملنے عراق گیا تاکہ عراق اور ایرانی سرزمین میں آنے کی مماثل اجازت حاصل کرے، اور یہ کہ ایک اور بھائی المطلب نے یمن کا سفر کیا تاکہ وہاں کے حمیری بادشاہ سے بھی اسی طرح کا اجازت نامہ حاصل کرے۔

ابن حبیب کی کتاب المنق (ص ۲۶۲ تا ۲۶۳) میں اسی موضوع پر ایک دوسرا باب بھی ہے جس کا عنوان ہے ”حدیث الرحلتین“ اس میں الکھسی کی روایت نقل ہوئی ہے کہ ابتداء قبریش کی یہ عادت تھی کہ ہر سال دو مرتبہ کاروانی سفر کریں: سردیوں میں یمن کا گرمیوں میں شام کا۔ رفتہ رفتہ یہ ان کے لیے دو بھر ہو گیا..... (اس لیے کہ وہ مالدار اور آرام طلب ہو گئے تھے؟ یا اس لیے کہ اصل کارپرداز تاجر بوڑھے ہو گئے تھے؟)..... اس پر تبالہ اور جرش نیز یمن کے بعض دیگر ساحلی رقبوں کے باشندے سامان پہنچانے کا کام خود انجام دینے لگے۔ بری تاجر (جنوبی مشرقی مضافات مکہ یعنی) الحبب تک سامان پہنچاتے، اور بحری تاجر بندر گاہ جدہ تک۔ اس طرح اہل مکہ کو خود سفر کرنے کی حاجت نہ رہی، مگر ایک مرتبہ ایسا قحط پڑا جو مسلسل کئی سال تک جاری رہا اور اہل مکہ کے سارے سرمائے خرچ ہو گئے، اس وقت ہاشم نے شام کے سفر کا ارادہ کیا۔ وہاں اس نے بڑی مقدار میں روٹیاں خریدیں اور انہیں مکہ لا کر چور چور کیا (کہ سخت ہو گئی تھیں) اور انہیں ایک گرم شوربے میں ڈال کر اہل مکہ کی ضیافت کی، اسی سبب سے اسے ہاشم کے لقب سے یاد کیا جانے لگا (جس کے معنی ہیں ”چور چور کرنے والا“) ورنہ اس کا نام اصل میں عمرو تھا۔

نظام الدین القمی نے اپنی تفسیر میں سورۃ ایلاف کی بحث میں ان معلومات کا اضافہ کیا ہے کہ مذکورہ بالا بحری تاجر حبشی تھے، یہ کہ مکے والے جدے تک اپنے گدھے لیجاتے تاکہ کشتیوں سے اتارا ہوا مال مکے تک لائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حبشی تاجروں نے بعد میں اپنا حلقہ عمل وسیع تر کر لیا اور

اپنا درآمد کردہ مال خود ہی کئے تک پہنچانا شروع کیا۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے واقعے کا بلاذری (انساب الاشراف، مخطوطۃ استانبول ۲/۴۲۵) اور ابن عبد ربہ (العقد الفرید، ۲/۴۷) نے ذکر کیا ہے وہ یہ کہ ایک مرتبہ قحط سالی کے زمانے میں حبشی تاجر سامان مکہ لائے مگر وہاں چند نو جوانوں نے اسے فوراً لوٹ لیا، اہل مکہ (قریش) ڈرے کہ کہیں اس کے برے نتائج میں حبشی سامان کی درآمد ہی بند نہ ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے نجاشی کے ہاں ایک سفارت بھیجی اور چند آدمی بطور یرغمال بھی اس کے سپرد کیے، تاکہ اسے اپنی حسن نیت کا یقین دلائیں۔ نجاشی ابویکسومل نے ان یرغمالوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔

ابن ہشام (سیرۃ رسول اللہ، طبع یورپ، صفحہ ۳۶ تا ۳۸، ۸۹ تا ۸۷، اور ۱۱۳ تا ۱۱۴) کے ہاں کوئی خاص نئی چیز نہیں۔

وہ مذکورہ قصے کا خلاصہ بیان کرتا اور چند اشعار نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہے، اس کتاب کے شارح سیبلی (الروض الانف ۱/۴۸، ۹۴ تا ۹۷، ۱۱۷) نے کوئی نئے معلومات نہیں دیے ہیں، البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس مولف کے ہاں (ص ۴۸ پر) جن حکمرانوں نے کارواں لانے کی اجازت دی تھی ان میں مصر کے بادشاہ کا ذکر ہے، یمن کے حکمران کا نام نہیں ممکن ہے سہو قلم ہو۔

البلاذری (انساب الاشراف، طبع مصر ۱/۵۹) میں مختصر ذکر ہے اور لکھا ہے کہ ہاشم نے شام وغیرہ کے حکمرانوں سے ”عصم“ یعنی حفاظت کی اطمینان دہانیاں حاصل کیں۔

آخر میں مسعودی (مروج الذهب، طبع یورپ ۳/۱۲۱ تا ۱۲۲) قابل ذکر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ”قریش نے بادشاہوں سے ایلاف حاصل کیا اور یہ کہ اس لفظ کے

۱۔ اس زمانہ میں یکسوی خانوادے کی حبش میں حکومت تھی، معلوم نہیں اسی کی طرف اشارہ ہے، یا واقعی اس نجاشی کے بیٹے کا نام بھی یکسوم تھا، یمن کے سد مارب پر ابرہہ کا جو کتبہ ہے اس میں ابرہہ کے ایک بیٹے کا نام یکسوم ہی لکھا ہے۔ اور اس ابرہہ کو بھی عرب مورخ ابویکسوم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آیا نجاشی یعنی حبش کے بادشاہ کا بھی یہی نام تھا، یہ معلوم نہیں۔

معنی ہیں امن۔ پھر اس مؤلف نے تائید میں مطرود الخراجی کی بیٹیں نقل کی ہیں جن میں ان مذکورہ معابدوں کو لفظ ”عہد“ سے موسوم کیا گیا ہے۔
ان واقعات کی توقیت اور حکمرانوں کا تعین:

جیسا کہ نظر آئیگا سارے ہی مؤلف اس پر متفق ہیں کہ یہ معاشی و سفارتی کارنامہ ہاشم نے انجام دیا تھا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہیں، ہمارے ماخذوں میں واقعے کی تاریخ بیان نہیں ہوئی ہے لیکن اس کا متعین کرنا دشوار نہیں معلوم ہوتا۔
 ابن ہشام (صفحہ ۱۰۸) کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کی وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ سال تھی۔ انساب البلاذری (۸۴/۱) میں وہ ساری روایتیں جمع کی گئی ہیں جن میں عبدالمطلب کی عمر کا ذکر ہے وفات ۸۲ یا ۸۸ یا ۱۱۰ سال کی عمر میں ہوئی۔ بلاذری (حوالہ بالا) ابن حبیب (کتاب المجرب ص ۱۷۴) نیز دیگر بعض مؤلفوں نے تو عبدالمطلب کی وفات ۱۴۰ سال کی عمر میں قرار دی ہے۔ ان سب کا اوسط یعنی ۱۱۰ سال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور عام طور پر مورخ یہی عمر بیان کرتے ہیں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مورخوں (انساب البلاذری ۸۴/۱ اور محرم لابن حبیب، ص ۲۹۶) کے مطابق سن رسیدگی کے باعث عبدالمطلب کی بصارت بالکل زائل ہو گئی تھی۔

چونکہ رسول اکرم کی ولادت ۵۶۹ء میں ہوئی اور جب آپ کی عمر آٹھ سال کی تھی تو عبدالمطلب نے وفات پائی ۵۷۷ء میں اور ولادت اس سے ۱۱۰ سال قبل ۴۶۷ء میں ہوئی چاہیے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ عبدالمطلب کی ولادت مذکورہ بالا معاہدات کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہوئی اس طرح ایلاف کا زمانہ کم و بیش ۴۶۵ء کا سمجھا جاسکتا ہے۔

اس زمانہ میں کون کہاں کا بادشاہ تھا؟

رومی:

قسطظنیہ کا یزظنی (رومی) حکمران اس زمانے میں لیون اعظم (پہلیا لیون) تھا

جس نے ۳۵۷ء تا ۳۷۳ء حکومت کی۔ اس کے زمانے میں افریقہ میں شدید جنگیں ہوئیں۔ اس کے عہد میں ایران سے تعلقات پُر امن تھے اس لیے ہر قسم کی معاشی سرگرمی کا موقع ملا ہوگا۔ سلطنت روما کے جب دو ٹکڑے ہوئے تو مصر، یونانیوں کے قبضے میں رہا اور کہتے ہیں کہ انہوں نے تجارتی حمل و نقل کو خشکی کے کاروانوں کی جگہ سمندری جہازوں کے ذریعے سے انجام دینا شروع کیا۔ افریقہ میں جنگ چھڑی تو لازماً سارے بحری وسائل فوج اور ہتھیار روانہ کرنے میں لگا دیے گئے ہوں گے، ان حالات میں یمن، ہندوستان اور باقی مشرقی ممالک سے جن چیزوں کی درآمد ہوا کرتی تھی اس کے لیے یہ قابل فہم اور معقول چیز ہے کہ ان خشکی کے کاروانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے جو مکہ سے گزرا کرتے تھے۔

ایرانی:

۳۶۵ء کی تاریخ پر ایران میں خسرو پرویز تخت پر نظر آتا ہے۔ نویلڈ کیے اور کرشنن کے مطابق یہ ۳۵۵ء تا ۳۷۲ء حکمران رہا مگر اس میں سہو معلوم ہوتی ہے۔ ابن حبیب (کتاب المحبر، ص ۳۶۱ و مابعد) کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے کہ پرویز نے ۳۵۹ء سے ۳۸۳ء تک حکومت کی۔ مندرجہ ذیل واقعے سے معلوم ہو سکے گا کہ اس بادشاہ کو بیرونی کاروانوں اور درآمدوں کی کیوں ضرورت پیش آئی:

اس کی حکومت کے زمانے میں ایک قحط پڑا لیکن بادشاہ نے اس سے اچھی طرح نبٹ لیا۔ جو کچھ خزانہ شاہی میں تھا وہ اس نے بانٹ دیا اور محصول (ٹیکس) کی وصولی بند کر دی۔ اور جتنا ہو سکتا تھا نظم و نسق کو بہتر بنا دیا۔ صرف ایک شخص کو مستثنیٰ کر دیں تو کوئی آدمی اس زمانے میں قحط کی وجہ سے نہ مرا..... دیگر راویوں کے مطابق یہ قحط مسلسل سات سال تک جاری رہا، نہروں اور چشموں کا پانی سوکھ گیا، درخت اور جنگل خشک ہو گئے، زراعت اور نباتات عام طور پر مر گئے، چاہے میدانوں میں ہوں کہ پہاڑوں پر، پرندے اور جنگلی

جانور بھوک سے ہلاک ہو گئے، گھریلو جانور قحط زدگی سے اتنے کمزور ہو گئے کہ حمل و نقل کے لیے ان پر کوئی چیز لادی نہیں جاسکتی تھی۔ دریائے دجلہ میں پانی اتر گیا اور غذا کی کمی مایحتاج کی قلت اور ہر قسم کی مشکلوں کے باعث لوگ عام طور پر قحط کا شکار ہو گئے۔ اس پر بادشاہ (پرویز) نے رعایا کے نام فرمان صادر کیا اور انہیں اطلاع دی کہ انہیں محصول مالکداری جزیہ (محصول چنگی) اور نانہہ (دیگر عارضی محصولوں) اور بیگاری سے معاف کیا جاتا ہے، یہ کہ اب وہ اپنے مالک آپ ہیں۔ اور یہ کہ وہ انہیں حکم دیتا ہے اپنی بقا و گذر کے لیے غلہ فراہم کرنے کی ساری ممکنہ کوشش کریں، بادشاہ نے ان کے نام ایک اور فرمان بھی جاری کیا، اس میں انہیں حکم تھا کہ چھپائے ہوئے، جمع کیے ہوئے اور غلے کے دیگر ذخیرے نکالیں جو کہ انسانوں کے لیے غذا کا کام دیتے ہوں، آپس میں مساوات ملحوظ رکھیں، ترجیحات کو نظر انداز کریں، امیر اور غریب میں یکسانی پائی جائے، چھوٹے بڑے میں تفریق نہ ہو۔ بادشاہ نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر کہیں کوئی شخص فاقہ کشی سے مرے تو اس پورے شہر یا گاؤں کے باشندوں کو سزا دی جائے گی اور بہت سخت سزا دی جائے گی۔ پرویز نے اس قحط کے زمانے میں نظم و نسق اس طرح چلایا کہ کوئی شخص بھوک کی وجہ سے ہلاک نہ ہونے پایا۔ صرف ”اردشیر خرد و فیروز“ نامی مقام پر ایک واردات ہوئی۔ پھر اس زمانے میں بادشاہ نے خدا سے رجوع کیا اور برسات کے لیے دعا کی، خدا نے اس کی دعا قبول فرمائی اور ملک حسب سابق سرسبز ہو گیا پانی کو افراط ہو گیا اور درخت ہرے بھرے ہو گئے۔“ (تاریخ طبری، طبع یورپ سلسلہ اول صفحہ ۸۷۲ تا ۸۷۴، کرشنن کی فرانسیسی تاریخ ساسانیان، ص ۲۸۵ تا ۲۸۶)۔

یعنی:

جہاں تک یمن کے حکمران کا تعلق ہے اس سے مراد غالباً تبع بن حسان بن تبع ہے جس نے مشہور الحارث بن عمرو الکندی (مشہور شاعر امرؤ القیس بن حجر کے دادا) کو اپنا نائب اور سپہ سالار بنا دیا تھا۔ اس کے متعلق تاریخ طبری (ص ۸۸۱ تا ۸۸۲) میں لکھا ہے: ”اسے جنات نے (ویران صحرائیں) بھٹکا دیا تھا، مگر وہاں سے وہ صحیح سلامت واپس آ گیا وہ علم نجوم کا سب سے بڑا ماہر اور اپنے زمانے کے عالموں میں سب سے زیادہ عقلمند تھا، اور تاریخ گذشتہ اور آئندہ واقعات کو پیشین گوئی کی واقفیت بھی سب سے زیادہ اس کو تھی پھر وہ تبع بن حسان بن تبع بن ملکہرب بن تبع الاقرن کے نام سے حکمران بنا۔ حمیری (جنوبی عرب والے) ہوں کہ دیگر عرب، سب اس سے تھراتے تھے۔ اس نے اپنے بھانجے الحارث بن عمرو بن حجر الکندی کو ایک بری فوج کا سپہ سالار بنا کر قبائل معد اور شہر حیرہ اور اس کے آس پاس علاقے کی طرف روانہ کیا، اس زمانے میں حیرہ کا بادشاہ النعمان بن امرؤ القیس (المعروف بہ ابن الشقیقہ) تھا، حارث وہاں پہنچا اور لڑائی کے بعد نعمان اور اس کے چند رشتہ داروں کو قتل کیا اور اس کی فوج کو شکست دی صرف بادشاہ کا بیٹا جو قبیلہ نمر کی ماء السماء نامی بیوی کے بطن سے پیدا ہوا تھا، اس قتل عام سے جان بچا کر بھاگ نکلا الممذر کا خانوادہ حکومت سے محروم ہو گیا اور الحارث بن عمرو اس کے علاقے کا بھی مالک ہو گیا۔“ یہ حارث بہت دن تک حکمران رہا۔ اس نے اپنے بیٹوں کو فوج دے کر بھیجا کہ شام اور غسانیوں کی حکومت بھی چھین لے۔ سویڈن کے مستشرق اولنڈر نے اپنی انگریزی کتاب:

(OLINDER, THE KINGS OF KINOA OF THE FAMILY OF AKILAL MURAR)

یعنی خانوادہ آکل المرار کے حکمرانان کندہ، مطبوعہ لوند، ۱۹۲۷ء ص ۲۸) میں اس کے متعلق لکھا ہے: ”یہاں جس حمیری حکمران کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد ہارتمان صفحہ ۴۹۷ (HARTMANN, ARABISCHE FRAGE) کے مطابق شرحیل یکف بن شرحیل یعفر ہے جس کا ذکر ۴۶۷ء کے ایک کتبے میں ملتا ہے (اس بارے میں دیکھو گلازر، ص ۲۶)

(GLASER ZWEI INSCRIFTEN) اس شرحیں یعفر کا ذکر ریکمانس (GRYKMAN) نے بھی مجلہ موزیون (MUSEON) جلد ۶۱، شمارہ ۳، ۴، ۱۹۴۸ء ص ۲۳۳ میں اپنے فرانسیسی مضمون (احمد فخری کے دریافت کردہ یمنی کتبے) میں کیا ہے، اس گماں کی تائید اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ حضرموت میں بمقام رابیہ ہر سال ایک میلہ لگتا تھا جس کے متعلق مورخ لکھتے ہیں:

”وہاں جانا ہوتا تو قریشی تاجر تو خانوادہ آکل المرار سے خفارہ (بدرقہ) حاصل کرتے اور اس میلے کو جانے والے دوسرے لوگ حضرموت کے قبیلہ آل مسروق بن وائل سے خفارہ حاصل کرتے، یہ دونوں قبیلے خفارہ مفت مہیا کرتے لیکن قریش کی سرپرستی کے باعث قبیلہ آکل المرار سب پر غالب ہو گیا۔“
(ابن حبیب کی کتاب الحجر، ص ۲۶۷، اور المرزوقی کی لازمہ و الامکنہ، ۱۶۵/۲، ہر دو مطبوعہ حیدرآباد دکن)

حبشی:

حبش کے سلسلے میں ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ اس زمانے میں مشہور یکسومی خانوادہ وہاں حکمران تھا، لیکن ان بادشاہوں کے سلسلے میں زیر بحث زمانے کے متعلق کوئی تاریخی معلومات حاصل نہیں۔ اگر بعد کے زمانے کے واقعات کو معیار قرار دیا جائے تو اس میں عربی مورخوں کی بیان کردہ باتوں کو ناممکن قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی۔

مصری:

باقی رہتا ہے بادشاہ مصر، جس کا ذکر صرف سہیلی کے ہاں ہے، اگر یہاں کوئی غلطی یا سہو قلم نہیں ہے تو اس سے مراد کوئی یونانی گورنر ہوگا، بعد کے زمانے میں مکے والے تاجر اکثر مصر جایا کرتے نظر آتے ہیں لیکن مصر کے کسی بادشاہ کا، جیسا کہ سہیلی نے ذکر کیا ہے، کوئی پتا نہیں چلتا۔

مکی تجارت کا نظام:

مکی تاجروں نے بین الممالک تعلقات کا جو وسیع اور حیرت انگیز سلسلہ قائم کیا اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہوگی۔ جب تک پرانی صدیوں کی تجارتی روایتیں اور تجربے نہ رہے ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے تجارت کے سلسلے میں جو تعلقات پیدا کیے اور (ایلاف کے ذریعے سے) جو اجازت نامے حاصل کیے وہ کوئی بے معنی اور مردہ چیز نہ ثابت ہوئے بلکہ ایک زندہ حقیقت تھے، اس کا ثبوت قدیم قومی تاریخ کے متخصص ابن الکلی کے ہاں موجود ہے۔ اور ”اسواق الغرب“ کا اس نے جو جیتا جاگتا تذکرہ کیا ہے، دیکھو ابن حبیب کی کتاب المحبر، ص ۲۶۳ تا ۲۶۸۔ الرزوقی کی الازمنہ والامکنہ ۱/۱۶۱ تا ۱۶۸۔ الیعقوبی کی تاریخ، طبع یورپ ۱/۳۱۳ تا ۳۱۵۔ قلتخندی کی نہایت الارب، طبع مصر ص ۴۶۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے تاجر بیزنطینی علاقے میں جاتے تھے، اور ایرانی بستیوں میں بھی جہاں وہ مقامی باشندوں اور تاجروں کے علاوہ ہندوستانی اور چینی تاجروں سے بھی ملتے تھے۔ یہ میلے ایک مستقل ادارہ تھے اور ہر سال معینہ وقت پر شروع ہوتے تھے، ایک مقام کے بعد دوسرے مقام کا میلہ کچھ اس جغرافیائی ترتیب سے مقرر تھا کہ سارے عرب کی چکر ہو جاتی تھی نیز جنوبی فلسطین اور جنوبی عراق کی بھی۔ ان میلوں کا آغاز (ماہ محرم میں) عرب کے شمال سے شروع ہوتا۔ پھر بعد کے مہینوں میں وہ مشرق میں لگتے، پھر جنوب میں، پھر مغرب میں سال کے اواخر (ذی الحجہ) میں۔ مزید برآں خفارے (بدرقے) کا مؤثر نظام موجود تھا جس کے ذریعے سے کاروان والوں کی جان و مال کی بخوبی حفاظت ہوتی، عرب کے مختلف علاقوں (قبیلوں) میں حفاظت کا اطمینان حاصل کرنے کے لیے ظاہر ہے کہ پیشگی ان قبیلوں سے سفارتی کارکردگی کے ذریعے سے معاہدے کیے جائیں۔ اس پر مستزاد حرام مہینوں (اشہر حرم) کا ایک ادارہ بھی پایا جاتا تھا جس کے باعث ہر سال دو مرتبہ مکہ کا راستہ سارے عرب کے لوگوں کے لیے کھل جاتا اور پُر امن ہو جاتا تھا، حج اکبر کے زمانے میں مسلسل تین مہینے تک یعنی ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم میں، اور حج اصغر یا عمرے کے زمانے میں ایک ماہ کے لیے

پورے رجب میں لڑائی بھڑائی حرام سمجھی جاتی اور قافلوں تک کو کوئی چھیڑ نہ سکتا، جہاں تک خود اہل مکہ کا تعلق ہے، ان کے لیے ہسل کا مشہور ادارہ پایا جاتا تھا (جس کا ذکر سیرۃ ابن ہشام ص ۶۶ میں اور فیروز آبادی کی القاموس میں مادہ ”ب س ل“ کے تحت ملے گا) اور چند کلی قبیلوں کو پورے آٹھ مہینے..... اور ہمارے خیال میں اشہر حرم کے چار مہینوں کے علاوہ کہ اس سے سارے ہی لوگ متمتع ہوتے، گویا سال تمام..... سارے عرب میں امن حاصل رہتا۔ اور وہ جہاں اور جس قبیلے کے علاقے میں چاہتے جاسکتے، یہ امتیاز اصل میں تو مکے کے چند خانوادوں کو حاصل ہوا تھا۔ لیکن اس سے دوسرے لوگ بھی بہ آسانی استفادہ کر سکتے۔ یعنی وہ ان خاندانوں کے کسی فرد کا خفاہ حاصل کر لیں تو وہ ان کے ساتھ ہر جگہ جاتا اور حفاظت مہیا کر سکتا۔ اس خدمت کا اس شخص کو حسب معمول کوئی معاوضہ دیدیا جاتا۔

خلاصہ :

اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے تجارتی اغراض کے لیے ایک وفاق میں منسلک ہو کر متحد ہو چکا تھا، اس سے اس سیاسی اتحاد کا راستہ بن گیا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کارنامہ ہے۔ مذکورہ بالا تاریخی واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ نے جو وسیع اور بار آور سفارتی سرگرمی دکھائی وہ عرب ہی نہیں عربوں کے نسلی و جغرافیائی و سیاسی حدود کے باہر تک بھی موثر ہو چکی تھی۔

ان سارے بیانات کو کوئی شخص چاہے تو محض خیالی کہہ کر رد کر سکتا ہے، ہمارا مقصد یہاں یہ ہے کہ اس مواد کو جو منتشر پایا جاتا تھا یکجا، اور اکٹھا کر دیں، محض گمان کے ذریعے سے واقعات تراشنے ”خواہش“ کو ”حقیقت“ سمجھنے اور ”ہوا ہونا چاہیے“ کہنے کے مقابلہ میں دستاویزوں اور تاریخی بیانات کو بہر حال زیادہ وقعت دینی پڑے گی، ہماری رائے میں یہ ناممکن نہیں کہ ان عربی بیانات میں کہیں کہیں کچھ مبالغہ کیا گیا ہو، لیکن ان کو محض بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا۔

ضمیمہ:

اوپر کتاب المصنف مؤلفہ ابن حبیب کا ذکر آیا اسے حال میں دائرۃ المعارف نے چھاپ بھی دیا ہے، جن لوگوں کی اس تک دسترس نہ ہو ان کے فائدے کے لیے اس کے دونوں بابوں کو یہاں مع ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

(۱) حدیث الایلاف

عن ابن الكلبي قال: كان من حديث الایلاف ان قريشا كانت تجارا، وكانت تجارا تهم لا تعدو مكة، انما يتقدم عليهم الاعاجم بالسلع فيشترون منهم ثم يتبايعون بينهم و يبيعون من حولهم من العرب فكانت تجارتهم كذلك حتى ركب هاشم بن عبدمناف الى الشام فنزل بقیصر واسم هاشم يومئذ عمرو، فكان يذبح كل يوم شاة فيصنع جفنة ثريد ويد عومن حوله فیا کلون وکان هاشم فيمازعموا احسن الناس عسبا واجملهم فذكر لقيصر

(۱) ایلاف کا قصہ

ابن الکلبی کی روایت ہے کہ ایلاف کا قصہ یوں ہوا کہ (کے کے باشندے یعنی) قریش تاجر لوگ تھے لیکن ان کی تجارتی سرگرمیاں مکے سے آگے نہ بڑھتی تھیں بلکہ اجنبی لوگ سامان لیکر آتے تو یہ ان سے خریدتے، پھر مکے والوں کو بھی بیچتے اور آس پاس رہنے والے عربوں کو بھی۔ ان کی تجارت کا یہی حال رہا تا آن کہ ہاشم شام کے سفر پر روانہ ہوا اور قیصر کے سکونی علاقے میں ٹھہرا، اس وقت تک ہاشم کا نام عمرو تھا۔ وہ ہر روز ایک بکری کاٹا اور گوشت اور روٹی سے پکائے جانے والے ثرید کے پیالے دسترخوان پر رکھے جاتے اور دعوت عام ہوتی کہ آس پاس کا ہر شخص آکر کھائے۔ کہتے ہیں کہ ہاشم گٹھے ہوئے بدن کا اور بہت خوبصورت شخص تھا، اس کی اطلاع قیصر تک پہنچائی گئی کہ یہاں ایک قریشی آیا

ہے جو روٹی کو چورا چورا کر کے اس پر شوربا ڈالتا پھر اس میں گوشت ملاتا ہے۔ بات یہ ہوئی کہ عجی لوگوں کی عادت یہ تھی وہ شوربا تھالیوں میں رکھتے اور تھوڑی سی روٹی بطور سالن کے چکھتے۔ اور اسی لیے اسے ”ہاشم کا لقب دیا گیا جس کے معنی ہیں چورا چورا کرنے والا۔ قیصر کو اطلاع ملی تو اسے بلایا۔ جب ملاقات اور گفتگو کی تو بہت اچھا اثر لیا چنانچہ وہ اسے اکثر بلایا کرتا اور ملاقات کرتا۔ جب ہاشم نے اپنا رسوخ دیکھا تو ایک دن اس سے کہا ”اے بادشاہ، میری بھی ایک قوم ہے جو سارے عرب کی تجارت کی مالک ہے، اگر مناسب معلوم ہو تو انہیں نوشتہ دے کر جان کی حفاظت کا بھی یقین دلا اور تجارتی مال کی حفاظت کا بھی، تاکہ وہ حجاز کے اچھے چمڑے اور کپڑے لا کر تمہارے ہاں بیچا کریں اور یہ تمہیں زیادہ سستا پڑے گا“ چنانچہ قیصر نے اسے ایک نوشتہ دیا کہ جو بھی عرب آئے حفاظت سے رہیگا۔ ہاشم یہ نوشتہ لے کر واپس روانہ ہوا شام کے راستے میں جس جس عرب قبیلہ سے گزرتا اس کے سرداروں سے ایلاف حاصل کرتا، ایلاف کے معنی ہیں ان کی سرزمین میں

وقیل: ههنا رجل من قریش
یهشم الخبز ثم یصب
علیه المرق و یفرغ علیہ
اللحم وانما كانت الاعاجم
تصنع المرق فی الصحاف
ثم یوتدم بالخبز فلذلک
سمی هاشم۔ وبلغ ذلک
قیصر فدعا به فلما رآه
وکلمه، أعجب به۔ فکان
یرسل الیه فیدخل علیہ،
فلما رأی مکانه منه قال له
هاشم: ”ایها الملک ان لی
قوماً وهم تجار العرب فان
رأیت ان تکتب لهم
کتاباتؤ منهم وتؤ من
تجارتهم فیکدموا علیک بما
یستظرف من ادم الحجاز
وثیابه فیکونوا یبیعونه
عندکم فهو ارخص
علیکم“ فکتب له کتابا
بأمان من أتی منهم فاقبل
هاشم بذلک الکتاب فجعل
کلاماً بحی من العرب
بطریق الشام اخذ

کسی حلفی کے بغیر (رہ گزر کا) امن حاصل ہو، اور یہ امن سب لوگوں کو حاصل ہو، اس کے معاوضے میں قریش ان قبائل کا سامان تجارت خود لیجائیں گے حمل و نقل کے مصارف نہ مانگیں گے اور بیچنے کے بعد قیمت اور نفع دونوں ان کو واپس ادا کر دیں گے، اس طرح ہاشم نے اپنے اور شام کے درمیان جتنے قبیلے تھے سب سے ایلاف حاصل کیا اور جب وہ مکہ پہنچا تو (خوشخبری) لایا اس سے بڑی کوئی چیز ممکن نہ تھی پھر سب لوگ ایک بڑا تجارتی کاروان لے کر نکلے۔ ہاشم عربوں کے جس جس قبیلے سے گزرتا اس سے ایلاف کی شرط کی وعدہ وفا کی کرتا رہا اور یہ وعدہ وفا کی سب کے ساتھ ہوئی اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قبائلی سرداروں کو بھی جمع کرتا رہا اور سب کو ساتھ لیکر شام پہنچا اور وہاں کے شہروں میں ٹھہرا لیکن وہ اسی سفر میں شام (فلسطین) میں بمقام غزہ فوت ہو گیا۔

(اصل میں یہاں کئی مرثیے ہیں جو حذف کیے جاتے ہیں)

جب ہاشم کی وفات ہو گئی تو اسکا بھائی مطلب بن عبد مناف یمن گیا اور وہاں

من اشرفهم ایلافا فالایلاف
ان یامنوا عندهم فی
ارضهم بغیر حلف علیهم،
وانما هو امان الناس وعلی
ان قریشا تحمل لهم بضائع
فیکفونهم حملانها ویردون
الیهم راس مالهم وربحهم
فاخذهاشم الایلاف ممن
بینہ و بین الشام حتی قدم
مکة فاتا هم باعظم شئی
اتوا به۔ فخرجوا بتجارة
عظيمة وخرج هاشم
یجوزهم ویوفیهم ایلافهم
الذی اخذلهم من العرب،
فلم یبرح یوفیهم ذلك
ویجمع بینهم و بین اشراف
العرب حتی ورد بهم الشام
واحلهم قراها فمات فی
ذلك السفر بغزة من الشام۔

(حذفنا المراثی)

فلما مات هاشم، خرج
المطلب بن عبد مناف الی

کے حکمرانوں سے عہد لیا کہ جو قریش ان کے ہاں تجارت کے لیے آئے اسے امن رہیگا پھر راستے میں جتنے عرب قبیلے پڑتے تھے ان سے ایلاف حاصل کرتا گیا اور ویسے ہی معاہدوں کے ساتھ مکہ آیا جیسے ہاشم نے کیا تھا، عبد مناف کے بچوں میں مطلب سب سے بڑا بیٹا تھا اسے فیض کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ جس وقت (مکرر) یمن کو جا رہا تھا تو یمن میں بمقام ردمان فوت ہو گیا۔ عبد شمس بن عبد مناف حبش کے بادشاہ کے پاس روانہ ہوا اور اس کے ہاں تجارت کے لیے آنے والے قریشیوں کے حق میں ایک نوشتہ اور عہد حاصل کیا، پھر ان (قبائل) سے بھی ایلاف لیا جو راستے میں پڑتے ہیں اور وہ اس طرح (کامیاب) مکہ واپس آیا۔ عبد شمس کی وفات کے میں ہوئی اور اسے حجون میں دفن کیا گیا۔ عمر میں یہ ہاشم سے بھی بڑا تھا۔

اور نوفل بھی سفر پر نکلا، یہ عبد مناف کے بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا..... وہ عراق روانہ ہوا اور کسریٰ سے قریشی تاجروں کے حق میں عہد حاصل کیا۔ پھر ان سب عرب (قبائل) سے بھی ایلاف حاصل

الیمین فاخذ من ملوکهم عہد لامن تجر قبلهم من قریش، ثم اقبل ياخذ الایلاف ممن مر به من العرب حتی اتی مکة علی مثل ماکان ہاشم اخذ وکان المطلب اکبر ولد عبد مناف وکان یسمى الفیض۔، فہلک المطلب بردمان من الیمین وهوراجع الی الیمین و خرج عبد شمس بن عبد مناف الی ملک الحبشة فاخذ منه کتابا و عہدا لامن تجر قبله من قریش، ثم اخذ الایلاف ممن بینہ و بین العرب حتی بلغ مکة و ہلک عبد شمس بمكة فقبر بالحجون، وکان اکبر من ہاشم۔

وخرج نوفل بن عبد مناف وکان اصغر ولد عبد مناف فخرج الی العراق فاخذ عہدا من کسریٰ لتجار قریش ثم اقبل ياخذ

کرتا گیا جن کے علاقوں سے گزرنا پڑا۔
اور اس طرح مکہ واپس آیا پھر جب وہ
(مکرر) عراق روانہ ہوا تو عراقی سرزمین
میں بہ مقام سلمان فوت ہو گیا۔

عبدمناف کے یہ بیٹے وہ لوگ ہیں جن
کے ہاتھوں ہی سب سے پہلے خدانے
قریش کی قدر و منزلت بلند کی، ان لوگوں
سے زیادہ فیاض، عالم، عقلمند اور خوبصورت
عربوں نے کبھی نہ دیکھے تھے، حقیقت میں
یہ آسمان کے تارے ہی تارے تھے۔

(۲) دو کاروانی سفروں کا قصہ

کلبی کا بیان ہے کہ قریش کو (سالانہ) دو
کاروانی سفروں کی عادت تھی ایک
سردیوں میں یمن کی طرف، دوسرے
گرمیوں میں شام کی طرف وہ اسی عادت
پر قائم رہے تا آں کہ یہ محنت ان پر بار
گزرنے لگی پھر تبالہ اور جرش نیز یمن کے
ساحلی علاقے کے باشندوں کی بن آئی،
چنانچہ ساحلی علاقے کے لوگ سامان
تجارت سمندری راستوں سے، اور
اندرونی علاقے والے اونٹوں پر سامان
لا کر آنے لگے۔ ساحل والے جدہ میں

الایلاف ممن یمربہ من
العرب حتی قدم مکة ثم
رجع الی العراق فمات
بسلمان من ارض العراق۔

وكان بنو عبدمناف هؤلاء
اول من رفع الله به قريشا۔
لم تر العرب مثلهم قط اسمع
ولا اعلم ولا اعقل ولا
اجمل۔ انما كانوا نجوما من
النجوم..... کتاب المنمق
(ص ۳۱ تا ۴۰)

(۲) حدیث الرحلتین

الکلبی قال: کانت قريش
تعودت رحلتين احداهما
فی الشتاء الی الیمن
والاخری فی الصيف الی
الشام۔ فمکثوا بذلك حتی
اشتد علیهم الجهد۔
واخصب تباله و جرش
واهل ساحل البحر من
الیمن، فحمل اهل الساحل
فی البحر و حمل اهل البربا
لمحصب فامتار
اهل مكة ماشاوا، وكفاهم

اللہ الرحلتین کانوا یرحلون
 الی الیمین والشام فانزل اللہ
 عزو جل: ”لایلاف قریش
 ایلافهم رحلة الشتاء
 والصیف“ وقوله: ”امنهم
 من خوف“ یرید خوف
 العدو، وخوف الجذام
 فلیس فی الارض قرشی
 جذم۔ وایلاف قریش یعنی
 داب قریش رحلة الشتاء
 والصیف فاصابت قریش
 سنوات ذهین بالاسوال
 فخرج هاشم الی الشام فامر
 بخبز کثیر فخبزله، فحمله
 فی الغرائر علی الابل حتی
 اتی مكة فهشم ذالک
 الخبز ونحر تلك الابل ثم
 طبخها والقی تلك القدور
 علی ذلک الخبز فاطعم
 اهل مكة و اشبعهم وکان
 ذلک اول الحیاة
 (کتاب المنمق (ص ۲۶۲ تا
 ۲۶۳)

لنگر ڈالتے اور خشکی والے (کے کے
 مضافات میں) محب تک سامان
 پہنچاتے۔ اور یوں کے والے جو چاہتے
 مایحتاج سامان حاصل کر سکتے، اور وہ یمن
 اور شام کے جو دو سفر کیا کرتے تھے ان
 سے خدا نے انہیں نجات دلائی۔ قرآن
 میں خدا نے یہی یاد دلانے کے لیے وحی
 فرمائی ہے کہ ”قریش کے ایلاف کے
 باعث، ان کے ایلاف ہی کے باعث سرما
 اور گرما کا کاروان چلتا ہے۔ نیز یہ آیت
 ”اور اس نے خوف پر انہیں امن مہیا
 کیا“۔ مراد یہ ہے کہ دشمن اور جذام
 کے خوف سے چنانچہ ساری سرزمین میں
 کوئی جذام زدہ قریشی نہیں ملے گا۔ اور
 ایلاف کے معنی ہیں قریش کی سردی اور
 گرمی کے کاروانی سفر کی عادت۔ پھر
 قریش کے لیے مسلسل کئی سال قحط پڑا
 جس سے ان کا سارا اندوختہ ختم ہو گیا۔
 اس پر ہاشم شام روانہ ہوا اور وہاں بڑی
 مقدار میں روٹیوں کی فرمائش دی اور جب
 روٹیاں تیار ہوئیں تو اس نے انہیں تھیلیوں
 میں بار کر کے اونٹوں پر لادا اور لیکر مکہ آیا
 یہاں اس نے ان روٹیوں کو چورچوڑا کر کیا
 اور (ان لانے والے) اونٹوں کو ذبح

کر کے پکوان کیا (گوشت اور شور بے)
یہ دیکھیں اس روٹی پر انڈیلی گئیں اور یہ اس
نے مکے والوں کو کھلایا اور پیٹ بھر کر کھلایا
اور یہ (وہاں) نئی زندگی کا آغاز تھا۔

(ابتدائی فرانسیسی اشاعت ۱۹۵۷ء ضروری تصحیحات
کے ساتھ مؤلف ہی نے ترجمہ کیا)

(ماہ نامہ البلاغ - کراچی - جون ۱۹۶۸ء)

کلام اللہ ازلی ذکر من الرحمن مُحدَث تراجم قرآن مجید تازہ بتازہ نو بنو

تمہید:

تیس ۳۰ برس ہوتے ہیں، موقر رسالہ معارف کے دسمبر ۱۹۵۹ء کے شمارے میں میرے ایک مضمون کو اشاعت کی عزت بخشی گئی تھی۔ ”قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے۔“ اس میں اس وقت تک کے سارے معلوم فرانسیسی ترجموں کا تاریخ وار ذکر کیا گیا تھا اور ان چھپیس ۲۶ تراجم کی فہرست میں سب سے آخری وہ تھا جسے اس سے ایک ہی مہینہ پہلے یکم نومبر ۱۹۵۹ء کو شائع کرنے کی مجھے سعادت حاصل ہوئی تھی، اس مضمون میں خاص کر اس آخری ترجمے کی سرگزشت بھی درج تھی کہ کن حالات میں وہ کام ہاتھ میں لیا گیا اور کس طرح جلد اجلدی میں تکمیل کو پہنچایا گیا۔

ان تین دہ سالگیوں میں بہت سے نئے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں اور اپنی بعض پرانی معلومات کی اصلاح بھی کرنی پڑی ہے۔ جس سے ناظرین معارف کو ناواقف نہیں رہنا چاہیے۔ اجازت ہو تو آج اسی موضوع پر عود بھی کروں اور نظر ثانی بھی اور اس کی ایک ضمنی ذیلی تقریب یہ بھی ہوئی ہے کہ خود میرے ترجمہ کا خدا کی ششدر کرنے والی عنایت سے پندرہواں اڈیشن اس وقت مطبع میں ہے۔ پروف دیکھ

چکا ہوں، سابق میں کچھ نہیں تو اڑھائی لاکھ نسخوں کی نکاسی ہو چکی ہے اور مانگ کی کثرت سے اس دفعہ نیا ایڈیشن ناشر ایک لاکھ کی تعداد میں چھاپ رہا ہے۔ واللہ الحمد والمنة۔

اس تمہیدیک تنظیم کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ مقالہ ہذا کی تدوین کے لیے جب معارف موثر کا متعلقہ پرانا شمارہ نکالا تو کچھ عجیب باتوں سے بھی دوچار ہوا۔ اس میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب بھی مقالہ نگاروں میں تھے اور ان کا نام اب رسالے کے ٹائٹل کو زیب دے رہا ہے۔ اسی ٹائٹل کے آخری صفحہ پر خطبات مدراس اور ”رحمتِ عالم“ جیسی شہرہ آفاق کتابوں کا اشتہار بھی تھا۔ ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ میری ”خطبات بہادپور“ کا نظر ثالث شدہ ایڈیشن اسلام آباد میں چھپ گیا ہے جو ”خطبات مدراس“ ہی کا خوشہ چین اور گویا تکملہ ہے۔ اس طرح میری فرانسیسی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچویں ایڈیشن کے پردف بھی آئے ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ چند ماہ میں چھپ جائیں گے۔

اسی شمارہ معارف میں جگن ناتھ آزاد کی منظوم تاریخ انسانیت سے ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا متعلقہ اقتباس بھی پڑھا۔ بے اختیار آنسو بہ نکلے۔ معلوم نہیں موصوف ابھی بقید حیات ہیں یا نہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس نظم کا فرانسیسی ترجمہ کر کے یہاں کے کسی رسالہ میں شائع کروں۔ واللہ المستعان، یہ ہو سکا تو ان شاء اللہ اطلاع دوں گا۔

آدم برسر مطلب:
تصحیح:

دسمبر ۱۹۵۹ء کے معارف کے محولہ پرانے مضمون میں پرانی معلومات کی اساس پر (جو ’’بوش انسائیکلو پیڈیا‘‘ پر مبنی تھیں) عرض کیا تھا کہ اولین معلوم فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید طلیطا (اندلس) کے عالم دون ابراہام Don Abraham (غالباً یہودی) کا ہے۔ تخطیلہ

۱۔ بقید حیات ہیں اور علمی سرگرمیوں میں مشغول بھی۔ (معارف)

کے حکمران الفونسو دہم (حکمرانی ۱۵۰۶ء تا ۱۵۲۱ء/ ۱۲۸۳ء) کے حکم سے یہ کام اپنی زبان میں کیا گیا اور پھر اسی اپنی سے بون آوین تورادے سیوے (Bonaventura De Seve) نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

مگر روما کے آنجمنانی فاضل پروفیسر لیوی ڈیلا ویدا (Levi Della Vida) نے اپنے ایک عنایت نامے میں مجھے لکھا تھا کہ یہودی انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار اشائٹن شناڈر (Steinschnider) کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دون ابراہام نے سورہ معارج کا نہیں بلکہ ایک عربی معراج نامے کا اپنی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا لاطینی اور فرانسیسی میں (Bonaventura De Sienne) نے ترجمہ کیا اور یہ کہ اس کا نام De Seve غلط ہے۔ یہ ایک شہر ہے جو اٹلی میں ہے اور اطالوی میں Siena لکھا جاتا ہے (یعنی سئے ناوالا) اس موضوع پر دیکھو چیرول لی کی اطالوی کتاب معراج E. Cerulli Il Libro Della Scalla.

میری تازہ معلومات کے مطابق قدیم ترین فرانسیسی ترجمہ قرآن دون ابراہام کا نہیں بلکہ میٹائیل بوڈئے (Michael Baudier) کا ہے (جس کا زمانہ ۱۵۸۰ء تا ۱۶۳۵ء کا ہے)۔ یہ مستقل ترجمہ قرآن تو نہیں ہے بلکہ اس کی کتاب ”ترکوں کے مذہب کی تاریخ“ (Histoire De La Religion Des Turcs) مطبوعہ پاریس ۱۶۲۵ء میں بکثرت آیات قرآن کا کامل مفہوم یا تلخیص و خلاصہ دیا گیا ہے۔ اچھا ہوا برا یہ سب سے پرانا ترجمہ ہے جو فرانسیسیوں کو ان کی اپنی زبان میں پڑھنے کو ملا تھا۔

معارف کے محولہ پرانے مضمون میں فرانسیسی تراجم کی مجموعی تعداد چھپیس (۲۶) دی گئی تھی۔ میرے زیر طبع فرانسیسی ترجمہ قرآن کے دیباچے میں فرنگی زبانوں کے تراجم قرآن کی جو فہرست ہے، اس میں فرانسیسی میں اب پورے سترترجے بلکہ کچھ زائد ہی دیے گئے ہیں۔ آج اس پر پوری تفصیل سے بحث نہیں کروں گا، صرف اپنے ترجمے کی سرگزشت عرض کروں گا۔

اس کے پہلے ایڈیشن کی ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو طباعت مکمل ہوئی تھی۔ اس میں سے چھپیس (۲۶) نسخے خصوصی عمدہ کاغذ پر چھپے اور ان پر حروف (A) تا (Z) بھی درج کیے گئے

ہیں (یہ ناشر نے خاص لوگوں کو دیے) مزید ایک سو نئے بھی اچھے کاغذ پر چھپے اور ان پر اعداد (i, ii, iii) درج ہیں اور یہ ناشر کمپنی کے مالکوں اور حصہ داروں کے لیے مخصوص کیے گئے۔ ان کے علاوہ بارہ (۱۲) ہزار نئے چھپے جن پر ہندسے (2.1 تا 12000) درج ہیں اور یہ ناشر کمپنی کے شرکاء کے لیے فروخت کے لیے پیش کیے گئے۔ (ناشر کا نام ہے ”کتابوں کا فرانسیسی کلب Club Francais Du Livre اور اس کی نشریات صرف ان لوگوں کو فروخت کی جاتی ہیں جو اس کلب کے ممبر بنیں عام خریداروں کو نہیں)۔ ترجمہ چھپتے ہی ممبر ٹوٹ پڑے اور یہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ناشر ان کو ہر کتاب کی اشاعت کی اطلاع اور تفصیل دیتا ہے۔ چنانچہ اس ترجمہ کی خوبصورت طباعت اور خوبصورت زریں جلد کے باعث سارے بارہ (۱۲) ہزار نئے صرف دو ہفتوں میں بک گئے۔ خفیف اصلاح کے بعد دوسرا ایڈیشن نومبر ۱۹۵۹ء میں کلب ہی نے چھاپا۔ اس کا ایک چوری کا عکسی ایڈیشن قم میں بلا تاریخ چھپا، تیسرا اور چوتھا ایڈیشن ناشر کی اجازت سے پارلیس کے مطبع قرطاجہ کے مسلمان مالک نے ۱۹۶۳ء میں چھاپے۔ ان میں سے ایک میں عربی متن بھی ہے۔ پارلیس کے ایک غیر مسلم ناشر کتب پادو (Padour) نے ۱۹۶۵ء میں ایک نیا پانچواں ایڈیشن بہ اجازت چھاپا۔ اس میں جو عربی متن ہے وہ ترکی کے ایک مشہور خطاط کا لکھا ہوا ہے اور ترکی کے محکمہ امور مذہبی نے اس کا عکس چھاپا تھا مگر اس فرانسیسی ناشر نے ترکی حکومت سے اجازت لینی ضروری نہ سمجھی۔ اس ایڈیشن کی دو جلدیں ہیں۔ ایک میں قرآن کا متن و ترجمہ اور دوسری میں کچھ لغو تصویریں ہیں اور گویا ترجمے کی ہمراہی جلد ہے۔ یہ مولف سے پوچھے بغیر نئے ناشر نے کیا تھا۔ چھٹا اور ساتواں ایڈیشن مولف کی نظر ثانیوں کے بعد اصل ناشر ہی نے ۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۱ء میں چھاپے۔ آٹھواں نظر ثانی شدہ ایڈیشن عربی متن کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں بیروت میں چھپا۔ اس کے ناشر نے اس کے دو مزید ایڈیشن بلا تاریخ چھاپے۔ مگر ان پر تاریخیں درج نہ کیں، نواں چوری کا ایڈیشن جو تیسرے ایڈیشن کا عکس ہے کتب خانہ اشاعت اسلام دہلی نے عربی متن کے ساتھ چھاپا اور اس کے دو مزید ایڈیشن بلا تاریخ طبع ہوئے اور یہ جزیرہ موریشس کے ایک مسلمان تاجر کے مصارف پر نکلے۔ دسواں ایڈیشن مولف کی نظر ثانی سے عربی متن کے ساتھ بیروت میں دو جلدوں میں

چھپا، اسی کو ۱۹۸۰ء میں حکومت قطر نے مکرر چھپوایا۔ گیارہواں ایڈیشن بلا ترمیم بیروت میں ۱۹۸۱ء میں ایک جلد میں طبع ہوا۔ بارہواں ایڈیشن بعد نظر ثانی ۱۹۸۳ء میں انقرہ میں چھپا ہے۔ ایک چوری کا ایڈیشن جس میں باہر دسواں ایڈیشن لکھا ہے اور اندر گیارہواں ایڈیشن لکھا گیا ہے بیروت میں چھپا ہے مگر یہ حقیقت میں بیروت کے آٹھویں ایڈیشن کا عکسی چھاپا ہے۔ تیرہواں ایڈیشن مولف کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۸۵ء میں پچاس (۵۰) ہزار کی تعداد میں امیر کا میں چھپا۔ چودہواں ایڈیشن مولف کے علم و اجازت کے بغیر ۱۹۸۵ء ہی میں بینن Le Hennin نامی کمپنی نے شائع کیا جو غالباً ایک پُرانے ایڈیشن کا عکسی چھاپا تھا اور جس میں عربی متن بھی لگایا جانا معلوم ہوا۔ یہ کمپنی افلاس کے باعث جلد ہی ٹوٹ گئی اور مولف کو اس ایڈیشن کی صورت دیکھنے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ اللہ کی مرضی۔ پندرہواں ایڈیشن مولف کی نظر جدید کے بعد آج کل (یہ مضمون لکھتے وقت اکتوبر ۱۹۸۸ء میں) امیر کا میں زیر طبع ہے اور اس کے مسلمان ناشر کا بیان تھا کہ مانگ کی کثرت کے باعث اس کے ایک لاکھ نسخے چھاپے جارہے ہیں، واللہ الحمد۔

اپنے اس ترجمے کی خصوصیتیں پرانے مضمون میں لکھ چکا ہوں۔ نئے ناظرین معارف سے معذرت کرتا ہوں کہ اس کی تکرار نہیں کر سکتا۔ اس میں سو (۱۰۰) صفحے سے زائد کا ایک مقدمہ ہے جس میں خاص کر قرآن مجید کی تدوین کی تاریخ اہمیت رکھتی ہے۔ نئے زیر طبع ایڈیشن میں اس سند کا نوٹو بھی شامل کر رہا ہوں جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے شیخ القراء نے اس گناہگار کو شروع سے آخر تک پورا قرآن مجید ان کو سنانے کے بعد عطا فرمائی تھی۔ اس میں نسلاً بعد نسل سارے اساتذہ کا ذکر ہے اور آخری مرحلے میں حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم پانچ صحابیوں سے سننے کا ذکر ہے اور اس سے اوپر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آتے ہیں۔ اس مقدمہ کے بعد فرنگی زبانوں کے سارے تراجم کا ذکر ہے یہ انچاس (۴۹) زبانیں ہیں اور بعض میں کامل نہیں صرف جزئی ترجمہ ہوا ہے۔ ضخامت کے خیال سے مشرقی زبانوں کا اس فہرست میں ذکر نہیں ہے۔ کتاب میں تین انڈیکس ہیں۔ ایک مقدمہ کا، دوسرا مترجمین کی فہرست کا اور تیسرا ترجمہ و حواشی قرآن

کا۔ خطا و نسیان سے مبرا نہیں ہوں، غصہ و مولا کا فقیر و محتاج ہوں۔

ترجموں کی فہرست :

دنیا میں جتنی بھی عجبی (غیر عربی) زبانیں ہیں ان میں سے ہر ایک میں قرآن مجید کے ترجمے کی ضرورت ہوگی تاکہ جن کو عربی نہیں آتی وہ بھی احکام خداوندی سے واقف ہو سکیں۔ اسے وہی شخص کر سکتا ہے جسے دونوں زبانیں آتی ہوں اور اچھی آتی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی زبان میں کئی کئی لوگ ترجمہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید کے ترجمہ کا آغاز عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے۔ مشہور حنفی فقیہ شمس الاممہ سرخسی اور امام تاج الشریعہ بیان کرتے ہیں کہ چند نو مسلم ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے خواہش کی کہ وہ ان کو نماز کے لیے لایہ عنصر یعنی سورۃ فاتحہ کا فارسی ترجمہ مہیا کریں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے اس کو انجام دینے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہ فرمایا تو وہ ترجمہ ان کو بھیج دیا اور یہ لوگ اس کو اس وقت تک نمازوں میں پڑھتے رہے جب تک کہ عربی متن ان کو یاد نہ ہو گیا اور یہ کہ اس فارسی ترجمے کا پہلا جملہ تھا: ”بنام خداوند بخشنایندہ مہربان“۔

جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، عام تعلیم کے لیے کامل قرآن مجید کے ترجموں کی ضرورت ہونے لگی۔ دوست ہی نہیں دشمنوں کو بھی تاکہ اسلام کی تردید کر سکیں۔ نو مسلموں میں فارسی اور ترکی سرفہرست نظر آتے ہیں تو معترضین میں سریانی اور یونانی۔ مجھے معلوم نہیں ساری زبانوں کے معلوم تراجم قرآنی کی فہرست سب سے پہلے کس نے مدون کی البتہ یہ جانتا ہوں کہ دیگر اسلامی چیزوں کے ساتھ فرنگیوں نے خاص کر گزشتہ صدی میں اس سے بھی دلچسپی لی۔ مثلاً وکٹور شووین (Victor Chauvin) کی فرانسیسی کتاب (مطبوعہ بلجیم) ہے جس کے عنوان کا ترجمہ ہوگا: ”ان کتابوں کی فہرست جو عربی میں یا عربوں سے متعلق ۱۸۱۰ء سے ۱۸۵۰ء تک عیسائی یورپ میں چھپیں۔“ (مخفف نام بلیوگرانی Bibliograane) کی دسویں جلد قرآن اور حدیث سے متعلق ہے۔ اس میں تراجم قرآن مجید کا کافی مواد ہے۔ یورپ اور امیرکا کے بڑے کتب خانوں کی

فہرستوں سے مدد ملتی ہے۔ امیر کا کے مشنری رسالے ”مسلم ورلڈ“ نے اس بارے میں ایک خصوصی اور طویل مقالہ شائع کیا۔ غالباً اسی سے لے کر مصر کے عربی رسالے الہلال میں جرجی زیدان نے بھی ایک مقالہ چھاپا۔ مگر یہ سب سوکھی پھینکی فہرستیں تھیں جن میں زبان وار مترجموں کے نام اور زیادہ سے زیادہ ترجمے کی تاریخ طباعت درج تھی۔ مگر میں شروع میں ان سے بھی واقف نہ تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ خود توریت و انجیل کے تراجم کی بھی مکمل فہرستیں میرے علم میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

مجھے اس سے دلچسپی ایک انگریزی کتاب دیکھ کر ہوئی۔ اس کا نام ہے ”انجیل بہت سی زبانوں میں“ (Gospel In Many Tongues)۔ اس میں کئی سو زبانوں کا نام اور ہر ایک میں انجیل کا ایک مختصر اقتباس بطور نمونہ دیا گیا ہے۔ اس میں عربی بھی ہے، اردو بھی اور ایسی زبانیں بھی جن کا نام بھی مجھے پہلی دفعہ اس کتاب سے معلوم ہوا۔ یہ کوئی پانچ سات سو زبانوں کے مواد پر مشتمل کتاب تھی جس سے مجھے تاسف ہوا کہ ہم نے قرآن کی کیا خدمت کی ہے؟ اس میں صرف تراجم کے اقتباس ہیں، مترجموں سے بحث نہیں ہے۔

آدم برسر مطلب، حیدر آباد دکن میں مرحوم ابو محمد مصلح صاحب نے (جو غالباً بہار کے باشندے تھے اور ”بچوں کی تفسیر“ کے مولف، لاہور وغیرہ میں عرصہ تک قرآن مجید کی خدمت میں سرگرم رہ چکے تھے) ”عالمگیر تحریک قرآن مجید“ کے نام کی ایک انجمن ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں قائم کی۔ اس کا مقصد دنیا کی ساری زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے شائع کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی اس سے واقفیت ہوئی اور موسس کا ہاتھ بٹانے کی تھوڑی بہت مجھے بھی سعادت حاصل ہوئی۔ چنانچہ ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء میں ”القرآن فی کل لسان“ (Quran In Every Language) نامی کتاب اسی انجمن نے شائع کی۔ اس میں ۲۳ زبانوں کے بارے میں مواد تھا۔ ہر زبان کے سارے معلوم ترجموں اور ترجموں کی فہرست اور بطور نمونہ سورۃ فاتحہ کا ترجمہ ہر زبان کے ساتھ شامل کیا گیا۔ کتاب بہت مقبول ہوئی، والحمد للہ اور دوسرے ہی سال ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء میں وہیں اس کا دوسرا

اڈیشن نکلا اور اس دفعہ ۴۳ زبانوں کا ذکر کیا جاسکا۔ پھر مانگ کی کثرت سے ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۴ء میں تیسرا ایڈیشن بھی نکلا جس میں ۶۷ زبانوں کے ترجموں کا پتا چلا تھا۔

پھر مشیت الہی یہ ہوئی کہ انگریز بھی ملک بدر ہوں اور سلطنتِ آصفیہ بھی بڑے خون خرابے کے ساتھ ختم ہو۔

اس کے بعد سے مجھے اس کا موقع تو نہ ملا کہ کتاب کا نیا ایڈیشن نکال سکوں، لیکن معلومات جمع کرنے کا شوق برقرار رہا۔ اس کا بھی موقع ملا کہ عالم دوستوں اور ملاقاتیوں کی مدد سے سورہ فاتحہ کے نئی نئی زبانوں میں ترجمہ کرا کر اپنے ذخیرے کا حجم مصنوعی طور پر بڑھا سکوں، آج کل میرے پاس ڈیڑھ سو سے زیادہ زبانوں کا مواد فراہم ہو گیا ہے۔ جن میں سے تقریباً اسی میں کامل ترجمہ قرآن ہے باقی میں جزئی۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ تراجم قرآن کی کثرت کے لحاظ سے مشرقی زبانوں میں اردو کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے کہ اس میں پانچ سات سو ترجمے بتائے جاتے ہیں۔ پھر ترکی اور فارسی کا نمبر آتا ہے۔ فرنگی زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن فائق ہیں۔

جو بندہ یا بندہ، کتاب کی اشاعت کے وسائل نہ ہونے پر یہ سوچا کہ کتاب کی جگہ مقالے چھاپوں، اتفاق کے بات ہے کہ ۱۹۶۰ء میں لیک ایرانی صاحب سے ملاقات ہوئی جو پاریس سے فرانسیسی زبان میں ”افکار شیعہ“ (La Pense Chi ites) نامی ایک دو ماہی رسالہ نکالنے لگے۔ مجھے کچھ حرج نہ معلوم ہوا کہ اس کے ہر نمبر میں حروفِ حتمی پر ایک ایک زبان کا مواد شائع کروں اور ساتھ ہی حسب سابق سورہ فاتحہ کا ترجمہ بھی اس زبان میں دیتا جاؤں لیکن دو ہی سال بعد بارہ ہی نمبر نکلے تھے کہ ۱۹۶۲ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا، اس میں فرانسیسی، افریقائی، البانی، انجیادو، المانی (جرمن)، عربی، ارمنی، آسامی اور آذری کا ذکر آیا تھا۔ پھر ایک تونسسی مسلمان پاریس ہی سے ”فرانس اسلام“ نامی ایک ماہوار رسالہ ۱۹۶۷ء سے فرانسیسی زبان میں شائع کرنے لگے، میں نے اس سے بھی استفادہ کیا، پچاس ایک نمبر نکلنے کے بعد مالی دشواریوں سے یہ رسالہ

بھی بند ہو گیا۔ رسالہ افکار شیعہ کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں دوبارہ ”پیش اسلام“ (Connaissance De L'Islam) کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا۔ پھر ۱۹۸۳ء میں مکرر بند ہو گیا، مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔

اس سلسلہ کی ایک آخری چیز یہ ہے کہ بعض عربی سلطنتوں اور ترکی حکومت نے استانبول میں ایک ادارہ قائم کیا ہے جو اسلامی تاریخ، فنون لطیفہ اور ثقافت (تہذیب و تمدن) پر تحقیقاتی کام کرتا ہے۔ وہاں کے مواد کی کثرت کے باعث استانبول سے بہتر اس کا کوئی مرکز نہیں ہو سکتا۔ اس کے ناظم اعلیٰ (ڈائریکٹر جنرل) ایک ترکی فاضل ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوغلو ہیں۔ اس نے ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء میں ایک کتاب انگریزی میں چھاپی ہے جس کا نام ہے: (World Bibliography of Translations of the Meanings of the Holy Quran, Printed Translations 1515-1980) یعنی مطبوعہ تراجم قرآن مجید کی عالمگیر فہرست از ۱۵۱۵ء تا ۱۹۸۰ء۔ اس میں ۳۳+۸۸۰ صفحے ہیں۔ قلمی تاحال شائع شدہ ترجمے اس فہرست سے خارج ہیں۔ لعل اللہ يحدث بعد ذلك أمرا۔

یہ بیان کرنا شاید ضروری ہے کہ یک لسانی فہرستیں بھی ہیں۔ صرف فارسی ترجموں پر، صرف ترکی ترجموں پر (ازنا چیز حمید اللہ)، وغیرہ، نیز یہ بھی کہ جب ۱۹۵۹ء میں میرا فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید شائع ہوا، تو اس کے فرنگی ناشر کے اصرار پر میں نے اس کے مقدمے میں صرف یورپی زبانوں کے ترجموں کی مکمل فہرست شامل کی (مولف کا نام، مقام اشاعت، تاریخ طباعت ہائے مختلفہ وغیرہ)۔ اس میں بہ شمول ترکی والبانی اٹھائیس (۲۸) زبانوں کا مواد تھا۔ اس کے پندرہویں ایڈیشن میں جو ان سطروں کی تحریر کے وقت (۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء) مطبع میں ہے چھیالیس (۴۶) زبانوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے متعدد کئی کئی خطوں میں لکھی جاتی ہیں۔ مثلاً یوگوسلاوی، بوشاق زبان عربی، لاطینی اور روسی تین خطوں میں ملتی ہے۔ ترکی زبان اویغوری، عربی، لاطینی اور روسی چار خطوں میں، یونانی زبان عربی اور یونانی خطوں میں، پولینڈی زبان عربی اور لاطینی خطوں میں وغیرہ۔ ایک زمانے میں اندلسی زبان صرف عربی خط میں لکھی جاتی تھی، مسلمانوں میں بھی عیسائیوں میں بھی اور اسے نام دیا جاتا تھا ”الحمیادو“

(Aljamiado) حرف ”ل“ (جے) کا تلفظ ”خ“ اور یہ نام ہے ”الاعجمیہ“ کا اپنی تلفظ اور اس زبان میں متعدد تراجم قرآن مجید تا حال کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور میرے پاس ان کے مانگرو فلم وسائل کا انتظار ہے کہ ان کو چھاپ دوں۔

ایک نئی کتاب کا تعارف:

۱۹۸۷ء میں اسلام آباد میں ایک نئی کتاب ہمارے موضوع پر چھپنے لگی اور ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ یعنی ”قرآن کریم کے اردو تراجم، کتابیات، مرتبہ ڈاکٹر احمد خان“۔ ناشر: ”مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔“

اس کے مولف جو فاضل بھی ہیں، سابق میں عرصے تک پاکستان کے ادارہ تحقیقات علمیہ کے کتب خانے کے ناظم بھی رہے ہیں اور میرے بہت عزیز دوست بھی ہیں۔ اس لیے ان سے گلے اور شکوے سے آغاز کرتا ہوں۔

کتاب کے مقدمے میں (ص ۱۶ پر) وہ مجھ ناچیز کی کتاب ”القرآن فی کل لسان“ کا ذکر واقفانہ انداز سے کرتے ہیں لیکن جب صفحہ ۲۹۱ و مابعد میں مآخذ و مراجع کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کتاب نظر نہیں آتی ذکر آتا ہے تو صفحہ ۲۹۵ پر مغربی زبانوں کی کتابوں میں میرے فرانسیسی ترجمہ قرآن مجید طبع دہم کے مقدمے میں مندرج فہرست تراجم کا حالانکہ اس فہرست میں اردو تراجم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تالیف کے وقت ”القرآن فی کل لسان“ ان کے سامنے نہ تھی اور انہیں تکلف ہوا کہ مجھے لکھ کر اس کے دیکھنے کا موقع حاصل کر سکیں۔ اس میں اردو تراجم کی طویل فہرست ہے اور میں نے دیکھا کہ اس میں ایسے ترجمے بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا مواد انہیں زیر تبصرہ تالیف کے لیے کسی اور مآخذ سے نہ مل سکا۔ اس پر میں نے اپنی پرانی کتاب کی فوٹو کاپیاں لے کر فوراً انہیں ہوائی ڈاک سے بھیج دیں تاکہ کسی آئندہ اڈیشن میں ان سے استفادہ کر سکیں۔ ہمارے مولف امیر کا کینیڈا کی نیشنل یونین کٹیلاگ (National Union Catalog) سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں جو کئی سو جلدوں میں ہے اور بہت اہم اردو مآخذوں میں خود پاکستان میں چھپی ہوئی کتاب ”تذکرۃ المفسرین“ مولفہ قاضی زاہدہ الحسینی بھی مفقود ملی۔

بہر حال زیر نظر کتاب ان تالیفوں میں تازہ ترین ہے جو ایک ہی زبان کے تراجم قرآن سے بحث کرتی ہیں۔ جیسا کہ عرض ہوا اردو اس بارے میں سب سے باثروت ہے اور خوش قسمتی سے اس کتاب کو ایسے فرد نے مرتب کیا ہے جو اس فن کا ماہر اور تجربہ کار ہے۔ یقین ہے کہ جلد ہی اس کی طباعت جدید کا موقع ملے گا اور اس وقت اس میں مزید اصلاحیں بھی عمل میں آئیں گی۔

کتاب تاریخ و انہیں بلکہ مولف وار ہے اور مولفوں کے نام حروف تہجی پر مرتب ہیں۔ میں شخصی طور پر اس کو پسند کروں گا کہ تراجم کو تاریخ تالیف پر مرتب کیا جائے یعنی سب سے قدیم معلوم مترجم کا ذکر سب سے پہلے آئے اور اسی اندراج میں اس کی جملہ طباعتوں کا ذکر کر دیا جائے اور کتاب میں ایک اشاریہ ہو جو مترجموں کے ناموں کا حروف تہجی پر ذکر کرے۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ بعض ناموں کا اشاریہ میں کئی بار ذکر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اس دفعہ پہلا نام آغا قزلباش دہلوی کا ہے۔ میرے مجوزہ اشاریہ میں وہ آغا اور قزلباش دو جگہ آسکتا ہے۔ اس دفعہ امام غزالی کا ذکر حرف الف میں ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان کی تلاش کبھی حرف الف میں نہ کر سکتا امام فخر الدین رازی کا ذکر حرف الف میں نہیں، حرف ر میں ہے۔

اس دفعہ مکمل اور جزوی (جزئی؟) اردو تراجم کی مجموعی فہرست نمبر ۱۰۱۱ پر ختم کی گئی ہے۔ لیکن نظریہ آیا کہ ایک ہی ترجمہ کئی بار کئی مقاموں پر چھپا ہو تو نمبر پر قرار رکھنے کی جگہ نیا نمبر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ حقیقت میں اردو میں کتنے ترجمے ہوئے۔ شاید مشکل سے اس کے ایک تہائی ہوں۔ جدتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک اشاریہ مطبوعوں کے ناموں کا دیا گیا ہے۔ دوسری یہ کہ ایک اشاریہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اردو ترجمہ راست اصل عربی سے نہیں کیا۔ بلکہ کسی اور زبان کے ترجمے کو ”اردو میں ڈھالا“ اچھا ہوتا اگر وہیں قوسین میں مزید وضاحت ہوتی کہ اس سے کیا مراد ہے۔ اشاریہ میں مندرج ”ف“ سے مراد غالباً فارسی ہے لیکن ”ع“ سے کیا عربی مراد ہے؟ سارے ہی ترجمے عربی سے ہوئے ہیں۔ نمبر (۱۳۶) پر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ترجمے کا ذکر ہے اور تفصیل میں اسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی

تفسیر کا ترجمہ بتایا ہے صحیح کون ہے؟

معمولی طباعتی غلطیاں بھی ناگزیر تھیں، مثلاً مترجم نمبر ۲۲۹ کو ۶۲۹ لکھا گیا ہے۔ مگر ان معمولی چیزوں سے قطع نظر کتاب خوش آمدید کہے جانے کے لائق ہے اور اپنے موضوع پر فی الوقت حرف اخیر ہے۔ خدا کرے جلد نئی اور مکمل تراشاعت کا موقع ملے، موضوع ہی ایسا ہے کہ ہر روز نئے تراجم قرآن کی اشاعت سے ترمیم و تکمیل کی ضرورت رہے گی۔ شاذ و نادر تبدیل و تصحیح کی بھی۔ مثلاً موجودہ اڈیشن کے صفحہ ۲۹۵، سطر ۱۷ میں لکھنا یہ چاہیے تھا کہ ”یورپی زبانوں کے تراجم قرآنی کی فہرست جو مذکورہ ماخذ کے دسویں اڈیشن کے مقدمے میں شامل کی گئی ہے“۔ نہ یہ کہ ”فہرست تراجم قرآن، دسواں اڈیشن ۱۹۸۰ء“ اور ظاہر ہے کہ یہ ماخذ اردو تراجم سے قطعاً غیر متعلق ہے۔

کتاب میں اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہر اردو ترجمے خاص کر پرانے ترجمے کے متعلق یہ بھی بیان کریں کہ وہ اب کہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس سے ہمارے فاضل مولف کی انتھک کوشش، عظیم محنت اور اس اصولی عمل کا پتا چلتا ہے کہ محض سنی سنائی باتوں پر اکتفا نہ کریں۔

کتاب میں کوئی تین سو صفحے ہیں اور ٹائپ پر خوبصورت چھپائی ہوئی ہے، جزاء اللہ خیراً۔

(معارف اعظم گڑھ - نومبر ۱۹۸۸ء)

قرآن مجید کی سالگرہ مبارک

مسلمان قرآن مجید کی سالگرہ منانے کی عزت و سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ خدا مبارک فرمائے اور رجوع الی القرآن کی توفیق مرحمت ہو۔ یہ سالگرہ منانے کی تحریک مقبول تو ہوئی ہے لیکن دل کو خلش ہوتی رہی کہ کہیں یہ بدعت تو نہیں، کہیں بے ادبی تو نہیں۔

ابھی شعبان ۱۳۸۷ھ میں سوچ رہا تھا تو خدا نے کچھ باتیں دل میں ڈالیں۔ علماء کرام کی خدمت میں غور کے لیے عرض کرتا ہوں۔

پہلی وحی سورہ اقرآء کی پانچ پہلی آیتوں پر مشتمل تھی۔ اس میں اُمّیوں کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کا حکم دیتے ہوئے یہ ولولہ انگیز چیز، گویا بطور دلیل اور ثبوت کے، بیان ہوئی ہے کہ خدا قلم ہی کے ذریعے سے انسان کو وہ چیز سکھاتا ہے جو اسے معلوم نہ ہوتی ہے۔ گویا سارے تمدن اور ساری تہذیب انسانی کی حفاظت قلم کے سپرد ہے اور شاید اسی لیے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ”أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللَّهُ الْقَلَمَ“ (خدا نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا)

اس کے بعد تین سال تک فُتْرُت رہی اور کوئی تازہ وحی نہ آئی۔ اور کرر آغاز ہوا تو سورہ والضحیٰ نازل ہوا جس کی آخری آیت ہے وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

(رہی اپنے رب کی نعمت، سو (اسے) بیان کر) اسلام اور قرآن سے بڑھ کر انسان پر خدا کی نعمت کون سی ہو سکتی ہے؟ ابدی نجات اور دنیوی فلاح غرض حسنتِ دارین کی اسی سے رہنمائی ہوتی ہے۔ مفسر بیان فرماتے ہیں کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کا حکم تھا۔ درست ہے لیکن خدا کے کلامِ بلاغت نظام میں اور بھی پہلو ہو سکتے ہیں۔ میلاد شریف کی محفلیں منانا، قرآن مجید کی سالگرہ منانا بھی خدا کی نعمت کو یاد کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ساری عمر ہر روز چوبیس گھنٹے ایک ہی چیز بیان کریں اوسط آدمی تھک کر بیزار ہو جائے اس لیے سالگرہ منانا سال میں ایک بار سو نچنا سہولت بخش ہو سکتا ہے مگر اس آیت میں مدت کا ذکر نہیں ہے، سال میں ایک بار ہو یا کسی اور مدت میں۔

پھر سورۃ صافات کی آیت (۱۰۷ تا ۱۰۸) اللہ نے ذہن میں ڈالی ”وَفَدَيْنَاهُ بِذَبْحٍ عَظِيمٍ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ“ (یعنی جب خدا کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو قربان کرنا چاہا تو خدا فرماتا ہے: اور ہم نے ایک بڑے ذبیحے کے ذریعے سے اس کا فدیہ دیا اور اسے بعد والوں پر واجب کر دیا)“ اب عید الاضحیٰ میں ہر سال ہر ملت ابراہیمی و محمدی کا تابع یہ فدیہ برابر ادا کیا کرتا ہے۔ اس آیت میں نجات اسماعیلی کی سالگرہ منانے کا خود خدا نے، خود قرآن نے حکم دیا ہے، ہر اپنے حوصلے اور اپنی سمجھ کے مطابق یہ عید، یہ سال بہ سال عود کرنے والی تقریب مناتا ہے۔

اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ سورۃ زُخرف کی چند آیتیں (۲۶ تا ۳۲) ذہن میں آئیں: اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں اس چیز سے بیزار ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ بجز اس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا کیونکہ وہی میری رہنمائی کرتا رہے گا۔ اور (خدا) نے اسے اس (ابراہیم) کی اولاد میں ایک باقی رہنے والی بات بنا دیا، کہ شاید وہ (گمراہی سے) رجوع کریں، بلکہ میں (یعنی خدائے تعالیٰ) نے ان (مشرکین مکہ) کو اور ان کے آباء و اجداد کو مال و متاع بھی دیا تا آن کہ ان کے پاس حق بھی آیا اور ایک واضح رسول بھی، اور جب وہ ان (مشرکین مکہ) کے پاس آیا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر ہے اور ہم اسے نہیں مانتے اور یہ بھی کہا۔ یہ قرآن دو مشہور شہروں کے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا یہ لوگ تیرے رب کی

رحمت کو خود بائنا چاہتے ہیں؟ یہ ہم (یعنی اللہ تعالیٰ) ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی کے لیے ان کے اسباب معیشت کو بائنا ہے اور ہم ہی بعض کو بعض پر درجے کی فوقیت دیتے ہیں اور ان میں سے بعض دوسروں سے جبری کام لیتے ہیں۔ مگر (یاد رکھو کہ) خدا کی رحمت (یعنی قرآن و اسلام) اس (مال) سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔“

اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ مجھے اب وہ خلش بھی نہ رہی جس کا اوپر ذکر کیا۔

ایک غیر متعلق مگر دلچسپ چیز پر اسے ختم کرتا ہوں۔ سنا گیا ہے کہ دین دار صدر پاکستان کی سرپرستی میں قرآن مجید کو ریشمی کپڑے پر سنہری تاروں سے کاڑھا جا رہا ہے۔ چند ماہ ہوئے کتب خانہ پیرس کے ایک مسلمان افسر مصر بھیجے گئے تو انہوں نے وہاں بالکل ایسا ہی ایک پرانا قرآن مجید دیکھا جو ایک ٹن وزنی ہے اور ہندوستان سے آیا ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ بغداد کی تباہی کے بعد جب مصر میں نئی خلافت عباسیہ قائم ہوئی اور محمد تغلق نے ایک سفارت بھیج کر بیعت بھی کی، اور اپنی حکومت کی دربار خلافت سے توثیق بھی کرائی تو یہ شاندار اور متبرک تحفہ وہاں بھیجا۔

والحمد للہ یہ بھی ایک سالگرہ اور توارد ہے۔

(خاتون پاکستان، کراچی - نزول قرآن مجید ۱۳۸۷ھ)

سیرت

سرورِ کائنات کی حکومت

مندرجہ عنوان بحث پر روشنی ڈالنے سے پہلے چند امور صاف کرنے ضروری ہیں:
 کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکومت قائم کرنی چاہتے تھے یا اس سے بھی کسی
 بڑے سطح نظر کے حصول کے لیے حکومت کا قیام ایک ناگزیر چیز تھا؟ عام طور پر حکومت
 کے قیام کے ذرائع کیا سمجھے جاتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ماحول، جس میں
 حکومت قائم کی گئی، کیا تھا؟
آنحضرت کا ماحول:

چودہ سو برس پہلے عرب کی سیاسی حالت کا عام نقشہ یہ تھا کہ گو عرب طبعاً ایک ہی
 ملک تھا، جغرافیائی، لسانی، نسلی، ایک جہتی موجود تھی۔ رسم و رواج یکساں تھے مگر کوئی متحد
 کرنے والی مرکزی قوت موجود نہ تھی۔ ڈاکہ، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، بھوا، زنا،
 شراب نوشی ہر قسم کی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں (تفصیل صبح الاشی از قلعندی وغیرہ میں
 دیکھیے) خانہ جنگیاں عام تھیں، جن کے باعث ساحلی و سرحدی مقامات پر طاقتور ہمسایہ
 حکومتوں کی حمایتیں (PROTECTORATES) قائم ہو گئی تھیں۔ ایک حصہ پر رومن اثر تھا، تو
 دوسری طرف ایرانی گرفت بھی تھی اور یہ اجنبی تسلط و نفوذ ہر قسم کے اثرات ڈال رہا تھا۔
 چنانچہ ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ عربی زیر حمایت حکومتوں میں شاہانہ
 طمطراق اور کز و فر پیدا ہو گئے تھے مگر گورنر یمن ابرہہ حبشی کی تباہی کے بعد (جو عربوں کی

روایات اور قوی معبد کو تباہ کرنے آیا تھا) ۲ ”یوم ذی قار“ میں اجنبی استعمار کو ایک زبردست دھکا لگا تھا جس سے عربوں کے دلولوں میں ایک خاموش محرک پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی برتر قابلیتوں کو محسوس کرنا شروع کر چکے تھے۔ قسمت سے ان استعماری قوتوں (روم و ایران) میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں جس سے دونوں کمزور ہو گئے۔ قبیلہ واری حکومت تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے اثر سے ملک میں ایک طرح کی مرکزیت بھی تھی۔ چنانچہ سب عرب حج کو مکہ معظمہ آتے تھے، جہاں قریش اور قریش بھی عبد مناف کا خاندان سب سے بااقتدار تھا۔ حج اور دیگر میلے وحدت لسانی و خیالی میں بہت مددگار تھے۔ ان میں ایک طرح کی جمہوریت موجود تھی۔ دارالندوہ میں وقت ضرورت ان کی ”پارلیمان“ کا اجلاس ہوتا تھا۔ ان کے خطیب، سفیر، حکم یا ثالث خزانہ دار وغیرہ بھی منتخب ہوتے تھے۔ ملک میں چپکے ہی چپکے ذہنیت ترقی کر رہی تھی اور بیرونی ممالک کے سفر وغیرہ سے ان کے چند اعلیٰ تر دماغوں میں تلاش حق پیدا ہو گئی تھی۔ بعض لوگ شراب چھوڑ چکے تھے۔ متعدد لوگ بت پرستی سے خود بخود نفور ہو گئے تھے۔ موحدین بھی غیر موجود نہ تھے۔ انسانی قربانی بند ہو چکی تھی اور ایسی منت کا معاوضہ سو اونٹ مقرر ہو چکے تھے۔ انسانیت پروری کا خیال پھیلنے لگا تھا اور متعدد قبائل نے معاہدہ ”حلف الفضول“ کے ذریعے ایک انجمن مظلوموں کی مدد کے لیے قائم کی تھی۔ غرض اس قسم کی قابلیت ملک میں پیدا ہو چکی تھی کہ انہیں ایک متمدن اور منضبط قوم بنا کر ان کی عملی قوتوں سے کام لیا جائے اور ساتھ ہی ہمسایہ اجنبی حکومتیں اور کمال کو پہنچنے کے بعد تیزی سے رو بہ انحطاط تھیں۔

ظہورِ قدسی:

ان حالات میں ۹ ربیع الاول ۵۳ھ قبل ہجرت (۲۰ اپریل ۷۷۱ء) مولانا شبلی کے الفاظ میں ”شاہ حرم، حکمران عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہ کونین، عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللہم صل علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وسلم۔ ۳

سرورِ کائنات کا مقصد رسالت:

عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کو باور نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کوشش اور جدوجہد کا منشا فقط یہ تھا کہ خداے واحد ہی کا بول بالا ہو۔ اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آئے، جس میں ظلم معدوم ہو۔ ہر شخص اعتقاد کی کامل آزادی سے بہرہ ور ہو۔ دنیا سے بد امنی و فساد دور ہوتا کہ ہر شخص کو اپنی قابلیت کے مطابق خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع ملے اور نیز محتاجوں کو ممکنہ حد تک حکومت کی جانب سے امداد دی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ تمام انسان ایک مذہبی و سیاسی معاشرے یعنی حکومت کے تحت لائے جائیں، جس کے بغیر امن انتظام اور خودداری ممکن نہیں۔ آپؐ کے مشن کے خالص مذہبی اغراض سے یہاں ہمیں بحث نہیں ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ابتدائی دور رسالت میں اہل مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مال و دولت کی، حسین عورتوں کے ساتھ عقد کی اور امارت و حکومت کی چاٹ دی تا کہ آپؐ نبوت کے دعویٰ سے باز آجائیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ٹھکرا دیا اور کہا کہ اگر چاند سورج بھی مجھے توڑ کر لا دیے جائیں، تو میں تبلیغ حق سے باز نہیں آ سکتا۔ اس واقعہ سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ چالیس پچاس برس کی عمر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی کوئی خواہش نہ تھی، اس کے بعد بھی آپؐ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور بقیہ چند سالہ زندگی گویا سی واقعات سے پر ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخر تک یہی فرماتے رہے کہ ”میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لیے بھیجا گیا ہوں اور بس۔“

حکمرانی کی تربیت:

پیدائش سے چند ماہ قبل باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا، بچپن قبیلہ بنی سعد کے پہاڑوں میں گزارنا، چند ہی سال کے اندر ماں اور دادا کا بھی دنیا سے کوچ کر جانا، ایک جنگ (حرب فجار) میں بعض بزرگ رشتہ داروں کے تیر بردار کی حیثیت سے شامل ہونا،

دو ایک تجارتی سفر شام کے اختیار کرنا، ایک معمر بیوہ سے شادی کرنے کے بعد غریب پروری اور نیکو کاری کرتے کرتے بلند تر جذبات کے اثر سے خلوت گزینی پر مائل رہنا۔۔۔ یہی وہ چند باتیں ہیں، جو اس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ آپ کے دادا قبیلہ قریش کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ مکہ معظمہ میں آباد تھا، جو قدیم سے ملک عرب کا مرکز تھا۔ آپ کے دادا کے انتقال پر سرداری دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ آپ کے متعدد چچا بھی زندہ تھے، اس لیے آپ کو سرداری حاصل کرنے کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ ظاہر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سلطنت کے قیام کی تحریک اس زمانے میں دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

حکومتیں کس طرح قائم ہوتی ہیں؟
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت:

قیام حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانوں سے قبائل اور قبائل سے شاہی پھر شہنشاہی بنتی ہے۔ قبائلی دور تک ارتقاء طبعی ہوتی ہے اور بلا مخالفت، لیکن قبائل کے شیوخ کو کسی مرکز (بادشاہ) اطاعت پر جمع کر لینا آسان نہیں۔ شاہی سے شہنشاہی مملکت مختلف طور سے بن سکتی ہے اور جدید اضافہ ملک یا تو ایسے ممالک کا ہوتا ہے، جس میں کوئی حکومت اور انتظام پہلے سے موجود ہوتے ہیں، یا محض خود سر قبائل کے مقبوضات ہوتے ہیں۔

خود سر قبائل کے ملک کا الحاق دو طور سے ہو سکتا ہے: یا تو بزورِ شمشیر یا بذریعہ تدبیر۔ یہ تو ظاہر ہے کہ موروثی طور سے کسی کو تاج شہریاری حاصل ہو جائے تو اس کو محفوظ رکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا بزور بازو کوئی مملکت قائم کرنا۔ مملکت قائم کر کے اسے مستحکم اور پائیدار کرنا، حکومت عدل و انصاف سے کرنا اور نیک نام چھوڑ جانا، بہر حال ان کے برعکس امور سے بہتر ہیں اور مشکل تر بھی۔

محض حسن ظن سے نہیں بلکہ استقراء و تفحص کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عرب میں کسی مملکت کا قیام ایک واقعی مشکل

کام تھا۔ ملک میں کوئی حکومت نہ تھی۔ بے شبہ بعض خطوں پر چھوٹی چھوٹی شاہی حکومتیں حکمران تھیں اور وہ بھی اجنبی استعماریت کا شکار۔ (ان کو اپنے ماتحت بنانا، ان کی حامی و محافظ قوی استعماری شہنشاہیتوں سے مقابلے کرنے کے بغیر ناممکن تھا) ان حیرہ وغیرہ کی حکومتوں کے قطع نظر عرب میں عام طور سے صرف قبائلی حکومت تھی۔ جن میں آپس میں سخت رقابتیں اور موروثی جھگڑے صدیوں سے بیش از بیش ہی ہوتے چلے آ رہے تھے۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل کی ان مرکز گریز قوتوں کو یکجا کرنا، ان میں معاشرتی اور اخلاقی کایا پلٹنے والی اصلاحات کو رائج کرنا، عرب کو غیر ملکی حمایتوں سے آزاد کرا کے ان کا الحاق کرنا، ایک حکومت کی جملہ ضروریات قانونی و انتظامی کو بالکل نئے سرے سے مہیا کرنا اور اندرون ملک کی یہودی اور نصرانی مخالفتوں سے روبراہ ہونا تھا (یہودی مخالفتیں، مذہبی، معاشی، سیاسی ہر قسم کی رہیں اور بہت سخت جیسا کہ آئندہ بھی اشارۃً ذکر ہوگا) اس مہم کو سر کرنے اور مملکت عرب کو قایم کرنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مضبوط اور گہری بنیاد پر مستحکم حالت میں چھوڑ جاتے ہیں۔ رہا آپ کا نیک نامی سے مملکت کو قایم کرنا اور نیک نامی سے حکومت کرنا اور اپنے بعد بھی نیک نام چھوڑ جانا، اس سلسلے میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

ان سب کے علاوہ قیام کے دو بڑے ذریعے یعنی زر اور زور (فوج) میں سے ایک بھی آپ کے پاس نہ تھا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ حکومت کا قیام کرنے کی غرض سے نہیں چاہتے تھے۔ آپ کا پہلا اور آخری مقصد بُرے رسم و رواج کو مٹانا اور مذہب اسلام کی تبلیغ کرنا۔ غرض مقصد وحید اصلاح قوم تھا۔ اسی وجہ سے لوٹ مار، ظلم، طمع، لالچ، بکروفریب، دغا وغیرہ (جن سے اپنے گرد جتنے جمع کیے جاسکتے ہیں اور دولت جمع کی جاسکتی ہے) آپ کے طریق عمل سے خارج تھے۔ آپ کو تبلیغ دین کر کے متبعین فراہم کرنے تھے اور اصولاً اور حسب معمول یہ متبع ابتداءً عموماً مفلسوں، غریبوں، مسکینوں وغیرہ ہی پر مشتمل تھے، جن سے معمولی امداد تو کجا، خود ان کی جانی و مالی حفاظت مشکل تھی۔ ان سب امور کے باعث قیام حکومت میں آپ کے لیے بے اندازہ اور بے انتہا مشکلیں پیش آئی تھیں اور آئیں بھی۔ اس پر آپ کس طرح غالب آئے، آئندہ مذکور ہوگا۔

ابتدائے کار:

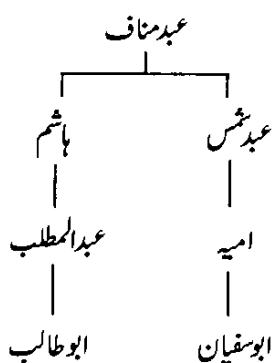
چالیس سال کی پختہ عمر میں عرفان سے مالا مال ہو کر اور ربانی ہدایت کے ماتحت (ہونے کا دعویٰ فرماتے ہوئے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے سخت تر کام نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ عربوں کی سی اجڈ اور پُر نفاق قوم کو خدائے واحد کی پرستش پر یکجا کرنا، مکارم اخلاق سکھانا اور تمام ساتھ دینے والے قبیعین کو بھائی بھائی بنا دینا، یہ آپ کا منشا تھا۔ متلاشیانِ حق دوڑ پڑے کہ چشمہٴ حیات کا پتا لگ گیا۔ غرض چند سال کی خفیہ اور پھر علانیہ کوشش اور تبلیغ سے دنیا کے چند اعلیٰ ترین دماغ مل گئے، جو آپ کی تعلیم کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تن من دھن سے اس کی توسیع پر آمادہ ہو گئے۔ زبردست ہم خیالوں کا پیدا کرنا آئندہ ہونے والے کام کی مضبوط بنیاد تھی۔

جب اس کا چرچا پھیلنا اور کچھ اہل مدینہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آنحضرت نے ان سے عہد لیا کہ ”اگر آپ کو مدینہ آنا پڑے، تو یہ لوگ پوری امداد دیں گے اور حفاظت کریں گے۔“

حریتِ خیال اور آزادیِ تبلیغ میں جب مزاحمت ہوئی، تو اس کی شدت کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور بظاہر یہ واقعہ حکومت کے قیام کی تحریک کا پہلا باعث ہوگا، یعنی دشمنوں کو شکست دے کر فاتحانہ وطن کو لوٹنا، ہر ایسے جبری تارکِ وطن کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ غرض جو بھی ہو، مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں قیام اختیار کیا گیا، جہاں سیکڑوں ہی قبیعین موجود تھے اور جن سے مدد کا معاہدہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کرنا قریش کی جانب سے عملاً ایک اعلانِ جنگ تھا۔ اس پر مستزاد انہوں نے اسلام کو تباہ کرنا اپنا قومی مقصد بنا لیا، جیسا کہ بعد کے حالات سے ثابت ہوتا ہے۔

آپ کی مخالفت جو اہل مکہ کر رہے تھے، اس پر بنو امیہ کا خاندان پیش پیش تھا۔ اور یہ مخالفت پشتینی تھی، کیونکہ عبد مناف کی زندگی میں ان کے فرزند اکبر عبد شمس کا انتقال ہو گیا تھا، اس لیے فرزندِ اصغر اور ان کے بعد ان کی اولاد نے سرداری حاصل کی، لیکن

عبد شمس کی اولاد کا دعویٰ باقی رہا اور ہاشم سے ان کا جھگڑا عبد مناف کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا۔ آخر عبد المطلب اور ابو طالب کی وفات پر بنو امیہ نے مکمل اقتدار حاصل کر لیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت گویا دوبارہ بنو امیہ کے لیے بنو ہاشم کی اطاعت پر مجبور ہونا تھا۔ چونکہ بنو امیہ اب قریش کے سردار تھے، اس لیے ان کا مخالفت پر تلنا گویا پورے اہل مکہ کا تلنا تھا۔



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ آتے ہی اس بات کی کوشش کی کہ اپنے تمام ساتھیوں میں اتحاد و اتفاق کی روح کو ترقی دیں۔ اس سے پہلے عربی قبائل میں باہم چشمک رہا کرتی تھی۔ خصوصاً اہل مکہ تو سب کو حقیر سمجھتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا کہ تمام اہل مکہ کا، جو مدینہ منورہ ترک وطن کر کے آئے ہوئے تھے، مسلمانانِ مدینہ کے ساتھ بھائی چارہ (عقدِ مواخات) کرادیا۔

یہ فقط برائے نام نہ تھا۔ یہ کارروائی اس جوش و خروش سے قبول کی گئی کہ اہل مدینہ نے اہل مکہ کو ہر چیز میں اپنا شریک بنا لیا۔ اپنی دولت کا آدھا حصہ انہیں دے دیا۔ ان میں سے کوئی مرتا تو اس کا ساتھی وارث بھی ٹھہرتا۔

اس سے متعدد فائدے ہوئے۔ بے گھر و بے بس اہل مکہ چین سے بس گئے۔ قبائلی تعصب اور علیحدگیوں کا ایک قلم خاتمہ ہو گیا اور تمام مسلمانوں میں بلا امتیاز رنگ و زبان اخوت اور امدادِ باہمی کی حقیقی روح کام کرنے لگی۔

لیکن پھر بھی جو بے الطمینانی اور خوف و دہشت پھیلی ہوئی تھی، اس کا کسی قدر اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مسلمان مسلح سر بکف ہوتے تھے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام موجودہ قوتوں کو نہ صرف ایک مرکز کے تحت قائم کر لیا بلکہ ان میں اعلیٰ درجے کا ضبط (ڈسپلن) اور مل کر کام کرنے اور اُبھرنے کا غیر مختتم جوش بھی پیدا کر دیا۔ عرب یوں بھی ایک جنگجو قوم تھی، اب ان کی قابلیتوں کو ابھار کر ان سے بہتر فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی آس پاس کی اجنبی قوتوں سے (یہودی و دیگر عرب قبائل سے) معاہدے کرنے شروع کر دیے ۱۲۔ ان معاہدوں کا مقصد یہ تھا کہ قریش کے منصوبوں کے خلاف حلیف پیدا کر کے قومی حفاظت کا مقصد حاصل کیا جائے۔ چنانچہ یہودیوں کے معاہدے کا متن یہ تھا:

۱۔ ”خون بہا اور مذہب کا جو طریقہ پہلے سے قائم چلا آتا ہے، اب بھی قائم رہے گا۔“

۲۔ ”یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔“

۳۔ ”یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔“

۴۔ ”یہود یا مسلمان کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔“

۵۔ ”کوئی فریق قریش کو امداد نہ دے گا۔“ (شبلی نے امداد کی جگہ امان لکھا ہے)

۶۔ ”مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا، تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔“

۷۔ ”کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا، تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا۔ لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔“

بنی ضمہ کے معاہدے کے یہ الفاظ تھے:

”یہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تحریر ہے بنو ضمہ کے لیے۔“

ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا، اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلے میں لڑیں اور پیغمبر خدا ان کو مدد کے لیے بلائیں گے، تو یہ مدد کو آئیں گے۔“

اسی زمانے میں عید رمضان کے دن فطرہ یعنی غلہ خیرات کرنے کا حکم ہوا جس پر آئندہ بحث ہوگی۔

ان انتظامات کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقصد و فرض یعنی تبلیغ اسلام کا کام بھی برابر جاری رہا اور روز بروز حلقہ بگوشوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اہل مکہ کو کچھ تو اس بات کی جلن تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ سے صحیح سلامت نکل گئے تھے اور اس سے زیادہ یہ خوف تھا کہ آپ کی روز افزوں طاقت کسی نہ کسی دن مکہ معظمہ پر حملے کا باعث ہوگی۔ اس لیے سردار ان قریش مخالفت کا سامان کرنے لگے۔ ادھر سے بھی کوئی غفلت نہیں برتی گئی۔ تجسس اور خبر رسانی کا کافی انتظام کیا گیا۔ پتا چلا کہ مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا ہے، جس کے سردار طے کر چکے تھے کہ جملہ منافع ”خلاف مسلمانانِ مہم“ کی سربراہی کے لیے مخصوص کر دیا جائے گا۔ وجہ کافی تھی۔ اس کو روکنے کی کوشش کی گئی مگر اسلامی دستہ دیر سے پہنچا۔ اس سے مکہ اور مدینہ کے سیاسی تعلقات کی فضا اور بھی مکدر ہو گئی۔ دو ایک چھوٹی مقامی جھڑپیں رہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کو برابر ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب مسلمانوں کے ایک خبر رساں دستے نے لوٹ مار کی اور دو ایک آدمیوں کو مار ڈالا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے۔

آخر جب شام سے قریش کا مذکورہ بالا تجارتی قافلہ واپس ہونے لگا (جس کا نفع مسلمانوں کے خلاف مہم کی تیاریوں میں صرف کیا جانے والا تھا) تو خطرے کے احساس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے چل پڑے اور چاہا کہ اسے روک لیں۔ قافلے کی مدد کو مکے سے کمک پہنچ گئی۔ قافلہ راستہ کترا کر نکل گیا، لیکن اس کی مدد کے لیے جو فوج آئی تھی، اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں سے مذہبیڑ ہو گئی۔

باوجود ایک اور تین کے تناسب کے اعلیٰ تر حربی انتظام اور فوجی ضبط کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاندار فتح ہوئی ۱۳۔ اہل مکہ شکست کا بدلہ لینے کے لیے بے چین ہو گئے۔ جلدی ہی وہ مدینہ منورہ چڑھ دوڑے۔ وہاں بھی خبر لگ گئی تھی اور گو اس مقابلے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی، ۱۳، لیکن مکہ والے اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان کے لیے فتح و شکست برابر ہی۔

اس عرصے میں حلیف یہودیوں کی بدعہدی ناقابل برداشت ہو گئی اور ان کی اچھی طرح سرکوبی کی گئی ۱۳، مگر اس کے بعد ایک خطرناک ترین دور شروع ہوا۔ شکست خوردہ یہودیوں نے قریش کے ساتھ اتحاد کر لیا اور ایک انتہائی آخری کوشش مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے شروع ہوئی۔ اس واقعہ کو جنگ احزاب یا جنگ خندق کہتے ہیں۔ اس کی شدت کا خود قرآن شاہد ہے ۱۳۔ مگر اب کی بھی برتر فوجی قوت اور سیاست دانی سے حریفوں کو محاصرہ اٹھا کر واپسی پر مجبور کر دیا گیا ۱۳۔ اور مدینہ منورہ سے غدار یہودی عنصر کو بھی اس کے بعد ہی خارج کر دیا گیا۔ ۱۳

مگر یہودیوں کا غرور اور ان کی قوت پوری طرح نہ ٹوٹی تھی اور وہ خیبر کی نوآبادی میں آمادہ جنگ ہو رہے تھے۔ اس لیے ایک طرف تو ان کی قوت کا قطعی طور پر استیصال کر دیا گیا ۱۲ اور دوسری طرف صلح حدیبیہ میں قریش سے ایک معاہدہ امن ہو گیا۔ ۲ لیکن چند روز میں ادھر سے بدعہدی ہوئی تو ادھر سے ایک لشکر جرار نے جا کر مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا۔ خالم مگر بے بس حریفوں کو عام معافی دے دی گئی اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر تھا کہ فاتح لشکر نے (جسے کبھی دیس سے ٹکنا اور انتہائی تکالیف و آلام برداشت کرنا پڑا تھا) اپنے سابقہ دشمنوں کے قصوروں کو یک لخت نسیا منیا کر دیا ۱۳ اس کی نظیر سے ہمارے علم میں تاریخ عالم تہی مایہ ہے۔

مکہ معظمہ کی فتح حکومت عرب کے بنیادی استحکام کا آخری مرحلہ تھا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں طوعاً و کرہاً ۱۵ عربوں کو مرکزی حکومت کا فرمانبردار بننا پڑا۔ ہر طرف سے اطاعت کے وفود آنے لگے اور مرکزی حکومت کی جانب سے ہر جگہ ٹیکس یا مالگوار (زکوٰۃ) وصول کرنے والے اور مذہبی و سیاسی فرائض انجام دینے والے افسر

مقرر کیے جانے لگے۔ ۱۶ اور آپؐ کے تدبیر و انتظام کا نتیجہ تھا کہ عرب جیسے ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدار جزیرہ عرب پر پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے صلح حدیبیہ کے دوران میں اپنی عالمگیر تعلیم سے دنیا کو مستفید کرنے کے لیے آپؐ نے سفارتیں روانہ فرمائیں ۱۲۔ اور بین الاقوامی (یا صحیح تر اصطلاح میں بین الممالک) تعلقات کی بنا پڑی۔

اجنبی استعمار پر حملہ :

عربی سلطنت پر اب اجنبی استعمار کی نظریں پڑنے لگیں۔ یہ تصادم ناگزیر تھا۔ اس کی نمایاں صورت جبکہ تبوک و موتہ میں ظاہر ہوتی ہے، جس کے ذریعے عرب کی آئندہ سیاست معین ہو گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دقت ایک اور زبردست مہم کشور کشائی کے لیے فلسطین روانہ ہونے ہی کوٹھی۔ ۱۳

حقوق شہریت کا منشور اعظم :

حیۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبے دیے، وہ تاریخ تمدن میں نہایت اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں تفصیل سے رعایا کے حقوق و فرائض کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تفصیل سیرت شہلی، تاریخ ذہبی، ابن ہشام وغیرہ میں ملے گی۔ مختصراً تمام جاہلیت کے دستور پامال ہیں۔ سب انسان برابر ہیں، عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں۔ فقط پرہیزگاری وجہ کرامت ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہو، غلاموں کو وہی کھلاؤ، جو خود کھاؤ، وہی پہناؤ جو خود پہنو۔ موروثی جاہلانہ انتقام باطل ہیں۔ جاہلیت کے سود لگو ہیں۔ عورتوں سے برتاؤ میں خدا سے ڈرو۔ تمہارا ان (عورتوں) پر ان کا تم پر حق ہے۔ ہر شخص کا جان و مال و آبرو محفوظ ہے۔ ضابطہ قرآنی کو ملحوظ رکھ کر گمراہ نہ ہو گے۔ حقوق ترکہ و میراث متعین ہو گئے۔ وارث کے لیے (مزید) وصیت نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے، زانی کے لیے پتھر ہیں، جو بچہ اپنے ماں باپ کے سوا غیر اور جو غلام

اپنے مالک کے سوا دوسرے کا ہونے کا دعویٰ کرے، اس پر خدا کی لعنت ہے۔ عورت اپنے ”شوہر کے مال“ سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ نہ دے۔ قرض ادا کیا جائے۔ عاریت واپس کی جائے۔ عطیے کا بدلہ دیا جائے۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔ باہم خونریزی نہ کرو۔ ہر شخص اپنے فضل کا ذمہ دار ہے۔ بیٹا باپ کا، باپ بیٹے کا جوابدہ نہیں، اپنے امیر کی اطاعت کرو، چاہے وہ کلفا جیٹی ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کی عبادت کرو، پانچ وقت نماز پڑھو، مہینا بھر کے روزے رکھو۔ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ جنت میں جاؤ گے۔

اسی زمانے میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: ”آج تمہارا دین مکمل ہو گیا“

حکومت کے ارادے:

حکومت اگر باقی نہ رہ سکے، تو اس کے حصول سے کیا فائدہ۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کس طرح اوامر الہیہ کے تحت عدالت و صداقت کے ذریعے قائم فرمائی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کی استواری و پائیداری کے متعلق کیا ارادے قائم کیے گئے۔ اس بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

استقرار سے پتا چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ”دنیا و آخرت“ دونوں کی بھلائی پر مشتمل ہے اور اس کے ذرائع (۱) علم (۲) جسم (۳) اخلاق قرار دیے گئے ہیں۔ علم سے مراد اپنے حقوق و فرائض کا علم ہے، یعنی ہر چیز تو (لفظ میری نہیں) ہماری ہے لیکن ہم (اور ہیں بھی) خدا کے۔

چنانچہ اسلام کے ارکان (ایمان کے بعد) پانچ ہیں: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد۔ ان میں آخر الذکر فرض کفایہ ہے یعنی اگر کافی تعداد اس میں حصہ لے، تو باقی سے ساقط ہو جاتا ہے۔ باقی چار فرض عین ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اس دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ دین و دنیا کی بھلائی ان سے حاصل ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمومی فرائض ہر مسلمان پر واجب ہیں۔ ان کے علاوہ جو خصوصی فرائض حاکم وقت کے ہیں، وہ

علیحدہ بیان ہوں گے۔

چونکہ ایک حکومت کے لیے افراد رعایا کے غالب حصے کا متحد ہونا ضروری ہے، اس لیے اس اتحاد کی روح کو ابھارنے کا لحاظ ہر حکم میں شامل رہا اور مذہبی احکام میں بھی اسی چیز کی آبیاری کی گئی۔ چنانچہ عمومی فرائض سے (سوائے بچوں اور دیوانوں کے جو مرفوع القلم طبقہ ہے) کوئی مستثنیٰ نہیں۔ راعی، بادشاہ، اور ادنیٰ مزدور سب کو ایک ہی قسم کے فرض کی ادائیگی کا حکم دیا گیا۔ ہر روز پانچ مرتبہ محلے والوں کو، ہر ہفتے شہر والوں کو اور ہر سال دو مرتبہ شہر و مضافات کے باشندوں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ ایک حربیاتی نے غالباً صحیح لکھا ہے کہ اسلامی نماز ایک طرح کی فوجی پریڈ اور عسکری تربیت ہے۔ صف بندی قائد (امام) کے احکام پر متفقہ حرکت، وقت کی پابندی، صفائی و طہارت، صبح تڑکے اٹھنے کی عادت یہ سب نماز کے جز ہیں۔ ایک حدیث میں (غالباً ابوداؤد میں) ہے کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کو نکلتے تو بلندی پر چڑھتے وقت اللہ اکبر کہتے، نشیب آتا تو سبحان اللہ فرماتے۔ اسی پر نماز کے قیام و قعود اور رکوع و سجود کے اور اقرار کیے گئے“۔ نماز ایک ورزش اور کسرت بھی ہے، کیوں نہ ہو عماد الدین یعنی دین کا ستون ہے۔ جنگی ضروریات میں سفر کی عادت بہت ضروری ہے۔ حج اسی کا موقع بہم پہنچاتا ہے اس میں ہر سال مکہ معظمہ میں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ یہ عالمگیر اخوت اور انسانی برادری (یا دوسرے الفاظ میں تمام رعایا کی یگانگی) کی یاد تازہ کرنے کا بھی بہترین وسیلہ ہے۔ جملہ صوبہ جات مملکت اور اقطاع عالم کے مسلمانوں کی ایک سالانہ موثر بھی ہے۔ خلیفہ اسلام کا ایک دربار عام بھی ہے، جس میں ہر حصے کی بہترین نمائندگی کی گئی ہے۔ زکوٰۃ کو لیجیے۔ حکومت بغیر مالیے کے عضو معطل ہے۔ زکوٰۃ اور عشر زراعت حکومت اسلامیہ ہی نہیں، ہر حکومت کے لیے لابدی اور ضروری ہیں۔ مگر تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت کی آمدنی کو بادشاہ کے صرف خاص کی جگہ ملکیت عامہ (Public Property) قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا مصرف یوں معین کیا گیا کہ صدقات (یعنی زکوٰۃ، عشر، خمس، غنیمت وغیرہ) فقراء و مساکین کی امداد، عہدہ داران متعلقہ کی تنخواہ، غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کو قرض سے نجات دلانے اور فی سبیل اللہ یعنی فوجی تیاری،

رفاہ عام، سڑکوں، پلوں کی تعمیر وغیرہ میں اور راہگزاروں کی امداد میں صرف ہوں بلکہ انفرادیت و اجتماعیت کا مین بین، محنت اور سرمائے اور زمین کی اصلاح، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا بہترین محافظ، ملک سے افلاس کو دور کرنے اور معاشی حالت کو سدھارنے کا علاج اگر کوئی اسلامی ادارہ کرتا ہے، تو یہی ادارہ زکوٰۃ و صدقات ہے اور برٹارڈ شا کے الفاظ میں اس سے بہتر کوئی امر ممکن نہیں۔ ۴۰

جہاں دنیاوی کاروبار کی تکمیل کے بہت سے ادارے قائم کیے گئے اور رہبانیت کو مردود ٹھہرایا گیا، وہیں متعدد احادیث و آیات کے ذریعہ خیرات کی انتہائی تاکید کر کے روحانی و مادی جذبات میں توازن قائم کیا گیا اور ”فصل الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة“ ”دین و دنیا کی بھلائی“ عام طور پر ہر فرد کا مح نظر قرار دیا گیا اور اسی سلسلے میں ہر سال مہینا بھر روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، جس میں خود ضبطی، ایثار، امیروں اور مفلسوں میں یکسانیت غرض بہت سے مصالح پوشیدہ ہیں اور یہ سب امور شہریت کی تربیت کے لیے واجب قرار دیے گئے۔

فرائض و مقاصد حکومت کی انجام دہی:

جدید اصول قانون میں حکومت کے اعلیٰ ترین فرائض صرف دو قرار دیے ہیں: جنگ اور عدل گستری۔ یہ دونوں دراصل حفاظتِ حقوق ہی کے دو ذریعے ہیں، جنگ غیر عدالتی ذریعہ ہے اور عدل گستری عدالتی۔ جنگ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی خدمات ہر مسلمان پر اسی طرح لازم کر دیے جس طرح اب بھی CONSCRIPTION کے نام سے اکثر یورپی ممالک میں ہے۔ حسب معمول طبیعت میں راسخ کر دینے کے لیے اسے بھی مذہبی رنگ دے دیا گیا، ورنہ جنگی تیاریوں کے لیے قوم کو عام رغبت ۴۰ دلانا کوئی آزاد و مختار قوم بے جا نہیں ٹھہرا سکتی۔ الفاروق میں شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عام جبری فوجی خدمت کا طریقہ نہ تھا۔ اس کی ابتداء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی۔ اس کا مزید تذکرہ آگے آئے گا۔ یہ یاد رہے کہ تبدیل مذہب کے لیے جنگ یا جبر کرنا اسلام میں جائز نہیں، لیکن حکومت الہیہ (سلطنتِ اسلامیہ) کے

قیام کو مذہب سے (اس کے محدود معنوں میں) کوئی تعلق نہیں۔

حکومت کا دوسرا بڑا فریضہ عدل گستری ہے تاکہ ”امن“ انتظام اور تمدن کا دور دورہ ہو اور خوشحالی اور ترقی کا زمانہ آئے۔ عدل گستری کے معنی یہ ہیں کہ ”جماعت، قوم اور اس کے افراد کے صحیح حقوق کی نگہداشت“۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدالت کا جو مستحکم اور ترقی یافتہ ادارہ قائم کیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر و غریب سب کا قانون ایک رکھا گیا، جس کے اصول غیر متبدل تھے۔ قاضی وقت کے روبرو خود بادشاہ اسلام پر مقدمہ دائر ہو سکتا تھا۔ تاریخ یہ واقعہ محفوظ رکھتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری عمر میں مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ جس کسی کا آپ پر حق ہو، وہ طلب کرے اور جس کسی کو آپ سے تکلیف پہنچی ہو، وہ انتقام لے۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کا مطالبہ کیا جس کی آپ نے فوری ادائیگی فرمائی۔ شاید حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا اپنے دور خلافت میں قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنا، یہاں ایک تذکرہ بے محل ہوگا، یہاں صرف اسلامی عدلیہ کے خدوخال بیان کرنے ہیں کہ وہ عاملہ یا ستفیدیت سے مکمل اور قطعاً آزاد تھا۔ یہاں تک کہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہونے سے بادشاہ اسلام بھی نہیں روک سکتا تاوقتیکہ قاضی کا فیصلہ شرع و قانون کے صریح خلاف نہ ہو۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

”خدا تم کو عدل کرنے کا حکم دیتا ہے۔“

نیز ”اور جب تم لوگوں میں فصلی مقدمات کرو، تو عدل سے فیصلہ کرو۔“

ایسی احادیث بے شمار ہیں، جن میں عدل و انصاف کی تاکید اور ظلم و ستم پر دھمکی وارد ہے۔ غرض اسلام میں امیر و غریب، آقا و غلام، مسلم و غیر مسلم سب عدالتی نقطہ نظر سے برابر کے حقوق اور وجوہات رکھتے ہیں۔

جس حکومت میں حقوق کی حفاظت اور انصاف ہو اور وہاں کی رعایا کے کلیات خمس ۲۲ (یعنی دین، عقل، نفس، نسب، مال) کی آزادانہ اور مکمل نگہداشت ہو، تو ان کی وفاداری اور امداد میں کیا شبہہ رہتا ہے؟ عدلیہ کے لازمی جزو ”شرع اور تشریع“

(قانون و قانون سازی) ہیں۔ اسلامی قانون ”شخص قانون“ ہے، یعنی مسلمان جہاں بھی ہو اسی کا پابند ہے۔ سائنڈ ”اصول قانون“ میں لکھتا ہے کہ:

”مقامی قانون روز بروز بے وقعت بنتا اور کم ہوتا جا رہا ہے اور شخص قانون بڑھتا جاتا ہے۔“

قانون کے استحکام اور تبدیل پذیری کے متعلق ابھی تک بڑی بحث ہے۔ سائنڈ کی رائے یہ ہے کہ قانون کا کچھ اصولی حصہ غیر تبدیل پذیر ہونا چاہیے جس سے ذیلی قواعد حسب ضرورت بنائے اور بدلے جاسکیں تاکہ قانون ضروریاتِ زمانہ کا ساتھ دے کر تمدن کی ترقی میں معاون ہو نہ کہ خارج اسلامی قانون۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کا قانون مقرر فرمایا۔ قرآن مجید میں غیر متبدل اصولی احکام ہیں احادیث میں قطعی اور متواتر بہت ہی کم ہیں۔ اس لیے کتاب و سنت سے مسائل قیاس و اجتہاد کی پوری اجازت دی گئی۔ مگر واضح رہے کہ متعدد قوانین و ضوابط کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں تدوین ہو چکی تھی، چنانچہ تعزیرات، ٹارٹ (ہرجے اور دیتیں) تحریری صورت پا چکی تھیں ۲۳۔ انہی چیزوں کو بعد میں ترقی دی گئی اور اس میں استنباطی ترقی کی پوری اجازت دی گئی۔ اسلامی ضابطہ قانون و تشریع کی ابتداء اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جس میں معاذ ابن جبلؓ کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ وہ بطور قاضی کس طرح فیصلے صادر کریں گے، تو انہوں نے کہا کہ قرآن کے مطابق اور اگر اس میں نہ ہو، تو سنتِ نبویؐ کے موافق اور اس میں بھی پتا نہ چلے تو ”اجتہاد برائی“ یعنی میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صحیح قرار دیا اور ان کی تعریف کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آپؐ کی امت میں ایسے صائب دماغ پیدا ہوئے ہیں (ترمذی)۔ ظاہر ہے کہ مختلف حکام عدالت کا اجتہاد مختلف ہوگا اور ایک مسئلے کے متعلق متضاد احکام بھی ہو سکیں گے اور غالباً اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اختلاف أمتی رحمة

(یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔)

اور الدین یسیر۔ دین آسان چیز ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون میں ہر ملک اور ہر زمانے میں کارآمد ہونے کی صلاحیت ہے اور مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے ہر زمانے کا ساتھ دے سکے کے متعلق یہ صریح خوشخبری بھی دی ہے کہ ہر سو برس کے بعد ایک مجدد پیدا ہوگا، جو اس امت کے دین کی تجدید کرے گا ۲۴ اور واقعہ ایسا ہوتا رہا ہے۔

مزید برآں قانون کا تبدل پذیر ہونا گونظرے کی حد تک اچھا ہو، لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ عملاً قانون اسلامی کے اصول میں کسی ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہی اب تک نہیں پائی گئی بلکہ دنیا اسی کی طرف کھینچی چلی آرہی ہے ۲۵، اور مسئلہ توریث، ازدواج و طلاق اور ترک مسکرات میں خاص کر یورپ و امریکہ کا میلان طبع قائل ذکر ہے۔

قانون اور انصاف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی ترقی دی تھی اور یہ امر کہ جواب دہ صرف خاطی اور مجرم ہی ہو، سب سے پہلے توریث میں اس کا حکم ہوا ۲۶۔ قدیم تر زمانے میں ملزم کے اہل خاندان بلکہ اہل قوم بھی جواب دہ ہوتے تھے۔ اسلام نے ایک اور زبردست نظریہ قانون میں پیدا کر کے کروڑوں بے گناہوں کو محفوظ کر دیا اور وہ نیت کا مسئلہ تھا۔ حدیث کی کتابوں میں سب سے مشہور حدیث یہی مروی ہوتی ہے کہ:

”أَنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ“

یعنی کام نیت کے مطابق ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقف، توریث، طلاق وغیرہ متعدد نئی چیزوں کو قانونی حیثیت عطا فرمائی اور ”جائیداد“ یا ”دولت“ کے متعلق ایسا انتظام فرمایا کہ دولت کی تقسیم میں توازن ہو، لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (تاکہ مال مالداروں ہی میں نہ پھرتا رہے) زکوٰۃ، مالگذاری، توریث، تحدید وصیت اس کے خاص اجزاء ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فصل مقدمات کا نہ صرف مستقل اور باقاعدہ انتظام فرمایا تھا اور نہ صرف قاضیوں کے تقرر اور ان کے لیے شہادت و قضا کے دستور العمل مرتب کیے گئے تھے، بلکہ ساتھ ہی افتاء (یعنی پبلک کو قانونی احکام دریافت کرنے پر مستند معلومات بہم پہنچانا) اور اصلاح بین الناس (یعنی بیرون عدالت جھگڑے رفع

کرنے) کے انتظامات شروع فرمائے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ - شبلی)

عدالتوں کے ساتھ سزا دہندہ عملہ (جلاد وغیرہ) اور پولیس اور احتساب یعنی تجارتی و غیر تجارتی ہر قسم کے کاروبار کی نگرانی اور انسپکشن کی طرح بھی پڑ چکی تھی۔ (ایضاً) اسی سلسلے میں قانون شہریت اور رعایا کے باہمی برتاؤ پر روشنی ڈالنی چاہیے، جو حکومت کے استحکام میں بہت اہم حصہ رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایا میں مسلمان اور ذمی (امان دادہ غیر مسلم) دو حصے قرار دیے۔ حفاظت حقوق کی حد تک سب برابر تھے۔ البتہ مسلمانوں پر جنگی خدمات فرض تھیں اور ذمیوں کو اس سے نیز دیگر بہت سے مسائل سے مستثنیٰ کیا گیا۔ صرف ان سے ایک حفاظتی ٹیکس لیا جاتا تھا، اسے جزیہ کہتے تھے۔ مسلمان رعایا کو اپنی قومیت کی فلاح و بقا کے لیے یہ تعلیم دی گئی کہ ”غیروں پر سخت اور باہم رقیق القلب“ نیز مومنوں پر نرم اور غیروں پر سخت ۲۷۔ سیاسیات کے اس عام اصول پر مزید بحث ضروری ہے۔ اسلام چونکہ محض خدا کا بول بالا کرنے کے لیے آیا تھا، اس لیے اکثر فقہاء کا یہ خیال ہے کہ صرف خدا کے قائل یعنی اہل کتاب کو اسلامی عملداری میں جزیہ دے کر رہنے کی اجازت ہے (مثلاً یہود، نصاریٰ، مجوس) بُت پرستوں کو اجازت سکونت نہیں۔ مگر اس پر عملدرآمد عرب کے باہر کبھی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں تک کو مشابہ اہل کتاب قرار دے لیا گیا۔

رعایا کے فرائض ”امداد، وفاداری و اطاعت حکومت ہیں“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت احتیاط سے نہ صرف اس کے احکام اور ترغیبات دیے بلکہ مسلمانوں کا ماحول ہی ایسا پیدا کر دیا کہ جس میں خود بخود ان فرائض کی تعمیل پر ابھارنے والے جذبات کی آبیاری ہوتی ہے ۲۸، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ جو ارکان مذہب ہیں۔ اس سے عملاً خود بخود امداد، وفاداری اور اطاعت کی تربیت ہوتی ہے۔ نیز ایک جگہ قرآن میں ہے: ”اور نزاع نہ کرو ورنہ فٹل پیدا ہو جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ۲۹۔ اسکی فوجی اور ملکی یعنی سول ضبط یا ”ڈسپلن“ میں جیسی اہمیت ہے ظاہر ہے، ان کے علاوہ تمدنی فرائض بھی ہیں مثلاً حلال و حرام غذا میں، درست و غلط معاملات وغیرہ۔ ان کی

تفصیل یہاں بے محل ہے، صرف اتنا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ ان کی سائنٹیفک تقسیم کی گئی ہے یعنی حلال و حرام، مکروہ و مستحب اور مباح اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ انسان ملکی قانون سے زیادہ مذہبی اور ضمیری قانون کی تعمیل کرتا ہے۔ اس لیے فرائض شہریت کو مذہبی رنگ دے کر ذہنیت میں رچا دیا گیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی تعمیل حسبِ دلخواہ ہوئی، ورنہ امریکہ کا صرف قانوناً شراب حرام کر دینا عملاً بے اثر ثابت ہوا ہے۔ اسلام میں جس طرح شراب بند کی گئی، اس نظریہ سے امریکہ اور دنیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی حال ہر قسم کی اصلاحات کا ہے، جس میں تدریج اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

حکومت کے لیے دستور لازمی چیز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ”منتخبہ ذمہ دارملوکیت“ "ELECTED RESPONSIBLE MONARCHY" قائم فرمائی، جو ایک بالکل نیا لیکن مسلمہ طور سے بہترین نظریہ ہے کیونکہ موروثی کی جگہ منتخب ہونے سے بہترین صلاحیت و قابلیت کا فرد حاکم اعلیٰ بنے گا۔ اسی طرح ہر فرد رعایا کے روبرو بالراست ہو یا بالواسطہ جوابدہ ہونے کے فوائد ظاہر ہیں۔ ملوکیت بالاتفاق اس طرز حکومت پر بہ لحاظ افادہ مرئج ہے جو ایک جماعت پر مشتمل ہو، مگر شرط یہ ہے کہ فرد مستبد ”بہی خواہ و بے غرض ہو“۔ ذمہ دار شاہی جو مشورہ لینے کی پابند ہو، وہ پروفیسر لاسکی کے الفاظ میں اس مقصد کو بہترین طور سے پورا کرتی ہے اس۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ عالمگیر حکومت قائم کرنی چاہتے تھے، اس لیے ایک زبان بولنے یا ایک ملک میں رہنے یا ایک قوم سے ہونے کو عقبی حصے میں ڈال دیا اور ہر رنگ اور ہر ملک کے مسلمانوں میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی یا نسلی یا لسانی یا ملکی رشتوں سے کہیں مستحکم اور دیرپا تھا اور بتایا گیا کہ یہی جلِ اللہ ہے، اسی کو تھاے رہنے میں مسلمانوں کی فلاح و بقا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے (شرعی) قانون اور خارجہ سیاست کے، جو مرکزی حکومت سے متعلق تھے اور امور میں بڑی حد تک صوبہ داری خود مختاری رکھی اور عامل یعنی گورنر کی ذات (جو بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں فرائض کی کثرت کے باعث عامل، قاضی، تحصیلدار مال تین افراد میں منقسم ہو گئی) صوبے میں

بالکل خود مختار تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیابت اور منصری کا طریقہ بھی ڈال دیا تھا۔ جب کبھی آپ مستقر سے باہر جاتے، کسی کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ جاتے، تاکہ کاروبار عادی میں ابتری نہ پیدا ہو۔ مختلف انتظامی ادارے مثلاً خفیہ پولیس کا انتظام بھی قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ فتح مکہ سے قبل حضرت عباسؓ مکہ معظمہ میں خفیہ پرچہ نویس مقرر تھے ۱۵ دیگر اداروں کی بھی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں اوپر متعدد صیغوں کا تذکرہ ہو چکا ہے، جن میں سے عدالت، احتساب، پولیس، افتاء وغیرہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ان کے سوا تبلیغ، تعلیم، سول و ملٹری سروس اور قوانین منضبطہ متعلقہ معاملات وغیرہ، فوج، صیغہ خارجہ (دارالانشا وغیرہ) اور صیغہ داخلہ (مہمانداری، عدالت، احتساب وغیرہ) اور صیغہ مالیہ کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔

تبلیغ و تعلیم:

اسلام کے سب سے مقدم ادارے رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی مذہبی اور عام تعلیم کے لیے خاص ذرائع اختیار فرمائے۔ چنانچہ علاوہ ترغیب و تشویق کے خود معلم جا بجا بھجوائے۔ تعلیم یافتہ جنگی قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ (تشویق کے سلسلے میں اطلبوا العلم ولو کان بالصحین، طلب العلم فريضة على كل مسلم و مسلمة، والذين اوتوا العلم درجات، فلولوا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين وغیرہ قابل ذکر ہیں)۔

غیر مسلموں میں تبلیغ کے وسیع انتظامات مستقل طور سے قائم فرمائے۔ چنانچہ سرکاری آمدنی کی ایک اہم مدد اس کے لیے مختص تھی۔ وقت بے وقت جو غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی، اس سے بھی تالیف قلبی کی جاتی تھی۔ بے شبہ جبری اسلام پر کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا گیا اور نہ قرآن اس کی اجازت دیتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا کہ ہر شخص تبلیغ دین کرے اور اعلائے کلمۃ اللہ میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کرے۔ اس

کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عرب کے مختلف حصوں اور مصر و شام وغیرہ بلکہ کہتے ہیں کہ دُور دراز ممالک مثلاً چین وغیرہ تک بھی تبلیغ کے لیے خاص خاص صحابہ کو روانہ فرمایا۔

مساجد مسلمانوں کی بزم گاہیں ہیں اور ان کی ہر قسم کی دینی و دنیوی سرگرمیوں کا مرکز اور جزو غیر منفک۔ ان کی تعمیر و ترمیم، ائمہ و مؤذنین کے تقرر وغیرہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی اور خاص احکام دیے۔

سول سروس:

ان سب کے ساتھ سول سروس کا ادارہ بھی قائم ہو گیا۔ جہاں گورنروں، قاضیوں، اماموں، مبلغوں، معلموں وغیرہ کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی اور ان کا امتحان لیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کا کسی عہدے پر تقرر ہوتا تھا، انہیں زبانی اور تحریری دستور العمل اور ہدایات دیے جاتے تھے۔ عہدیداران مال کو ہر قسم کے مد اخل (زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ وغیرہ) کی شرحیں تحریری طور پر لکھ کر دی جاتی تھیں۔ مخارج کا بھی ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ چنانچہ ایک رجسٹر میں سرکاری وظیفہ یا تنخواہ پانے والوں کے نام تحریر تھے۔ مجرد و متاہل کی شرح میں ایک و دو کا تناسب تھا۔ بند و بست و مالگزاری کی طرح پڑ چکی تھی اور جاگیرات نو آبادی بسانے کے لیے ملنے لگے تھے۔ اس میں اصول یہ تھا کہ چشمے وغیرہ مفاد عامہ کی چیزیں شخصی ملک نہ ہو جائیں (شبلی صفحہ ۲)۔ قاضیوں کو خاص کرفوج داری (تعزیری) اور دیوانی ضابطے مہیا کیے جاتے تھے اور نارٹ (ہر جے اور دیت) کے متعلق معلومات بہم پہنچائے جاتے تھے۔ جن امور میں متضرر قصاص معاف کر دے، وہاں متضرر کو کیا معاوضہ دلایا جائے، معاملات و معاہدات (خرید و فروخت، سود وغیرہ) اور سماجی تعلقات (مثلاً نکاح، طلاق وغیرہ) کے متعلق بھی آپ نے اصولی طور سے قوانین و قواعد مرتب فرما دیے تھے جن کی ضروری تفصیل و تشریح و ترمیم بھی وقت بوقت ہوتی گئی۔ ان تمام کی تدوین مسلمانوں نے بعد میں مکمل کی۔

فوج:

حکومت کی بقا اور ترقی کے لیے فوج ناگزیر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام فوجی تعلیم اور مستعدی اور تیار باشی کے زبردست احکام دیے۔ وقت بوقت تیر اندازی، گھوڑ دوڑ، نیزہ بازی وغیرہ میں حصہ لے کر شوق بڑھایا۔

سپہ سالاروں کو بھی آگاہ کیا جاتا تھا کہ غیر جانب داری، جنگ اور اس سے پہلے اور اسکے بعد کیا امور ملحوظ رہیں۔ مثلاً آداب سفر و قیام، مختلف طبقوں کی مختلف پلٹنیں، صف آرائی، دشمن کو پہلے اطاعت کی دعوت دینا، غیر جنگی عنصر کو قتل نہ کرنا، نہ زراعت و عمارات وغیرہ کو تباہ کرنا، تقسیم غنائم، تبادلہ قیدیوں، قیدیوں سے سلوک، زنجیوں کے لیے دوا خانے اور مقتولین سے برتاؤ وغیرہ وغیرہ۔

دارالانشاء:

میں فرامین و توقعات، معاہدے، مراسلتیں، احکام وغیرہ لکھائے جاتے تھے اور قرآن مجید مدون کرایا جاتا تھا (قرآن موجودہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پوری طرح مدون ہو چکا تھا۔ تاریخ القرآن۔ پروفیسر مفتی عبداللطیف جامعہ عثمانیہ) سیغہ داخلہ:

مہبانداری، مریضوں کی عیادت پر توجہ کی جاتی تھی۔ عدالت و قانون و خفیہ پولیس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہ ہے حکومت اسلامیہ کے قیام اور اس کی تنظیم و تشکیل کا خلاصہ۔

حوالے

- ۱۔ شبلی۔ سیرۃ النبیؐ جلد اول NOLKE DAS LEBAN MUHAMMAD سد یوکی (فرنجی تاریخ عرب باب ۸)
- ۲۔ ابن ہشام نیز صبح الأعشی قلعندی

۳ عرب اور ایران کی مشہور جنگ، جو عین زمانہ ولادت نبوی میں ”ذی قار“ نامی چشمے کے کنارے ہوئی اور جس میں عرب کامیاب رہے۔ دیکھئے سدیو
SEDILLOT کی کتاب YLISTORIC GENERALE DES ARABES, LEW EMPIRE, LEW
CIVILISATION اور ایام عرب مولفہ شروغیرہ۔

۴ شبلی وغیرہ
۵ عرب قبل اسلام، شام، ہند، چین وغیرہ سے تجارت کرتے تھے۔ مزید تفصیل
کے لیے دیکھیے تمدن عرب مترجمہ سید علی بگرامی اور مضمون حکیم شمس اللہ قادری
”تجارت العرب قبل الاسلام“ رسالہ دبدبہ آصفی بابت رجب و شعبان
۱۳۲۳ھ۔

۶ قرآن مجید: لتكون كلمة الله هي العليا

۷ ابن ہشام

۸ حدیث: بعثت لاتمم مكارم الاخلاق

۹ قرآن مجید: اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته

۱۰ اخوانا۔

۱۱ ابن ہشام

۱۲ تفسیر بیان القرآن از محمد علی۔ آیت: واولوا الارحام بعضهم اولى ببعض۔

۱۳ شبلی صفحہ ۸۱ ھ میں یہودیوں اور ۸۲ ھ میں بنی ضمرہ و بنی مدج وغیرہ

سے معاہدے ہوئے۔

۱۴ ابن ہشام

۱۵ قرآن مجید: اذجاؤكم من فوقكم ومن اسفل منكم واذ زاغت

الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون بالله الظنونا هنالك

ابتلى المومنون وزلزلوا زلزالاً شديداً۔ (۱۰:۳۳-۱۱)

۱۶ اشارہ ہے بت شکنی کی مہموں اور جنگ حنین وغیرہ کی طرف۔ تفصیل ہر سیرت کی

کتاب میں ملے گی۔

- ۱۶ فوائد بدریہ از ”قاضی الملک بدرالدولہ۔ شبلی وغیرہ۔
- ۱۷ قرآن مجید: انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفي الرقاب والغارمین وفي سبیل اللہ وابن السبیل۔
- ۱۸ مضمون انگلستان کا مذہب آئینہ صدی میں حسب بیان برنارڈ شا، بحوالہ رسالہ اشاعت الاسلام۔ لاہور
- ۱۹ سامنڈ کی کتاب ”JURISPRUDENCE“ حصہ اول
- ۲۰ قرآن مجید: (الف) ان اللہ اشتري من المؤمنین انفسہم واموالہم۔
- (ب) واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ۔
- (ج) لا تحسین الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا وغیرہ وغیرہ
- ۲۸ قرآن مجید: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول۔ الآیہ (۵۹:۴)
- ۲۹ قرآن مجید: ولا تنازعوا فتفسلوا وتذهب ریحکم۔ الآیہ
- ۳۰ حدیث: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔
- ۳۱ "THE NATION OF LEAVING THE GOVERNMENT OF THE STATE TO DECIDE AND COMPELLING IT ONLY TO CONSULT, SEEMS PREFERABLE"
- GRAMMAR OF POLITICS BY H. LASKI P.82 CH. SOVEREIGNTY.
- ایچ لاسکی کی کتاب گریمر آف پالیٹکس باب ساورینٹی یعنی اقتدار اعلیٰ:
- ”یہ خیال بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کو فیصلے کا اختیار دے دیں اور اسے صرف مشورے لینے پر مجبور کیا جائے.....“

(نقوش لاہور۔ رسول نمبر (۳) جنوری ۱۹۸۳ء)

عہدِ نبویؐ کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تاریخِ عالم میں ایک انقلابی نقطہ اور ایک عہدِ آفریں دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایران اور روم کی سلطنتیں دنیا پر چھا جانے کی کوشش میں باہم زندگی و موت کی آویزش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ اگرچہ چین اور ہند میں بھی متمدن قومیں حکمران تھیں لیکن بحرِ متوسط اس زمانے میں بھی نہ صرف جغرافیائی اعتبار سے بلکہ سیاسی و معاشی حیثیت سے ”وسط الارض“ (میدی ترانین) تھا۔ یونان اس سمندر پر آباد ہے، تو روم بھی، مصر و شام بھی اس کے ساحل پر ہیں، تو خود عرب کی شمالی سرحدیں اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ ایران بھی اپنے حدودِ مملکت اس تک پہنچانے کی کوشش میں تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے کئی بار کامیاب ہو چکا تھا۔ قدرت نے عرب کو ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تینوں براعظموں کے بیچوں بیچ پیدا کیا ہے اور اس عرب میں بھی مکہ آباد ساحلی علاقے کے وسط میں واقع ہے اور یہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ نافِ زمین پر آباد ہے اور پرانی دنیا کی کوئی عالمگیر تحریک اس سے بہتر مرکزِ مشکل سے پاسکتی ہے۔ یورپ کی سردیوں، افریقہ کی گرمیوں اور ایشیا کی سرسبزیوں میں سے ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ حجاز کو عطا ہوا ہے اور اس امر نے وہاں والوں کو تینوں براعظموں کی اخلاقی خوبیاں عطا کر دی تھیں۔ جنگی نقطہ نظر سے بھی اس سے محفوظ مقام کم

مل سکتے ہیں۔ ۱۳ ق، ۶۱۰ء میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آبائی شہر مکہ میں اصلاح دین کی کوشش شروع فرمائی۔ اور معدودے چند لوگوں کے ہم خیال ہونے کے ساتھ ساتھ عام اہل ملک کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر تیرہ کھن سالوں کے اختتام پر ۱۱ھ، ۶۲۲ء میں آپؐ کو وطن سے بے وطن ہو کر مدینہ منورہ جا رہنا پڑا۔ جیسا کہ معلوم ہے، نراج میں آپؐ نے ایک تنظیم پیدا کرنے اور ایک شہری مملکت کے قائم کرنے میں کامیابی حاصل فرمائی۔ جس کا تحریری دستور تاریخ نے آج تک (۵۲) دفعات کی ایک دستاویز کی صورت میں محفوظ رکھا ہے۔ ۱۔ مدینہ آنے کے چند ہی مہینوں بعد آپؐ اس پاس کے قبائلی علاقوں کا دورہ فرمانے اور ان سے حلیفانہ تعلقات فرمانے لگے۔ چنانچہ مدینے سے بیع تک جو علاقہ ہے، وہاں کے قبائل (بنی ضمرہ، مدلج وغیرہ) نے باوجود اسلام قبول نہ کرنے کے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہو تو یہ مسلمانوں کو مدد دیں اور اگر ان کے علاقے پر کوئی چڑھائی کرے، تو مسلمان ان کو مدد دیں۔ البتہ جارحانہ پیش قدمی میں غیر جانبداری برتی جائے۔ ۲۔ یہ وہی علاقہ ہے، جہاں سے کاروانی قافلے گزرا کرتے تھے۔ اور مکے والے اگر شام، مصر یا عراق جانا چاہتے تو اسی راستے سے گزرتے تھے۔ اس راستے کی بندش قریش پر معاشی دباؤ ڈالنے میں اتنی موثر ثابت ہوئی کہ بدر کی فاش شکست بھی انہیں اتنا بے بس نہ کر سکی۔ ۳۔ ۱۱ھ میں احد میں مسلمانوں کو صدمہ پہنچا، لیکن فوراً ہی انہوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ نجد کے علاقے میں جو مدینے کے مشرق میں ہے، اپنے اثرات پھیلا دیے اور مکے والوں کو عراق جانے کا جو متبادل گوت تکلیف دہ راستہ باقی رہ گیا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔ اسی اثنا میں بنی قینقاع اور بنی النضیر کے یہودی مضافات مدینہ سے جلا وطنی پر مجبور ہوئے، تو انہوں نے مدینہ کے شمال میں خیبر وغیرہ کی یہودی بستیوں میں جا کر بسنا اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنی شروع کیں اور قریش و غطفان وغیرہ

۱۔ اس پر میرا مضمون ”دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور“ مجلہ طیلسانین حیدرآباد دکن جولائی ۱۹۳۹ء ملاحظہ ہو۔

۲۔ ان کے متن کے لیے دیکھیے میری عربی تالیف الوتائق السیاسیہ (قاہرہ ۱۳۶۰ھ)

قبائل کو درغلانا آغاز کیا۔ عرب کے شمال میں دومتہ الجندل ایک بڑا اہم کاروانی جنگشن تھا۔ مدینہ آنے والے کاروانوں کو یہاں چھیڑا جانے لگا۔ جو کوئی تعجب نہیں کہ یہودی سرمایہ داروں کے اثرات ہی کے باعث ہو اور انہی یہودیوں کی کوشش سے غطفان و فزارہ نے ایک طرف سے اور قریش اور ان کے حلیفوں نے دوسری طرف سے خندق کے معرکے میں مدینہ کا محاصرہ کیا اور انتظام کر لیا گیا کہ عین نازک لمحے میں مدینہ کے اندر کے ماقمی یہودی یعنی بنی قریظہ بھی غداری کریں جب کسی طرح یہ بلا ٹلی اور بنی قریظہ کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑی، تو خیبر و تیماء اور وادی القری و مقنا وغیرہ کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف نئے سرے سے شدید جدوجہد کا آغاز کیا۔

یہ مسلمانوں کے لیے بڑا نازک زمانہ تھا۔ شمال میں خیبر وغیرہ یہودی قوت کے مرکز تھے۔ شمال مشرق میں فزارہ و غطفان کے قبائل خیبر والوں کے حلیف تھے اور ان کی مسلمانوں سے ہنتی نہ تھی اور جب موقع ملتا، یہ مسلمانوں کی تاخت کے درپے رہتے تھے۔ جنوب میں مکہ تھا، جس کی قوت چاہے معاشی طور سے متاثر ہوئی ہو، جنگی حیثیت سے برقرار تھی اور یہ سب کے سب غم و غصہ سے بیقرار اور مسلمانوں کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے اور سابقہ ناکامیوں کی خلش الگ تھی۔ آثار یہ نظر آ رہے تھے کہ خیبر میں جا بے ہوئے (جلاوطنان مدینہ یعنی) بنی النضیر کی کوششیں رنگ لائیں گی اور یہودی غطفان اور قریش سہ گانہ قوت مدینہ پر بلہ بول دے گی۔ جس کی مدافعت آسان نہ تھی۔ معرکہ خندق میں دس ہزار کاشکر مدینہ پر چڑھ آیا تھا جس میں یہود شریک نہ تھے۔ مجوزہ حملے میں کچھ نہیں تو تین چار ہزار مزید سپاہیوں کا اضافہ ہو جاتا۔ خندق میں جوان اور بچے ملا کر مسلمانوں کے پاس کوئی تین ہزار آدمی تھے۔ اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

ضرورت تھی کہ خیبر اور مکہ دونوں کی قوت کا استیصال کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کے پاس اتنی قوت نہ تھی کہ وقت واحد میں ان دونوں مرکوزوں پر حملہ کر سکتے یا کم از کم مدینہ کی مدافعت کے قابل محافظ دستہ چھوڑ کر کسی ایک مرکز کو تباہ کر سکنے والی فوج روانہ

۱۔ التنبیہ والاشراف للمعودی ص: ۲۲۸

۲۔ عیینہ بن حصن الفزازی کی تاخت مدینہ کی طرف اشارہ ہے

کر سکتے۔ ساتھ ہی اس کا بھی خوف لگا ہوا تھا (جیسا کہ شمس اللامہ سرخسی نے کتاب المبسوط ۱ میں نہایت بالغ نظری اور تہ نبی سے واضح کیا ہے) کہ اگر مسلمان مکہ جاتے ہیں، تو خیبر و غطفان مدینے پر چڑھ نہ دوڑیں اور اگر مسلمان خیبر جائیں تو مکہ والے اپنے مواشی و موالی کے ساتھ آکر مدینہ لوٹ نہ لیں۔ کیونکہ مدینہ بچوں بیچ واقع ہے۔ خیبر اس کے شمال میں کوئی آٹھ منزل کی مسافت پر ہے تو مکہ اس کے جنوب میں بارہ منزل پر ہے۔

ان حالات میں سیاست دانی کا اقتضاء یہی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک دشمن سے صلح کر کے دوسرے کے مقابلے میں اس کو دوست ورنہ کم از کم ناظر فدا رہنا دیا جائے اور جب ایک سے فراغت ہو جائے گی، تو دوسرا خود ہی ہتھیار ڈال دے گا اور اسے پھر سرزوری کی جرأت نہ ہوگی۔ سوال یہ تھا کہ صلح کے والوں سے کی جائے یا خیبر والوں سے؟ خیبر کے حلیف و معاون یعنی فزارہ و غطفان محض لوٹ مار کے شایق اور بالکل بے اصول خانہ بدوش عرب تھے۔ خیبر میں یہودی تھے، جو تمدنی اور نسلی وجوہ سے عربوں سے الگ تھے۔ ان کو اپنی جلا وطنی اور جائیداد کے لئے کا داغ تھا۔ جو جائیداد کی واپسی کے بغیر مٹ نہ سکتا تھا۔ سرمایہ داری کی وجہ سے کوئی معمولی ”ماہہ الاحتفاظ“ ان کو مطمئن نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی ان کی بات پر کوئی اعتماد کیا جاسکتا تھا شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ خیبر کا مالدار مرکز ایک نسبتاً غیر جنگ جو قوم کے قبضے میں ہونے سے آسان تر مال غنیمت بھی تھا۔

دوسری طرف مکہ مسلمانوں کے لیے بہت سی رعایتوں کا متقاضی تھا۔ مسلمان مہاجرین سب کی ہی تھے اور اہل مکہ ان کے رشتہ دار۔ کعبہ مسلمانوں کی نماز کا قبلہ اور حج کی منزل مقصود تھا۔ اہل مکہ کی تباہی سے زیادہ ان کا اسلام زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ کیونکہ قریش کے معاشی اور تمدنی تعلقات تمام عرب سے تھے اور ان کی صلاحیتیں تمام عرب میں سب سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ ان میں بات کا پاس تھا، وہ دھن کے کپے تھے، قومی مفاد کے لیے تن من دھن سے لگ جاتے تھے۔ طبیعت مہبات پسند تھی، ادبی ذوق اور

انتظام ملک کی قابلیت و ملکہ بھی عام بدویوں کے مقابلے میں ان میں کہیں بڑھا ہوا تھا اور شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی دباؤ کے باعث اب وہ واقعی صلح پر آمادہ بھی ہو چکے تھے اور صرف لاج رکھنے کے لیے کسی اچھی شرط کے منتظر تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں حجاز میں سخت قحط پڑا تھا۔ اور مکہ والوں کی رسد کے مرکز یمامہ پر بھی مسلمانوں کا (ثمامہ بن اثال کے اسلام لانے کے باعث) قبضہ ہو کر درآمد بند ہو گئی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بندش کا اثر محسوس کر دینے کے بعد اپنی مرضی اور اختیار سے ممانعت اٹھا کر نیز مکہ والوں میں سے غربا و فقراء کی امداد کے لیے سرمایہ قحط میں اس زمانے میں پانچ سو اشرفیاں روانہ کر کے وہاں کے عوام کے دل موہ لیے تھے اور مکہ کے سب سے بڑے اور با اثر سردار ابوسفیان کی لڑکی بی بی ام حبیبہؓ سے، جو حبشہ گئی ہوئی تھیں، اس زمانے میں عقد عاتبانہ کر لیا تھا۔ نیز مختلف سامان ضرورت (کھجور وغیرہ) ابوسفیان کو ”ہدیہ“ بھیج کر معاوضہ میں جانوروں کی کھالیں طلب کی تھیں۔ غرض باوجود حالت جنگ قائم رہنے کے یہ خاموش دلدہی کے کام جاری تھے۔ قریش کے حج کا زمانہ بھی آگیا تھا جس میں وہ مسلسل تین ماہ تک لڑائی بھڑائی حرام سمجھتے اور اس میں ان کا سخت ترین دشمن بلکہ قابل قصاص ملزم بھی ان کے شہر میں نہیں ملتا، تو اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ مسلمانوں نے بھی قریش ہی کے کعبے کو اپنا قبلہ بنا لیا تھا اور حج کعبہ کو بھی اپنے دین کا جز بنا لیا تھا۔ جس کا نفسیاتی اثر قریش پر پڑے بغیر رہ نہ سکتا تھا۔

ان حالات میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوچا کہ اگر حج کے مہینوں میں مکہ جائیں اور ارادہ طواف کعبہ اور قربانی و عمرہ کے لیے ہو اور قریش کو منہ مانگی شرطیں پیش کی جائیں، تو کوئی تعجب نہیں جو وہ صلح پر آمادہ ہو جائیں اور اتفاق

۱۔ سیرۃ ابن ہشام ص: ۹۹۷ تا ۹۹۸۔ استیعاب ابن عبدالبر، سوانح عمری ص: ۲۷۸

۲۔ ایضاً

۳۔ مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص: ۹۱ تا ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص: ۶۹

۴۔ مبسوط سرخسی جلد ۱۰ ص: ۹۲۔ شرح السیر الکبیر سرخسی جلد ۱ ص: ۷۰

سے اسی زمانے میں نینوا کے مقام پر ایران و روم کی صدیوں سے چلی آنے والی جنگ ایران کی مکمل اور قطعی شکست پر منبج ہوئی تھی۔ اور کچھ اور نہیں تو عرب میں جو ”لا وارث“ ایرانی صوبے مثلاً یمن، بحرین، عمان تھے، ان کے متعلق حسبِ دلخواہ کارروائی کرنے کا اس بین الاقوامی صورت حال کے باعث ایک خداداد اور نادر موقع بھی ہاتھ آ گیا تھا۔ یمامہ پر قبضہ کے باعث مسلمان پہلے ہی بحرین و عمان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ قریش کا ہموار ہونا یمن کا راستہ بھی کھول دیتا تھا اور رومیوں کی نینوا میں کامیابی ابھی فی الحال شمال میں کسی بڑی کارروائی میں مانع تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ مدینے میں قابلِ کار مسلمان مرد تقریباً تین ہزار تھے۔ اب ذی قعدہ کے مہینے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو آدمیوں کے ساتھ مدینے سے چلتے ہیں۔ حج کا احرام بندھا ہوا ہے اور ساتھ قربانی کے جانور ہیں اور ارادہ محض سالمانہ ہے اس لیے ساتھ جنگی ہتھیار تک نہیں ہیں۔ (البتہ کچھ دور جانے کے بعد حضرت عمرؓ کے مشورے سے احتیاطاً مدینے سے فوجی مخزن منگالیا جاتا ہے)۔ جو ساتھ رہتا ہے مگر بند حالت میں (مسلمان کافی فوج مدینے میں چھوڑ گئے تھے اور خاموشی کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں سے حدودِ حرم شروع ہوتے ہیں۔ جہاں سے ساحلی میدان ختم ہو کر دشوار گزار وادیاں اور پہاڑی سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ مکے والوں کو اطلاع مل گئی تھی اور جنگی نقطہ نظر سے حدیبیہ کے درے کے دہانے پر حریف کو روکنے سے بہتر ان کے لیے کوئی اور مقام نہیں مل سکتا تھا۔ یہ جگہ مکہ سے صرف دس بارہ میل پر واقع ہے اور ایک طرح قریش اپنے گھر ہی میں رہ کر دُور دراز سے آئی ہوئی اور ہر طرح کی رسد اور مدد سے منقطع اسلامی فوج سے لڑ سکتے تھے۔

حدیبیہ آتے ہی سفارتی سرگرمی شروع ہو گئی۔ قریش کے نمائندے اور کارندے آ کر مقصد معلوم کرنے لگے آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داماد حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا کہ مختار کل کی حیثیت سے گفت و شنید کریں۔ مکے میں عجیب بد نظمی تھی اور

۱۔ دیکھیے گرائڈ کی جرمن کتاب ”قیصر ہرقل کی جنگی مہمیں“

۲۔ تاریخ طبری ص: ۱۵۳۱

کوئی مرکزیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کا سب سے بااثر سردار ابوسفیان بھی کسی نامعلوم راستے سے چھپ چھپا اور بچ بچا کر ان دنوں شام گیا ہوا تھا۔ اسی لیے حضرت عثمانؓ نظر بند ہو گئے اور ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو مسلمانوں کو خوف ہوا کہ کہیں انہیں شہید نہ کر دیا گیا ہو۔ اب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور حدیبیہ میں انہوں نے مرنے مارنے کا اقرار کیا جس کا ”إذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ“ کے الفاظ میں قرآن مجید میں بھی ذکر ہے۔ قریش کو خبر ملی تو وہ گھبرائے آخر صلاح کر کے انہوں نے سہیل بن عمرو کو مختار کل کر کے سفیر بنا کر حدیبیہ بھیجا اور تھوڑی سی رد و قدح کے بعد صلح نامہ طے ہو گیا۔ قریش کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مطالبہ کہ:

۱۔ مسلمان اس سال مکہ آئے بغیر واپس ہو جائیں اور سال آئندہ عمرہ کرنے آئیں۔

۲۔ کوئی مسلمان بھاگ کر مکہ آئے اور پناہ گزیں ہو، تو اس کی تحویل عمل میں نہ آئے لیکن کوئی مکی بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو مطالبے پر اس کی قریش کے ہاتھ تحویل عمل میں آجائے۔

۳۔ دس سال تک باہم صلح رہے۔ ایک دوسرے کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور تجارت وغیرہ مسلمانہ ضرورتوں سے ایک دوسرے کے علاقے سے گزرنے کی اجازت ہو۔

اسے جب مسلمانوں نے منظور کر لیا اور معاہدہ کے متن میں بجائے ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کے خالص فارمولے کے قریش فارمولا ”بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ“ لکھا جانا اور ”مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ کی جگہ ”مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ“ لکھا جانا طے ہوا تو گویا فتح قریش ہی کی ہوئی اور انہیں دینا پڑا اور بظاہر یہ صحیح بھی تھا اور مسلمان سپاہیوں میں عام طور پر رنج کی لہر دوڑ گئی۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے دقیقہ رس مدیر بھی اپنی بے چینی کو چھپانہ سکے۔ لیکن مسلمانوں میں نظم و ضبط اتنا کچھ آچکا تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ طے ہو چکا ہے اور آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں، تو پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ سوائے خاموشی اور اطاعت شعاری کے کچھ اور کریں۔

حدیبیہ کی اس صلح (یا بقول قریش ”شکست“) کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے لیے ”فتح مبین“ اور ”نصر عزیز“ کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں حیرت ہوتی ہے کہ یہ ”برعکس نہند نام زنگی کافور“ کیوں؟ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی حکومت تو قریش کی منہ مانگی شرطیں منظور کرنے کو تیار تھی۔ صرف خیبر میں جنگ سے ان کی غیر جانبداری مطلوب تھی۔ اسے قریش نے منظور کر لیا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ رعایتیں منظور کر لی تھیں۔ ”باسمک اللہم“ کے فارمولے میں کوئی شرک یا بت پرستی نہیں ہے اور اس کو نیز ”محمد بن عبد اللہ“ کو منظور کرنے میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نہ تھا۔ اسی طرح عمرے میں رکاوٹ معمولی امر ہے اور ”من استطاع الیہ سبیلا“ کے باعث اس وقت وہ مسلمانوں پر فرض ہی نہ تھا۔ ایک طرف تحویل ملزمین کی توجیہ خود جناب رسالت مآب نے یہ فرمائی کہ ہمارے پاس سے بھاگ کر جانے والا کافر ہی ہوگا۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اور قریش کے پاس سے بھاگ کر آنے والا مسلمان ہی ہوگا اور اگر وہ اپنے ہم وطنوں کے مظالم پر صبر کرے گا تو خدا اسے اجر دے گا۔ یوں بھی چند ہی دنوں میں اسلامی عملداری کے باہر نو مسلموں نے قریشی کاروانوں کا کچھ وہ ناطقہ تنگ کر دیا کہ خود قریش نے جناب رسالت مآب سے التجا کی کہ اس شرط کو منسوخ کر کے ان نو مسلموں کو مدینہ بلا لیں اور تیسری شرط تو مسلمان خود ہی چاہتے تھے کہ قریش مسلمانوں سے صلح کر لیں اور مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے لیے سخت ترین نازک زمانے میں حدیبیہ میں قریش کا اس صلح پر آمادہ ہو جانا اسلامی سیاست خارجہ کی ایک واقعی ”فتح مبین“، ”نصر عزیز“ تھی جس کے باعث ان کے ہاتھ کھل گئے اور فوری خطرات پر نجات ملنے پر انہوں نے آزادی کے ساتھ تین ہی سال میں پُر امن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا اور وہاں سے رومی اور ایرانی اثرات بالکل خارج کر کے ایک ایسی مستحکم حکومت قائم کر دی، جو پندرہ ہی سال میں تین براعظموں پر پھیل گئی اور جو اس سے ٹکرایا، پاش پاش ہو کر رہ گیا اور جس نے سر تسلیم خم کر دیا، وہ اسلام کے رنگ و زبان سے بالاقویت میں برابری کے حصے کے ساتھ شریک ہو گیا۔

یہی وہ صلح حدیبیہ ہے، جسے عہد نبوی کی سیاست خارجہ کا شہ کار کہنا چاہیے۔ اس معاہدہ کا متن عربی ماخذوں میں کہیں تو پورا پورا، کہیں جستہ جستہ ملتا ہے، جس کی تفصیل میں نے الوثائق الاسلامیہ (مطبوعہ مصر ۱۳۶۰ھ) میں دستاویز نمبر ۱۱ کے تحت دی ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ کافی ہوگا۔

معاہدہ حدیبیہ:

- ۱۔ تیرے نام سے اے اللہ!
- ۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے، جو محمد بن عبد اللہ اور سہیل بن عمرو میں طے ہوا،
- ۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے، جس دوران میں لوگ امن سے رہیں اور ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔
- ۴۔ یہ کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لیے مکہ آئے، تو اس کی جان و مال کا امان ہوگا اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام (برایت ابو عبیدہ عراق یا شام) جاتے ہوئے مدینے سے گزرے، تو اسے جان و مال کا امان حاصل ہوگا۔
- ۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی (سرپرست) کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا، تو آپؐ اسے ان کے سپرد کر دیں گے اور محمدؐ کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آجائے گا، وہ اسے آپؐ کے سپرد نہیں کریں گے۔
- ۶۔ یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہ ہو سکے گی) اور نہ تو خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلاف عہد دغا کریں گے۔
- ۷۔ یہ کہ جو محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ بھی ایسا کرے گا

۱۔ یہ دفعہ ابن الحنفی اور ابن ہشام میں نہیں ہے۔ نہ ہی تاریخ طبری میں ہے۔ لیکن تفسیر طبری، ابو عبیدہ کی کتاب الاموال، فتوح بلاذری اور بکری وغیرہ میں ہے۔

(اس پر قبائل خزاعہ نے اٹھ کر کہا کہ ہم محمدؐ کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں اور بنی بکر نے کہا کہ ہم قریش کے معاہدہ اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں۔)

۸۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا اور ہمارے ہاں مکہ نہ آئے گا۔ البتہ سال آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں (مکہ میں) داخل ہو کر تین راتیں ٹھہر سکیں گے۔ تیرے ساتھ سوار کا ہتھیار ہوگا یعنی تلوار میان میں پڑی ہوئی۔ اس کے سوا کوئی اور ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آ سکے گا۔

۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے، جہاں ہم نے ان کو پایا (یعنی حدیبیہ میں) اور ان کو حلال کر دیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس (مکہ قربانی کے لیے) نہیں لایا جائے گا۔ اور صراحت کہ ہمارے اور تمہارے حقوق اور واجبات برابر کے ہوں گے۔

(غالباً) مہر نبویؐ

(غالباً) مہر سہیل بن عمرو

گواہان اسلام: ابو بکرؓ، عمرؓ، عبدالرحمن بن عوف، عبداللہ بن سہیل بن عمرو، سعد بن وقاص، محمود بن مسلمہ، ابو عبیدہ بن الجراح وغیرہ

گواہان قریش: مکرز بن حفص، وغیرہ

کاتب: علی بن ابی طالب

ماخذ ہائے متن:

تفسیر طبری ص ۲۶، ص ۶۱، سیرۃ ابن ہشام ص ۷۴ تا ۷۸، فارسی ترجمہ سیرۃ ابن اسحق ورق ۱۷۰/الف (مخطوطہ پارلیس) مغازی واقدی (مخطوطہ برٹش میوزیم) ورق ۱۴۰/الف (طبقات ابن سعد ج ۱) حصہ نمبر ۲ ص ۷۷ نیز ج ۲ حصہ نمبر ۱ ص ۷۰ تا ۷۱، تاریخ طبری ص ۱۰۴۶ تا ۱۰۴۷، سیرۃ طبری بروایۃ الکبریٰ (مخطوطہ آیاصوفیاء) فصل حدیبیہ تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۱۶۸ تا ۱۶۹، تاریخ انیس للدیار کبری ج ۲ ص ۲۳، تاریخ ابن الاثیر ج ۲ ص ۱۵۶، سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۲۳۔

ماخذ ہائے اقتباس متن:

کتاب الاموال لابی عبید ص ۴۴۱ تا ۴۴۲۔ صحیح البخاری ۴۴/۴۳، ۶۴/۲۹-۳۵، ۶۴/۷۱، ۵۴/۷۱، ۵۴/۷۱ وغیرہ۔ عن کتب سید المرسلین لابن طولون نمبر ۲۶۔ فتوح بلاذری ص ۳۶۔ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۵۵۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد۔

جدید بحث و ترجمہ:

کائناتی کی اطالوی تاریخ اسلام حالات ۶۔ ص ۳۴۔ ہیفنگ کی جرمن کتاب ”اسلام کا قانون خارجہ“ ضمیمہ دوم۔ اشپرنگر کی جرمن ”سوانح و تعلیمات محمدی“ ص ۳، ص ۲۴۶ جہاں تیمی کے ایک اور متن کا ذکر ہے۔ نقل نہیں۔

مجید خدوری کی انگریزی کتاب ”اسلام کا قانون جنگ و امن“ ص ۸۹ مزید حوالے فنسنک کی مفتاح کنوز السنہ میں تحت عنوان حدیبیہ ہیں۔

(نقوش لاہور۔ رسول (۳) جنوری ۱۹۸۳ء)

عہدِ نبویؐ کے اصولِ سیاسیات

ایک شخص جس کو وطن میں جان کے لالے پڑے ہوں۔ صرف ایک رفیق کے ساتھ غاروں میں چھپتا، نامانوس اور دشوار گزار راستوں پر چلتا سیکڑوں میل دور جا پناہ گزیں ہوا ہو۔ وہ دس ہی سال بعد جب انتقال کرتا ہے تو دس لاکھ مربع میل کے علاقے پر حکمران ہو چکا تھا۔

پھر اس علاقے میں جہاں اس سے پہلے کبھی سیاسی مرکزیت آئی ہی نہ ہو اور ملک قبائلی سطح تمدن سے بلند نہ ہو سکا ہو، اس مزاج میں ایک راج قائم کرے اور بغیر نمونے کے ایک باقاعدہ مملکت کی ضرورت کی ہر چیز رائج کرے اور ایک ایسی حکومت قائم کرے جس کا آغاز ایک شہر کے چند محلوں سے ہو اور جو ۲۷ ہی سال میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہیوں میں وقت واحد میں لڑ کر اور بیسیوں دیگر سلطنتوں کو شکست دے کر ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں پر پھیل جائے۔

اس سیاست کا مطالعہ صرف ایک عظمتِ ماضیہ کا مطالعہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسی شخصیت کے کارناموں کا مطالعہ ہے جس کے ہر قول و فعل کو اب بھی دنیا کی چوتھائی آبادی اپنا قانون اور اپنا اسوہ حسنہ سمجھتی ہے۔ اگرچہ انسانوں کا یہ گروہ دنیا کی چوتھائی آبادی ہی پر مشتمل ہے لیکن ایک تو یہ ”مشارك الارض“ سے ”مغارب الارض“ تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے پرانی دنیا کی اکثر اہم شاہراہوں پر سیاستا نہیں تو سکونتِ قابض ہے۔ تیسرے زیادہ تر جنگی نسلوں پر مشتمل ہے۔ چوتھے عظیم الشان اور قابلِ رشک تاریخ رکھتا ہے۔ جس کے پچھلے کارہائے نمایاں ہمیشہ امکانات کے خوش آئند

ارادے اور دلولے پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پانچویں ایک نسلی نہ رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوئی نہ کوئی جز ”مقاتی انحطاط“ کو ختم کر کے نئی زندگی کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔ چھٹے ابھی تک اس کا پھیلاؤ رکا نہیں اور انتہائی ناسازگار مقاموں میں زبردست ترین اور منظم حریفوں کو شکست دے رہا ہے اور ساتویں اس کے پرانے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے قاعدے متمدن ممالک میں بھی ضروریات حاضرہ کے مطابق خیال کیے جا رہے ہیں۔
وغیرہ وغیرہ

سیاست کاری:

عہد نبویؐ کی سیاست خارجہ کے اصول و حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں بعض ایسے تھے جو عام اور ہمہ گیر تھے اور ہر حال میں اور ہر کسی کے ساتھ ملحوظ رہتے تھے اور بعض ہر انفرادی وحدت کے ساتھ بدلے ہوئے تھے اور یہ ناگزیر بھی تھا کہ:

- ۱۔ اپنے ظالم وطن مکہ
- ۲۔ عرب کے غیر عربی عناصر خاص کر یہودی قبائل
- ۳۔ خانہ بدوش عرب قبائل
- ۴۔ عرب کے حضری زندگی رکھنے والے شہر یا شہری مملکتیں (City States) مثلاً طائف۔
- ۵۔ عرب میں بیرونی دخل انداز یعنی ایرانی اور رومی صوبے، محفوظات، نوآبادیاں وغیرہ۔
- ۶۔ عرب کے ہمسایہ ممالک وغیرہ میں سے ہر ایک کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ”سیاست کاری“ خصوصی مسائل سے دوچار ہو اور ان کو حل کرنے کے لیے وہ ہر جگہ الگ اور بدلی ہوئی رہے۔ سطور ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف مکی سیاست سے بحث کی جائے گی۔

مکہ کی اہمیت:

شہر مکہ قدیم جغرافیہ نگاروں کے الفاظ میں ”ناف ارض“ پر ہونا چاہیے۔ اسلام کی

عالمگیر تو سب میں کتنا ہی مدد و معاون رہا ہو لیکن یہاں زمانہ پائے مابعد سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ عہد نبویؐ میں اس کو کیا اہمیت حاصل تھی۔ ہمیں ان مشنری پادریوں کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں جو مصلحت مکہ اور مکہ والوں کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتے اسی طرح ان روحانی غفلتوں یا دیگر لا حاصل قصوں سے بھی یہاں سروکار نہیں جو کرہ ارض کے بننے میں مکہ کے حصے وغیرہ سے متعلق ہیں۔

شہر مکہ میں جو عرب بستے تھے وہ قریش کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کے تجارتی تعلقات کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور ہر قبیلہ اور اس کے علاقے سے گزرنے والے کے لیے زمانہ حال کے پاسپورٹوں سے بھی زیادہ دشواریاں تھیں اس لیے کاروانوں کے سفر کرنے اور بین الممالک تجارت کے عرب سے گزرنے کے لیے خفاروں اور بدرقوں کا ایک وسیع اور ترقی یافتہ نظام وجود میں آ گیا تھا۔ اس نظام نے عرب میں سیاسی تو نہیں ایک معاشی وفاق ضرور قائم کر دیا تھا۔ اس وفاق میں قریش کے موقف کا اندازہ مشہور مؤرخ محمد بن حبیب (فوت ۲۴۵ھ) کے اس بیان سے ہو سکتا ہے:

”ہر تاجر جو یمن یا حجاز سے وہاں (دومتہ الجندل جو عرب کے شمال میں ہے) جانا چاہتا تو جب تک قبائل مضر کے علاقہ سے گزرتا ہو قریشی خفارے کے خدمات حاصل کرتا کیونکہ نہ کوئی مضر اور نہ مضر یوں کا کوئی حلیف قریشی خفارے کو تکلیف دیتا چنانچہ قبائل کلب (بنی النجم سے حلفی کے باعث) اور قبائل طے (بنی اسد سے حلفی کے باعث) قریشیوں کو نہیں چھیڑتے تھے۔ قبائل ربیعہ کے پورے علاقہ میں تاجر اپنے لیے بنی عمرو بن مرثد کا خفارہ حاصل کرتے تھے..... بحرین کے صدر مقام المشرق کو جانے کے لیے بھی قریشی خفارہ حاصل کیا جاتا تھا..... جنوبی عرب میں مہرہ جانے کے لیے بنی محارب کا خفارہ لیا جاتا تھا.....

حضرموت کے سوق رابیہ جانے کے لئے قریشی کارواں بنی آکل المرار کے خدمات حاصل کرتے تھے..... جس کے باعث آکل المرار جلد اپنے حریفوں پر غالب ہو گیا..... عکاظ عرب کا سب سے بڑا سالانہ میلہ تھا جس میں تمام عرب کے قبائل سامان لاتے تھے۔ مثلاً قریش، ہوازن، غطفان، عضل، ویش، جبار، مصطلق، احابیش وغیرہ۔“

اس کے سوا زمانہ جاہلیت میں قریش اپنے حج کے سلسلے میں مکے کے مضافات میں منی میں جمع ہوتے تھے۔ ۳ھ میں بیعت عقبہ کے سلسلے میں مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ اہل مدینہ سے ملنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ قبائل کے پڑاؤں میں تبلیغ کے لیے گئے تھے۔ ان میں سے کندہ عرب کے انتہائی جنوب میں رہتے تھے۔ کلب انتہائی شمال میں دومتہ الجندل میں بستے تھے۔ بنی حنیفہ بحرین کے پاس انتہائی مشرق میں آباد تھے۔ ان کے علاوہ وہاں یمن کے مدینے کے غرض عرب کے ہر حصے کے لوگ آتے تھے اور یہ ہر سال ہوتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو ۹ھ تاریخ اسلام میں ”عام الوفود“ (سفارتوں کا سال) کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ عرب کے ہر حصے سے مدینے میں سفارتیں ٹوٹ پڑیں اور فاتح مکہ کے مذہب اور فاتح مکہ کی حکومت کو ماننے کا اعلان کرتی گئیں اور یہ سفارتیں بھی عرب کے ہر حصے سے آئی تھیں۔

جیسا کہ اوپر عرض ہوا۔ سیاست نبویؐ کے چند اصول عام اور ہمہ گیر تھے پہلے ان ہی کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے یہ مکے سے مقابلہ کرنے میں بھی اتنے ہی ملحوظ رہے جتنے دیگر سیاسی وحدتوں کے سلسلے میں۔

تبلیغ رسالت:

سب سے پہلا اصول جو ہر حالت میں پیش نظر رہا وہ یہ تھا کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے تھے اس کی اشاعت ہو۔ اس غرض کے لیے مالی

منفعت اور خواہش انتقام کو نظر انداز کرنا بھی گوارا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مکہ کو بلا شرط اور بزور فتح کر لیا تو یہ بہت آسان تھا کہ اس مالدار شہر کو آپ لوٹ لیتے اور مہاجرین کی مغصوبہ جائیدادوں اور دیگر کثیر جسمانی اور مالی نقصانوں کا بدلہ لیتے۔ ابوسفیان گرفتار ہو کر ہاتھ آئے تو کچھ نہیں تو ان سے چند ہزار کا فدیہ ہی طلب کرتے۔ اس کی مزید مثالیں جمع کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اندرونی استحکام:

کوئی بڑی سے بڑی سلطنت بھی جو سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا ہوا کثر حقیر اور کمزور دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تاریخِ عالم اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اس اصولِ مسلمہ کا بیان مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ناگزیر باہمی اختلافات کو کس طرح روکا یا دور کیا جاتا تھا اور کس طرح اختلافات کو مٹانے سے اپنی قوت میں اضافہ ہوتا تھا۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے آئے ہیں تو مسلمانانِ مدینہ اوس اور خزرج کے دو رقیب اور خون کے پیاسے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ابھی بے گناہی کی معرکہ آرائی کا خون بھی خشک نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں متضاد قوموں کی سرداری کوئی قابلِ رشک حالت نہیں کہی جاسکتی جس طرح آج اسلامی مبلغین کو ممالک متحدہ امریکہ میں ایک حل نہ ہونے والی غتھی سے سابقہ ہے کہ وہاں حبشیوں میں تبلیغ کرو تو وہ کہتے ہیں۔ آمنا لیکن آپ گوروں کی لچنگ پر اتر آنے والی ننگِ انسانیت قوم کو اسلام کے برکات سے ہرگز متمتع نہ ہونے دیجیے اور گورے نو مسلم نہیں چاہتے کہ حبشی بھی مسلمان ہو کر ان سے سماجی مساوات حاصل کر لیں۔

عرب کے خانہ بدوش بدو آج بھی اپنے حضری اور بستیوں میں رہنے والے بھائیوں کو سخت حقارت سے دیکھتے ہیں۔ عہدِ نبویؐ میں تو حضری آبادی آج سے بھی فوجی مہموں میں بدوی رضا کاروں کا ضبط جیسی صبر آزما چیز ہوگی محتاجِ بیان نہیں۔

سب سے مقدم یہ کہ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں ایک مزاج تھا ایک شہری

مملکت تک نہیں پائی جاتی تھی۔ چند مدنی عرب قبائل مسلمان ہو گئے تھے اور چند میں ابھی تک اسلام پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ ان کے ساتھ ہمسائے میں ہزاروں کی تعداد میں یہودی رہتے تھے جو زراعت، تجارت، صنعت غرض جملہ معاشی زندگی پر حاوی تھے ان میں بھی آپس میں خون ریز اور امٹ رقابتیں تھیں اور ان کا اپنا ایک مذہب اور تمدن تھا اور ان کے اسلام قبول کرنے کی اتنی بھی توقع نہ تھی جتنی لامذہب بدوؤں کی۔ ان سب کے ساتھ ٹیکڑوں مہاجرین تھے جو مکے کے بیسیوں قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تمام عناصر میں ایک وفاقی وحدت پیدا کرنا اور مدینے میں ایک شہری مملکت قائم کر کے اس کا ایک دستور مرتب کرنا اور اس کے ذریعے راعی و رعایا کے حقوق و فرائض کا تعین کرنا اور پھر ان تمام مقاصد اور ضائع ہونے والی توانائیوں کو ایک مرکز پر لا کر ان سے مفید کام لینا یہ ابتدا سیاست خارجہ ہی کے مسائل تھے اور طے ہو چکنے کے بعد اندرونی مسائل بن گئے۔

مدینے کی حفاظت کے لیے علاوہ اس اندرونی استحکام کے اس کی ضرورت تھی کہ آس پاس کے قبائل سے دوستی کی جائے۔ چنانچہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کے جنوب مغربی اور ساحل سے متصل علاقے کا بار بار دورہ شروع کرتے ہیں اور ینبوع وغیرہ میں رہنے والے قبائل سے حلفی کرتے ہیں کہ ان پر کوئی حملہ کرے تو مسلمان اُن کو مدد دیں گے اور مسلمانوں پر کوئی حملہ کرے تو یہ مدد کو آئیں گے۔ بعض معاہدات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں سے دوستی نہ رکھنے کی شرط منظور کی گئی تھی بعض میں اتنی پابندی بھی نہ تھی اور قبیلہ غیر جانبدار رہنے پر آمادہ ہوا تھا بعض میں مسلمانوں کی دینی لڑائیوں میں ان قبائل کو مدد دینے کی پابندی سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ بہر حال مدینے کے چاروں طرف دوستوں میں اضافہ اور مخالفوں میں کمی کی مسلسل کوشش کی جا رہی تھی۔

ایک اور اصول یہ قرار دیا گیا کہ عرب میں جو شخص یا خاندان یا قبیلہ مسلمان ہو وہ ہجرت کر کے مدینہ یا مضافات میں آجے۔ یہ سیاست فتح مکہ تک باقی رہی (لا ہجرة بعد الفتح مشہور حدیث اسی سیاست کے اختتام کا اعلان تھی) اور بہت کم اس سے

استثنا منظور کیا جاتا تھا۔ اس سیاست کا نتیجہ دو گونہ تھا۔ مسلمان فوج کے لیے محفوظ رضا کاروں میں روز افزوں اضافہ اور ان نو مسلموں میں اسلام کی گہرائی۔

انسانی خون کی عزت:

عہد نبویؐ میں دس سال میں دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا جس میں یقیناً کئی ملین آبادی تھی۔ اس طرح روزانہ تقریباً ۲۷۴ مربع میل کے اوسط سے دس سال تک فتوحات کا سلسلہ ہجرت سے وفات تک جاری رہا۔ ان فتوحات میں دشمن کا ماہانہ ایک آدمی قتل ہوا۔ اسلامی فوج کا نقصان اس سے بھی کم ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے انا نبی الرحمة انا نبی الملحمة (میں رحمت کا پیغمبر ہوں میں جنگ کا پیغمبر ہوں) اس کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔ دشمن کے ۷۰ آدمیوں کا مارا جانا (جنگ بدر میں) سب سے بڑی تعداد ہے۔ یاد رہے کہ یہ عہد نبویؐ کی سب سے پہلی جنگ تھی۔

فنون حرب کی ترقی و استفادہ:

دشمن کو بے بس کر دینے اور ساتھ ہی خوزیری کو کم ترین حد تک گھٹا دینے کے لیے ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ فنون حرب میں اتنا کمال حاصل کیا جائے کہ حریف مقابلہ ہی نہ کر سکے۔ اس غرض کے لیے ہر اچھی چیز چاہے کسی ملک کی ہو اختیار کی گئی۔ عربوں میں صف بندی کا رواج نہ تھا۔ جوش کا بے وقت اور بے محل استعمال اور اسلحہ کا بیکار خرچ بھی عام چیز تھی۔ جنگ بدر ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سپاہیوں میں صف بندی شروع کر دی تھی اور معائنہ میں جو آگے پیچھے نظر آتا تھا اسے درست کیا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے وقت تو صف آرائی ایک مخصوص افسر کے سپرد ہو گئی تھی جو وازع کہلاتا تھا۔ ہر فوج کا مہم پر روانگی سے پہلے شہر کے باہر معائنہ ہوتا تھا اور کم عمر رضا کار یا سواری یا اسلحہ نہ رکھنے والے یا اور طور پر نامناسب افراد (مثلاً مشرکین، یہودی وغیرہ) واپس کر دیے جاتے تھے۔ جنگ بدر میں صف آرائی کے بعد جو جامع ہدایات دی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ ”جب تک میں حکم نہ دوں کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ

کرے دشمن دور ہو تو تیر چلا کر بیکار ضائع نہ کرے۔ بلکہ اوپر آئے تو مارے اس سے قریب آئے تو پتھر پھینک کر مارے اس سے بھی قریب آئے تو نیزہ اور پھر تلوار چلائے۔“ وردی کی غیر موجودگی میں اور شب خون کی ضرورتوں کے لیے اسلامی سپاہیوں کے لیے ”شعار“ (واچ ورڈ) مقرر کیے گئے تھے اور ہر دہ بدو کے مقابلہ کے وقت سپاہی اسے دہراتا اور حریف وہ لفظ نہ دہراتا تو اطمینان ہو جاتا کہ وہ رفیق نہیں ہے بلکہ دشمن۔ خندق کے ذریعے محصور شہر کی مدافعت اسی اصول کی ایک دوسری مثال ہے۔ چنانچہ جگہ خندق میں شہر مدینہ پر دشمن کو حملہ آور ہونے سے اسی کے ذریعہ سے روک کرنا کام واپس کیا گیا۔

خیبر کی لڑائی میں منجینق سے دشمن کے محصور قلعہ میں پتھر برسائے گئے تھے۔ طائف کے محاصرہ میں مزید برآں دبا بے بھی استعمال کیے گئے تھے۔ جو ترقی پا کر زمانہ حال میں خود بخود حرکت کرنے والی ٹینک کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

دبابہ ایک پیسے والی گاڑی ہوتی ہے جس کے اوپر ٹیل کا یا کوئی اور موٹا چڑھ منڈھ دیا جاتا تھا کہ تیروں سے اندر رہنے والے آدمیوں کو صدمہ نہ پہنچایا جاسکے۔ فصیلوں کو کھودنے اور مماثل کام کرنے کے لیے اسے کام میں لایا جاتا تھا۔ طائف میں منجینق کے علاوہ عراوہ بھی برتا گیا تھا۔ جو منجینق ہی کی طرح پتھر وغیرہ دور پھینکتا تھا۔

فوجوں کی مشقیں، گھوڑوں، اونٹوں، گدھوں وغیرہ کی دوڑ، تیر اندازی کے مقابلے اور فوجی اسپورٹ وغیرہ ایک مستقل مضمون کے محتاج ہیں۔ نمازوں کے ذریعے صف بندی، روزے کے ذریعے ہر موسم میں سپاہیوں کو بھوک پیاس کی مشق، حج کے ذریعے عرفات وغیرہ کے بے آب و گیاہ علاقوں میں کوچ اور قیام کی عادت وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ سرکاری اصطبلوں، محفوظ چراگا ہوں اور اسلحہ خانوں کا قیام بھی اسی سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

خبر رسانی اور نا کہ بندی:

ایک اور چیز جو عام تو تھی لیکن جس کا قریش کے سلسلے میں بہت مکمل مظاہرہ ہوا

وہ یہ ہے کہ دشمن کی ہر نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر رہیں اور اپنی نقل و حرکت سے اسے آخر وقت تک بے خبر رکھیں۔

اس غرض کے لیے مکہ میں بھی آپ کے نامہ نگار متعین تھے۔ خندق کے معرکے میں قریش نے مدینہ کے شمال کے قبائل غطفان وغیرہ کے دس ہزار کے جم غفیر کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ اتنا بڑا لشکر عرب میں غیر معمولی بات تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے شمال میں دو مہاجرین کی طرف گئے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آدھے راستے سے واپس آ جانا اور محاصرہ کنندوں کے پہنچنے سے پہلے دو ہفتہ کی مہلت پا کر خندق کی کھدائی کو مکمل کرنا خبر رسانی کے عمدہ انتظام پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح فتح مکہ کی تیاری ایک شخص نے مدینہ سے قریش کو لکھ کر بھیجی تو پیام رساں راستے میں پکڑا گیا۔ اپنی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ناکوں کی بندش (حبس طرق) جتنی مکمل ہو چکی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دس ہزار کا لشکر مدینہ سے مکہ کی طرف چلتا ہے اور مضافات مکہ میں پڑاؤ ڈالنے سے پہلے دشمن کو خبر نہیں ہوتی۔ اس کا ایک اور طریقہ غلط سمت میں جانے کی خبر مشہور کرنا تھا کہ دشمن مغالطہ میں مبتلا ہو اور غلط سمت میں سفر کر کے چکر کھا کر منزل مقصود پر پہنچنا بھی ہر وقت زیرِ عمل تھا اور مورخین نے صراحت سے لکھا ہے کہ ”صرف تبوک“ کی مہم میں سفر کی درازی اور موسم کی خرابی کے باعث سپاہیوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ کہاں جانا ہے ورنہ ہمیشہ تور یہ (دکھاوا) کیا جاتا تھا۔

معاشی دباؤ:

یہ سب جانتے ہیں کہ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین کو کس طرح تکلیفیں دے کر ترکِ وطن پر مجبور کیا تھا اور کس طرح ان مہاجرین کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح سب لوگ اس سے بھی واقف ہیں کہ قریش کا روزگار زیادہ تر تجارت سے حاصل ہوتا تھا اور تبادلہ اشیاء کے ذریعے وہ نفع کمایا کرتے تھے اور اس غرض کے لیے سردیوں میں جنوب یعنی یمن وغیرہ کو کارواں

لے جاتے تھے اور گرمیوں میں شمال یعنی شام، فلسطین، مصر، عراق وغیرہ جایا کرتے تھے۔

شمالی راستہ اس علاقے سے گزرتا تھا جو مدینہ اور ینوع کے مابین ہے۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ہجرت کے چند مہینے بعد ہی اس علاقے کے باشندوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفت پیدا کرنے شروع کر دیے تھے اور جب اس کی ایک حد تک تکمیل ہو گئی تو قریشی کاروانوں کو حق غنیم کے تحت لوٹ لیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے ساحلی راستہ مجبوراً ترک کر دیا اور صحرا میں سے ہو کر عراق جانے لگے، لیکن جلد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر نجد تک پھیل گیا تو وہ راستہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ قریش کو بحرین اور یمامہ سے بھی غلہ ملتا تھا۔ ان علاقوں پر اسلامی اثر کے پھیلنے خاص کر ثمامہ بن اثال کے مسلمان ہونے پر غلہ کی برآمد مکہ کو روک دی گئی تھی۔ متعدد قیمتی کاروانوں کے لٹنے کے علاوہ ذرائع معیشت کا بند ہو جانا قریش کو مطیع کرنے کا سب سے مقدم اور سب سے مؤثر ہتھیار ثابت ہوا۔

غنیم کے دوستوں کو توڑ لینا:

دوسری اہم تدبیر یہ اختیار کی گئی تھی کہ مختلف وسائل سے قریش کے دوستوں کو اس دوستی کے توڑنے اور مسلمانوں سے جوڑنے پر آمادہ کیا جائے۔ یہ طریقہ بہت آہستہ چلا مگر بالآخر بہت کارگر ثابت ہوا۔

بیعت عقبہ میں جو مدینے والے مسلمان ہوئے تھے۔ وہ اصل میں قریش سے حلینی کرنے آئے تھے۔ دستور مملکت میں مدینے کے یہودیوں کو اسی شرط پر کسی حملہ آور کے خلاف مدد دینا منظور کیا گیا تھا کہ وہ قریش کو کبھی مدد نہ دیں۔ نہ ان کے جان و مال کو کوئی پناہ دیں۔ اس دستور میں مدینے کے غیر مسلم عربوں کی حفاظت اس شرط سے منظور کی گئی تھی کہ وہ قریش کو نہ تو خود کوئی مدد دیں اور نہ ان کی جان و مال پر مسلمان حملہ کریں تو آڑے آئیں اطراف مدینہ کے قبائل سے بھی معاہدات میں اسے ملحوظ رکھا گیا۔ کاروانی اسٹیشنوں پر جو لوگ رہتے ہیں۔ انہیں کاروانوں کے ٹھہرنے کے

زمانے میں کھانے پینے کی چیزیں پانی اور دیگر ضروریات کے فروخت سے روزگار نکلتا ہے، آج کل بھی حجاج کا قافلہ اونٹوں پر جائے تو کئی کئی دن پہلے سے منزلوں پر تیاریاں ہونے لگتی ہیں اور دور دور سے بدوی تربوز، گھی، بھینڑ، بکری وغیرہ وہاں لے جاتے ہیں۔ قریشی کاروانوں کے رک جانے سے متعدد قبائل نے روزگار کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کی تھی اور آٹھ وغیرہ اسی طرح حلیف بنے تھے۔ (حوالہ ابن سعد)

اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ صلح حدیبیہ ہے۔ لہٰذا میں مدینہ میں مسلمانوں کو دو خطرے تھے۔ شمال میں خیبر اور جنوب میں مکہ دونوں سے ایک ہی وقت میں مقابلہ ممکن نہ تھا۔ دونوں کی بڑھنے والی دوستی کو روکنا اور ہم خیالی کو ہم عملی کی صورت اختیار نہ کرنے دینا بھی ضروری تھا۔ یہ بھی خوف تھا کہ اگر مسلمان خیبر پر حملہ کرنے جائیں تو مدینہ کو فوج سے خالی پا کر مکہ والے آکر نہ لوٹ لیں اور مکہ پر حملہ کریں تو یہی خدشہ خیبر سے تھا۔ صلح حدیبیہ میں قریش کو اس بات پر آمادہ کر دینا کہ وہ مسلمانوں کی جنگوں میں غیر جانبدار رہیں گے (اور اس کے معاوضہ میں مسلمان قریش کا تجارتی راستہ کھول دیں گے اور دس سال تک باہم صلح رہے گی) ایک زبردست سیاسی فتح تھی جو مسلمانوں نے حاصل کی کیونکہ قریش کو اس وقت مؤثر مدد دے سکے والے صرف خیبر ہی رہ گئے تھے۔ ان کو پھڑا دینے اور پھر تباہ کر دینے سے قریش کا آئندہ کوئی مددگار نہ رہا۔

دشمنوں سے گھیرنا:

مذکورہ بالا اصول کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ قریش کے اطراف چاروں طرف مسلمان یا مسلمانوں کے حلیف ممالک اور قبائل جمع ہو جائیں۔ قبائل اسلم و خزاعہ اس کی بہت نمایاں مثال ہیں جو مکہ کے اطراف رہتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتداء سے یہ اصول تھا کہ بات کا پاس رہے اور حلیفوں کی مدد سے کبھی غفلت نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی فوجوں کی جنگی برتری فتوحات کی دھاک، معاشی وسائل پر زبردست اقتدار، ان تمام امور نے چو طرف کے

چھوٹے چھوٹے قبائل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع کر دیا تھا۔
وَعَايَہ کاری:

دشمنوں میں پھوٹ ڈالنا بھی ایک مفید اصول کے طور پر اکثر عہدِ نبویؐ میں برتا گیا تھا۔ جنگِ خندق اس سلسلے میں کئی نظیریں پیش کرتی ہے۔ محاصرہ کرنے والے متحدین میں سے قبیلہ غطفان کو اس پر آمادہ کر لیا گیا تھا کہ وہ بعض شرائط پر محاصرہ اٹھا کر اور قریش کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر ان شرائط پر خود مسلمان افسر آمادہ نہ ہوئے گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان پر راضی تھے۔

دوسری نظیر اسی جنگِ خندق میں قریش اور مدینے کے یہودیوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ اس میں جتنی زبردست کامیابی ہوئی اس سے سب واقف ہیں کہ قریش نے بیزار ہو کر محاصرہ اٹھا دیا اور بے نیل مرام واپس چلے گئے۔

دشمن کے ایک طبقے کو موہ لینا:

یہ اصول بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اوپر بیان ہوا کہ قریش کے غلہ کی منڈی جو یمامہ میں تھی بند کرادی گئی تھی۔ مورخ بیان کرتے ہیں کہ اس سے مکہ میں قحط نمودار ہو گیا۔ اس سال عرب میں بارش نہ ہونے سے عام کال بھی تھا۔ اس دباؤ کی قوت کا جب قریش کو اندازہ ہو گیا تو پھر یہ بندش اٹھالی گئی اور وہ بہت ممنون ہوئے یہی نہیں بلکہ اسی زمانے میں پانچ سو اشرفی کی خطیر رقم مکہ کے سردار ابوسفیان کو بھیجی گئی کہ مکہ کے فقراء میں تقسیم کر دے۔

ان کارروائیوں سے مکہ میں بیسیوں یہی خواہ پیدا ہو گئے اور اس طرح کی سیاست سے مختلف مواقع پر اور مختلف ممالک میں مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا۔

معزز دشمنوں کا اسلام میں بھی اعزاز:

اس مختصر تبصرہ کے آخر میں اس اصول کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو حدیث میں ہے کہ
 خیار کم فی الجاہلیۃ خیار کم فی الاسلام اذا فقهوا (غیر مسلم معزز

اسلام لانے پر بھی معزز رہیں گے۔ اگر وہ اسلامی قوانین سے بھی واقف ہو جائیں (یہی وجہ تھی کہ عمر بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے پر انہیں سابقین اولین کا سردار بنا کر فوجی مہموں میں بھیجا گیا۔ ابوسفیان نے اسلام قبول کیا تو نہ صرف انہیں انعام و اکرام دیا گیا بلکہ ان کا گھر امن گاہ قرار دیا گیا۔ انہیں لشکروں کی سرداری اور صوبوں کی گورنری بھی فوراً دی جانے لگی۔ خالد ابن الولید کو (باوجود احد میں مسلمانوں کی شکست کا واحد سبب ہونے کے) اسلام لاتے ہی سیف اللہ کے قابل رشک خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

اگر سیرت النبی کا ان امور کی تلاش کے لیے مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف مذکورہ بالا اصولوں کی مزید نظیریں ملیں گی بلکہ اور نئے سیاست کاری کے اصول بھی نظر آ سکتے ہیں۔ یقین ہے کہ اہل علم ان سے مستفید ہو کر اوروں کو محروم نہیں رکھیں گے۔

(نقوش لاہور۔ رسول نمبر (۳) جنوری ۱۹۸۳ء)

www.KitaboSunnat.com

عہد نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات

قبل اسلام:

جزیرہ نمائے عرب زیادہ تر صحرا ہے۔ اس لیے وہاں کی آبادی اپنی غذا تک کے لیے قدیم سے بیرونی درآمد کی محتاج رہی ہے۔ تعداد ازدواج سے آبادی میں تیز اضافہ اور ذرائع معیشت میں خانہ جنگیوں وغیرہ کے باعث روز افزوں انحطاط عربوں کو اکثر ترک وطن پر قدیم سے مجبور کرتا رہا ہے۔ ایک طرف وہ خطرناک بحری راستہ سے مشرقی افریقہ جاتے رہے، تو دوسری طرف شمال مشرق میں عراق کی طرف اور شمال مغرب میں فلسطین کی طرف بھی خشکی کے راستے تھے ہمیشہ ^۱ ان کا رخ رہا۔ بعد میں ملاچی مہارت بڑھنے پر وہ ہند اور چین تک تجارت کے لیے آنے جانے لگے۔

جہاں تک ایران کا تعلق ہے، اس کو سب سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ طے ہی سے سابقہ پڑا۔ چنانچہ اب یہ مسلمات سے سمجھا جاتا ہے کہ فارسی لفظ تازی اور اسی کا بگڑا ہوا چینی لفظ ”تاشی“ ^۲ (جس سے عرب مراد لیتے ہیں) اسی لفظ ”طی“ کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

۱۔ اس کی قدامت اور وسعت کے لیے دیکھیے میرا مقالہ ”عربوں کے تعلقات بریطانیوں سے“ مجلہ تحقیقات عالیہ جامعہ عثمانیہ سالنامہ سوم۔ مختصر یہ کہ سینٹ پاول کے زمانہ میں دمشق میں ایک عرب بادشاہ حارث حکمران تھا، تو حلب جیسے شمالی علاقوں تک میں عرب کی راجدھانیاں قائم ہو چکی تھیں۔

۲۔ بریٹ شائدر کا انگریزی رسالہ ”عربوں کے متعلق چینیوں کی معلومات“ (ص ۶)

ان تارکان وطن کی تعداد ایرانی صوبہ عراق میں اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ انہوں نے عہد نبویؐ سے صدیوں قبل حیرہ (کوفہ) میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی تھی اور محمی قبیلہ کے ان عرب حکمرانوں پر ماحول کا کچھ اتنا اثر پڑا کہ شام کی طرف جانے والے غسانیوں کے برخلاف انہوں نے خانہ بدوشی تک ترک کر دی اور بستیوں میں بس کر عربی تہذیب کی عظیم الشان خدمت انجام دینے لگے۔

ایرانی شہنشاہوں نے مختلف مصلحتوں سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ عرب اور ایران (عراق) کے مابین حد فاصل اور حاجز مملکت (Buffer-State) بنے اور خانہ بدوش بدویوں کی عراق میں لوٹ مار کی مہمیں خود یہ لوگ جھیلنے لگے۔ اور ایرانی امن میں ہو گئے تو دوسری طرف ایرانی جو روز افزوں آرام طلب ہوتے جا رہے تھے، مفت کے عرب رضا کاروں سے اپنی فوج میں کثیر تعداد میں کام لینے لگے۔ اس سے عربوں میں جنگجوی اور فوج آرائی کی روح نہ صرف تازہ رہی بلکہ صیقل پاتی اور فطرت میں رچتی گئی، تو ساتھ ہی ایرانی روز بروز جنگ سے ڈرنے لگے اور بزدل ہوتے گئے۔ ایرانی بیزنطینی جنگوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان عربی فوجوں نے جو فیصلہ کن اور عظیم الشان حصہ لیا اور ایرانی حکومت کے لیے صرف اپنے بل بوتے پر جو وسیع فتوحات حاصل کیں، ان سے ہر کوئی واقف ہے، ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ امر البتہ نمایاں کیے جانے کے قابل ہے کہ بیزنطینی قیصروں نے صجعمیوں اور پھر غسانیوں سے جنگی معاہدہ کر لیا اور ایرانی کسراؤں کے لیے بھی ناگزیر تھا کہ اسی کے مماثل طاقتور عربوں کو اپنا حلیف بنائے رکھیں۔

عرب کے جانوروں تک کی وفاداری ضرب المثل ہے۔ پھر حیرہ کے حکمرانوں پر کسرایان ایران کا اعتماد کیوں نہ بے پایاں ہوتا۔ کسی اور ملک میں یہ نظیر نہ ملے گی، جیسی یہاں ملتی ہے کہ کسراے ایران اپنے ولی عہد کو اپنے جو نیر حلیف بلکہ ماتحت حکمران حیرہ کے ہاں بھیج دے تاکہ وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہو۔ بعد میں بدوی روایات کے حامل اس شہزادے نے حکمران بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ حیرہ کا عربی ماحول مدائن کے

ایرانی ماحول سے کہیں زیادہ مفید و کردار ساز تھا۔

حیرہ والوں کی خدمات خود عرب کے لیے کچھ کم اہم نہ تھیں۔ عربی شعرا اور تاجر ہمیشہ ان کے دربار میں بھرے رہتے تھے اور غیر محسوس طور سے تاثر و تاثیر کرتے چلے جاتے تھے اور غالباً صحرائی نشینوں سے اس مسلسل تعلق ہی نے باوجود عیش و ترفہ کے نجی حکمرانوں میں بہت سی اچھی بدوی صفیتیں مثلاً بات کا پاس اور آن کے لیے جان تک کی پروا نہ کرنا، بہت کچھ برقرار رکھیں۔

عربی رضا کاروں کی وفاداری اور اطاعت شعاری نے رفتہ رفتہ دربار مدائن کو یہ بھلا دیا کہ حیرہ کمزور اور جو نیر حلیف سہی لیکن ماتحت اور غلام نہ تھا۔ مجوسی و مزدکی روایات نے عصمت و ناموس کا تصور ہی ایرانی دربار سے منادیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اس میں کوئی برائی ہی نہیں سمجھی، کہ انہی اصول کا اطلاق عرب حکمران کی بہو بیٹیوں پر کیا جائے۔ اس کے نتیجے سے سب واقف ہیں کہ حکمران حیرہ کو مدائن طلب کیا گیا اور اس وفا شعار نے جانتے بوجھے اس کی تعمیل کی، تو تحفظ عصمت کے جرم میں اس کا سر قلم کیا گیا اور شہ غرور میں چور شہنشاہ نے عاجز مملکت کو بھی فنا کر دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حیرہ میں ایرانی افسر آدھمکے اور گورائے نام ایاس بن قبیصہ نامی ایک عرب کو بھی وہاں کے عربوں کا سردار بنایا گیا، لیکن سلطنت حیرہ کا ایران سے الحاق کر کے ایک معمولی صوبہ بنا دیا گیا۔ یہ قصہ یہیں ختم نہ ہوا، بلکہ حکمران حیرہ نے اپنے پاس کا بعض امانتی مال اصل مالکوں کو پہنچانے کے لیے بعض بدوی قبائل کے سرداروں کے سپرد کیا تو شہنشاہی احکام اس کی فوری حوالگی کے لیے پہنچے اور انکار پر سزا دی اور عربوں کی بالکلیہ تباہی کے لیے ایک عظیم الشان ایرانی لشکر روانہ کیا گیا مگر اب کی دفعہ قدرت نے ایران کو ایک تنبیہ کرنی چاہی اور ذی قار کی جھیل پران کی فوج کو جان پر کھیلے ہوئے بدوؤں نے کاٹ کر رکھ دیا مگر دربار ایران نے بجائے سبق لینے اور اپنی اصلاح کرنے کے عربوں پر مزید ستم آرائی شروع کر دی اور انہیں روز افزوں اپنا دشمن بنانا شروع کیا (اب جناب

۱۔ مزدک نے ملکہ ایران کے متعلق بھرے دربار میں شہنشاہ سے جس بے باکانہ بے حیاتی کا اظہار کیا تھا، اس سے عربی خوان بے خبر نہ تھے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا مدنی دور زندگی شروع ہو چکا تھا) اور خلافت صدیقی کے آغاز پر اسی ایرانی سرحد کے ستم رسیدہ شنی شیبانی کا ایران پر حملے کے لیے اپنی رضا کارانہ خدمات کا پیش کرنا زیادہ تر ایران کی اسی عرب کش سیاست کا ردِ عمل تھا۔ اس واقعہ سے چند ہی سال قبل یمینوں کی دعوت اور تعاون سے ایرانیوں نے حبشیوں کو نکال کر یمن پر قبضہ کر لیا تھا اور ہرز کی فوجی گورنری کے بعد لایق باذان وہاں گورنر بنا لیکن پائے تخت ایران میں کچھ ایسی تیزی سے شاہ گردی ہو رہی تھی کہ مٹھی بھر ایرانی فوج کے لیے کسی مزید کمک کی غیر موجودگی میں یمن پر قبضہ رکھنا بڑا دشوار ہو گیا تھا۔

حیرہ اور یمن کے علاوہ مشرقی اور جنوب مشرقی عرب کے ساحلی علاقوں یعنی عمان اور الحسا میں بھی (جسے اس زمانہ میں بحرین کہا جاتا تھا) ایرانی اثرات مستحکم ہو گئے تھے۔ عمان میں جلندی بن المستکمر کا خاندان کسریٰ ایران کی طرف سے حکمران نامزد ہوا تھا، جس کے کچھ حالات محمد بن حبیب (التوفی ۴۳۵ھ) نے اپنی مشہور کتاب المحمر (مخطوطہ دائرة المعارف حیدرآباد) میں لکھے ہیں اور بعد میں اسی جلندی کے بیٹوں جفر اور عبد سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مخاطب فرمایا تھا۔ عمان وسیع ملک ہے، وہاں کے ایک اور عرب سردار ہوزہ بن علی کو کسریٰ نے ایک جواہر نگار ٹوپی عطا کی تھی، اس لیے اس کا لقب ذوالتاج یا صاحب التاج مشہور ہو گیا تھا (دیکھیے اشتقاق ابن درید ص ۲۰۹، عقد الفرید ابن عبد ربہ جلد ۲ ص ۶۷) الحسا میں کسی عرب ریاست کا بظاہر پتہ نہیں چلتا اور وہاں کے صدر مقام ہجر میں ایرانی فوجی گورنر (مرزبان) رہا کرتا تھا۔ بعض غیر موروثی عرب افسر بھی تھے۔

عرب مولفوں کے ہاں اس قسم کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں۔ فلاں عربی شیخ نے فلاں بادشاہ (کسریٰ، قیصر، نجاشی وغیرہ) کے ہاں باریابی حاصل کی۔ ابن عبد ربہ نے اس کا ایک مستقل باب (الوفادات) ہی قائم کیا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص سے خوشنودی کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ شیخ کی خواہش پر کسریٰ نے ایک مہندس (انجینئر) بھیجا جس نے وادی وچ میں ایک فصیل دار قلعہ تعمیر کیا، جسے طائف کہنے لگے (کتاب الاغانی جلد ۱۲ ص ۲۸-۲۹)۔ اس کے استحکام کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا

ہے کہ فتح مکہ وحین کے بعد طائف کو اسلامی فوجوں نے آگھیرا تھا اور باوجود منجھنق اور دباہوں کے استعمال کے محاصرہ ختم ہوتا نظر نہ آیا اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید جانی نقصان نا مناسب سمجھ کر محاصرہ اٹھالیا تھا۔

ابتدائے اسلام:

ایران آتش پرست تھا۔ انتہائی جنسی اباحت رکی بھی تو حقیقی بہنوں اور صلبی بیٹیوں تک کو وہاں ازدواجی اغراض کے لیے محرمات میں نہیں شامل کیا جاتا تھا۔ غالباً اسی قسم کے معاملات ہوں گے، جس نے مشرک عیسائیوں کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں مجوسیوں پر قابل ترجیح بنا دیا تھا۔ قرآن مجید کی سورہ روم بھی انہی جذبات کی ترجمان ہے۔

ابن ہشام (ص ۲۷۸) وغیرہ نے روایت کی ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کو اسلام کی دعوت اور اسلام کی مدد کی ترغیب دیتے تو علاوہ اخروی روحانی ثواب کے وعدے کے یہ پیش گوئی بھی فرماتے کہ کسریٰ و قیصر کی دولت تمہارے ہاتھوں پر نچھاور ہوگی۔ جنگ خندق میں سنگِ مرمر کی چٹانوں کو توڑتے وقت چنگاریاں اڑنے پر اسی پیش گوئی کا اعادہ فرمایا گیا تھا۔ (دیکھو طبری وغیرہ)

میں نے ایک مستقل مضمون میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔^۱ کہ صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے ”فتحِ مبین“ اور ”نصرِ عزیز“ کیوں کہا ہے اور کس لیے اسے اسلام اور مسلمانوں کی سیاسی کامیابیوں کا شہ کار سمجھا جاتا ہے (مشہور عام خیال تبلیغ کی سہولت کچھ دل کو نہیں لگتا) یہاں اس کا دہرانا غیر ضروری ہے۔ بہر حال اس صلح سے جہاں مسلمانوں کے ہاتھ کھل گئے اور وہ خیبر کے نمودیر خطرے کا دو ہی تین ماہ میں استیصال کے قابل ہو گئے، وہیں انہیں منیوا میں ایرانیوں کی بیڑنظییوں (رومیوں) کے ہاتھوں عہد آفرین شکست کے سلسلہ میں بین الممالک صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا

۱۔ دیکھیے رسالہ سیاحت حیدرآباد کن اپریل ۱۹۳۲ء

موقع مل گیا۔ (نیزو کی لڑائی شعبان ۶۵ھ میں ہوئی، اس کے بعد ہی صلح حدیبیہ ہوئی) بلاذری (فتوح ص ۷۹) اور ابن الاثیر (کامل ۲/۱۷۵) نے بیان کیا ہے کہ ایرانی مقبوضہ بحرین کے ایک عربی النسل افسر منذر بن ساوی کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا خط لکھا ہی میں روانہ کیا تھا۔ غالباً کسرے ایران کا خط بھی اسی نامہ بر کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہوگا، جس نے بحرین کے حاکم سے خواہش کی کہ اسے کسرے کے پاس مدائن بھیج دے۔

یہاں اس کی غالباً ضرورت نہیں کہ سواہ، بحرین، عمان، یمن وغیرہ عرب کے جملہ ایرانی مقبوضات سے عہد نبویؐ میں جو اسلامی تعلقات رہے، ان کی پوری تفصیل اور ان کا ارتقاء بتایا جائے ورنہ ان علاقوں کے ایرانی افسروں یا عرب شیوخ کے نام لکھے ہوئے کئی درجن نامہ ہائے نبویؐ تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ ایک منذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے نام کے نو خط ملتے ہیں۔ جن میں بحرین کی سیاسیات کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ ان کے متن کے لیے میری حقیر تالیف ”الوثائق السیاسیہ“ دیکھی جاسکتی ہے (جس کی طباعت کے بعد اوائل ۱۳۶۱ھ میں کتب خانہ خدا بخش مرحوم پٹنہ میں قبیلہ عبدالقیس سے کیا ہوا اور ایک اور معاہدہ کتاب وسیلۃ المتعبدین میں دستیاب ہوا ہے) یہاں صرف شہنشاہ ایران سے خط و کتابت پر کچھ بحث کی جائے گی جس میں متعدد گتیاں سلجھانی ہیں۔

تمام اسلامی مورخوں، محدثوں اور دیگر مولفوں نے متفقہ طور سے بیان کیا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ہی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے نام اسلام کے تبلیغی خطوط بھیجے تو ان میں سے ایک کسرے ایران کے نام بھی تھا۔ اس کا متن جس میں کچھ لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں، یہ ہے:

- ۱۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم
- ۱۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم
- ۲۔ من محمد رسول اللہ الی کسری عظیم فارس۔
- ۲۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے سردار ایران کسری کے نام

۳۔ سلام علی من اتبع الهدی وامن باللہ ورسولہ
 ۳۔ ہدایت پر چلنے اور خدا و رسول پر ایمان لانے والے کے
 لیے سلامتی ہو۔

۴۔ وادعوك بدعاية الله فاني انارسل الله الى
 الناس كافة

۴۔ میں تجھے خدا کا بلاوا دیتا ہوں کیونکہ مجھے خدا نے تمام
 انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔

۵۔ لا نذر من كان حياً و يحق القول على الكافرين
 ۵۔ تاکہ میں ہر زندہ شخص کو ڈراؤں، کافروں کے متعلق خدا کی
 بات پوری ہو کر رہے گی۔

۶۔ فاسلم تسلم

۶۔ اسلام لاسلامت رہے گا۔

۷۔ فان ابیت فان اثم المجوس عليك

۷۔ اگر تو انکار کرے تو تمام مجوسیوں کا وبال تجھی پر پڑے گا۔

یہ متن تاریخ طبری ص ۱۵۷، ص ۱۵۷۲ (دور وایتیں) صبح الاشی قلقتندی جلد ۶
 ص ۲۹۶، کتاب الصنائعین لابی ہلال العسکری، نیز جلد ۶ ص ۳۷۸، اعلام السالکین عن
 کتب سید المرسلین لابن طولون مکتوب ۳، المواہب اللدنیہ للقسطلانی جلد نمبر ۱ ص ۲۹۱،
 تاریخ یعقوبی جلد ۲ ص ۸۳، نصب الرایۃ الاحادیث الہدایۃ للزیلعی مکتوب نمبر ۹، مفید
 العلوم وبلید الہوم، للقرظینی مکتوب نمبر ۲، دلائل النبوة لابی نعیم جلد ۲ ص ۱۲۲، المشتقی لابی
 نعیم ورق ۳۵/ب (مخطوط حیدرآباد دکن) لفریدون یک جلد ۱ ص ۳۱، وسیلۃ المستعبدین
 لعمر الموصلی جلد ۸ ورق ۲۷/ب (مخطوطہ بانکی پور) میں مکمل ملتا ہے اور طبقات ابن سعد،
 اموال ابی عبید، صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل وغیرہ میں جستہ جستہ ملتا ہے۔ اس پر
 کاتبانی نے اپنی اطالوی تاریخ اسلام میں اور اسپرنگر نے اپنی جرمن کتاب سوانح و
 تعلیمات محمد میں بحث کی ہے۔ ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے اجلاس دوم کی روداد میں

میرا بھی ایک انگریزی مضمون اس خط کے متعلق ملے گا۔

جیسا کہ ابھی بیان ہوا، یہ متن مختلف تاریخوں نے لفظی اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اہم تر یہ ہے، بعض روایتوں میں ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ حذف ہو گیا ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں، کیونکہ حذف عبارت کا عام رواج رہا ہے۔

قلقشندی نے ابو ہلال عسکری سے جو متن نقل کیا ہے، صرف اسی ایک روایت میں ”کسرے ابرویر عظیم فارس“ کے الفاظ ہیں اور باقی کسی نے بھی پرویز کا نام نہیں لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پرویز کا نام بعد کا قیاسی اضافہ ہے، واللہ اعلم

ف ۳: میں طبری کی ایک روایت میں واشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ وان محمداً عبده ورسوله کے الفاظ زاید ہیں، جو اصل فقرے کی صرف شرح معلوم ہوتی ہے۔

ف ۴: میں دعاء اللہ اور دعاۃ اللہ کی روایتیں عام ہیں۔ رسالات نبویہ مولفہ عبدالمعتم خاں ٹوکنی نے دعاء الاسلام کہیں سے نقل کیا ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔

ف ۵: میں قرآنی آیت کے لحاظ سے بعض روایتوں میں ”لینذر“ بھی مروی ہے، جو عربی کے لحاظ سے ذرا تکلف سے ٹھیک ہوگا۔

ف ۷: میں ”فان“ کی جگہ ”وان“ اور اسی طرح ”ابیہ“ کی جگہ ”تولیت“ نیز ”انتم المجوس علیک“ کی جگہ ”علیک انتم المجوس“ وغیرہ فرق بھی ملتے ہیں، جو روایت بالمعنی کا نتیجہ ہیں۔ ان سے مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غرض یہ خط عبداللہ بن حذافہ السہمی بحرین کے حاکم کے پاس لے گئے تھے، یہ ٹھیک طور سے نہیں معلوم ہوتا کہ آیا عبداللہ بن حذافہ ہی مدائن گئے تھے یا حاکم بحرین نے اپنے کسی آدمی کے ہاتھ اسے پائے تخت روانہ کیا تھا۔ بہر حال تمام اسلامی مولف بیان کرتے ہیں کہ کسریٰ (خسر و پرویز) نے طرزِ مخاطب دیکھتے ہی پورا خط پڑھے بغیر چاک کر دیا اور نامہ بر کو سامنے سے نکلوا دیا۔ اس کے علاوہ یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسریٰ نے یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ دو آدمی مدینہ روانہ کرے اور نبی صلی اللہ

علیہ وسلم عربی کو برضا مندی ورنہ گرفتار کر کے مدائن روانہ کرے۔ جب یہ لوگ مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا۔ اس پر وہ یمن چلے آئے اور جلدی ہی مدائن سے کسریٰ شیرویہ نے سرکاری اطلاع بھیجی کہ اس نے مصلحت عامہ کے تحت اپنے باپ کو قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا ہے اور کہتے ہیں کہ شیرویہ کی پدرگشی کی تاریخ وہی تھی، جو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی اور اس معجزہ کو دیکھ کر باذان اور بہت سے یمنی مسلمان ہو گئے۔

یہ واقعہ سیرت ابن ہشام (ص ۴۶) پر مذکور ہے جو بہ ظاہر ابن اسحاق کا بیان نہیں ہے بلکہ ابن ہشام نے زہری کی روایت خود اضافہ کی ہے۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷ میں جہاں بادشاہوں کے نام خطوط کا ذکر ہے وہاں کسریٰ کے سلسلہ میں یہ قصہ بیان نہیں ہوا ہے۔ تاریخ طبری (ص ۱۵۷۲ تا ۱۵۷۴) میں جہاں اس سفارت کا ذکر ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل ہوا ہے، وہیں زہری کی روایت صرف اتنی بیان ہوئی ہے کہ کسریٰ کے نامہ مبارک کو پارہ پارہ کر ڈالنے کی اطلاع ملی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا اس کے ملک کو بھی پارہ پارہ کر دے اور طبری نے شیرویہ کی پدرگشی کا قصہ زہری کے اس قطع کلام کے بعد یزید بن حبیب کی روایت کی بناء پر نقل کیا ہے اور وہاں زہری کا اس سے تعلق نہیں ہے۔

اس اختلاف کو ہم کوئی خاص اہمیت عام حالتوں میں نہیں دیتے لیکن طبری نے جہاں یہ قصہ ۶ھ کے حالات میں حدیبیہ کے بعد بیان کیا ہے وہیں ایران قدیم کے حالات ہیں (ص ۱۰۰۹ پر) یہ جملہ بھی عکرمہ کے حوالہ سے ایک غیر مربوط قصہ کے آخر میں لکھا ہے:

فاهلك الله كسرى وجاء الخبر الى رسول الله (صلی

الله عليه وسلم) يوم الحديبية ففرح و من معه۔

چنانچہ خدا نے کسریٰ کو ہلاک کر دیا اور اس کی اطلاع جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ کے دن پہنچی جس سے آپ

کو اور آپ کے ساتھیوں کو خوشی ہوئی۔

جب خسرو پرویز کے مرنے کی اطلاع حدیبیہ کے دن آچکی تھی، تو پھر بعد میں پرویز کے نام خط لکھنا اور پدرگشی کی اطلاع بطور معجزہ دینا سب بے بنیاد قصے بن جاتے ہیں۔ کثیر نویسی کی وجہ سے طبری کے ہاں بلا تنقید متضاد روایات کا آجانا اور روایات میں بھی بے احتیاطی سے قطع و برید ہو جانا ایک معروف واقعہ ہے جس سے ہر وہ شخص واقف ہے، جس نے طبری کا غور سے مطالعہ کیا ہے۔

اسی بنا پر ابو نعیم کی دلائل النبوة (جلد ۲ ص ۱۲۴) کی یہ روایت خاص توجہ کی مستحق ہے کہ:

”رومہوں کے ہاتھوں ایرانیوں کو اسی دن شکست ہوئی تھی، جس دن حدیبیہ کی صلح ہوئی اور جب اس کی اطلاع پہنچی تو جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی خوشی ہوئی (کہ قرآن مجید کے سورہ روم کی کئی سال قبل کی پیشگوئی پوری ہو گئی)۔“

نیذا کی لڑائی شعبان ۶ھ (دسمبر ۶۲۷ء) میں ہوئی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ عام طور سے اسلامی مورخ یہ بیان کرتے ہیں کہ مہم حدیبیہ کے لیے مسلمان مدینہ سے ذی قعدہ ۶ھ میں نکلے لیکن امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۱۲۸) میں روایت بیان کی ہے کہ جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے لیے رمضان میں نکلے۔ تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۴) میں حدیبیہ کے ذی قعدہ میں پیش آنے کا ذکر کر کے اس بات پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے کہ عرودہ کے بیان کے مطابق صلح حدیبیہ ماہ شوال میں منعقد ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر زمانہ کی تاریخیں نہ تو بیزنطینیوں کے ہاں محفوظ رہیں، نہ ایرانیوں کے ہاں اور نہ حبشیوں کے ہاں۔ ان حالات میں ایک واحد استثناء خاص توجہ کا محتاج ہے، وہ یہ کہ قیصر ہرقل اور کسریٰ پرویز میں جب آخری فیصلہ کن لڑائی ہوئی، تو قیصر میدان جنگ سے وقتاً فوقتاً اپنے بیٹے کو خط روانہ کرتا رہا۔ اتفاق سے یہ اب تک محفوظ ہیں اور انہی میں سے ایک میں قیصر نے اپنے بیٹے کو لکھا ہے کہ

”خبر آئی ہے کہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شہروہ نے ۲۷ فروری ۶۲۸ء کو قتل کر ڈالا ہے۔ ۱۔ (جو وسط رمضان ۶ھ کے مطابق ہے) قرآنی شہادت قیصر کے اس خط کی صحت کی تائید کرتی ہے۔ شعبان میں نینوا میں فیصلہ کن شکست کھانے کے بعد وسط رمضان میں اس کا مارا جانا کوئی تعجب کا حامل نہیں اور بظاہر قیصر کو اس واقعہ کے بیان کرنے میں عدا جھوٹ پر آمادہ کرنے کی کبھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اسی وجہ سے واقدی کا یہ بیان کرنا کہ:

”شہروہ نے اپنے باپ کسریٰ کو منگل کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ ۷ھ کو قتل کیا جب کہ چھ گھڑی رات گزر چکی تھی۔“
(تاریخ طبری ص ۱۵۷۴)

اپنے اندر مقابلہ کم کشش رکھتا ہے۔
غرض اس وقت جو گتھیاں نظر آتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ قیصر ہرقل کی جنگوں کے متعلق بھی بڑی پیچیدگیاں ہیں۔ اس موضوع پر سب سے مستند کتاب جرمن زبان میں گیرلانڈ (Gerland) کی ہے جس کا نام ”قیصر ہرقل کی ایرانی مہمیں“ Die Persische Peldzuge Des Kaisers Heraklius ہے۔ یہ واقعہ اس کتاب میں یونانی مورخ تیوفان کے حوالہ سے نقل ہوا ہے۔

عام مورخین	ہر قل کا خط	ابن کثیر فی فی روایہ	واقعی	ابو یوسف	الوہیم	طبری فی روایہ	واقعی
شعبان لاھ	-	یوم الحدیبیہ	-	-	-	-	نبیوا میں ایرانی شکست
	وسط رمضان لاھ	-	۱۰ جمادی الاولیٰ لاھ	-	-	یوم الحدیبیہ	کسری پر یز کا قتل بیٹے کے ہاتھ
حدیبیہ کے کئی ماہ بعد تقریباً ربیع الثانی یا جمادی الاولیٰ میں	-	-	-	-	یوم الحدیبیہ	-	اس قتل کی اطلاع جناب رسالتنا کو پہنچنا
ذی قعدہ لاھ	-	-	-	رمضان لاھ	-	-	حدیبیہ کے لیے روانگی صلح حدیبیہ
تقریباً اواخر ذی قعدہ یا اوائل ذی الحجہ لاھ	-	شوال لاھ	-	-	-	-	

ان میں ممکن ہو تو باہم تطابق دینے ورنہ کسی ایک کے بیان کو ترجیح دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس طرف توجہ کرنے سے قبل دو اہم امور بطور تمہید ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد نے سیرۃ نبویہ کے واقعات کو کبھی تو ہجری سنہ سے بیان کیا ہے اور کبھی ہجرت کے وقت سے اور سب جانتے ہیں کہ ہجرت ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی اور سنہ ہجری اس سے کوئی دو ماہ اٹھارہ دن قبل کیم محرم سے شمار کیا جاتا ہے۔ اسی لیے مثلاً جنگ بدر کا ذکر کرنا ہو تو ماہ نہم (رمضان) ۲ھ یا ہجرت سے ایک سال چھ ماہ بعد کہنا پڑے گا۔ واقدی نے کسی ایک طریقہ شمار کا چونکہ شروع سے آخر تک لزوم نہیں رکھا ہے، اسی لیے من الهجرة (ہجرت کے وقت سے) اور للہجرة (ہجری سنہ سے) کہنے سے بآسانی غلط ملط ہو سکتا ہے۔ مزید برآں اگر راوی کی صرف روایت پہنچی ہو اور اس سے بالمشافہ جرح اور تعین کا موقع نہ ہو اور راوی نے ہجری سنہ مراد لیا ہو اور واقدی نے وقت ہجرت سے مدت مراد ہونی سمجھی ہو، تو نادانستہ تین ماہ کا بڑی آسانی سے فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ خاص کر اس لیے کہ واقدی نے مہینے کا نام لینے کے لیے اکثر مہینوں کی گنتی دی ہے کہ ہجرت کے اٹھارہ یا بیس مہینوں بعد، وغیرہ

۲۔ جناب رسالتآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی حجہ ۱۰ھ میں سال کبیسہ کو عربی مہینوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے منسوخ فرما دیا اور خطبہ حجۃ الوداع میں اس کی قرآنی ممانعت (انما النسئ زیادة فی الکفر الایہ) کو دہرانے کے بعد ارشاد فرمایا تھا:

وان الزمان قد استدار کھیئة یوم خلق اللہ

السموات والارض۔

زمانہ چکر کھا کر پھر وہی شکل اختیار کر چکا ہے جیسا خلقتِ آسمان و

زمین کے وقت تھا۔

(سیرۃ ابن ہشام - ص ۹۶۸، تاریخ طبری ص ۱۷۵۴ وغیرہ)

اور متفقہ طور سے اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ اس وقت ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر قمری اور کبیسہ دونوں لحاظ سے ذی حجہ باہم جمع ہو گئے تھے۔ قمری اور کبیسہ مہینوں

کے متعلق عربی مورخوں نے جو بیانات چھوڑے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر تیسرے سال قبیلہ بنی فقیہ کا سردار (جس کا لقب قلمس ہوا کرتا تھا) حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص رسم کی انجام دہی کے ذریعہ سے اعلان کرتا تھا کہ اب جو ذی حجہ چل رہا ہے، اس کے بعد نیا چاند نظر آئے، تو وہ محرم الحرام کا نہ ہوگا (بلکہ ایک گم نام اور محترم مہینا ہوگا) اور اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا ہوگا۔ (جدید علم ہیئت بھی یہی کہتا ہے کہ قمری سال میں شمسی سال سے دس دن کم ہوتے ہیں اور ہر تیسرے سال ایک مہینا کا فرق پڑ جاتا ہے) اس بیان کے بموجب اگر **ہا** میں دونوں قسم کے مہینے یکجا ہو گئے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ:

شہ		۹		۸		۷		۶	
کیسہ کی	ہجری مدنی	کیسہ کی	ہجری مدنی	کیسہ کی	ہجری مدنی	کیسہ کی	ہجری مدنی	کیسہ کی	ہجری مدنی
حرم	حرم	حرم	حرم	حرم	حرم	حرم	حرم	حرم	حرم
صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر	صفر
ربیع ۱	ربیع ۱	ربیع ۱	ربیع ۱	ربیع ۱	ربیع ۱	ربیع ۱	ربیع ۱	ربیع ۱	ربیع ۱
ربیع ۲	ربیع ۲	ربیع ۲	ربیع ۲	ربیع ۲	ربیع ۲	ربیع ۲	ربیع ۲	ربیع ۲	ربیع ۲
جمادی ۱	جمادی ۱	جمادی ۱	جمادی ۱	جمادی ۱	جمادی ۱	جمادی ۱	جمادی ۱	جمادی ۱	جمادی ۱
جمادی ۲	جمادی ۲	جمادی ۲	جمادی ۲	جمادی ۲	جمادی ۲	جمادی ۲	جمادی ۲	جمادی ۲	جمادی ۲
رجب	رجب	رجب	رجب	رجب	رجب	رجب	رجب	رجب	رجب
شعبان	شعبان	شعبان	شعبان	شعبان	شعبان	شعبان	شعبان	شعبان	شعبان
رمضان	رمضان	رمضان	رمضان	رمضان	رمضان	رمضان	رمضان	رمضان	رمضان
شوال	شوال	شوال	شوال	شوال	شوال	شوال	شوال	شوال	شوال
ذی قعدہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ	ذی قعدہ
ذی حجہ	ذی حجہ	ذی حجہ	ذی حجہ	ذی حجہ	ذی حجہ	ذی حجہ	ذی حجہ	ذی حجہ	ذی حجہ

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ذی قعدہ ۶ء مکی میں جب صلح حدیبیہ ہوئی، تو رمضان ۶ء ہجری چل رہا تھا اور اس طرح عروہ کا یہ کہنا کہ مہم حدیبیہ شوال میں ختم ہوئی یا امام ابو یوسف کا کہنا کہ حدیبیہ کے لیے مسلمان رمضان میں نکلے تھے اور عام مورخین کا اس واقعہ کو ذی قعدہ میں قرار دینا، ان میں باہم کوئی تضاد نہیں، چونکہ اُس وقت تک سال کبیہ منسوخ نہیں ہوا تھا اور مکہ پر قریش ہی قابض تھے، اس لیے ان کے حج کا موسم ان کے ذی قعدہ سے شروع ہوا تھا۔ حالانکہ خالص قمری حساب سے ابھی رمضان ہی کا مہینا چل رہا تھا۔

سنہ ہجری اور وقت ہجرت کے فرق کے تین مہینے اور قمری اور کبیہ سالوں کے ۶ھ میں فرق کے تین مہینے جملہ چھ مہینوں کا فرق، یہ بڑی آسانی سے واقدی کی اس روایت کی توجیہ کر دیتا ہے کہ پرویز کا قتل ذی قعدہ (مکی) کی جگہ جمادی الاولیٰ میں کیوں بیان کیا گیا، دوسرے الفاظ میں راوی نے کہا ہوگا کہ سنہ ہجرت اکہترویں مہینے میں اور واقدی نے وقت ہجرت (ربیع الاول) سے حساب کیا اور نہ تو دو کبیہ سالوں کا خیال رکھا اور نہ ہجرت اور سنہ ہجری کے فرق کا لحاظ کیا اور سنہ ہجرت کے اکہترویں مہینا یعنی ذی قعدہ ۶ء مکی کی جگہ جمادی الاولیٰ ۶ھ بیان کر دیا۔

واقدی نے یہ نہیں بیان کیا ہے کہ خسرو پرویز کے اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارے جانے کی تاریخ انہیں کس ماخذ سے معلوم ہوئی۔ اگر اس تاریخ کے متعلق یونانی مورخ کا بیان (خود قیصر ہرقل کے خط کی بنا پر) صحیح مانا جائے تو یہ واقعہ ۲۷ فروری ۶۲۸ء (مطابق وسط رمضان ۶ھ م وسط ذی قعدہ ۶ھ مکی) کو ہوا ہوگا اور یہ روایت قطعاً رد کردینی پڑے گی کہ کسریٰ کے حکم سے جب یمن سے دو ایرانی افسر مدینہ آئے تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ”آج رات میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کر دیا۔“ اور یہ کہ اس پیش گوئی یا غیب گوئی کے صحیح ثابت ہونے پر گورنر یمن مع حوالی موالی مسلمان ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اپنی عظمت کی برقراری کے لیے ایسے کسی معجزہ کی محتاج نہیں، خاص کر جب کہ اس معجزہ کا حال کچھ بہت زیادہ مستند ذرائع سے بھی معلوم نہیں ہوتا ہے اور اس کے متعلق خود عرب

مولف متضاد باتیں بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر واقدی کی روایت کہ یہ قتل ۱۰ جمادی الاولیٰ کو ہوا، صحیح بھی مانی جائے تو متعدد علمی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پرویز کے قتل کی جو تاریخ ایرانی اور رومی ذرائع سے متعین ہے، اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔ اسی لیے طبری کی روایت کہ کسریٰ کے قتل کی اطلاع حدیبیہ کے دن آئی، اصل میں اس روایت کی بگڑی ہوئی شکل ہے، جو ابو نعیم نے بیان کی ہے کہ نینوا کی شکست کی خبر حدیبیہ کے دن آئی اور اس میں کوئی امر مانع نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ حدیبیہ سے مہینا بھر پہلے کا واقعہ تھا اور اس عرصہ میں ایران کی خبر اس زمانہ میں مکہ تک آسکتی تھی۔ مجھے اپنے ان اخذ کردہ نتائج پر اصرار نہیں ہے اور اگر کوئی اہل علم ان کی اصلاح کر سکیں اور گتھیوں کو سلجھا سکیں تو سیرۃ نبویہ کی ایک الجھن رفع ہو سکے گی۔

واللہ الہادی الی الصواب وهو الموفق والیہ المآب۔

تتمہ:

جیسا کہ عرض کیا گیا جناب رسالتآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ”کسریٰ عظیم الفرس“ کے نام خط روانہ فرمایا تھا، ابو ہلال عسکری کی روایت کہ خط میں ”کسریٰ ابرویز“ لکھا ہوا تھا، ممکن ہے کہ صحیح ہو اور باوجود پرویز کے قتل ہو چکنے کے اس کی اطلاع اس وقت تک مدینہ منورہ نہ آئی ہو، لیکن پرویز کے قتل کے بعد مدائن میں جو شاہ گردی شروع ہوئی، اس کے باعث یہ معلوم نہیں کہ وہ نامہ مبارک دراصل کس نے وصول کیا۔ بہر حال ایران کی پریشان صورت حال کے باعث جناب رسالتآب صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست ایرانی مقبوضات عرب کے افسروں سے مخاطبت شروع فرمائی۔ چونکہ ان مٹھی بھر ایرانیوں کو اب مدائن سے کسی کمک اور مدد کی توقع نہ رہی تھی جیسا کہ طبری نے (تاریخ ص ۱۹۹۰ میں) بیان کیا ہے کہ کم از کم یمن میں ایک وطنیت پسند تحریک زور و شور سے اٹھ چکی تھی کہ مداخلت کنندہ ایرانی غیر ملکوں کو نکال باہر کیا جائے، اس لیے علاوہ اور اسباب کے کوئی تعجب نہیں کہ اپنی جان و مال کے اس خطرہ کو دیکھ کر ان ایرانیوں

۱۔ گوا ابو نعیم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نینوا کی شکست ہی حدیبیہ کے دن ہوئی۔

نے اسلام قبول کرنے اور حکمران عرب صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت حاصل کرنے کی جانب ترغیب پائی ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ یمن، عمان، بحرین، وغیرہ کے ایرانی مقبوضات دیکھتے کے دیکھتے مدائن سے ٹوٹ کر مدینہ سے جڑ گئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست خارجہ کچھ اتنی کامیاب ہو رہی تھی کہ ماقبی علاقوں کے لیے مدائن کو فکر ہونے لگی۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں جب قسمت نے بوران دخت کو تخت کیانی پر پہنچایا، تو اس نے جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحفے تحائف بھیج کر دوستی کی طرح ڈالنی چاہی (جیسا کہ تاریخ طبری ص ۳۱۶۳ میں صراحت سے اور ترمذی شریف جلد ۲ ص ۲۹۶ باب قبول الہدایا میں بلا صراحت نام اس کا ذکر ملتا ہے)

ضمیمہ:

نسی کے متعلق عرب مولفوں میں سے البیرونی وغیرہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ سال قمری کو سال کیسہ بنانے کا نام ہے تو بعض مولف یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اشہر حرم کی طوالت سے گھبرا کر غیر حرام مہینا بیچ میں شامل کیا جانے کا نام تھا تا کہ اس زمانہ میں لوٹ مار کی جاسکے۔ غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ”نسی“ کی حرمت کے کئی سو سال بعد جب خالص قمری سنہ میں پہلے ہوئے بعض عرب مولف اس کو سمجھ نہ سکے اور جس طرح قمری و شمسی سال میں سالانہ دس دن کا فرق قدیم زمانہ میں عام بدویوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا اور وہ قلمس کی کیسہ گری کو محض یہ سمجھتے تھے کہ مسلسل تین حرام مہینوں کی دل برداشتہ کرنے والی طوالت کو توڑنے کے لیے ایک غیر حرام مہینا لایا گیا ہے، بالکل اسی طرح ان بدویوں کی اولاد اور ان کی کہاوتوں اور روایتوں کے حامل مسلمان علماء بعد کو زیادہ غور کیے بغیر بدویوں کی روایتوں کو اسلامی ادبیات میں شامل کرنے لگے۔ نسی کے متعلق سویڈن کے پروفیسر موبرگ (Moberg) نے جرمن زبان میں ۱۹۳۱ء میں جو مقالہ لکھا ہے، وہ چاہے نتائج کے لحاظ سے غیر تشفی بخش ہو لیکن مواد اور حوالوں کے اعتبار سے بہت مفید ہے، اس کا خلاصہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں بھی دیا گیا ہے۔

(معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۳۲ء)

نوٹ: بعد میں یہ مضمون نقوش لاہور رسول نمبر جلد ۳ میں بھی شائع ہوا۔

آنحضرت ﷺ کا نام مبارک کسری کے نام ایک نئی دریافت

دریافت:

مئی ۱۹۶۳ء کی دسویں یا اس کے لگ بھگ زمانے میں ساری دنیا کے اچھے اخباروں نے بیروت کی یہ اطلاع شائع کی کہ وہاں کے سابق وزیر خارجہ ہنری فرعون کے موروثی ذخیرے میں اصل مکتوب نبویؐ بنام کسری دستیاب ہوا ہے۔ اس سے چند ماہ پہلے اس کا فوٹو راز میں پاریس کے کتب خانہ عام کو رائے کے لیے بھیجا گیا تھا اور مجھ سے بھی وہاں رائے طلب کی گئی تھی۔

پھر ۲۲ مئی ۱۹۶۳ء (مطابق ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ) کو بیروت کے روزنامہ الحیاء میں ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے اس نامہ مبارک کا فوٹو بھی چھاپا اور اس پر ایک تحقیقی مضمون بھی شائع کیا۔ چونکہ یہ دریافت انہی نے کی اس لیے یہاں اس کے ضروری اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔ ضمناً یہ اشارہ کرتا چلوں کہ اس کے کوئی دو سال بعد مجھے بیروت جانے کا موقع ملا تو وہاں ہنری فرعون صاحب کی وفور عنایت سے اصل کے دیکھنے کا مجھے بھی شرف حاصل ہوا اس لیے کہیں کہیں اپنے مشاہدے کی کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا۔

صلاح الدین منجد صاحب لکھتے ہیں:

(الف) ہنری فرعون کے والد نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر یہ دستاویز دمشق میں ڈیڑھ سواشرنی میں خرید کی یا تو خود اسے معلوم نہ تھا، یا یہ کہ اس نے اپنے اہل خاندان کو نہ بتایا کہ یہ کیا چیز ہے، بہر حال ہنری فرعون کو ۱۹۶۲ء تک معلوم نہ تھا کہ یہ ایک مکتوب نبویؐ ہے۔ نومبر ۱۹۶۳ء کے آخر میں اس نے یہ صلاح الدین منجد کے سپرد کیا کہ اس کو پڑھنے کی کوشش کریں۔

(ب) یہ ایک رَقّ (جھلی) ہے جو ایک سبز کپڑے پر جس کا رنگ مرور زمانہ سے تبدیل ہو گیا ہے، چسپاں ہے اور کپڑا بھی مالیدہ ہو گیا ہے، اور یہ سب ایک کانچ کے فریم میں جڑا ہوا ہے۔ مزید برآں:

(۱) جھلی پرانی اور نرم ہے، اور گہرے خاکی رنگ کی ہے، اس کے کنارے کالے

پڑ گئے ہیں۔ یہ (۲۸) سنٹی میٹر لمبی اور (۲۱/۲) سنٹی میٹر چوڑی ہے۔

(۲) یہ جھلی مستطیل سی ہے مگر چوڑائی یکساں نہیں، اوپر زیادہ چوڑی ہے نیچے کم۔

(۳) اس پر عبارت (۱۵) سطروں میں ہے مگر کوئی سطر (۳۱/۲) سم ہے تو کوئی

(۲۱/۲) سم۔

(۴) عبارت کے نیچے ایک گول مہر ہے جس کا قطر (۳) سم ہے۔

(۵) جھلی کے نچلے حصے نے پانی کا مار کھایا ہے جس کے باعث بعض جگہ (حروف یا)

الفاظ مٹ گئے ہیں اور بعض جگہ مدہم ہو گئے ہیں۔ مہر کی عبارت مٹ گئی ہے

بجز حرف ”ز“ کے جو مہر کے وسط میں ہے جو غالباً لفظ ”رسول“ کی بقایا ہے۔

(۶) اس جھلی کو کسی نے پھاڑنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ وہ تیسری سطر دائیں طرف

سے وسط تک چیری گئی ہے پھر طولاً دسویں سطر تک پھٹی ہے، اس پھٹن کی شکل

(۱) ہے۔

۱۔ جب میں نے ۱۹۶۵ء میں دیکھا تو یہ کپڑا نکال دیا گیا تھا اور صرف جھلی دو شفاف کانچوں کے

نچ میں رکھ کر بند کر دی گئی تھی۔

۲۔ خوردبین سے ذرا غور سے پڑھیں تو پورا لفظ ”رسول اللہ“ پڑھا جاتا ہے اور پانی کا مار صرف

نچلے حصے میں نہیں اوپر سے نیچے تک جا بجا ہے۔

- (۷) اس پھن کو بعد میں کسی نے مہین جھلی سے ٹانگے لگا کر سی دیا ہے۔
- (۸) قدیم ترین عربی کتبہ اسلامی عہد میں وہ ہے جو مدینہ منورہ میں جبل سلع پر ہے اور جس میں ابو بکر، عمر اور علی کا نام ہے اور جو ۳۲ ہجری کا ہے۔ ۳
- صلاح الدین منجد نے لکھا ہے کہ وہ علم رسم الخط کے نقطہ نظر سے اس اصل مکتوب کے متعلق ایک تحقیقی مقالہ مکرر لکھیں گے اور اس کے ہر حرف کی جانچ کریں گے (مگر تاحال اس مضمون کے چھپنے کی اطلاع نہ ملی) ان کی رائے میں یہ مکتوب اصلی ہے۔ (اسی مضمون کا خلاصہ انہوں نے کراچی کے ماہنامہ ”الوعی“ میں بھی مع فوٹو کے شائع کیا ہے اور خود میں نے روما کے رسالہ RSO جلد ۴۰، ۱۹۶۵ء میں فرانسیسی میں ایک مقالہ چھاپا ہے جو وہاں صفحہ ۵۷ تا ۶۹ آیا ہے اور اس میں چار فوٹو ہیں)۔
- اس اصل کی عبارت یوں پڑھی جاتی ہے۔

- (۱) بسم اللہ الرحمن
(۲) [۱] لرحیم من محمد عبد اللہ و
(۳) رسولہ الی کسری عظیم فارس
(۴) سلام علی من اتبع الہدی
(۵) و آمن باللہ و رسولہ و

۳ صلاح الدین صاحب نے حوالہ نہیں دیا ہے، بظاہر وہ میرے مضمون کی بنا پر ہے جو رسالہ اسلامک کلچر حیدر آباد دکن ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۲ تا صفحہ ۳۳۹ پر بعنوان ”چند عربی کتبے مدینہ میں ہجرت کے ابتدائی سالوں کے“ چھپا ہے۔ صلاح الدین صاحب دو کتبوں کو خط ملط کر رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر و عمر کا نام ایک کتبے میں ہے، اور حضرت علی کا دوسرے میں (تینوں نام ایک ہی کتبے میں نہیں ملتے) اور یہ ۳۲ ہجری کا نہیں بلکہ ۵۵ ہجری کا غزوہ خندق کے زمانہ کا ہے اس مضمون میں فوٹو کی اساس پر میں نے لکھا تھا کہ کتبے میں ”علی بن ابی طالب“ درج ہے لیکن ۱۹۴۶ء میں مکرر زیارت کا موقع ملا تو دیکھا ہے وہاں ”علی بن ابی طالب“ لکھا ہے اور میرے سابقہ فوٹو میں روشنی کے پھیلنے سے ”ابی“ کی جگہ ”ابو“ بن گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمائیں۔

- (۶) شهد ان [لا] اله الا الله
 (۷) وحده لا شريك له وان محمد [۱]
 (۸) عبده ورسوله ادعوك
 (۹) بدعاية الله فانني انا رسول
 (۱۰) الله الى الناس كافة
 (۱۱) لينذر من كان حيا ويحق
 (۱۲) القول على الكافرين
 (۱۳) اسلم تسلم فان ابينه
 (۱۴) نما عليك اثم المجوس



میری کتاب ”سیاسی زندگی“ ۳ء میں دیکھا گیا ہوگا سطر ۲-۳ کی عبارت پرانے
 ماخذوں میں سے بعض میں محمد رسول اللہ ہے تو بعض میں محمد رسول اللہ النبی الامی۔
 یہاں محمد عبداللہ ورسولہ ملتا ہے۔ سطر ۸ میں یہاں صرف ادعوک ہے۔ ماخذوں میں
 وادعوک مروی ہے۔

سطر ۱۳ میں یہاں صرف اسلم ہے، تاریخوں میں واسلم نیز فاسلم کی روایت ہے
 یہاں ابیتہ پڑھا جاتا ہے، تاریخوں نے عام طور پر ابیت لکھا ہے۔
 سطر ۱۳-۱۴ میں یہاں فانما علیک اثم المجوس ہے، طبری میں فانما اثم المجوس علیک

آیا ہے۔

۴ کتاب کا پورا نام ”رسول اکرم کی سیاسی زندگی“ ہے۔ (مرتب)

عکس مکتوب نبوی
بنام کسری پرویز



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ الْي
كَسْرَى عَظِيمِ فَارِس، سَلَامٌ
عَلَى مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى وَأَمَنَ بِاللَّهِ
وَرَسُولِهِ وَشَهِدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ
وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَإِنْ مُحَمَّدًا
عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ أَدْعُوكَ بِدَعَايَةِ
اللَّهِ فَإِنِّي أَنَا رَسُولُ اللَّهِ إِلَى
النَّاسِ كَافَّةً لِأَنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّاوُ
يَحَقُّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ،
أَسْلِمَ تَسْلَمَ فَإِنْ أَبَيْتَهُ فَإِنَّمَا
عَلَيْكَ إِثْمُ الْمَجْرُوسِ۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد کی طرف
سے فارس کے بادشاہ کسری کے نام، سلامتی
ہو اس شخص پر جو ہدایت کی پیروی کرے اور
اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس
بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود
نہیں، اور محمد اللہ کا رسول ہے، میں تمہیں اللہ
کی دعوت پہنچاتا ہوں، اس لیے کہ میں تمام
انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں تاکہ جو
زندہ ہو اسے ڈراؤں، اور کافروں پر (خدا کی)
بات سچی ہو جائے۔ تم اسلام لے آؤ، سلامتی
پاؤ گے، پھر اگر تم نے اس سے انکار کیا تو تم پر
تمام مجوسیوں کا گناہ ہوگا۔

محمد رسول اللہ

محمد رسول اللہ

ان اختلافات میں جو روایت بالمعنی کی وجہ سے ہیں مطلب کہیں نہیں بدلتا۔
رسم الخط کے نقطہ نظر سے یہ عجیب چیز ہے کہ کاتب:

سطر ۳-۴	فارس	کی جگہ	فارسہ	لکھتا ہے
سطر ۱۰	الناس	کی جگہ	الناسہ	لکھتا ہے
سطر ۱۲	الکافرین	کی جگہ	الکافرینہ	لکھتا ہے
سطر ۱۳-۱۵	المجوس	کی جگہ	المجوسہ	لکھتا ہے
اسی طرح سطر ۱۳ میں	فا	کی جگہ	فا	لکھتا ہے

مزید برآں ۶ تا ۷ نیز ۸ میں وحدہ، عبدہ کی جگہ وحدہ عبدہ ہے جو خاص
اس کاتب کی خصوصیت ہے کہیں اور اس کا رواج نظر نہیں آتا۔

ایک اور خصوصیت ہے کہ درمیانی ھ کو..... لکھا جاتا ہے مثلاً

سطر ۳-۴	میں	الہدی	کی جگہ	التدی
سطر ۶	میں	شهد	کی جگہ	سعد

لیکن یہ خصوصیت تینوں دوسرے اصل نامہ ہائے نبویؐ میں بھی ہے مثلاً
مکتوب مقوقس میں:

سطر ۳	میں	الہدی	کی جگہ	التدی
سطر ۱۱	میں	اشهدوا	کی جگہ	استدو

مکتوب المنذر میں:

سطر ۳	میں	اشهد	کی جگہ	مسجد
سطر ۶	میں	اسرہم - لهم	کی جگہ	امر عہم - لهم
سطر ۸	میں	اہل	کی جگہ	اہل
سطر ۹	میں	منہم - مہما	کی جگہ	معہم - معما

مکتوب نجاشی میں:

سطر ۴	میں	الہدی	کی جگہ	التدی
سطر ۶	میں	المہيمن	کی جگہ	التمین

سطرے میں اشد کی جگہ اسد
 سطرے ۱ میں الہدی کی جگہ الہدی

اور کہنا پڑتا ہے کہ عہد نبویؐ کا رسم الخط وہی تھا، کم از کم دربار رسالت کے کاتبوں کے ہاں وہی رواج تھا۔

بعض تحقیقات میرے بس کی نہیں مثلاً کہتے ہیں ”تحت احمر“ "INFRARED" شعاعوں سے مٹی ہوئی عبارتیں پڑھی جاتی ہیں نیز بعض اور شعاعوں سے قدیم اور جدید سامان میں امتیاز ہو جاتا ہے، یہ کام جھلی کے مالک اور تجربہ خانوں کا ہے۔
 جھلی کا پھٹنا اور سلا ہوا ہونا بھی قابل ذکر ہے۔ تاریخوں کا بیان اور گزشتہ باب میں دیکھ چکے کہ کسریٰ نے جب خط کا پہلا جملہ سنا کہ رسول اللہ کا نام پہلے اور کسریٰ کا بعد میں ہے تو اسے اپنی ہنک سمجھ کر خط کو پھاڑ دیا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی درباری نے اسی کو اٹھالیا اور محفوظ رکھا (ممکن ہے خود ایلچی نے ایسا کیا ہو)۔

بہر حال یہ حیثیت مجموعی قرائن اس خط کے اصلی ہونے کی تائید میں ہیں۔
 آخر میں یہ کہتا چلوں کہ ہنری فرعون عیسائی ہیں لیکن غیر متعصب، انہوں نے اپنے گھر کو ایک عجیب خانہ بنا دیا ہے جس میں تقریباً ساری کی ساری چیزیں اسلامی ہیں، صرف ایک جگہ صلیب وغیرہ کچھ عیسائی آثار قدیمہ ہیں اور مجھ سے کہنے لگے ”میں نے یہ چیزیں یہاں بے جوڑ ہونے کے باوجود عمداً اس لیے لگائی ہیں کہ عیسائی لوگ کہیں یہ الزام نہ لگائیں کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔“

لبنان و شام میں بہت سے خاندان مخلوط مذہب کے ہیں کچھ ”شہابی“ مسلمان ہیں تو کچھ عیسائی۔ خاندان فرعون کا بھی یہی حال ہے، ہنری فرعون عیسائی ہیں، لیکن رشاد فرعون جو مسمودی عرب میں وزیر ہیں مسلمان ہیں اور شامی الاصل ہیں اور بہت دنوں پیرس میں سعودی سفیر رہے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط (قیصر روم کے نام)

آغازِ اسلام کے وقت شام کا زرخیز علاقہ بیزنطینی سلطنت کے ماتحت تھا۔ اس کے جنوب میں جزیرہ نمائے عرب کی سرحد پر بہت سے بدوی قبائل بستے تھے جو آزاد تو تھے، لیکن بیزنطینی اثرات ان پر کار فرما تھے، انہیں قیصر روم کی جانب سے معقول معاش مقرر تھی۔ اس کے معاوضے میں وہ عاجز کا کام دیتے اور خانہ بدوش عربوں کو بیزنطینی علاقے پر چھاپہ مارنے سے روکتے تھے۔

عرب بہت قدیم زمانے سے شام کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے اور ہر سال گرمی کے موسم میں ان کے کاروان اور قافلے شام پہنچتے تھے۔

ایرانی اور بیزنطینی سلطنتوں میں نسبا نسل سے برابر جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تو اس میں اور تیزی پیدا ہو گئی تھی، اس سے متحاربین میں سے کسی کو بھی کیا فائدہ پہنچتا دونوں روز بروز کمزور ہوتے ہی چلے گئے۔ ہجرت نبوی سے کچھ پہلے (۶۱۳ء تا ۶۱۶ء میں) ایرانی فوجوں نے دمشق، بیت المقدس اور اسکندریہ پر قبضہ کر لیا، مگر ہجرت کے پانچویں سال (۶۲۷ء) میں نینوہ کے مقام پر ایرانیوں کو کچھ ایسی زبردست اور مکمل شکست ہوئی کہ لڑائی کا پانسہ ہی پلٹ گیا اور بیزنطینیوں نے نہ صرف اپنا کھویا ہوا سب علاقہ واپس لے لیا، بلکہ حریف سے من مانی شرطیں بھی منوالیں۔ ۲

De Goeje memite our la conqueta de la syrieed P29DEA prnicophore cpolitane de re bus

post mauriciumgestise p 27.

Nolde Ke Encycolo paedia Brita nnica SV Peroia

مسلمان مورخ ۱ بیان کرتے ہیں کہ ۶ھ کے اواخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیزنطینیوں کے سردار (عظیم الروم) کے نام ایک نامہ بھیجا ۲ اور سفیر کو حکم دیا کہ شہر بصری (علاقہ حوران) کے حاکم کے حوالے وہ خط کر دے۔ گورنر بصری نے اس کا انتظام خود کیا ۳ کہ وہ خط قیصر ہرقل کے پاس جوان دنوں ایشیائے کوچک میں مقیم تھا، بھیج دے۔ اگرچہ گولثی ہر ۴ جیسے مولفوں کو اس واقعے کی صداقت کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں، لیکن ہم یہاں ان اعتراضات کی چھان بین کریں گے جو مختلف یورپی علماء کی طرف سے اٹھائے گئے ہیں۔

چنانچہ سویڈن کے مشہور مؤلف بول ۵ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھتے ہوئے ان خطوط کا بھی ذکر کیا ہے جو ہمسایہ فرمانرواؤں کے نام تبلیغ اسلام کی غرض سے بھیجے گئے تھے، مگر اسے اس واقعہ کی صحت میں شبہ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ مسلمان مورخوں کی روایت کے بموجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ سفیر معجزانہ طور سے ان ممالک کی زبانیں بولنے لگ گئے، جہاں انہیں بھیجا گیا تھا، یہ قصہ اصل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے متعلق مشہور ہے کہ انہیں دنیا کے مختلف حصوں میں جانے کے لیے نامزد کیا گیا، اور ان کے عذر پر کہ انہیں ان ملکوں کی زبانیں نہیں آتیں، حضرت عیسیٰ نے دعا کی اور ہر حواری خود بخود اس ملک کی بولی بولنے

۱ مثلاً تاریخ طبری ص (۱۵۵۹)

۲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مکتوب کا متن حسب ذیل کتابوں میں ملتا ہے:

صحیح بخاری کتاب نمبر باب نمبر ۱۶، کتاب نمبر ۵۰ باب نمبر ۱۰۲، کتاب نمبر ۶۵، باب نمبر ۳ حدیث نمبر ۴، تاریخ طبری ص ۱۵۶۵، مسند احمد بن حنبل جلد نمبر ۱ ص ۲۶۳، جلد نمبر ۳ صفحہ ۴۴۱، تاریخ یعقوبی جلد دوم ص نمبر ۴، صحیح الاشی مؤلفہ قلعشندی جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۶، ۳۷، ۳۷، مفید العلوم و بلید المہوم، مؤلفہ قزوینی، باب ہشتم نمبر ۱۔ زاد العاد، مؤلفہ ابن القیم، جلد نمبر ۳، ص نمبر ۶۰، رسالہ نبویہ مؤلفہ عبدالمعتم خان نمبر ۱۱۶، وغیرہ وغیرہ

۳ صحیح بخاری کتاب نمبر ۱۶، باب نمبر ۶ نیز کتاب نمبر ۵۶، باب نمبر ۱۰۲۔

۴ Goldziher die Religion de Islam Kultur den Gegenwart IIII Yebner Kab. P. 96

۵ Buhl, Das lebon hiohammed P. 245

لگ گیا جہاں اسے بھیجا جا رہا تھا، دوسرے الفاظ میں مسلمان مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ ممالک میں سفیروں کے بھیجنے اور ان سفیروں کے نئی زبانوں کے خود بخود سیکھ جانے کے قصے کو محض اس لیے گھڑ لیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم نظر نہ آئیں۔

لیکن بول کو غلط فہمی ہوئی ہے اگرچہ اس سلسلے میں اس نے اپنے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے لیکن کوئی تعجب نہیں۔ جو خدا بخشے واقعی کی کسی افسانہ نگاری سے اسے سابقہ پڑا ہو، چنانچہ ابن سعد نے بھی طبقات (جلد اول حصہ دوم ص ۱۹) میں واقعی کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں واقعے کے بعض اہم جزئیات کو نظر انداز کر دینے سے مطلب خبط ہو گیا، یہ واقعہ پورے تفصیلات کے ساتھ ہمیں ابن ہشام کی سیرۃ رسول اللہ (ص ۹۷) اور طبری کی تاریخ (سلسلہ اول ص ۱۵۶۰) میں ملتا ہے۔ وہاں تو کچھ اور ہی ذکر ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طے فرمایا کہ متعدد ہمسایہ فرمانرواؤں کے پاس تبلیغ اسلام کے لیے سفارتیں بھیجی جائیں، سفیروں کو نامزد کرنے سے پہلے آپ نے احتیاطاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے اور فرستادہ حواریوں کا قصہ بیان فرمایا اور ارشاد کیا کہ اگر میں بھی کچھ سفیر بھیجنا چاہوں تو تم لوگوں کو ان حواریوں کی طرح ہچکچاہٹ اور پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اعلان فرمایا کہ فلاں شخص فلاں حکمران کے پاس خط لے جائے اور فلاں شخص فلاں کے پاس۔

اس روایت میں نہ تو کوئی خارق العادہ واقعہ ہے اور نہ کوئی خلاف عقل یا غیر قرین قیاس امر حواریوں کا قصہ بیان کیے جانے کی ضرورت بھی واضح ہے، کہ کسی صحابی کو ذرا بھی تردد نہ پیدا ہو، اس واقعے سے شاید ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمسایہ ممالک میں تبلیغ کرنے کا خیال کس طرح پیدا ہوا۔ وہ کون شارح مذہب ہو گا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بیان کردہ فرستادگی اور حواریتین کی اقتدا کا خیال

نہ کرے، فبہذا ہم اقتدہ ۱ تو خود قرآنی حکم ہے۔

اب کچھ کائناتی کے اعتراضات ۲ بھی سنئے:

۱۔ ”مسلمان مورخ سفاء کے بھیجنے کا واقعہ ۶ھ کے اواخر کا قرار دیتے ہیں اور پھر یہی مورخین کائناتی نے واقدی، ابن ہشام، یعقوبی طبری جیسے متقدمین کے نام اس تذکرے کے آخر میں بطور مآخذ واقعہ گنائے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مال و متاع پر قیصر کی سفارت سے واپسی پر جوڈا کہ پڑا وہ ۶ھ کے وسط میں پیش آیا، ۶ھ کے اواخر میں روانگی اور اسی سال کے وسط میں واپسی بدیہی طور پر ناممکن ہے۔

۲۔ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قیصر کے پاس جانا بیان کیا جاتا ہے اور وہ خیبر کی مہم میں بھی شریک رہتے ہیں، یہ مہم سفارت کی روانگی کے بعد ہی پیش آئی۔ اور یہ غیر قرین قیاس ہے کہ حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سفارت کو سرانجام دے کر اس قدر جلد واپس ہو گئے ہوں۔

۳۔ مسلمان مورخ بیان کرتے ہیں کہ اسلامی سفیر نے قیصر سے بیت المقدس میں ملاقات کی جب کہ وہ (قیصر) صلیب مقدس کے ایرانیوں سے واپس مل جانے کی خوشی میں وہاں آیا ہوا تھا۔ قیصر کی آمد ۶۲۹ء کی ابتداء یعنی ۶ھ کے اواخر میں ہوئی نہ کہ ۶ھ کے اوائل میں جیسا کہ مسلمان مؤرخین کے بیان سے مترشح ہوتا ہے۔

۴۔ سیرت ابن ہشام حقیقت میں سیرت ابن اسحاق کی تہذیب دادہ صورت ہے، مگر ان سفارتوں کی روانگی کا واقعہ ابن اسحاق کی اصل کتاب میں نہیں ہے، کیونکہ روایت کی ابتداء میں ابن ہشام نے ابن اسحاق کا نام نہیں لیا ہے، (یعنی یہ واقعہ ابن ہشام نے خود گھڑ لیا ہے)۔

۵۔ سفیروں کی روانگی اگرچہ اتنا اہم واقعہ ہے لیکن عربی تاریخوں اور حدیث کی

۱۔ قرآن مجید سورہ ۶ آیت ۹۰

۲۔ Caetani annalidel, Islam, (1905) 6th : 50

کتابوں میں جملہ روایتیں صرف ایک ابن عباس ہی سے منقول ہیں، دیگر صحابہ کے بیانات بالکل مفقود ہیں۔

کائناتی کا پہلا اعتراض:

کچھ ٹھیک نہیں، سیرۃ ابن ہشام (ص ۹۷۶) اور تاریخ یعقوبی (جلد دوم ص ۷۴) میں جہاں حضرت وحیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مال لوٹنے وغیرہ کی مہم کا ذکر ہے، بلا تعین تاریخ واقعہ بیان کیا گیا ہے، جیسے اور بہت سے واقعات کا ان میں تذکرہ ہے، ظاہر ہے کہ اس سے کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ تاریخ طبری میں (ص ۱۵۵۵ پر) بے شبہ ۶ھ کے وسط کا ذکر ہے، مگر یہ واقف کی روایت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ طبری نے خود اس کو قبول نہیں کیا ہے، کیونکہ تھوڑی دور آگے چل کر طبری نے (ص ۱۷۳۱ پر) اپنی تاریخ میں مکرر اس مہم کا اس کے موقع پر ذکر کیا ہے، اگرچہ اس جگہ طبری نے تاریخ نہیں بیان کی ہے، لیکن واقعات اپنی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں، طبری کا واقف کی روایتوں کے متعلق جو رجحان ہے، وہ معروف ہے۔ ان روایتوں کے ساتھ اکثر زعم الواقف کا ایک حد تک طنزیہ فقرہ ضرور ہوتا ہے، اب رہتی ہے ایک واقف کی روایت، سو واقف کی حیثیت ایک تاریخی فسانہ نگار سے بڑھ کر نہیں، اس بیان کو بے پس و پیش رد کر دیا جاسکتا ہے ۱۔ واقف کی توقیتی غلطی کو مصری مورخ زینی دحلان نے

۱۔ اصل میں واقف نے واقعات کے وقت کے ذکر میں سہواً اس بات کا لحاظ نہیں کیا ہے کہ حجاز میں سنہ کیسے رائج تھا، اور ہر تین سال میں ایک مہینہ بڑھایا جاتا تھا، پھر بعض وقت سنہ ہجری سے وقت مقرر کیا ہے اور بعض وقت تاریخ ہجرت سے (دیکھیے کائناتی کی تاریخ انالی ۱۷ ف ۱۳ نوٹ نمبر ۱) سب جانتے ہیں کہ ہجرت نبوی اور سنہ ہجری میں ۳ ماہ کا فرق ہے اور ۶ھ میں حجاز کے مروجہ سنہ اور ہجری سنہ میں دو ماہ کا فرق ہو جاتا ہے، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ واقف نے حضرت وحیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مہم کا وقت بیان کرتے وقت مروجہ عربی سنہ کی جگہ سنہ ہجری بیان کر دیا اور کیسے مہینوں کے بڑھانے کا خیال نہ رکھا، تو پھر اس پانچ ماہ کے فرق کا اصلی باعث معلوم ہو جاتا ہے۔

۲۔ السیرۃ الحمدیہ مؤلفہ زینی دحلان جلد نمبر ۲ ص نمبر ۳۷۔

محسوس کر لیا تھا، چنانچہ سیرت نبویؐ لکھتے ہوئے اس واقعے کے تذکرے میں واقدی کی روایت کو اسی بناء پر رد کر دیا ہے کہ سفیر کی روانگی سے پہلے واپسی ناممکن ہے۔ ۲

عرب مورخ ۱۔ یہ ضرور بیان کرتے ہیں کہ حضرت وحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب قیصر روم کو مکتوب نبویؐ پہنچا کر شام سے واپس آ رہے تھے تو ان پر چند بدوی قبائل نے ڈاکہ ڈالا، مگر معلوم ہوتا ہے، کہ مورخین کو ایک غلط فہمی ہوئی ہے، کیونکہ حضرت وحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۲ھ کے اواخر میں شام کو روانہ ہوئے، اور جب وہ قبیلہ جذام کے علاقے میں تھے تو اس قبیلہ کے چند رہزنی پیشہ افراد نے اُن پر حملہ کیا، اس قبیلہ میں چند خاندان مسلمان ہو چکے تھے جب انہیں اطلاع ملی تو فوراً دوڑے اور حضرت وحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مال جو وہ تجارت کے لیے لے جا رہے تھے ۲ نہ کہ وہ جو قیصر نے بطور انعام و اکرام دیا تھا، جیسا کہ کائناتی نے واقدی کے افسانے سے اخذ کر کے لکھا ہے، ڈاکوؤں کے ہاتھ سے چھڑایا۔ حضرت وحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ غضبناک ہو کر مدینہ منورہ واپس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ اس کو بعض افراد عوام نے یہ سمجھ لیا کہ سفارت پوری کر کے واپس آ گئے اور انہی کی روایت مسلمان مورخین کے پاس جگہ پا گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً ایک تنبیہی مہم روانہ فرمائی اور چند دن بعد خود بھی خیبر کی جنگ پر روانہ ہو گئے جہاں حضرت وحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساتھ رہے اور خیبر کی فتح کے بعد وہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ شام کو روانہ ہو گئے تاکہ قیصر کو نامہ مبارک پہنچائیں۔ یہ یاد رہے کہ اس واقعے کے جزئیات سب حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے ماخوذ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عمر اس واقعے کے وقت دس سال سے زیادہ نہ تھی، انہیں یہ حالات بعد میں اور لوگوں کی زبانی معلوم ہوئے ہوں گے، اس لیے واقعے کے جزئیات میں بعض کوتاہیوں یا غلطیوں کا امکان ضرور رہتا ہے۔ گو اس کے ذمہ دار وہ خود نہیں۔ اس سے ضمنتاً یہ بھی معلوم ہو

۱۔ مثلاً سیرۃ ابن ہشام (طبع یورپ ص ۱۹۷)۔

۲۔ ایضاً۔

جاتا ہے کہ فرستادگی سفارت کا واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں بھی ملک میں مشہور تھا گو ایک سرکاری اور حکومتی معاملہ ہونے کے باعث اس کے تمام جزئیات سے عوام کو واقفیت نہیں ہو سکتی تھی۔

حضرت دجیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ڈاکے کے سلسلے میں جو مہم بھیجی گئی تھی وہ حسی نامی مقام پر پہنچی۔ حسی کا مقام وادی القریٰ کے پرے مدینے سے آٹھ دن کے ۱۔ فاصلے پر واقع ہے، یلغار کرتے آئیں تو بعض وقت اونٹ یہاں سے مدینہ کو تین ہی دن میں پہنچ جاتے ہیں۔ ۲۔ بعض حالیہ یورپی سیاح بھی تبوک کے اطراف میں اس نام کے ایک پہاڑ کا ذکر کرتے ہیں۔ ۳۔ غرض یہ مقام مدینہ سے اتنا قریب ہے کہ حضرت دجیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سفارت پر روانگی واپسی اور تنبیہی مہم سب اس مدت کے اندر وقوع میں آ سکتے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح حدیبیہ سے واپسی اور خیبر کی روانگی کے مابین پائی جاتی ہے، ابن ہشام ۴۔ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ سے ذی قعدہ ۶ھ کے آخری دنوں میں مدینہ واپس آئے، اور محرم ۷ھ میں خیبر روانہ ہوئے۔ ابن سعد ۵۔ کے مطابق خیبر کو روانگی اور چند ماہ بعد عمل میں آئی، غرض حدیبیہ سے واپسی اور خیبر کو روانگی کے مابین کم از کم پانچ ہفتوں کا وقفہ پایا جاتا ہے اور یہ مدت حضرت دجیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روانگی اور حسی کی تنبیہی مہم کے پیش آنے کے لیے کافی ہے۔

کائناتی کا دوسرا اعتراض:

کائناتی کا دوسرا اعتراض بھی مذکورہ بالا توضیح کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ کائناتی کی حضرت دجیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ خیبر میں شرکت صرف واقدی میں ملی ہے، مگر یہ

۱۔ معجم البلدان مؤلفہ یا قوت لفظ حسی۔

۲۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۸۷۹۔

۳۔ Jaussen et Savignac, mission archeologique en arabie Peris 1909 Vol. 1.P. 64

۴۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۵۵۶ تا ۵۶۷ نیز تاریخ طبری ۶ھ کے واقعات کا آخری حصہ۔

۵۔ طبقات ابن سعد جلد دوم حصہ اول ص ۷۷۔

۶۔ صحیح بخاری کتاب نمبر ۶۳ باب نمبر ۳۸، حدیث نمبر ۶ نیز کتاب نمبر ۳۴ باب نمبر ۱۰۸ حدیث نمبر ۲۔

واقعہ ابن ہشام، طبری اور بخاری ۱ نے بھی بیان کیا ہے تاہم جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں، صرف دحیہ کا ہم خیبر میں شریک رہنا ناممکن نہیں اور نہ ہی وہ اس بات کے لیے کوئی ثبوت بن سکتی ہے کہ سفارت شام کا واقعہ من گھڑت ہے۔

تیسرا اعتراض:

تیسرا اعتراض بھی برقرار نہیں رہ سکتا کیونکہ سفیر مذکور کا بچہ کے اواخر میں بیت المقدس میں رہنا کسی طرح بھی غیر قرین قیاس نہیں۔ علاوہ براس یہ امر قابل ذکر ہے کہ واقعات زیر بحث کے اسلامی ماخذوں میں امام بخاری کی شخصیت سب سے ممتاز ہے اور انہیں بہر حال واقعی پر ترجیح دینی ہوگی، خاص کر اس لیے کہ دونوں نے واقعات کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے۔ امام بخاری کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفیر کو حکم دیا تھا کہ خط گورنر بصری کے حوالہ کرے اور اس خط کو گورنر بصری نے قیصر کے پاس حمص خود بھیجا، قیصر بیت المقدس جا رہا تھا تاکہ وہاں صلیب مقدس کی واپسی کے شکرانے کی تقریب میں حصہ لے، چنانچہ گورنر بصری کا خط ملنے پر قیصر نے جسے اسلام اور بانی اسلام کے متعلق کوئی معلومات نہ تھے حکم دیا کہ رومی علاقے میں اگر تجازی تاجر آئے ہوئے ہوں تو انہیں حاضر کیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان تاجروں کو بیت المقدس میں باریابی کا موقع حاصل ہوا۔

رہا قیصر کا سفر سو ۶۲۵ء کی روایت یونانی مورخ تیوفان ۱ نے بیان کی ہے مگر مورخ نقیفور Nicephore لکھتا ہے کہ قیصر ہرقل ۶۲۸ء میں بیت المقدس آیا، وہاں کے گرجے کی یادداشت بھی اسی کی تائید میں ہے اور اس سے یہ تعین ہوتی ہے کہ ۶۲۸ عیسوی میں وسط ستمبر میں ہرقل نے عید واپسی صلیب میں شرکت کی۔

چوتھا اعتراض:

چوتھا اعتراض بھی درست نہیں کیونکہ گواہ ابن ہشام ۲ نے سفیروں کے واقعے کو

۱ Spenger, das leben und die lehre des hoch ammed III p. 261 N.I.

۲ سیرۃ ابن ہشام ص ۹۷۱ ۹۷۲۔

بیان کرتے وقت شروع میں ابن اسحاق کا نام نہیں لیا ہے لیکن اس روایت کے سلسلے میں ذرا نیچے اس نے دو مرتبہ ابن اسحاق کا حوالہ دیا ہے، ابن ہشام نے یہ بھی لکھا ہے کہ یمن اور بحرین کی سفارتوں کا حال اس کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہیں کہ باقی دیگر سفارتیں خود ابن اسحاق کی بیان کردہ ہیں۔ مزید براں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ ابن اسحاق نے قیصر و نجاشی کے پاس بھیجے ہوئے سفیروں اور خطوں کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے کیونکہ اگرچہ ابن ہشام نے اپنی کتاب میں ان خطوط کے متن حذف کر دیے ہیں لیکن طبری ۱۔ بیہقی ۲ اور قلتشندی ۳ نے ان خطوط کے متن ابن اسحاق کے حوالہ ہی سے درج کیے ہیں۔

کائناتی کا پانچواں اور آخری اعتراض:

کائناتی کا پانچواں اور آخری اعتراض یہ تھا کہ سفارت کا اہم واقعہ صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بیان کیا ہے اگرچہ اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا، مگر یہ اعتراض بھی کائناتی کی تحقیقات کا سطحی ہونا ثابت کرتی ہے کیونکہ علاوہ دیگر مؤلفین کے ۴ بلاذری ۵ اور احمد بن حنبل ۶ نے قیصر کی سفارت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی بناء پر بھی بیان کی ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ہمارے ماخذ معلومات ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابہ میں سے ہیں۔ ایک آپ کے چچا زاد بھائی ہیں تو دوسرے شخصی خادم۔ ان دونوں نے شام و مصر کے فتوحات اپنی آنکھوں سے دیکھے، ان کے متعلق اس بات کا کس طرح

۱۔ تاریخ طبری ص ۱۵۶۵، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰۔

۲۔ منقول از رسالات نبویہ مؤلفہ عبد المنعم خان نمبر ۱۰۹۔

۳۔ صبح الاشی جلد ۶ ص ۳۷۹، ۳۶۶۔

۴۔ ابن حبان (منقول از السیرۃ الحمد مؤلفہ زینی دحلان جلد دوم ص نمبر ۲۳۵)۔

۵۔ فتوح البلدان مؤلفہ بلاذری (طبع یورپ) ص ۳۶۱۔

۶۔ مسند احمد ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۳۔

گمان ہو سکتا ہے کہ ان میں اپنے آپ کو حقیر سمجھنے کا جذبہ پایا جاتا ہو جس کے تحت انہوں نے اپنے بانی مذہب کی بڑائی دکھانے کے لیے قیصر روم سے خط و کتابت کا واقعہ گھڑ لیا ہو، ان دونوں بڑی عمر پانے والے صحابیوں کی نو جوانی ہی میں قیصر ہرقل کی فوجوں کو مسلمان متعدد فاش شکستیں دے چکے تھے اور اس کی سلطنت کے چند نہایت زرخیز صوبے چھین چکے تھے۔

یہ تو جواب تھے اعتراضوں کے انہوں نے عدم امکان کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے علاوہ بعض اور وجوہ ہیں، جو ہمیں ارسال سفیر کے واقعہ کی صحت کا یقین دلاتے ہیں۔ اولاً یہ واقعہ ہے کہ معاصر بیزنطینی تاریخیں موجود نہیں ہیں۔ بیزنطینی حکومت کے دربار میں بھی سرکاری وقائع نگار ہوا کرتے تھے، مگر ایک زمانے میں ایک صدی تک ان میں فصل پڑ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دور بھی اس وقفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر بعد کے بیزنطینی مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ تو کوئی حیرت نہیں کیونکہ وہ عیسائی تھے اور ان کے بادشاہ کو اگر کسی نئے مذہب

۱۔ زوناراس Zonaras بارہویں صدی عیسوی کا مشہور یونانی مورخ ہے وہ قسطنطنیہ میں حکومت کا میرنشی تھا، پھر سیاسیات سے کنارہ کشی کر کے راہبانہ زندگی اختیار کر لی اور اسی سلسلے میں ایک تاریخ عالم لکھی۔ اس نے بعض اہم اور ایسی کتابوں کے اقتباسات اپنی تاریخ میں دیے ہیں جو آج مفقود ہیں۔ اس ایک مؤلف نے البتہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیصر سے ملنے کے لیے خود تشریف لائے تھے اور یہ کہ قیصر نے آپ کو کچھ زمین جاگیر میں دی زوناراس کے متعلق دیگر معلومات کروم باخر کی کتاب تاریخ ادبیات یونان (Krumbacher Geochichte der by zantinischen Literatur P. 340-44) میں ملیں گے زوناراس کی کتاب کا یونانی متن مع لاطینی ترجمے کے شہر بون واقع جرمنی میں ۱۸۹۷ء میں چھپا ہے، اس کتاب کے متعدد یورپی زبانوں میں ترجمے ہوئے مگر میرے پیش نظر صرف لاطینی ترجمہ تھا جس کا ضروری اقتباس دیا جاتا ہے:

In eodem registriumpalix Persia reditu regenicis venit maometus Saracenoreem princeps is igitur ex Aethribo Progressus regenicon venit et regionem ad habitandum petitam accepit joames zonaras Epitomae Historiarum Epit xiv 17, 12 P. 214, نیز دیکھیے:

Dictionnaire d'Histoire et de Géographie Eddlesiastiques (Paris 1914) Vol III S. Varabic Col

کے بانی نے تبلیغ کی ہو تو ان کی نظروں میں اس خط کو کیا اہمیت ہو سکتی ہے مسلمانوں سے بعد میں ان کی لڑائیاں رہیں۔ اسی لیے یہ بیزنطینی مورخ جنگ موتہ کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔^۱ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روانہ کردہ فوجوں کو ملا کر بیزنطینی فوجوں نے شکست دی تھی۔

دوسرے یہ کہ جملہ مسلمان مورخ جن میں امام بخاری جیسی محتاط شخصیت شامل ہے، اس سفارت کا ذکر کرتے ہیں:

تیسرے خود نفس معاملہ میں کوئی امر غیر قرین عقل نہیں۔ ایک بانی مذہب اپنی کامیابیوں سے حوصلہ و ہمت پا کر اپنے ایک ہمسایہ حکمران کو تبلیغ دین کرنے کی خواہش کرتا ہے اور اس حکمران کے ایک صوبہ دار کے توسط سے جس سے اس کے ہم وطن تجارت کے سلسلہ میں اچھی طرح واقف تھے، اس حکمران کے نام ایک خط روانہ کرتا ہے کیونکہ حکمران مذکور کا قیام اکثر سمندر پار قسطنطنیہ میں رہتا ہے۔ اس کی کہاں توقع کی جاسکتی ہے کہ نبی حجازی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مرسلہ خطوط میں ان ظاہری اور رعبی امور کی پابندی ہو، جو سلاطین عظام اپنی خط و کتابت میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ قیصر ہرقل کا نام عرب میں ہر شخص جانتا تھا۔ یہ وہی بادشاہ تھا جس نے اکتیس سال ۶۱۰ء تا ۶۴۱ء حکومت کی اور عربوں کی گرمائی تجارت گاہ شام و فلسطین و مصر کو ایرانیوں کے ہاتھوں سے دوبارہ چھین لیا تھا، یہ بات نہ بھلائی جائے کہ خط گورنر بصری کے پاس بھیجا گیا تھا سفیر کے ذمے یہ فریضہ بالکل نہ تھا کہ وہ قیصر سے بھی ملاقات کرے۔

چوتھے خود اصل خط کی موجودگی ہے، چنانچہ سب سے پہلے چھٹی صدی ہجری کے مراکشی مورخ سہیلی^۲ نے چشم دید گواہوں کی شہادت پر یہ واقعہ بیان کیا ہے، کہ ان کے زمانے میں اسپین (قسطنطیلہ) کے حکمران الفونسو^۳ نے جس کے قبضے میں

۱۔ دیکھئے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ محمد بحوالہ Theophanes Chrono Graphie ed De Boor vol 1.

۲۔ روض الاناف مؤلفہ سہیلی جلد دوم ص ۳۲۱۔

۳۔ اس نام کو عرب مؤلفوں نے معرب کر کے اذنونش بنالیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بنام ہرقل موجود تھا، ایک مسلمان سپہ سالار عبدالملک ابن سعید کو دکھایا، نیز یہ کہ القنوسکی وفات کے بعد یہ نامہ مبارک اس کے نواسے کو وراثت میں ملا۔ اس سے ایک صدی بعد علامہ عینی کا زمانہ آتا ہے۔ وہ مصر کے مملوک سلاطین کے دربار میں بڑا رسوخ رکھتے اور اعلیٰ سرکاری خدمت پر مامور تھے۔ وہ بھی لکھتے ہیں کہ ۲۔ مملوک سلطان قلاوون نے اسپین کے عیسائی بادشاہ کے پاس ایک سفارت بھیجی تھی اور اس بادشاہ نے سلطان کے سفیر سیف الدین قلیج کو نامہ مذکور بتایا تھا۔

یہ سفارت ۶۸۲ء میں بھیجی گئی تھی ۳۔ ابن فضل اللہ العمری (فوت ۷۴۸ھ) مصر کے میرنشی کا زمانہ اس کے بعد آتا ہے۔ اس نے بھی اپنی کتاب میں سلاطین عالم کے القاب کے سلسلے میں شاہ اسپین کا ذکر کیا ہے ۴۔ اور بتایا ہے کہ شاہ اسپین کے سفیر نے اس سے گفتگو کی اور کہا کہ شاہ اسپین قصر ہرقل کی اولاد ۵۔ میں سے ہے اور یہ کہ نامہ نبوی بنام ہرقل اس وقت تک شاہ اسپین کے پاس محفوظ و موجود ہے۔

مراکش کے مشہور امیر و عالم شیخ عبدالحی کتانی نے حال میں ایک دلچسپ کتاب ۶۔ شائع کی ہے جس میں عہد نبوی کے جملہ سیاسی اور سماجی اداروں اور پیشوں کے متعلق کتب حدیث و تاریخ وغیرہ کا مواد اکٹھا کر دیا ہے۔ اس کتاب کی جلد اول صفحہ (۱۶۸ تا ۱۵۶)

- ۱۔ ان کے حالات کے لیے دیکھیے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔
- ۲۔ عمدۃ القاری مولفہ یعنی جلد اول ص ۱۱۶، نیز دیکھیے فتح الباری مولفہ ابن حجر عسقلانی شرح حدیث بخاری کتاب نمبر ۱، باب نمبر ۶، ۱۱، المواہب اللدنیہ مولفہ قسطلانی جلد دوم ص ۲۹۰، السیرۃ النبویہ مولفہ دحلان جلد دوم ص ۱۴۴۔
- ۳۔ قلاوون کے خارجہ سیاسی تعلقات کے لیے دیکھو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام۔ خاص اس سفارت کے مزید حالات کے لیے دیکھیے تشریف الایام والعصور بسیرۃ السلطان الملک المنصور (مخطوطہ کتب خانہ عام پاریس کتاب عربی نمبر ۱۷۰۴ ورق ۲۳ تا ورق ۲۳۴ ب۔
- ۴۔ التہریف بالاصطلاح الشریف ص ۶۲، مطبوعہ مصر ۱۳۱۲ھ۔
- ۵۔ اس کی تائید میں دیکھیے غ الطیب مولفہ مقری جلد دوم ص ۱۵۸۔
- ۶۔ الترتیب الاداریہ والعمالات والصناعات والمناجرو الحلیۃ العلمیۃ الی کانت علی عہد تاسیس المدینۃ الاسلامیۃ فی المدینۃ المنورہ العلویۃ مطبوعہ شہر رباط۔

میں خاص اس خط کے متعلق ایک باب باندھا ہے۔ انہوں نے خفاجی (فوت ۶۹۰ھ) کی کتاب شرح شفاء جلد سوم صفحہ ۷۲ طبع اول پر یہ عبارت ڈھونڈ نکالی ہے۔ ”کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اب تک اسپین کے بادشاہوں کے پاس موجود ہے، وہ اس کی عزت کرتے ہیں اور ایک سنہری صندوق میں حفاظت سے رکھتے ہیں اور نسل بعد نسل اس کی نگہداشت کی وصیت کرتے آتے ہیں۔“

اسی طرح شیخ کتانی کی تحقیقات ۲ سے مراکش کے ایک مشہور مولف شیخ ابو اس بن احمد بن ناصر الراشدی المیسکری (فوت ۱۲۳۸ھ) کی کتاب الخبر المغرب عن الا حر المغرب الحال بالاندلس و تغور المغرب میں بھی اس خط کے وجود کا ذکر پایا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کتانی کو اس خط سے خاص دلچسپی رہی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں ۳ کہ جب وہ ۱۳۴۱ھ میں اسپینی مراکش کے پایہ تخت تطوان گئے تو وہاں کے اسپینی ریسیڈنٹ جنرل (مقیم عام) سے اس بارے میں گفتگو کی مگر جب سے مسلمان اسپین سے جا چکے ہیں اس کا کوئی پتا نہیں چلتا چنانچہ مقیم عام مذکور کو بھی اس بارے میں کوئی علم یا اطلاع نہیں تھی۔ مراکش کے سلطان مولیٰ اسماعیل بن الشریف نے بھی اپنے ہمعصر شاہ فرانس سے اس بارے میں خط و کتابت کی تھی کیونکہ سنا جاتا تھا کہ وہ اب فرانس میں ہے مگر ۱۳۳۲ھ میں جب رئیس جمہوریہ فرانس مراکش کے دورے پر آیا تو اس نے مقامی مسلمان علماء کی دریافت پر کہا کہ فرانس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے اور نہ اس نے اس سے پہلے اس بارے میں کچھ سنا

۱۔ بحوالہ کتانی جلد اول ص ۲۹۰، ۱۶۱۔

۲۔ بحوالہ کتانی جلد اول ص ۱۶۱۔

۳۔ بحوالہ کتانی جلد اول ص ۱۶۱ تا ۱۶۲۔

۴۔ الکواکب الدراری مولفہ الکرمانی نور النور اس مولفہ البرہان الحللی حاشیہ الصحیح مولفہ ابن غازی تشنیف المسامع مولفہ ابو زید الفاسی، سمط اللال مولفہ شیخ قویسم التونسی، روض القرطاس مولفہ ابن ابی زرع حواشی العارف الفاسی علی الصحیح وغیرہ۔ ابن ابی زرع کی کتاب کے صفحہ ۱۶۸ میں البتہ یہ لکھا ہے کہ ۶۰۶ھ میں ملک الناصر لدین اللہ محمد بن یعقوب المصمودی نے جب اسپین پر چڑھائی کا راہ دہ کیا تو شاہ الفونسو (افونس) نے ۶۰۶ھ

ہے۔ شیخ کتانی نے چند اور مسلمان مولفوں کے حوالے دیے ہیں۔ جنہوں نے اس خط کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ مگر ان کے بیانات سے کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسلامی مورخون ۱ کے بیان کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ تبوک کے وقت قیصر ہرقل کو ایک اور خط بھیجا تھا۔ بعض بیانات ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دفعہ بھی حضرت وحیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سفیر تھے۔ بعض متاخر مولف ۳ قیصر اور ہرقل میں فرق کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ ہرقل شام کے گورنر کا نام تھا اور قیصر قسطنطینہ کے بادشاہ کا لقب تھا اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط قیصر کے نام نہیں بلکہ ہرقل گورنر شام کے نام تھا، مگر شاید اسے غلط فہمی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سلطنت رومہ دو خود مختار مملکتوں پر مشتمل تھی۔ ایک کا پائے تخت رومہ تھا تو دوسرے کا قسطنطینیہ۔ قیصر عموماً رومہ کے شہنشاہ کا لقب ہوتا تھا، مگر اسلامی مورخ قسطنطینیہ کے بادشاہ کو بھی قیصر ہی کہتے آئے ہیں اور قسطنطینیہ کی بیزنطینی حکومت ہی شام کی مالک تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہاں ہرقل ہی حکمران تھا اس لیے قیصر اور ہرقل کا امتیاز کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اس بحث کے بعد اب شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیزنطینی شہنشاہ ہرقل کو تبلیغی خط لکھنا ناممکن نہیں ہے بلکہ حالات اس کی تائید ہی میں ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ۔ جون ۱۹۳۵ء)

☆ خود حاضر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ بنام ہرقل ملک الناصر کے ملاحظہ میں پیش کیا، اور اس کی وساطت سے رحم کی درخواست کی۔

۱۔ صبح الاشی مولفہ قلقتندی جلد نمبر ۶ صفحہ ۳۷۷ بحوالہ ابو عبیدہ، التنبیہ والاشراف مولفہ مسعودی ۲۷۱ السیرۃ النبویہ مولفہ دحلان جلد دوم صفحہ ۲۳۵، روض الانف مولفہ سبکی جلد دوم ص ۳۲۰۔

۲۔ مسند احمد بن حنبل جلد سوم ص ۴۴۱۔

۳۔ التصریف بالمصطلح الشریف مولفہ ابن فضل اللہ ص ۱۶۱۔

سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا پیغام

عصر حاضر کے نام

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم و مغفور نے 30 اپریل 1992ء کو اقبال اکادمی، پاکستان کے زیر اہتمام ”الحمر“ ہال، لاہور میں سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی، جس کا عنوان تھا:

”سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام، عصر حاضر کے نام“

یہ تقریر یہاں من و عن ہدیہ قارئین ہے۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام زمانہ حال کے مطابق ایک ایسا موضوع ہے جس کا مفہوم مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہے۔ اس لحاظ سے اس وسیع موضوع سے متعلق کچھ بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ کچھ ہچکچاہٹ یہ ہوتی ہے کہ سیرت طیبہ کے بے کنار سمندر میں سے کیا چیز منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کی جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک حل یہ کیا جاسکتا ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز کے سلسلے میں آج کے ماحول اور دنیا پر نظر ڈالیں، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو کس حالت میں پایا اور پھر اُس کی اصلاح کے لیے خدا کے احکام کے مطابق کیا کام انجام دیے۔ یہ شاید ہمارے لیے ایک نمونہ ہی بنے گا کہ آیا زمانہ حال کے حالات اور آئندہ عہد نبوت کے حالات یکساں ہیں یا مختلف ہیں۔ اگر یکساں ہیں تو وہ حل ہمارے لیے کام دے گا اور اگر یکساں نہیں ہیں تو جزوِ اسوۂ حسنہ کی چیزوں سے ہم استفادہ کر سکیں گے اور نئی چیزوں کے لیے شاید ہمیں کوئی نئی تدبیر اختیار کرنی پڑے گی، جس کے متعلق میں آپ سے وہ مشہور حدیث بیان کر سکتا ہوں، جس سے آپ واقف ہیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے ایک شخص (معاذ بن جبل) کو منتخب فرمایا اور یمن کے گورنر کے طور پر بھیجا، جب وہ رخصتی سلام کے لیے حاضر ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا:

اے معاذ! تمہارے پاس اگر مقدمات آئیں تو تم کس طرح انہیں حل کرو گے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا:

”جیسے قرآن میں احکام ہیں۔“

جواب بالکل صحیح تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دانست میں وہ جواب ناکافی تھا، اس اعتبار سے کہ اگر صرف وہ جواب اور لوگوں کے سامنے آئے تو شاید وہ اس سے استفادہ نہ کر سکیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ:

”اگر تم قرآن میں کوئی حکم نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟“

اس جواب کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ میں یا آپ نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ ممکن ہے کہ بعض تفصیلیں اور ذیلی باتیں قرآن مجید میں نہ ملیں۔ یہ خیال نہ کرنا کہ قرآن میں ہر چیز موجود ہے، اہم چیزیں ضرور ہیں، لیکن ہر چیز ملے، یہ ضروری نہیں، اس لیے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ:

”اگر قرآن میں وہ معاملہ نہ ملے تو کیا کرو گے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ: ”اس صورت میں میں سنت کے مطابق کام کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو طرز عمل رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اقوال ہیں، میں ان کے مطابق کام کروں گا۔“

یہ جواب بھی ٹھیک تھا، اس میں بھی وہی نکتہ پیش نظر رہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ:

”اگر تم سنت میں بھی نہ پاؤ تو کیا کرو گے؟“

یہ چیز خاص کر زمانہ مابعد کے لیے ہوتی ہے کہ عہد نبوی موجود نہ ہو، اس کے بعد کے زمانے آئیں اور لوگ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پوچھ سکتے ہوں تو کیا کریں گے؟ اس لیے یہ سوال بہت اہم تھا اور یہ دانستہ طور پر، کہنا چاہئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوال کیا اور حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا جو جواب دیا، پہلے وہ اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رد عمل، یہ دونوں ہمارے لیے سبق آموز ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:

اگر قرآن و حدیث میں تفصیل نہ ملے تو میں اپنی ذاتی رائے سے کوشش کروں گا اور کوئی جدوجہد نظر انداز نہ کروں گا۔ اجتہاد برأ ولا آلو۔

اس جواب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رد عمل سبق آموز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف، اللہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ:

”اے اللہ تیرے رسول کے رسول نے جو جواب دیا ہے وہ مجھے پسند ہے، میں اس پر خوش ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ٹھیک جواب ہے۔“

آدمی کو چاہیے کہ اولاً قرآن و حدیث پر نظر ڈالے، اپنی گتھی کے حل کے لیے،

اس کے بعد ہر شخص کو بلا استثنا کہنا چاہیے کہ حق بات یہ ہے کہ خدا نے اُسے جو عقل عطا کی ہے، خدا نے اُسے جو صلاحیتیں دی ہیں، اُن کی بنا پر جو چیز بھی اچھی ہو اسے اختیار کرے عہد اُردی چیز کو اختیار نہ کرے۔ کم ہی لوگ ہوں گے جو عہد اُردی چیز اختیار کرتے ہوں۔

بہر حال خدا کی بیان کردہ چیزوں کے بعد ہم خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اپنی انفرادی صلاحیتوں کے مطابق۔ اے اللہ مجھے سیدھے راستے پر چلا، اے اللہ مجھے ایسی بات کی تلقین کر جس میں تیری رضا مندی ہے۔

تو اس طرح وہ بھی بالواسطہ خدائی احکام بن جاتے ہیں اس معنی میں کہ اگرچہ پیغمبر جیسی شخصیت کے ذریعے سے وہ ہم تک نہیں پہنچے، ہم عام انسانوں کی حیثیت سے خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مطابق خدا ہی کی طرف رجوع ہو کر، جو حاضر و ناظر اور راستہ بتلانے والا ہے، اس کے ہاں درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں صحیح راستہ بتائے۔ اس کے بعد میں دوسرے پہلو پر آتا ہوں۔

عہد نبوی کے آغاز میں دُنیا کی صورتِ حال:

”عہد نبوی میں دُنیا“ ایک وسیع موضوع ہے۔ اگر صرف یہ پوچھا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن میں یعنی مکہ معظمہ میں کیا صورتِ حال تھی تو (اسے بیان کرنا) شاید آسان ہے، لیکن یہ کہنا کہ ساری دُنیا میں کیا حال تھا اتنا آسان نہیں رہتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کے اندر ایک ابتری پائی جاتی تھی۔ سیکڑوں قبیلے تھے جو روزانہ آپس میں لڑائی بھڑائی کیا کرتے تھے۔ اُن میں اخلاقی بُرائیاں بھی تھیں اور سیاسی بدتمیزی بھی تھی کہ آپس میں لڑ کر اپنے آپ کا بھی نقصان کریں اور اہل ملک کا بھی نقصان کریں۔ بہر حال عرب کے اندر افراتفری تھی اور وہاں ایک ایسی صورتِ حال تھی جو انسان کے شایانِ شان نہیں تھی۔

عرب کے باہر پر نظر ڈالیے، وہاں ایک طرف ایران کی عظیم الشان سلطنت پائی جاتی تھی۔ دوسری طرف بازنطینی یونانیوں کی حکومت پائی جاتی تھی اور آگے بڑھیں تو

مصر میں ایک صورت حال، جنوبی عرب میں ایک صورت حال، ہندوستان میں ایک صورت حال، چین میں ایک صورت حال، غرضیکہ افراتفری ساری دنیا میں پائی جاتی تھی اور امن ناپید ہو چکا تھا اور ہمسایہ ممالک ہر وقت لڑائی بھڑائی میں مشغول رہتے تھے۔

اس کے بعد جب عہد نبوی شروع ہوا تو پہلے دن تو لوگوں نے اُس کو محض استعجاب کے طور پر دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جلد ہی جب اُس میں بت پرستی کی بُرائی اور دیگر بُرائیوں کا جو ملک میں پائی جاتی تھیں، ذکر سنا تو اُن میں استعجاب کے بعد قبولیت کی طرف میلان کی بجائے نفرت پیدا ہوئی۔ خاص کر اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جو بت پرستی کرتے ہو نہ صرف وہ تمہارے لیے بُری (بات) ہے بلکہ اور لوگ بھی تمہارے آبا و اجداد بھی اگر بت پرستی کرتے رہے ہیں تو خدا ان کو جہنم میں بھیجے گا، سزا دے گا۔

”کیا میرے باپ، میرے دادا کو (تم) جہنم میں بھیجتے ہو؟“

یہ ایک احمقانہ طریقہ تھا سوچنے کا، مگر یہی ہوا۔ چنانچہ اس کے ردِ عمل کے طور پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دی جانے لگی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو اذیت دی گئی، بلکہ ان میں سے بعض کو قتل بھی کیا گیا۔ ایک عورت خاص طور پر قابل ذکر ہے سمیہ اس کا نام تھا جو اصل میں ترک تھی اور ایک لونڈی کے طور پر ایران میں پہنچی تھی اور ایران کے گورنر کے تحفے کے طور پر وہ مکے آئی تھی۔ بہر حال وہ ایک ترک بہن تھی، مسلمان ہوئی، اُس کو ابو جہل نے قتل کر دیا۔

غرضیکہ اذیت دہی کا سلسلہ ایک بحران کی شکل میں ملک میں پایا جاتا تھا اور ابتدائی دنوں کے بعد ہی ایک واقعہ پیش آیا جس کا یہاں ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پرست اور بہی خواہ چچا حضرت ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات ہو گئی۔

عرب کے نظام میں معیشت کے لحاظ سے ایک دوسرا چچا قبیلے کا سردار بنتا ہے، یہ تھا ابولہب، اس نے یہ اعلان کیا کہ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (اپنے قبیلے

ہے) خارج کرتا ہوں۔ اگر کوئی انہیں (ہلاک) بھی کر ڈالے تو میں اور میرا قبیلہ اس میں دخل نہیں دے گا اور اس طرح سے گویا ملک سے باہر جانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کر دیا گیا۔ ان حالات سے آپ واقف ہیں، میں تفصیل میں نہیں جانا صرف آخری نکتے پر پہنچتا ہوں۔

ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوچنے لگے کہ اللہ کے احکام کی تبلیغ کس طرح کروں۔ شہر مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تقریر کرنے کی ممانعت ہے، مکہ کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں، تو اتفاق سے ایک موقع تھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استفادہ فرمایا۔ وہ یہ کہ حج کے زمانے میں لوگ مکہ اور اُس کے مضافات، منی و عرفات میں سارے عرب سے آتے تھے، جن میں سے ظاہر ہے کہ سب کی اہل مکہ کے ساتھ دوستی نہیں تھی، مخالفین بھی کبھی آتے تھے، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں حج کے دنوں میں منی اور عرفات میں اُن بیرونی مہمانوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع کیا۔

ہر شخص کے پاس جاتے تھے اور پوچھتے تھے کہ تم کس قبیلے کے ہو، پھر اُس کو تبلیغ اسلام فرماتے تھے اور جو نکتہ میں خاص طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ کہتے تھے کہ اگر تم میری بات مانو، — یعنی خدا کے احکام کی تبلیغ میں میری مدد کرو تو جلد ہی قیصر اور کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر نچھاور ہو جائیں گے۔

یہ تھا وہ عزم اور وہ ہمت جو کہنا چاہیے کہ ہمارے لیے سبق آموز ہے۔ مصیبتوں سے نہ گھبرائیں اور مصیبتوں کی کثرت سے ہم مایوس نہ ہو جائیں، بلکہ وہ کریں جو اللہ جل شانہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ وہ یہ کہ ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ کام کرو، کام شروع کرو، اللہ جل شانہ تمہاری مدد کرے گا اور ان بڑی بڑی مشکلوں سے تم نہ گھبراؤ۔ یہ سبق آموز چیز ہے۔

آج بھی ہمارے لیے وہی مسئلہ پیش ہے۔ ہمارے دشمن لا تعداد بھی ہیں، ہم سے قوی تر بھی ہیں اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں اندرونی جھگڑے بھی

ہیں۔ بجائے اس کے کہ متحد ہو کر اپنے دفاع کی کوششوں میں مصروف ہوں ہم آپس کی لڑائیوں میں مشغول ہیں۔ یہ چیز اُس وقت بھی پائی جاتی تھی۔ عرب میں، عرب کے باہر ساری دنیا میں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمت دلاتے ہیں، اور کام شروع کرو۔ دنیا کی جو سپر طاقتیں ہیں یعنی قیصر اور کسریٰ وہ تمہارے قبضے میں آجائیں گی۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ ہمارے دشمن بہت سے ہیں۔ ہم سے قوی تر بھی ہیں لیکن اُس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری چیز جس کا میں ذکر کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو ایک حدیث میں ذکر آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر خدا جل شانہ نے بھیجے۔ ان ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کے ہمیں نام بھی معلوم نہیں، مقام بھی نہیں معلوم ہیں اور کاموں کی تفصیل بھی معلوم نہیں ہے۔ لیکن یقیناً کئی سو مذہب پیدا ہوئے ہوں گے۔

ایک دلچسپ حدیث فتوحات مکیہ میں حضرت ابن عربی نے لکھی ہے۔ معلوم نہیں کس حد تک صحیح ہے لیکن دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے ایک لاکھ آدم پیدا کیے اور ہم آخری آدم کی اولاد میں ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کیجئے کتنے کروڑ کتنے ارب سالوں سے انسانیت پائی جاتی تھی کہ ایک لاکھ آدم پیدا ہوئے ہوں اور ان کی ذریت (اولاد) پھیلی ہو۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ ہم سابقہ پیغمبروں کے حالات پر نظر ڈالیں جس حد تک بھی ہمارے امکان میں ہے، جس حد تک بھی معلومات ہم تک پہنچی ہیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اسلام اور اسلام سے قبل کے مذاہب میں بعض چیزوں کی حد تک تو اتفاق پایا جاتا ہے۔ مثلاً خدا کو ایک ماننا، لیکن بعض چیزوں کی حد تک اس میں فرق بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس صحیح معلومات موجود نہیں ہیں جو قابل اعتماد ہوں۔ لیکن جس حد تک بھی ذرائع معلومات سے معلوم ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لیجئے۔ انجیل جو ہمارے پاس عیسائیوں کے ذریعے سے پہنچی ہے اُس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے کہ مجھے دنیا کی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گویا ان کی تعلیم روحانی ہوگی، روحانی معاملات کے لیے ہوگی۔ شاید عقائد کے لیے ہوگی۔

لیکن عام معاملات خاص کر سیاسی اور حکومتی معاملات میں انہیں نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ وہ اُس کے لیے کوئی احکام دیتے ہیں۔

آج ہم سوچیں کہ اگر ہم اپنے کاموں سے حکومت کا حصول اور سیاسیات کو خارج کر دیں تو شاید کوئی دلچسپی کی چیز ہمارے پاس باقی نہیں بچے گی۔ آج ہر شخص حکومت کے متعلق ہی کوشش کرتا ہے۔ پارلیمنٹ کے انتخاب میں اس کا چناؤ ہو جائے، وزیر بنے، صدر حکومت بنے، وغیرہ وغیرہ۔

ہم دیکھیں گے مقابلہ کرتے ہوئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو سیاسی معاملات سے بالکل خارج رکھتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ پہلے ہی دن سے نام لیے بغیر حکومت قائم کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ ابھی تھوڑی سی تفصیل میں آپ سے عرض کروں گا۔ یہ ایک طرف، دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قول انہی عیسائیوں کی فراہم کردہ انجیل میں یہ بیان ہوا ہے۔

”میں بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے آیا ہوں، غیر قوموں سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ حتیٰ کہ ایک دن ایک غیر یہودی عورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی اور چاہا کہ ان کا دین قبول کرے۔ ان کے الفاظ جو انجیل میں ہیں ان سے ہمیں حیرت ہی ہوتی ہے، وہ یہ ہیں کہ بچوں کی روٹی کتوں کے سامنے نہیں ڈالی جاسکتی ہے۔ اُس کا ایمان قبول کرنے سے آپ نے انکار کر دیا۔

اُس کے برخلاف ہم اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے ہی کام نہیں کرتے بلکہ سبھی لوگوں کے لیے کام کرتے ہیں۔ اولین مسلمانوں میں کالے بھی ہیں، گورے بھی ہیں، ایرانی بھی ہیں، ترک بھی ہیں، غرضیکہ ساری دنیا کے لوگوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کام کرتے ہیں۔ جس سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ کیوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت (طبیہ) ہمارے لیے قابلِ عمل نمونہ ہے اور کس طرح ہم اُس سے آج بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا کہ ہجرت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمایا

کرتے تھے کہ اگر تم مجھ پر ایمان لاؤ، میری مدد کرو تو قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں پر بچھا دیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک پس منظر یاد آتا ہے اُس کا میں آپ سے ذکر کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مسلمانوں کی حکومت اور قیصر کی حکومت، یعنی بازنطینی یورپ کے یونانی حکمرانوں میں جھگڑے پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے ایک مسلمان سفیر کو قتل بھی کر دیا تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک سفارت بھیجی قیصر سے ملاقات کرنے کے لیے، تاکہ اُس سے کہیں کہ لڑائی بھڑائی کی جگہ دوستانہ تعلق رکھو۔ تمہارے لیے بھی یہ بھلائی کی چیز ہوگی اور ہمارے لیے بھی بھلائی کی چیز ہوگی، کیوں آپس میں لڑیں۔ یہ پیغام بھیجنے کے وقت جن لوگوں کو روانہ کیا گیا تھا، ان کی روایت کردہ تفصیل میں آپ کو سناتا ہوں۔

ایک سرکاری تقریب ہوئی، وہاں گفتگو ہوئی، وہاں بحث ہوئی اور اسکے بعد قیصر نے اس سفیر کو ایک دن پرائیویٹ ملاقات کے لیے اپنے گھر بلایا۔ جب وہ بادشاہ کے محل میں پہنچے تو اُس نے ایک خادم کو حکم دیا کہ ایک صندوق لاؤ۔ صندوق لایا گیا، صندوق میں ڈبے بہت سے پائے جاتے تھے۔ اُس نے ان کو کھولا اور اس میں سے ایک تصویر نکالی اور سفیر سے پوچھا:

تم جانتے ہو یہ کس کی تصویر ہے؟

جواب دیا نہیں۔

اُس نے کہا کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر ہے۔

پھر اُس کے بعد ایک دوسری تصویر نکالی، اس میں بھی دریافت کیا شاید حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہو (تصویر ہو) پھر اس نے ایک اور تصویر نکالی، پوچھا:

تم جانتے ہو یہ کون ہیں؟

سفیر نے فوراً جواب دیا: ہاں یہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تو قیصر اچنبھے میں پڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور کہا تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ واقعی یہ تمہارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر ہے، انہوں نے کہا ہاں

بالکل اُسی طرح جیسے ہم آپ کو دیکھا کرتے تھے، تو اس وقت اُس نے اقرار کیا کہ صندوق میں جو ڈبے ہیں، یہ آخری ڈبے کی چیز تھی صرف تمہاری آزمائش کے لیے اُسے میں نے پہلے نکال کر پوچھا، ورنہ اگر ترتیب سے آتا تو آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور فلاں اور فلاں تو تم اندازہ کر لیتے کہ یہ تمہارے پیغمبر کی تصویر ہوگی۔ لیکن اب تمہارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بہت سی اسلامی تاریخی کتابوں میں یہ قصہ موجود ہے۔ بہت سی اور تفصیلیں ہیں میں اس میں نہیں جاتا، لیکن یہ تصویریں کہاں سے آئیں، شاید یہ دلچسپی کا موجب ہو۔

چنانچہ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قیصر روم کے ہاں، فرنگی بیان کے مطابق ایک کتاب تھی، ”ہمارے ملک کا مستقبل باتصویر“ اس میں ہر زمانے کے حالات کا ذکر تھا۔ دونوں کو اگر ملائیں تو معلوم ہوتا ہے شاید اُسی بڑی (مصور) کتاب کا ایک جزو تھا جو بادشاہ نے مسلمان سفیر کو دکھایا تھا۔ اس کی تاریخ پر جائیں تو فرنگی مولوی بیان کرتے ہیں کہ حضرت دانیال ایک پیغمبر تھے، انہوں نے اللہ جل شانہ سے دعا فرمائی سکندر اعظم کی درخواست پر کہ مجھے فلاں چیز دکھائی جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کا خزانہ کہاں تھا وہ بتایا جائے تو کہتے ہیں کہ حضرت دانیال کے ذریعے سے حضرت آدم علیہ السلام کے خزانے میں جو (دینہ) چلا آ رہا تھا اُس کے اندر سے لی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ تصویریں تو جیسے ہمارے ہاں بھی یہ روایت ہے، ایک مرتبہ حضرت آدم علیہ السلام نے خدا جل شانہ سے دعا فرمائی تھی کہ میری اولاد میں جو پیغمبر ہوں گے، مجھے بتائیے وہ کون ہوں گے۔ اس طرح کی حدیث مسلمانوں کے ہاں بھی ملتی ہے۔ ان دونوں کو ملائیں تو باہمی ربط نظر آتا ہے۔

بہر حال قصہ مختصر یہ کہ انتہائی مصیبتوں کے زمانے میں مایوس کن حالات میں آس پاس کے دشمنوں کی عظیم الشان قوت کی موجودگی کے باوجود عزم راسخانہ رکھنا اور ہمت بے پایاں کو رکھ کر کام کیے چلے جانا، نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن ہمارا فریضہ صرف یہ ہے کہ کام کیے جائیں تو خدا تعالیٰ اس میں کامیابی دیتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع دین پیش کیا

اور اس کے لیے ایک ہمہ گیر کوشش کا آغاز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ وہ کوشش کامیاب ہو۔ ورنہ سیکڑوں پیغمبر ایسے گزرے ہیں جن کی قوم نے انہیں قتل کر دیا اور ان کے متعلق ان کے احکام، ان کی تعلیم، کوئی آثار اب باقی ہی نہیں ہیں۔

اس کے برخلاف جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کے حالات میں مایوسی پائی اور کہنا چاہیے ادب کے ساتھ کہ مجبور ہو گئے کہ اپنے وطن کو ترک کر دیں، مدینہ تشریف لے جائیں اور مدینہ میں کوشش کا آغاز کریں تو وہاں ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے کہ سب سے پہلا کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پہنچ کر فرمایا وہ یہ تھا کہ بے وطن پناہ گزینوں کی گزر بسر کا انتظام کیا۔ یعنی جو مکے کے مسلمان یا نو مسلم تھے اور مدینہ پہنچے تھے ان کے پاس ذرائع معیشت نہیں تھے تو ان کے لیے کوئی گزر اوقات کا انتظام فرمائیں۔ مواخات (بھائی چارے) کے ذریعے سے یہ کام انجام پایا۔ یعنی مہاجرین کو ملک کی معاشرت اور معیشت میں ضم کر دینا۔ پلک جھپکانے کا وقت لیا اور کام پورا ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا کام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ یہ تھا کہ بیرونی حملوں کے خدشے سے اپنے مستقبل کی حفاظت کے متعلق تدبیر اختیار کریں۔ چنانچہ حقیقتاً اہل مکہ، مشرکین مکہ نے یہ خط لکھا، مدینہ کے مسلمانوں، انصار کے نام کہ تم نے ہمارے ایک دشمن کو پناہ دی ہے یا تو اُسے قتل کر ڈالو یا اُسے اپنے ملک سے نکال باہر کرو ورنہ ہم تمہارے متعلق وہی کام کریں گے جو ہمیں مناسب معلوم ہوگا یعنی حملے کی دھمکی دی۔

ان حالات میں دفاع کا انتظام مقدم ترین تھا اور ملک کی صورت حال یعنی مدینہ منورہ کا حال یہ تھا کہ وہاں یکجہتی نہیں پائی جاتی تھی۔ وہاں عرب بھی تھے، وہاں یہودی بھی تھے، وہاں عیسائی بھی تھے، وہاں یہ نو آمد مسلمان اور اجنبی پناہ گزین بھی تھے، تو کیا کیا جائے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعوت بھیجی شہر کے تمام عناصر کے سرکردہ لوگوں کو کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس میں یہودی بھی آئے، نصرانی بھی آئے، نو مسلم بھی آئے اور غیر مسلم بھی آئے۔ اُن سے مخاطب ہو کر حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ملک کی افرا تفری کے باعث، آپس کے لڑائی جھگڑوں کے باعث ہمارے لیے خطرہ ہے کہ اگر کوئی اجنبی ہم پر حملہ کرے تو ہم نقصان اٹھائیں اور ہم اُن کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ایک چھوٹی سی حکومت، سلطنت قائم کی جائے، ہر قبیلے کو آزادی رہے گی لیکن ایک مرکز بھی ہوگا اور وہ مرکز ان کے مفاد کے لحاظ سے تدبیریں اختیار کرتا رہے گا۔

اس کو سب لوگوں نے قبول کیا۔ یہودیوں نے بھی قبول کیا، اور بت پرست عربوں نے بھی قبول کیا اور مسلمان تو ظاہر ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کو دیکھ کر اس سے متفق تھے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر مدینہ کے ایک جزو میں، مدینہ بہت چھوٹا شہر ہے۔ شہر مدینہ میں نہیں بلکہ شہر مدینہ کے ایک جزو (حصے) میں ایک حکومت قائم فرمائی، ایک سلطنت قائم فرمائی شاید چند مربع میل کا رقبہ ہوگا اور جو چیز قابل ذکر ہے اور جو حیرت انگیز ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سلطنت کا دستور تحریر فرمایا۔ تاریخ عالم میں نہ ایران و روم میں، نہ چین میں، نہ ہندوستان میں، نہ امریکہ میں، کسی بھی سلطنت کا دستور تحریری طور پر مرتب نہیں پایا جاتا تھا۔

تاریخ عالم میں پہلی دفعہ اُسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سلطنت کا دستور تحریری طور پر مدون فرمایا جو ہم تک پہنچا ہے۔ اس کی دفعات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہر قسم کی تفصیلات موجود ہیں جو اس زمانے کی ضرورتوں کے لیے بھی کافی تھیں، اُن میں سے بہت سی آج بھی ہمارے لیے کارآمد ہیں۔

جب یہ سلطنت قائم ہوئی تو اس میں چند یہودی قبیلے بھی شریک ہوئے، سب نہیں ہوئے۔ عیسائیوں کی تعداد کم تھی وہ شخصی جلن کے باعث، کہنا چاہیے کہ اس میں شریک نہیں ہوئے، لیکن جو باقی عرب تھے، مسلمان اور غیر بھی وہ اس میں شریک ہوئے اور جس چیز پر ہمیں حیرت ہوتی ہے وہ یہ کہ یہودیوں نے بھی جو مدینے میں تھے پسند کیا کہ اس سلطنت کے صدر یہ اجنبی شخص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ انہیں اہل مدینہ پر اعتماد نہیں تھا۔ لیکن خیال کیا کہ یہ شخص اجنبی ہے، غیر جانبدار رہے گا اور وہ ہمارے

ساتھ انصاف کرے گا۔ چنانچہ وہ اس سلطنت میں شریک ہوتے ہیں اور انہیں اُس کے حقوق بھی دیے گئے ہیں۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ اندرونی عبادت کی آزادی دی گئی، بلکہ دستور میں لکھا ہے کہ انہیں عدل و انصاف کی بھی آزادی ہوگی یعنی اگر کوئی جھگڑا دو یہودیوں میں پیدا ہو جائے تو حاکم عدالت بھی یہودی ہوگا اور قانون بھی یہودی ہوگا اور فریقین مقدمہ بھی یہودی ہوں گے۔ انہیں کلیتہً آزادی ہوگی اور مرکزی حکومت کی طرف سے اُس حاکم عدالت کے فیصلے میں کوئی دخل اندازی نہیں کی جائے گی، اُس کو بعینہ نافذ کیا جائے گا۔

اس کام سے فراغت پانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے ہیں کہ مدینے کی قوت محدود ہے اور مکہ مقابلتاً زیادہ قوی ہے۔ اگر وہ حملہ کرے تو ہم اپنی مدافعت نہیں کر سکیں گے اس کا حل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً یہ سوچا کہ مدینے کے آس پاس شمال جنوب، مشرق مغرب ہر مقام پر جو آزاد عرب قبیلے رہتے ہیں ان سے تعلق پیدا کیا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے ہیں جبینہ کے قبیلے کے پاس۔ مثلاً جو مدینے کے شمال میں بستا تھا اور ان سے کہتے ہیں:

دوستو! تم اس وقت آزاد ہو، جو چاہے کرو، جو چاہے نہ کرو۔ کوئی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ لیکن تم ہوتہا۔ اگر کوئی تمہارا دشمن تم پر حملہ کرے اور تمہاری ذاتی قوت اتنی نہ ہو کہ اس قوی تر دشمن سے مقابلہ کر سکو تو تمہیں کوئی مدد دینے والا بھی نہیں ہوگا۔ ان حالات میں کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم دونوں میں حلف (معاہدہ) ہو جائے۔ اگر کوئی تم پر حملہ کرے تو تم ہمیں اطلاع دو، تو ہم دوڑے ہوئے آئیں گے اور تمہاری مدافعت میں تمہارے ساتھ شریک رہیں گے۔ اگر اسی طرح کوئی ہم پر حملہ آور ہو، اپنے طور پر نہیں بلکہ اگر ہم تم کو بلائیں تو تم بھی ہماری مدد کو آؤ گے۔ یہ باہمی حلف ہمارے لیے، تمہارے لیے، ہم دونوں کے لیے مفید ہوگا۔ بات معقول تھی، انہوں نے قبول کر لی۔

اس میں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ وہ قبیلہ تھا غیر مسلموں کا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی حکومت کی مدافعت کے لیے غیر مسلموں سے حلف (قائم) کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں پاتے تھے۔ یہ ایک پہلو تھا۔ پھر اسی طرح مختلف مقامات پر تشریف

لے گئے اور ایک طرح سے کہنا چاہیے کہ اسلامی مملکت جو شہر مدینہ کے ایک گوشے میں پائی جاتی تھی، اس کے اطراف میں دوستوں کا ایک حلقہ ڈال دیا۔ کوئی اجنبی حملہ آور ہو تو اس کو عملاً مسلمانوں کے دوست قبائل سے گزرنا پڑے گا اور اس کے بعد مدد کے لیے یہ سب لوگ بھی دوڑیں گے انہیں بچانے اور انہیں روکنے کے لیے۔ تو غرضیکہ ایک جال ڈال دیا گیا حلیفوں اور دوستوں کا۔

یہ ایک طرف، دوسری طرف اسلام کی تبلیغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشغول رہے اور اسلام کی تبلیغ اس معنی میں اہمیت رکھتی ہے کہ ساری چیزیں بیک وقت نافذ نہیں ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ایک کے بعد ایک اور تجربوں سے فائدہ اٹھا کر۔ اگر چاہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نئے احکام دیے گئے۔

اب آغاز اسلام پر ہمیں صرف دو چیزیں ملتی ہیں۔ شہادت لا الہ الا اللہ، بت پرستی سے انکار ایک چیز — دوسری طرف نماز۔ صرف یہ دو واجبات تھے باقی چیزیں روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ وہ نہیں پائی جاتی تھیں۔ یہ بعد میں رفتہ رفتہ آتے ہیں، تو یہ بھی ہمارے لیے سبق آموز ہے کہ ان سارے کاموں کو بیک وقت شروع کرنے کے بجائے تقسیم کار بھی کرو اور بتدریج بھی کرو۔ یہ بھی ہمارے لیے ایک سبق آموز نمونہ ملتا ہے۔ ایک چیز پر میں (اس بیان کو) ختم کرتا ہوں۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حکومت جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی، کچھ اس کی تحلیل کریں کہ وہ کیسی تھی؟ کیا وہ بادشاہت تھی؟ کیا وہ جمہوریت تھی؟ کیا وہ یونیٹری (وحدانی) حکومت تھی؟ کمپوزٹ حکومت تھی؟ اگر ان چیزوں کو سوچیں تو اس میں بھی ہمارے لیے سبق ہے۔ خیال فرمائیے کہ میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا کہ مسلمانوں پر مصیبت کا زمانہ تھا، خاص کر مکے میں اور اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی نو مسلموں سے فرمایا تھا کہ اگر تمہارے لیے یہ صورت حال، یہ اذیت دشمنوں کی ناقابل برداشت ہو چکی ہے تو تم ملک چھوڑ کر حبشہ چلے جاؤ جہاں ایک عیسائی حکمران ہے لیکن اس کے ملک میں انصاف ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو غیر مسلم علاقے میں جا کر پناہ گزین ہونا یہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں

کہ اُس ملک میں انصاف ہوتا ہے۔ تو معیار کیا ہونا چاہیے، اُس کی ہمیں تفصیل ملتی ہے۔

اس کے بعد اور آگے چلیے۔ جب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی وہ شاید چند مربع میل کے رقبے پر مشتمل تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی دس سال بعد وفات ہوئی تو اس مملکت کا رقبہ پھیلتے پھیلتے دس لاکھ مربع کلومیٹر (کذا) کا ہو گیا۔ سارا جزیرہ نمائے عرب، جنوبی عراق، جنوبی فلسطین، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاقے کے اجزاء تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کو مانتے تھے اور اس اسلامی حکومت کے اجزاء تھے، جو شاید چار مربع میل ہو — ایک ملین مربع میل (کذا) کا فرق فوراً ہمارے سامنے آتا ہے کہ یہ اُس کوشش کا نتیجہ تھا۔

ایک دوسری چیز لیجیے، تعداد میں مسلمانوں کی، آغاز اسلام پر سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی مسلمان نہیں تھا۔ ایک دن بعد ایک کا اضافہ ہوا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیز بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ ایک سے بھی ظاہر ہے کام نہیں بننا، پھر اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ رفتہ رفتہ ایک دو تین چار، تعداد بڑھتی گئی مگر مصیبتیں بھی بڑھتی گئیں۔ جیسا میں نے ابھی آپ سے بیان کیا کہ حضرت مسیحؑ جو ترک تھیں اُن کو قتل بھی کر دیا گیا، تو عرض کرنا یہ ہے کہ تبلیغ اسلام کی کوشش جاری رہی۔ آغاز پر مٹھی بھر مسلمان تھے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایسا نظر آتا ہے کہ میرے اندازے میں نصف ملین لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔

یہ اندازہ میں نے کس طرح لگایا ابھی آپ سے بیان کروں گا لیکن حال ہی میں پیرس میں میں نے ایک عیسائی پادری سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دنیا میں تھے تو اس وقت کتنے لوگ عیسائی تھے، آج کل کتنے ہیں؟ یہ نہیں پوچھا بلکہ حضرت عیسیٰ کی دنیاوی زندگی میں کتنے لوگوں نے ان کا دین قبول کیا تو کچھ ناپسندیدہ حالات میں اس نے کہا کہ شاید تیس چالیس ہوں گے۔ خیال فرمائیے تیس چالیس، اور دوسری طرف نصف ملین لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان قبول کرتے ہیں۔

یہ نصف ملین کی تعداد میں نے کیسے سوچی، وہ بھی آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔
 اس زمانے میں کوئی اعداد و شمار اکٹھے نہیں کیے جاتے تھے اور کوئی مردم شماری
 نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی تعداد کا ذکر آتا ہے مختلف سلسلوں میں۔ مثلاً اس جنگ میں
 اتنے سپاہی تھے، دشمن کے اتنے اور ہمارے اتنے وغیرہ وغیرہ۔ تو اسی سلسلے میں لکھا ہے
 کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چند مہینے پہلے جو
 حج ہوا تھا اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے تھے، ایک لاکھ
 چالیس ہزار لوگ شریک تھے۔ یہ سب مسلمان تھے۔ ایک لاکھ چالیس ہزار وفات سے
 چند مہینے پہلے مسلمانوں کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اس حج میں آنے والوں کی تعداد ہے۔

ظاہر ہے کہ سارے لوگ نہیں آئے ہوں گے۔ کوئی بڑھا ہے، کوئی بیمار ہے، کسی
 عورت کی زچگی ہوئی ہے۔ غرضیکہ مختلف عناصر آبادی کے ایسے ہیں جو نہیں آئے ہوں
 گے اور حج ہر سال فرض بھی نہیں تھا، اس کے متعلق حکم تھا کہ عمر میں ایک بار حج کرو اگر
 اس کا امکان پاؤ۔ مفلسوں کے لیے اس سے معافی ہے۔ وہ ایک لاکھ چالیس ہزار
 حاجیوں کی موجودگی سے میں نے گمان کیا کہ شاید پانچ لاکھ مسلمان ہوں اُس سارے
 ملک میں، حجاز میں، نجد میں، شمال عرب میں، جنوب عرب میں اور ممکن ہے کہ ہندوستان
 اور چین میں بھی، ایک مختصر ذکر اس کا بھی کرتا ہوں۔

ہندوستان کے سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ہجرت سے قبل ایک رات مالِ مبارک
 ایک راجہ رات کو کسی ضرورت سے آسمان پر نظر ڈالتا ہے تو ششدر ہو جاتا ہے۔ اس
 نے دیکھا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ شق القمر کا ہمارا جو معجزہ ہے راجہ نے یہ ماجرا
 اپنے وزیر سے بیان کیا، اس نے کہا میں تو کچھ نہیں جانتا، لیکن ایک چیز مجھے معلوم ہے۔
 حضور (بادشاہ) کے آباؤ اجداد جو حکمران گزرے ہیں انہوں نے کسی ذریعے سے کچھ
 چیزیں معلوم کی تھیں راز کی۔ ان کو ایک ڈبے میں رکھ کر اُن پر مہر لگائی ہے جو سرکاری
 خزانے میں موجود ہے اور حکم ہے کہ اسے کبھی نہ کھولو۔ شاید اس ڈبے کے اندر اس کا
 کچھ ذکر ہو۔ میں اگر خزانچی سے کہوں گا تو مجھے نہیں دے گا۔ اگر حضور فرمائیں تو وہ ڈبہ
 لائے گا اور ہم کھول کر دیکھ سکیں گے۔

چنانچہ واقعاً ہوا یہی۔ اُس ڈبے کو منگوایا گیا، اسے کھولا گیا۔ اس کے اندر ذکر تھا پرانے راجہ کا، اس موجودہ راجہ کے آبا و اجداد میں سے کسی کا، جس میں لکھا تھا کہ آخری پیغمبر کے زمانے میں ایک مرتبہ چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے یہ اس کا معجزہ ہے۔ تم اس کی خلاف ورزی کبھی نہ کرنا، اس کی بات ماننا۔ اس پر راجہ نے اپنے بیٹے کو اپنی جگہ حکمران بنا دیا اور (خود) چلا گیا مکہ معظمہ، وہاں اس نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ یہاں نہ رہو شاید اس لیے کہ عرب میں امن نہیں تھا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم ہو رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے ملک ہی کو واپس جاؤ، اپنے ملک ہی میں اس مذہب کی تبلیغ کرو۔

چنانچہ وہ مکے سے واپس ہوتا ہے خشکی کے راستے سے یمن تک، تاکہ یمن میں کسی جہاز پر سوار ہو کر مالیبار واپس جائے، لیکن وہاں وہ بیمار پڑا، وہیں اس کی وفات ہوئی اور صدیوں تک اس کا مزار ایک عام زیارت گاہ بنا ہوا تھا۔ اسے لوگ ملک الہند کہہ کر پکارتے تھے کہ ہندوستان کے بادشاہ کا مزار ہے۔ یقیناً اس کے جو ساتھی ہوں گے وہ واپس گئے ہوں گے۔ وہاں ان چیزوں کا ذکر کیا ہوگا اور ممکن ہے کہ وہاں عہد نبوی ہی سے اسلام پھیلنا شروع ہو گیا ہو۔

اسی طرح چین کے مسلمانوں میں ایک روایت ہے جس سے ہم عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ وہاں کے چینوں میں یہ قصہ مشہور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفیر (چین میں) بھیجا تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا یا خالو کوئی قریبی رشتہ دار تھے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا کوئی اور صحابی — انہوں نے وہاں اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ اس کے حالات کی تفصیل ہمیں عام تاریخوں میں نہیں ملتی صرف چینی روایتوں میں اس کا ذکر ملتا ہے، اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح اسلام کی تبلیغ کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ واجبہ یہ بیان کیا گیا کہ وَلْيُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا ط (الانعام: ۹۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شخصی طور پر

تبلیغی کام انجام دیتے رہنا یہ شہرام القریٰ میں یعنی مکہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (سبا: ۲۸) ساری دنیا کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گئے ہیں اور قیامت تک کے لیے، تو اس کا حل کیا کریں۔

دو چیزیں نظر آتی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائیں۔ ایک تو چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو مختلف علاقوں میں تبلیغ کے لیے بھیجا جاتا تھا، اس میں کچھ کامیابی بھی ہوتی تھی اور ناکامی بھی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور تدبیر اختیار فرمائی جو دل چسپ ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کے مختلف ملکوں کے حکمرانوں کو خط لکھ کر انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ایسے کتنے خطوط تھے، صحیح معلوم نہیں، لیکن کم از کم چھ خطوط اصلی دستاویزیں ہم تک پہنچی ہیں۔ چنانچہ ایک قیصر روم کے نام تھا، ایک کسری ایران کے نام تھا، ایک حکمران مصر کے نام تھا، ایک نجاشی حبشہ سے متعلق تھا، اس طرح مختلف حکمرانوں کو خطوط بھیجے گئے تھے، انہیں اسلام کی تبلیغ کی گئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ تبلیغ کا ایک ہی طریقہ نہ ہو، ہر ممکن طریقہ کوشش کر کے دیکھا جائے۔

یہ ایک نمونہ ہے ہمارے لیے، اس معانی میں کہ اگر ہم اپنے زمانے میں اور چیزوں کے ساتھ تبلیغ کرنا چاہتے ہیں تو کس طرح کریں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اس بارے میں کیا رہا ہے۔

میں آپ سے ذکر کر رہا تھا کہ جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اس کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ کس طرح کی حکومت تھی؟ ظاہر ہے وہ خانوادہ قسم کی بادشاہت نہیں تھی، شاید اس لیے (خدا میرا قصور معاف کرے) کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بیٹا زندہ نہ تھا۔ اگر زینہ اولاد موجود ہوتی تو شاید مسلمان اُس کو اپنا جانشین بناتے۔ اپنا خلیفہ اول مقرر کرتے، پھر اُس کے بیٹے کو..... اور یوں ایک خانوادہ بن جاتا مگر اللہ جل شانہ کو کچھ اور منظور تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد زینہ زندہ نہ رہی۔ وہاں بادشاہت کا سوال نہیں تھا، جمہوریت کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا، اس معنی میں کہ جمہوریت میں عوام الناس اپنے صدر کا انتخاب خود کرتے ہیں اور پیغمبر، خدا جل شانہ کی

طرف سے نامزد ہوتا ہے، انسانوں کی طرف سے اس کا انتخاب نہیں ہوتا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک حکومت تھی اس معنی میں کہ ایک فرد (بطور سربراہ مملکت موجود) تھا جس کے احکام جس حد تک انسانی سوسائٹی میں ممکن ہے، سارے لوگ مانتے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اُس وقت چند چیزیں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں، وہ یہ کہ ایک حکمران، دوسرے ایک قانون — قرآن ایک قانون تھا جس کی تعمیل سارے مسلمانوں کے لیے واجب تھی۔ ایک حکمران — ایک قانون — اس کے بعد اُن افراد میں اور رعیت میں ایک رابطہ اور ربط قائم تھا۔ کہنا چاہیے کہ ایک تنظیم موجود تھی۔ لیکن کسی حکومت اور مملکت میں زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ زمین مسلمانوں کے پاس شروع میں نہیں تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں کے ملک میں، مکہ کے مشرکوں اور بت پرستوں کی حکومت کے اندر ایک سکونت پذیر شخص کی حیثیت سے موجود تھے۔ جو مٹھی بھر افراد مسلمان ہوئے وہ بھی وہیں کے باشندے تھے، لیکن حکومت ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ البتہ ایک حکومت کے جتنے عناصر ہوتے ہیں ان میں سے چند موجود تھے جنہیں فوراً اختیار کر لیا گیا، جو چند عناصر موجود نہیں تھے ان کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو وہاں ایک چھوٹی سی مملکت قائم ہوئی اور اس مملکت کی وسعت چار پانچ مربع میل کے رقبے سے شروع ہو کر دس لاکھ مربع میل تک عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں پھیل گئی تھی۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً بعد جو چیزیں رونما ہوئیں وہ اور بھی زیادہ حیران کن ہیں۔ مثلاً ۶۲ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مدینہ منورہ کا حکمران تین براعظموں پر حکومت کر رہا تھا۔ مسلمانوں کی فوجیں نہ صرف ایشیا اور افریقہ میں تھیں بلکہ یورپ کے اندر بھی وہ لوگ داخل ہو چکے تھے۔

لیکن میں یہاں عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کر رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کیا صورت حال تھی، اس میں ایک چیز قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ عرب میں نہ صرف قبیلے تھے بلکہ کچھ سلطنتیں بھی تھیں، ان میں سے عمان کا علاقہ جو شرقی اردن کا پایہ تخت ہے، مشرقی عرب میں بحرین کے پاس کا علاقہ ہے، وہاں ایک

بادشاہت قائم تھی۔ بادشاہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے دو بیٹوں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا، بجائے ایک کے دونوں بیٹوں کو۔ ایک کا نام جعفر اور دوسرے کا نام تھا عبیص۔ بادشاہ کا اپنا نام جولندا تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جعفر اور عبیص دونوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یاد رہے کہ حکمران ہوتے ہوئے انہوں نے اسلام قبول کیا (جب کہ رعیت میں غیر مسلم بھی شامل تھے) اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ ان کا تعلق مدینے کی اسلامی حکومت سے کس طرح ہوا؟

وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک افسر روانہ کیا جسے شاید آپ ریذیڈنٹ (Resident) کہہ سکتے ہیں۔ وہ ان کے دربار میں رہا۔ اس ریذیڈنٹ کے فرائض میں اسلام کی تبلیغ اور اسلام کی تعلیم بھی شامل تھی، لیکن اُس کو ملک کے عام نظم و نسق میں دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔ ملک کی رعایا خاص کر غیر مسلم رعایا کے سارے معاملات براہ راست جعفر یا عبیص یا دونوں کے پاس تھے اور دونوں مسلمان تھے اور..... اسلام کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، لیکن غیر مسلموں کی آزادی برقرار رکھی گئی تھی۔ ان حالات میں شاید زمانہ حال کی تعبیر کے لحاظ سے میں کہہ سکوں کہ وہ ایک طرح کا کنفیڈریشن تھا، یونیٹری (وحدانی) حکومت نہیں تھی، اس میں آزاد سلطنتیں بھی بعض شرائط کے ساتھ داخل ہوئی تھیں، چنانچہ اومان کی سلطنت (بھی اپنی اندرونی آزادی کے ساتھ) اس بڑی اسلامی سلطنت کا ایک جزو تھی۔

ایک دوسری مثال لیجیے، حبشہ کا بادشاہ جس کے متعلق ایک قصہ ہماری حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے کہ حکمران نجاشی کی وفات ہوئی، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں اذیت سہنے کے زمانے میں کمی نو مسلموں کو جا کر پناہ گزین ہونے کی ہدایت فرمائی تھی، ان میں سے ایک نجاشی کا انتقال ہوا۔ کئی نجاشی مختلف زمانوں میں ہوئے ہیں، ان میں سے ایک کا انتقال ہوا۔ اس کی مدینے خبر آئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بادشاہ کی عاتبانہ نماز جنازہ پڑھائی، جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ وہ بادشاہ مسلمان تھا اور آزاد بھی تھا۔ اس کی حکمرانی میں مدینے کی طرف سے کوئی دخل اندازی نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ کا انفرادی اسلام تھا۔ اس کے بعد وہاں جو حکمران

ہوا وہ مسلمان نہیں تھا۔

غرضیکہ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ غیر مسلم حکمرانوں کو دوست بنایا جاسکتا ہے اور ان کے ممالک سے تعلقات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ نیز ایک حکمران اپنی شخصی حیثیت میں دوسری سلطنت کی رعیت بن جائے، لیکن اپنی سرکاری حیثیت میں آزاد اور خود مختار رہے، یہ بھی ہمیں صورت نظر آتی ہے۔

عہد نبوی کی اسلامی مملکت کے عناصر میں سے ایک اومان کی حکومت ہے۔ ایک حبشہ کے نجاشی کی حکومت بھی ہے۔ اس کے علاوہ قبائل بھی آزاد تھے۔ حالانکہ ان قبائل کی حد تک مرکز کی جانب سے زیادہ مطالبات کیے جاسکتے تھے، لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ قبائل کے سرداروں کو بھی قبول کیا جاتا تھا، اگر مرکزی حکومت کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو قبیلے کے سردار کے ذریعے سے وہ کام انجام دیا جاتا تھا، غرضیکہ یہ اسلامی حکومت جو عہد نبوی میں قائم ہوئی، یونیٹری (وحدانی) قسم کی نہیں ہے، اس میں مختلف قسم کے عناصر پائے جاتے ہیں، اس میں افراد بھی ہیں، قبائل کے سردار بھی ہیں، بادشاہتیں بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک چیز کا اور ذکر کروں، وہ ہے سلطنت کی بقا کے متعلق تدبیریں:

دوسرے انسانوں کی طرح پیغمبر بھی انسان ہوتا ہے۔ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ناگزیر تھی، اس لیے وہ ہوئی بھی۔ وفات کے بعد کے کاموں کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں بہت ادب کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سلطنت اور حکومت قائم فرمائی تھی، اس کی وراثت یا جانشینی کے متعلق کوئی ایسی چیز نہ ارشاد فرمائی، نہ اس پر عمل کیا، جو اُس دور میں پائی جاتی ہے مثلاً انگلستان میں بادشاہ کے بعد اس کا بیٹا یا پہلی بیٹی خود بخود جانشین بن جاتے ہیں۔ اگر بیٹا نہ ہو تو بھائی بھتیجا وغیرہ جانشین مقرر ہو جاتے ہیں۔ گویا اُس دور میں جانشینی کے قواعد پائے جاتے ہیں، لیکن ایسی کوئی چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم نہیں فرمائی، جس کے معنی میں یہ لیتا ہوں کہ ہمیں اجازت دی گئی ہے کہ حسب ضرورت ہم خود کوئی طریقہ اختیار کر لیں،

چاہے وہ خانوادہ وار بادشاہت ہو، چاہے جمہوریت ہو، چاہے جماعتی حکومت ہو، سب کی ہمیں اجازت دی گئی ہے اور اس کے لیے ہمیں یہ بشارت بھی دی گئی ہے۔
يَذِ اللّٰهُ عَلَى الْجَمَاعَةِ۔

یعنی اگر سارے مسلمان متفق ہو کر کوئی کام کرتے ہیں تو اللہ جل شانہ کا ہاتھ اُن پر ہوتا ہے۔ اس لیے يَذِ اللّٰهُ عَلَى الْجَمَاعَةِ کی خوشخبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم اپنی ضرورت کی لحاظ سے اور اپنے حالات کے لحاظ سے جمہوریت بھی قائم کر سکتے ہیں، خانوادہ حکومت بھی قائم کر سکتے ہیں اور جو بھی مناسب سمجھیں کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ وفات سے دو تین دن پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی تھکن کی حالت میں تھے۔ فرمایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ تمہیں آخری احکام دوں۔ چنانچہ ظہر سے پہلے خطبہ شروع کیا، ظہر کے لیے وقفہ کیا، ظہر کے بعد دوبارہ خطبہ جاری رکھا اور اس اثنا میں جب انتہائی تھکن محسوس کرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام نے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس خطبے میں یہ صراحت تھی کہ جلد ہی میں رحلت کرنے والا ہوں لہذا تم فلاں کام کرو، فلاں کام کرو۔ یہ نصیحت کی باتیں تھیں۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے اور مزاج و طبیعت کے متعلق معلوم کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ اس وقت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا بہتر حالت میں پایا تو کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں بہت سی چیزیں بتائی ہیں..... اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) املا کروائیں اور کوئی ان چیزوں کو لکھ دے تو ہمارے لیے یہ وصیت کا کام دے گی اور یہ اچھی بات ہوگی۔

یہ مشہور قصہ ہے لیکن وہ پورا نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے متعلق نہ اس آخری خطبے میں کوئی صراحت فرمائی اور نہ اس سے چند مہینے پہلے حجتہ الوداع کے موقع پر جو مشہور عام

خطبہ دیا، اس میں کوئی صراحت فرمائی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ذیلی طریقے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معین کر دیا کہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ ہے نماز کی امامت - اسے اسلام میں جماعت کا سرکردہ اور حاکم شخص ہی انجام دیتا ہے۔ قبیلے میں قبیلے کا سردار، کسی شہر میں وہاں کا گورنر اور خود مدینے میں حکمران وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امامت کراتے تھے۔ ایک دن جب آپ انتہائی تھکن محسوس کر رہے تھے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دینے کے لیے آئے کہ جماعت تیار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہو کہ وہ امامت کریں۔ یہ ایک ذیلی طریقہ تھا یہ کہنے کا کہ میرے بعد سب سے ممتاز شخص ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں گے۔ صراحت نہیں تھی، لیکن ایسا ہوا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کام کو جاری رکھتے ہیں۔ پنج وقتہ نماز میں وہ امامت کراتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک دلیل کے طور پر، خاص طور پر ان لوگوں کو جو انصاریہ مدینہ کو چاہتے تھے کہ خلیفہ ان میں سے ہو، یہ کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امام بنایا ہے، کیا تم امام کو بدل کر کوئی دوسرا امام مقرر کرنے کی جرأت کرو گے؟

گویا اُن لوگوں سے ایک دلیل کے طور پر کہا گیا اور انہوں نے قبول بھی کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت ایک معنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی پر دلالت کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد ایک طرف انصاریہ مدینہ تھے جو چاہتے تھے کہ اسلامی حکومت برقرار رہے اور اس کا خلیفہ یا حکمران ان میں سے ہو، انصار میں پھوٹ تھی لہذا ان کی خواہش ایک ایسی خواہش تھی جس میں کوئی جان نہ تھی۔ اگر اوس کے قبیلے سے سردار لیا جاتا تو خزرجی اسے قبول نہیں کرتے، خزرجی ہوتا تو اویسی قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ ان میں اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے ہی دن سے خانہ جنگی اور پھوٹ پڑ جاتی۔ بہر حال اس موقع پر ایک قبیلے کے سردار نے اپنے محلے کی انجمن کے دفتر میں لوگوں کو جمع کیا اور یہ کوشش کی کہ ایک شخص کا انتخاب بطور خلیفہ کے کیا جائے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ کام ہو جائے تو پھر دوسرے لوگ بھی قبول

کر لیں گے۔ اگر نہ ہوا تو لوگ ہچکچاہٹ محسوس کریں گے۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی تو آپ فوراً اٹھے اور اپنے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابن جراح اور دو ایک ساتھیوں کو لیا اور سقیفہ بنی ساعدہ پہنچے، جہاں انصار کے قبیلے کے لوگ جمع ہو کر کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین بنانے پر غور کر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں بلا اطلاع پہنچتے ہیں مگر وہ لوگ یہ نہیں کہتے کہ جاؤ تمہاری ضرورت نہیں ہے، بلکہ کہتے ہیں تشریف لائیے۔ وہ لوگ انہیں ادب کے ساتھ سمجھاتے ہیں، کہتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ اسلامی حکومت برقرار رہے اور چونکہ انصاریوں کی مدد سے اسلامی حکومت پھیلی ہے، لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین خلیفہ بھی انصار میں سے ہونا چاہیے، بس یہی ہم سوچ رہے تھے۔

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھتے ہیں اور اُن کو مخاطب کر کے مختلف چیزیں بتاتے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم نے خود سنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار (یا بارہا) فرمایا ہے کہ خلیفہ قریشی ہونا چاہیے، لہذا وہ کوئی مکے کا مہاجر ہوگا، تم میں سے یعنی انصار میں سے نہیں ہوگا۔

انصار کی دین داری کی داد دینی پڑتی ہے کہ یہ بات سنتے ہی سب حیرت زدہ ہو جاتے ہیں اور اس ایک ہی لفظ پر سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ انصار کہتے ہیں بے شک سر تسلیم خم، ہم مانتے ہیں کہ مہاجرین میں سے کوئی شخص خلیفہ بنایا جائے۔

اس کے بعد کا واقعہ اس سے بھی زیادہ اثر انگیز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر چاہا کہ بیعت کریں، تو ایک انصاری سردار چلا آتا ہے، ٹھہرو! ٹھہرو! تم سے پہلے میں بیعت کروں گا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ انصار اس کے خلاف نہیں ہیں بلکہ انصار ہی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنایا ہے۔

یہ طریقہ بھی ہمیں نظر آتا ہے کہ جانشینی کے لیے عوام الناس سے استصواب کیا جائے، اور جو لوگ اسے قبول کریں اس کو سب لوگ مانیں۔

ایک آخری بات یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بننا نہیں چاہتے

تھے، مجبور ہو گئے تو گھر آ کر عام لوگوں کو بلایا، اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے کیا کرنا چاہیے؟ وہاں پر گفتگو ہوئی اور اس کے بعد حاضرین نے مسجد میں بیعت کی تجدید کی۔

اس واقعہ سے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان نظر آتی ہے، آدمی مدہوش ہو جاتا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے خلیفہ بناؤ، چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ تین دن تک شہر کی گلی گلی میں، محلے محلے میں ڈھنڈورا بٹایا گیا، لوگ بیان کرتے گئے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں خلیفہ نہیں ہونا چاہتا، تم مجھ سے بہتر کسی شخص کا انتخاب کر لو اور تمہیں تمہاری بیعت سے سبکدوش کرتا ہوں۔ کیا ہم ایسے بے نفس شخص کو خلیفہ بنائیں؟ یا حکومت کے خواہش مند کسی شخص کا انتخاب کریں؟ بالکل نتیجہ ظاہر ہے۔

بہر حال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت قائم فرمائی، وہ کس طرح پھیلی؟ یہ بیان کر چکا ہوں اور کس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کا انتظام فرمایا؟ یہ بھی آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ آج کل ہماری ضرورتیں بے شمار ہیں۔ ہر چیز کے متعلق میں آپ کے سامنے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ حکومتوں کے سلسلے میں اور خاص کر آج کل کی اسلامی حکومتوں کی مصیبتوں کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہمارے لیے ایسے سبق ہیں کہ اگر انہیں تلاش کیا جائے تو ہم اپنے ہر معاملے کو حل کرنے کی اس میں تدبیر پائیں گے۔

اگر ہم میں حقیقی اور مخلصانہ خواہش ہو کہ ہم خدا جل شانہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کریں، ذاتی خواہشوں کو چھوڑ دیں اور اسلامی طریقے کو اپنائیں تو ہمارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

یہ تھیں چند چیزیں جو میں نے عرض کیں۔ میری کوتاہیوں کو معاف فرمائیں۔

سوال و جواب

سوال : کیا ہر شخص یا ادارہ اجتہاد کا حق رکھتا ہے، خواہ اس کا مبلغ علم کچھ ہی ہو؟ اسلام کے احکام کے مطابق اجتہاد کا حق کس کو حاصل ہے؟

جواب : گذشتہ چند دنوں میں مجھ سے یہ سوال بار بار کیا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ اجتہاد کا حق ہر شخص کو ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ہر قسم کے معاملات میں اجتہاد کر سکے یا اس کی بات کو دوسرے لوگ بھی قبول کریں۔ اجتہاد کرنا ایک بات ہے۔ اس اجتہاد کو قبول کیا جانا دوسری بات۔ اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑی اہم بات بیان فرمائی ہے کہ المجتہد یخطئ ویصیب۔ یعنی اجتہاد کرنے والا صحیح نتیجے پر بھی پہنچ سکتا ہے اور غلطی بھی کر سکتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اضافہ فرماتے ہیں۔ اگر وہ صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے تو اللہ اُس کو دوہرا ثواب دیتا ہے۔ اگر اس نے نیک نیتی کے باوجود غلطی کی ہے تو بھی اُس کو نیک نیتی اور کوشش کی وجہ سے ثواب ملتا ہے۔ اس کے معنی میں یہ لیتا ہوں کہ اجتہاد کرنے کا حق ہر شخص کو ہے، لیکن یہ بھی سوچ لیجیے کہ ہر شخص ہر چیز کی اہلیت نہیں رکھتا۔ مثلاً میں نان باکی ہوں تو اپنے پیشے کے بارے میں کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر مشورہ نہیں لوں گا۔ میں بیمار ہوں تو اپنے علاج کے لیے کسی نوٹل پر اتر جاتا ہوں یا فائدہ دے دیتا ہوں۔

یافتہ ماہر ادب کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اجتہاد کا حق اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو دیا ہے، یعنی عقل دی ہے اور اس عقل کے ذریعے سے ہم کسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہمیں اعتماد ہے تو ہم اُس پر عمل کریں گے، لیکن ہماری بات دوسرے لوگ بھی قبول کریں، یہ ضروری نہیں ہے۔ اچھی ہوگی تو سب لوگ قبول کریں گے۔ یہ میری رائے ہے، مجھے اس پر اصرار بالکل نہیں ہے۔ لیکن میں عرض کروں گا

کہ اجتہاد سے مراد اگر آپ قانونی چیزیں لیتے ہیں تو اُسی شخص کو اس میں دخل دینا چاہیے اور وہی دخل دے گا جسے قانونی مسائل سے دلچسپی اور واقفیت ہو، کسی دوسرے فن کا ماہر شخص قانونی مسائل میں اپنی رائے ظاہر نہیں کرے گا۔

سوال : کیا اسلام میں بادشاہت جائز ہے؟ آپ نے اس کے جواز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جواب : جی ہاں! میں عرض کرتا ہوں، مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ خلیفہ بنے۔ ان میں کوئی بادشاہت نظر نہیں آتی کہ باپ کے بعد بیٹا حکمران بنا ہے، لیکن وہاں بھی ہمیں یہ امتیاز نظر آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو ایک جماعت نے منتخب کیا، لیکن حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے نامزد کیا، حضرت عمرؓ نے خود نامزدگی کرنے کی بجائے ایک کمیٹی مقرر فرمائی تاکہ وہ کمیٹی کسی جانشین کا انتخاب کرے، تو یہ بادشاہت نہیں تھی۔ بعد میں ہم بنی امیہ کی خلافت دیکھتے ہیں جو اسلام کے دعوے دار تھے، ان کے زمانے میں علما بھی تھے، علما نے بھی اُن کو حکمران تسلیم کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز اُسی خاندان کے ایک فرد ہیں، ان کو لوگ خلفائے راشدین میں شامل کرتے ہیں، تو یہ تھی ایک خاندان کی حکومت۔ بعد میں بنی عباس کی حکومت آئی، وہاں بھی یہی چیز نظر آتی ہے۔ بعد میں ہم ترکی سلاطین کو دیکھتے ہیں، جو اسلامی حکومت تھی۔ وہاں بھی ہمیں ایک طرح سے بادشاہت نظر آتی ہے۔ یہی نہیں، ایک اور چیز -- شاید میری طرف سے گستاخی ہوگی، عرض کروں کہ اسلامی حکومت کی تقسیم بھی ہم کو کافی پرانے زمانے سے ملتی ہے۔ حضرت عثمانؓ کی وفات پر کچھ لوگ حضرت علیؓ کے لیے اور کچھ لوگ حضرت معاویہؓ کے لیے میلان رکھتے تھے۔ ایک زمانے میں دونوں فریقین میں مصالحت ہوئی اور یہ قبول کیا گیا کہ حضرت علیؓ اپنے علاقے پر حکومت کریں، حضرت

معاویہؓ اپنے علاقے پر حکومت کریں، باہم امن وامان سے رہیں، اگرچہ یہ چلا نہیں لیکن یہ معاملہ سامنے آیا تھا۔ اس میں ایک وسیع اسلامی حکومت کے ٹکڑے کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دینے کا قابل ترجیح طریقے کے طور پر نہیں بلکہ ایک واقعی طریقے کے طور پر ثبوت ملتا ہے۔

یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ آج ایک نہیں پچاس اسلامی حکومتیں ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ سب ممالک ایک حکومت بن جائیں۔ ساری دنیا میں ایک اسلامی حکومت ہو۔ لیکن وہ کس طرح ہو، یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے حکمرانوں، جمہوریتوں کے صدور اور بادشاہوں وغیرہ کے باہم اختلافات کی وجہ سے یہ ناممکن چیز نظر آتی ہے۔ میں نے پہلے اشارۃً عرض کیا تھا کہ یہ طریقہ اختیار کریں کہ مسلمان حکمرانوں کی ایک مجلس بنائی جائے۔ اس کے رکن صرف حکومتوں کے سربراہ ہوں۔ مثلاً سعودی عرب کا بادشاہ، مصر کا صدر اور اسی طرح دیگر ممالک کے سربراہ وغیرہ۔ اس مجلس کا طریقہ یہ ہو کہ باری باری کسی ملک کا سربراہ مخصوص مدت کے لیے صدر نشین مقرر ہو۔ اس شخص کو ہم تشبیہی طور پر اپنا خلیفہ قرار دیں۔ ظاہر ہے کہ اُس جماعت کی باہمی مشارکت کے ذریعے جو بھی فیصلے ہوں گے ان کا اثر بیرونی دنیا سے تعلقات قائم کرنے میں انفرادی کوششوں کی بہ نسبت زیادہ ہوگا مثلاً پاکستان کی حکومت اگر کوئی مطالبہ کرتی ہے تو اس کا وہ اثر نہیں ہوگا جو حکمرانوں کی ایک جماعت کا ہوگا۔

سوال : آپ کے خیال میں پاکستان میں نظام حکومت کیسا مناسب رہے گا؟
 جواب : یہ آپ لوگوں پر منحصر ہے، مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ بادشاہت قائم کریں، ڈکٹیٹر شپ قائم کریں، کوئی مغربی قسم کی جمہوریت قائم کریں، جو جی چاہے کریں بشرطیکہ آپ اسلام پر عمل کریں۔ افراد ہوں، حکمران ہوں، سب اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہوں۔

سوال : اسلام میں جمہوریت کے تصور کی کیا اہمیت ہے؟ کیا امیر کا چناؤ یا سربراہ کا

انتخاب اشرافیہ طرز حکومت سے منسلک نہیں ہونا چاہیے؟

جواب : اس کا انحصار عوام کی رائے پر ہے۔ مثال کے طور پر ایک زمانے میں فرانس میں بادشاہت قائم تھی لیکن بادشاہ اور بادشاہ کا خاندان اس طریقے سے اپنی زندگی گزار رہا تھا کہ اہل ملک کو نفرت پیدا ہو گئی، لہذا انہوں نے بادشاہ کو ایک مجمع عام میں قتل کیا اور جمہوریت قائم کی۔ یہ عوام الناس کی رائے پر منحصر ہے، اسے کوئی لازمی یا واجبی طریقہ نہیں کہا جاسکتا۔ جمہوریت میں بھی برائیاں پائی جاتی ہیں۔ دونوں (صورتوں میں) عوام خود ہی دیکھیں گے اور خود ہی فیصلہ کریں گے۔ اس میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

سوال : خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں کیا حکم ہے؟

جواب : اس مسئلے کا جواب دینا ذرا مشکل ہے کیونکہ اصولی طور پر ہر شخص کو آزادی ہے کہ میں شادی کروں یا نہ کروں، شادی کے بعد میں اولاد حاصل کروں یا نہ کروں، لیکن کچھ اشارے ہمیں احادیث میں ملتے ہیں جس پر مسلمانوں کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک حدیث اور ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں کہ ”تنا کحوا تنا سلوا.....“ نکاح کرو، اولاد حاصل کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے پیغمبروں کے مقابلے میں اپنی امت کی کثرت تعداد پر فخر کر سکوں۔ ان حالات میں میں سمجھتا ہوں کہ ممکن ہے منصوبہ بندی ایک ملک میں مفید ہو، لیکن دوسرے ملک میں مضر ہو۔ مثلاً فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسے ملک میں ہیں جہاں وسائل معیشت بہت کم پائے جاتے ہیں، ہر شخص چار چار بیویاں کرے اور دس دس بچے پیدا کرے تو جلد ہی وہ مقام ناقابل رہائش ہو جائے گا۔ عرض کرنا یہ ہے کہ منصوبہ بندی میں جبر کا سوال نہیں ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ بچے نہ ہوں تو اس کا شوہر یہ سوچے کہ کیوں نہ ہوں، کیا یہ طبی وجہ سے ہے یا کسی اور وجہ سے؟ یا مرد چاہتا ہے کہ اس کے بچے نہ ہوں تو عورت سوچے۔ غرضیکہ یہ انفرادی معاملات ہیں، میرے خیال میں ایک قاعدہ سب پر عائد نہیں کیا جاسکتا۔

سوال : دورِ حاضر میں مثالی اسلامی ریاست کی ضرورت کس حد تک ہے؟ اگر ہے تو اس ریاست کی تشکیل کے لیے افراد کہاں سے آئیں گے؟

جواب : ”لا یكلف الله نفساً إلاّ وسعها“ آپ کوشش کریں جس حد تک ممکن ہے۔ رسول اللہ کی سیرت ہمیں یہی بتاتی ہے کہ ایک منزل مقصود معین کرو، اس کے لیے کوشش شروع کر دو۔ خدا تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ یہی نمونہ ہمارے لیے ہر چیز میں ہے۔ آج کل کی حکومت کے لیے بھی، آج کل کی تجارت کے لیے بھی، آج کل کی طبابت کے لیے بھی، ہمیں مقصد معین کر کے اس کے لیے کوشش کرنا چاہیے، ہو گا وہی جو اللہ نے مقدر کیا ہے، وہی اپنی مشیت کو نافذ کراتا ہے۔

سوال : پاکستان کی موجودہ صورت حال میں کنفیڈریشن کے مطالبے کی کیا اہمیت ہے؟

جواب : میں اسے اس لیے غیر ضروری سوال سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے صوبے پنجاب، بلوچستان اور سندھ میں علیحدگی کی خواہش پیدا ہو جیسا کہ بد قسمتی سے بعض اسلامی ملکوں میں نظر آ رہا ہے۔ کڑد اور ترک یک جا نہیں رہنا چاہتے تو اس وقت یہ سوال پیدا ہو گا۔ لیکن ہمارے عوام کم از کم ان کی اکثریت موجودہ طرز حکومت سے متفق ہے اور ملک کے حصے بخرے کرنا نہیں چاہتی ہے تو کنفیڈریشن کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یونیٹری (وحدانی) حکومت ہی چل سکتی ہے۔ البتہ جس حد تک اصلاحات کی ضرورت ہے وہ کی جا سکتی ہیں۔ کنفیڈریشن کے ذریعے سے بھی اور یونیٹری طرز حکومت کے ذریعے سے بھی۔ دونوں ممکن ہیں۔

سوال : ایک شخص کو ایک گروہ یا جماعت حکمران مقرر کرتی ہے کہ وہ اسلام کے مطابق حکومت چلائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب : اُس کو معزول کر دیا جائے گا۔ جنہوں نے حکمران بتایا ہے وہی معزول کر

سکتے ہیں۔ یہ قدیم مسلمہ چیز ہے، جو شخص کسی کو کسی عہدے پر مامور کر سکتا ہے وہی اس کو اس عہدے سے معزول بھی کر سکتا ہے۔ ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ حکمرانوں کو معزول کیا جاتا تھا۔ مثلاً آپ نے انتخابات میں اُسے ووٹ نہ دیجیے، اس طرح یہ گتھی خود بخود حل ہو جاتی ہے۔

سوال : ”هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ“ کی روشنی میں کیا یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم دین اسلام کو پوری دنیا میں Dominate (غالب) کریں اور اس کے لیے کیا بذریعہ جہاد انقلاب کا راستہ اپنائیں یا پُر امن جمہوری جدوجہد کا راستہ اختیار کریں؟

جواب : بھائی صاحب! مجھے اس سوال سے تھوڑی سی تکلیف ہوئی۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلام Dominate کریں یعنی Impose کریں۔ یہ قرآن کی آیت ”لا اکراہ فی الدین“ کے خلاف ہوگا۔ اس کی قطعاً اسلام میں اجازت نہیں ہے کہ کسی شخص کو دین اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اسلام کے پھیلانے کی کوشش ضرور کریں اور اس کے لیے اپنی زندگی، اپنا مال اور جان نثار کریں۔ لیکن Impose کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا اور خود اللہ تعالیٰ اس اسلام کو قبول نہیں کرتا جو مجبوری کی حالت میں اختیار کیا گیا ہو۔

سوال : سود سے متعلق سوالات ہیں کہ: کسی صورت میں سود جائز ہے؟ موجودہ دور میں معاشی نظام سود کے بغیر کیسے چل سکتا ہے؟ بے شک سود حرام ہے لیکن جب حکومتی سطح پر سودی لین دین ہو رہا ہو تو کیا عام آدمی حالت اضطرار میں یہ سود لے سکتا ہے؟

جواب : یہ سوال بار بار مجھ سے کیا گیا..... ذرا تحمل کی ضرورت ہے، لفظ سود پر ہم مطلق نہ جائیں۔ ہم سوچیں کہ کون سی چیز کیسی ہے؟ چنانچہ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں کہ میں مکان خریدنے کے لیے قرض لیتا ہوں، وہ سودی

قرض بھی ہو سکتا ہے لیکن اسی کو ہم اس طرح بھی Arrange (برت) کر سکتے ہیں کہ رقم دینے والا شخص شریک خریدار بنے۔ اُس کا ایک حصہ میری رقم سے ادا ہوگا، دوسرے حصے کی رقم دوسرے شخص کی طرف سے ہوگی۔ جب وہ شریک ملک ہے تو اس کو کرائے کے متعلق بھی تناسب کے لحاظ سے حق حاصل ہوتا ہے، تو دوسرا شخص جو وہاں رہتا ہے وہ رقم کی ادائیگی کا ایک طرف سلسلہ جاری رکھے اور جس مقام پر وہ رہتا ہے اس کا کرایہ بھی ادا کرے۔ یہ کرایہ جسے ہم سود کا نام دیتے ہیں، کرایہ بنے گا، سود نہیں رہے گا۔ بہر حال ان کی تفصیلات میں ہر قسم کے Transaction (تبادلے) کے معاہدات، ہم آسانی سے کر سکتے ہیں۔ مجھے عملاً اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی، باقی ساری تفصیلات اور تمام قسموں کا ذکر میں آپ سے نہیں کر سکتا۔

سوال : پراویڈنٹ فنڈ پر ملنے والا نفع کیا سود میں داخل ہے؟

جواب : میں اسے سمجھا نہیں۔ عہد نبویؐ میں ایک چیز پائی جاتی تھی جس کو ”معاقل“ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ایک طرح سے سوشل انشورنس کی صورت تھی، وہ یہ کہ ملک میں آئے دن ایسے حالات و واقعات پیش آتے ہیں، جن میں رقم ادا کرنے کے متعلق کسی شخص پر ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ مثلاً کسی نے کسی کو عمدہ نہیں اتفاقاً قتل کر دیا، یا اسی طرح کا کوئی اور واقعہ۔۔۔ لیکن قاتل خون بہا کے سوا دنٹ دینے کی طاقت نہیں رکھتا تو متاثرہ شخص کو محروم ہونے کی ضرورت نہیں معاقل (خون بہا) کا جو ادارہ ہوگا اس کی طرف سے رقم ادا کی جائیگی۔

سوال : فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، مصوری اور رقص وغیرہ کے سلسلے میں اسلام ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟ کیا یہ چیزیں بالکل حرام ہیں اور اگر حلال ہیں تو کس حد تک؟

جواب : فنون لطیفہ کے متعلق یہاں کچھ مثالیں دی گئی ہیں، میں بطور عمومی کہوں گا کہ قرآن مجید کے مطابق خود اللہ تعالیٰ نے زینت کے طور پر مثلاً ستارے

وغیرہ پیدا کیے ہیں تو وہ بھی ایک طرح سے فنون لطیفہ ہی ہے۔ بہر حال عرض کرنا یہ ہے کہ موسیقی کے متعلق امام غزالی نے احیاء العلوم میں ایک باب تفصیل سے لکھا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ سو فیصد (موسیقی) حرام نہیں ہے۔ عہد نبوی میں لوگ عید کے دن ڈھول بجاتے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ کے سامنے حبشی بچوں کا ایک گروہ آیا اور نیزے چلانے کے کرتبوں کے ذریعے سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو ڈانٹا، جاؤ یہاں سے نکلو، کیا کر رہے ہو۔ رسول اللہؐ کے الفاظ ہیں، ”یا عمر ہذا عید“۔ آج عید کا دن ہے، لہذا عید کے دن خوشی منانے کے جو طریقے ہیں، وہ موجود ہیں یا ذہن میں آتے ہیں اُن سے روکا نہیں جاسکتا۔

مصوری کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ صحیح بخاری شریف میں ایک حدیث ہے، قیامت کے دن سب سے شدید عذاب مصوروں کو ہوگا، اس کی تصریح میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس سے مراد ان چیزوں کی تصویر ہے جن میں جان ہوتی ہے، جیسے آدمی اور حیوانات وغیرہ۔ باقی درختوں، مکانوں اور اسی طرح کی چیزوں کی تصویروں کی کوئی ممانعت نہیں ہے، تو عرض یہ ہے کہ آج ہم مصوری سے مراد صرف آدمیوں کے پورٹریٹ بنانے کو لیں تو میرے نزدیک ناجائز ہوگا، لیکن عام تصویر، رنگوں کے ذریعے سے شکلیں بنائیں اور وہ آدمیوں کی نہیں بلکہ چیزوں کی ہوں تو اس میں کوئی عمل مجھے مانع نظر نہیں آتا۔

رقص کے متعلق بھی سوال کیا گیا ہے، ۱۹۴۸ء کی شاید بات ہے، آپ کے ہاں دستور بنانے کا کام شروع ہوا تھا، مجھے بھی اُس زمانے میں دعوت دی گئی تھی، اس میں ایک بنگالی عالم بھی شریک تھے، اُن لوگوں نے یہ کہا کہ رقص حرام ہے۔ لطیفہ کے طور پر میں نے عرض کیا کہ بھائی صاحب! اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے گھر میں رقص کرتا ہوں تو تمہیں روکنے کا کیا حق ہے۔ کہنے لگے کہاں؟ میں نے کہا گھر میں، پوچھنے لگے لوگوں کی موجودگی

میں؟ میں نے کہا بچے ہوں گے، بچے بھی خوشی سے ہاتھ بچائیں گے کہ اماں جان ناچ رہی ہے۔ تو غرضیکہ سو فی صدی رقص حرام نہیں ہے، البتہ اجنبی عورت سے یقیناً حرام ہے۔

سوال : ہمارے آج کے اسلامی ممالک، کیا غیر اسلامی ممالک سے مدد لے سکتے ہیں؟ جس طرح سعودی حکومت نے امریکہ اور فرانس سے کویت کے سلسلے میں عراق کے خلاف مدد لی؟ اور کیا انہیں حلیف بنا سکتے ہیں؟

جواب : میں نے ابھی آپ سے عرض کیا کہ ہجرت کے بعد رسول اکرمؐ نے مدینہ کے اطراف میں شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کے غیر مسلم عرب خود مختار قبیلوں سے باہمی تعاون کے معاہدات فرمائے تھے۔ میں سمجھتا ہوں یہ جواب آپ کے لیے کافی ہے۔

سوال : کیا حضورؐ کی ذاتِ اقدس کی مختلف حیثیتیں تھیں اور آپؐ صرف نبی کی حیثیت سے ہی مطاع تھے؟ کیا حضورؐ کی حیات طیبہ میں کوئی شخص امورِ دنیا میں حضورؐ سے زیادہ علم والا ہو سکتا تھا؟

جواب : اگر آپ سیرت طیبہ کا غور سے مطالعہ کریں تو جواب مل جاتا ہے۔ اس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے انتم اعلم بامورِ دنیا کم۔ رسول اللہؐ نے کھجور کے درختوں کے Polynation کے سلسلے میں ایک نامناسب چیز محسوس کی کہ زینہ چیز کو زنانہ چیزوں میں ڈالیں، اس طرح سے Sexual چیز پیدا ہوتی ہے Polynation سے منع فرمایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سال کھجور کی فصل بہت ہی خراب رہی۔ لوگ آئے اور شکایت کی یا رسول اللہؐ! آپ کے حکم کے مطابق ہم نے یہ کیا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے، تو رسول اکرمؐ نے اپنے حکم کو منسوخ فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال فرمائے تھے انتم اعلم بامورِ دنیا کم۔ میں نبی کی حیثیت سے خدا کے احکام تم تک پہنچاتا ہوں، دنیاوی معاملات میں خدا نے تمہیں آزادی دی ہے، اس کا میں مخلص (ماہر) نہیں ہوں، تم اُس میں جو مناسب معلوم ہوتا ہے

کرو۔ تو ان حالات میں ہمیں نظر آتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک شخصیت پیغمبر کی ہے، لیکن آپ کی انسانی شخصیت بھی ہے، بھوک آپ کو بھی لگتی ہے، نیند آپ کو بھی آ سکتی ہے۔ گر کر چوٹ سے زخمی ہونا یہ آپ کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ غرض ایک انسانی حیثیت ہے اور ایک ربانی نمائندے پیغمبر کی حیثیت ہے۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، دونوں وقت واحد میں چلتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی معین معاملے میں پیغمبر خود اجتہاد کر کے ایک رائے قائم کرتا ہے اور وہ خدا کو پسند نہ ہو تو وحی آتی ہے کہ نہیں ایسا نہ کرو۔ ایسی مثالیں ملتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اور بشریت دونوں آپ میں وقت واحد میں موجود تھیں، لیکن خدا کی نگرانی رہتی تھی کہ اگر کبھی پیغمبر سے کوئی سہو ہو جائے، اس طرح کا اجتہاد سہو، تو اُمت اس سے متاثر نہ ہو، فوراً وحی کے ذریعے سے خدا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ یہ ہے میرا جواب۔ خدا مجھے معاف فرمائے۔

سوال : آج کے مغربی معاشرے میں قلبی اور ذہنی بے اطمینانی بہت زیادہ ہے۔ کیا صوفیہ کا انداز تبلیغ وہاں کتابی تبلیغ کی نسبت زیادہ کامیاب رہے گا؟ مغرب میں کیا انداز تبلیغ اختیار کرنا چاہیے؟

جواب : اس سوال کا جواب اس لیے مشکل ہے کہ ہر قسم کے افراد دنیا میں پائے جاتے ہیں، مغرب میں بھی، مشرق میں بھی۔ جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں ان میں بھی ہر قسم کے لوگ موجود ہیں، ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔ پیرس میں ایک فرن موسیقی کا ماہر شخص تھا، ایک دفعہ وہ سیاحت کے لیے استنبول پہنچا اور مسجدوں کی بھی سیر کی۔ اس کے ساتھی ترک بھائی نے اسے ایک چیز بتائی، وہ یہ تھی کہ ترکی میں رواج ہے کہ ہر نماز کے بعد امام باواز بلند قرآن مجید کی کچھ آیتیں تلاوت کرتا ہے، لوگ اسے ادب سے سنتے ہیں، اس ترک بھائی نے اُس فرانسیسی غیر مسلم سیاح سے کہا یہ قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ نثر کی کتاب ہے، لیکن اُسے پڑھ رہا ہے وہ تمہیں عجیب نظر

آئے گا۔ واقعی وہ متاثر ہوا، کہا اس نثر میں نظم کی شان نظر آتی ہے، چند دن سوچتا رہا بالآخر مسلمان ہو گیا۔

اس کے بعد وہ دوبارہ استنبول گیا، اتفاق سے میں بھی وہیں تھا، ایک دن وہ گھبراہٹ کی حالت میں کانپتا ہوا میرے پاس یونیورسٹی میں آیا۔ کہنے لگا میرے خیال میں مسلمانوں نے قرآن مجید کو کامل طور پر محفوظ نہیں رکھا ہے کیونکہ اس کی بعض سورتیں اور بعض آیتیں تو بے شک علم موسیقی کے مطابق ہیں لیکن بعض نہیں ہیں، اور موسیقی کے مطابق نظر نہ آنے والی چیزیں میرے خیال میں کسی چیز کے حذف کر دینے کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ میں نے پوچھا کیا؟ اس اثنا میں وہ عربی خط سیکھ چکا تھا، فوراً جیب سے قرآن مجید کا چھوٹا نسخہ نکالا اور کہا دیکھو یہ سورت --- وہ سورت تھی ادا جاء نصر اللہ والفتح.....

یہ الفاظ موسیقی کے نقطہ نظر سے ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ یہاں کوئی چیز تم لوگوں نے حذف کر دی ہے، تمہیں معلوم نہیں ہے لیکن میں بتاتا ہوں کہ علم موسیقی کے لحاظ سے یہاں کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

میں نے کہا بھائی صاحب اس طرح نہیں پڑھا جاتا جس طرح تم نے پڑھا ہے۔ علمائے قراءت ہمیں بتاتے ہیں کہ اس کو پڑھنا چاہیئے..... افواجاً فسبح.....

بولاً: میں اپنے ایمان کی تجدید کرتا ہوں۔ غرض عرض یہ کرنا ہے کہ افراد ہر قسم کے ہیں، علم موسیقی کے ذریعے سے مسلمان ہونے والے بھی ہیں۔ دنیا میں مختلف قسم کے لوگ ہیں، ان میں سے کوئی صوفیانہ طریقے سے مسلمان ہوتے ہیں، کچھ اور طریقے سے اسلام میں شامل ہوتے ہیں، کوئی کسی اور طرح سے۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں آپ کو مثالیں دیتا کہ میرے سامنے کس قسم کے معاملات پیش آئے۔ اس لیے یہی کہنا پڑتا ہے کہ قبول اسلام کا کوئی معین قاعدہ نہیں، کسی کو تصوف کے ذریعے سے

آپ مسلمان بنا سکتے ہیں، کسی کو کسی اور ذریعے سے۔ مقصد ایک ہی ہے اور دونوں کا ایک ہی نتیجہ ہے۔

سوال : تصوف کو اسلامی کردار سازی میں آپ کس حد تک مناسب سمجھتے ہیں؟

جواب : میں نے اسے مفید پایا ہے۔

سوال : انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ کی نبوت محدود تھی، صرف بنی اسرائیل کے

لیے تھی، کیا احکام الہی صرف ایک قوم کے لیے ہو سکتے ہیں؟ اور حضرت

عیسیٰ تبلیغ میں امتیاز رکھ سکتے ہیں؟

جواب : بھائی صاحب اس میں دشواری یہ ہے کہ خدا نے ایک لاکھ چالیس ہزار پیغمبر

بھیجے ہیں، حضرت آدم سے لے کر ہمارے پیغمبر تک ان کی سوانح عمریاں

ہمارے پاس نہیں ہیں۔ لیکن معلومات کے جو وسائل ہمارے پاس ہیں، ان

کی اساس پر چاہے وہ ایران کے زرتشت کا قصہ ہو یا مصر کے حضرت موسیٰ

کا ذکر ہو یا فلسطین کے حضرت عیسیٰ کا ہو کہ سارے پیغمبر وقت واحد میں

ساری چیزوں سے دلچسپی نہیں لے سکتے تھے، اس لیے خدا نے کبھی ایک قوم

کے لیے پیغمبر بھیجا اور کبھی دوسری کے لیے، اور ایک پیغمبر ایسا بھی بھیجا جو

ساری دنیا کے لیے ہے اور اپنی زندگی تک کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک

کے لیے ہے۔ اس میں کوئی تضاد مجھے بالکل نظر نہیں آتا، ایسا ہو سکتا ہے۔

سوال : جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں جب کہ اسلام میں طاقت کا

سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ پھر اسلام میں جمہوریت کا کیا جواز ہے؟

جواب : یہ لفظ استعمال نہ کیجیے۔ بجائے جمہوریت کے آپ کوئی ایسا لفظ استعمال

کیجیے جو آپ کے خیال میں ناقابل اعتراض ہو، چیز وہی ہوگی جو موجود

ہے، لیکن اس کا نام بدلے گا۔ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے

کو عبد بھی کہتے ہیں، نبی بھی کہتے ہیں، رسول بھی کہتے ہیں، مرسل بھی کہتے

ہیں۔ اسی طرح جو ہماری اسلامی حکومت ہوگی اُسے ہم جو بھی نام دیں اُس

سے فرق نہیں پڑتا۔ دونوں کی اجازت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جمہوریت

سے مراد صرف طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ ایک ایسی جمہوریت ہم بنا سکتے ہیں جس میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ خدا کی ذات ہو۔ یہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے قانون پر منحصر ہوگا۔

سوال : آج کے یہودی یا عیسائی کیا اہل کتاب ہیں؟ ان سے معاملات کیسے ہوں؟

جواب : میں سمجھتا ہوں کہ آج کل کے یہود و نصاریٰ میں اور عہد نبوی کے یہود و

نصاریٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عقائد وہی تھے، خود قرآن ان کو اہل کتاب کہتا ہے۔ اگر اہل کتاب اپنی کتاب پر عمل نہ کریں تو بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے ایک مسلمان ہے جو قرآن پر عمل نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ وہ فاسق ہے، فاجر ہے، جو بھی کہیے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ ہیں، وہ اگر اپنے دین کے احکام پر عمل نہیں کرتے اور یقیناً بہت سی چیزوں میں وہ عمل نہیں کرتے تو ان کو ان کی حقیقت سے یعنی خدا کی بھیجی ہوئی کتاب کے ماننے والوں کی جماعت سے خارج نہیں کر سکتے۔

میں مکرر عرض کرتا ہوں کہ جو صورت حال آج کل کے یہود اور نصاریٰ کی ہے عہد نبوی میں بھی یہی حال تھا، کوئی فرق ہمیں نظر نہیں آتا، ان کو خدا نے اہل کتاب کا نام دیا ہے۔

(ماہ نامہ المعارف لاہور۔ جولائی و اگست و ستمبر ۱۹۹۲ء)

فقہ

فقہ کی تشکیل اور آغاز کا معمرہ (مترجم ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

گ، ہ، بوسکے (G.H. Bousquet) جامعہ الجزائر، شمالی افریقہ میں قانون اور عمرانیات کے پروفیسر رہے ہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ ہوا الجزائر کے ایک قانونی ماہنامے *Revue Algerienne Tunisienne et Marocaine de Legislation et de jurisprudence* بابت جولائی، اگست و ستمبر ۱۹۴۳ء میں عنوان بالا پر (جو اصل فرانسیسی میں *Le mystere de la formation et des origines du tigh* کے نام سے چھپا ہے، شائع کیا ہے۔ یہ ایک طرح سے پروفیسر ناتھینو کے اس اطالوی مضمون کا تکملہ ہے جس کا ترجمہ جنوری ۱۹۵۳ء کے معارف میں ”رومی اور اسلامی قانون کے تعلقات پر چند ملاحظات“ کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ موجودہ مقالہ میں بھی فقہ کی تدوین میں بیرونی اثرات کے وجہ سے انکار کیا گیا ہے اس لیے اس قابل ہے کہ اردو دان اہل علم اس سے آگاہی حاصل کریں۔ ترجمے کے مؤلف نے ازراہ عنایت اجازت دے دی ہے۔ (مترجم)

فقہ کے آغاز اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پر کم از کم تین مختلف جہتوں سے نظر ڈالی جاسکتی ہے:

(۱) پہلے وہ ہے جسے میں اس قانون کے ارتقاء کی سرکاری تاریخ سے موسوم کروں گا جو خاص کر کتب اصول فقہ اور عرب مؤلفوں کے دیگر اشارات سے ہویدا ہوتی ہے یعنی اس کے چار ماخذوں (قرآن، حدیث، اجماع، قیاس (مترجم)) کی توضیح، ان سے

استفادے کا طریقہ اور رفتہ رفتہ باب الاجتہاد کا قطعی طور پر بند ہو جانا وغیرہ۔ یہ بڑی نفیس چیزیں اور ساتھ ہی بعد کے زمانے میں اس مسئلے کے یورپی مطالعے کی اساس بھی ہیں لیکن ان کی بڑی خامی یہ ہے کہ ان کا بڑا حصہ بطور دلیل لی ۱ (aposteriori) مرتب ہوا ہے اور وہ ایک تذکرہ تو ہیں لیکن توجیہ نہیں۔

(۲) ان ماخذوں کی یورپی تنقید، دو نام یہاں بیان کرنے ناگزیر ہیں۔ ایک تو اسنوک ہورخردینے ۲ (Snouch-Hurjronge) جس نے تصور ”اجماع“ کی غیر معمولی اہمیت بتائی ہے اور دوسرے گولٹ سیر (Goldziher) جس نے بتایا ہے کہ مروجہ حدیثوں کے عظیم الشان انبار سے علماء و فقہاء نے کیا فائدہ اٹھایا اور یہ کہ ان جعلی حدیثوں ۳ سے ہمارا کیا مفاد وابستہ ہے۔ ان دونوں مؤلفوں کے باعث ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ نظریہ اصول فقہ کو ایک نئی روشنی میں دیکھیں۔ گویا ہم اس طرح اس نظام کی موثر قوتوں کو کارکردگی کی حالت میں دیکھ سکتے ہیں چنانچہ اس مفہوم کو ذہن نہیں لے کر اسنوک ہورخردینے نے فاندن برگ (V.den Berg) کے اس نظریے پر آگ بگولہ ہو کر تنقید

۱ یعنی وہ طریقہ استدلال جس میں نتیجہ دیکھ کر اس کے سبب کا پتا چلایا جاتا ہے، گویا وہ ”لم“ (کیوں؟) کا جواب ہوتا ہے (مترجم)

۲ ولایتی ناموں کا یہاں صرف صحیح تلفظ درج کیا جاتا ہے علمی حلقوں میں صحیح تلفظ کا پھیلنا ہر طرح قرین صواب ہے۔ ان ناموں کو انگریزی کے اصول پر پڑھنا غلط ہے کیونکہ مختلف حروف کا تلفظ مختلف فرنگی زبانوں میں الگ الگ ہوتا ہے۔ (مترجم)

۳ گولٹ سیر کا پرانا نظریہ (جواب از کار رفتہ ہو چکا ہے) یہ ہے کہ کتب حدیث، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی باتوں کی صحیح ترجمانی نہیں کرتیں، بلکہ ان کتابوں کی تالیف کے زمانے میں مسلمانوں کے جو افکار خیالات تھے ان کو ان کے مؤلف خواہ مخواہ عہد نبوی کی طرف منسوب کرتے رہے ہیں لیکن اب تیسری صدی ہی نہیں بلکہ دوسری اور خود پہلی صدی ہجری کی کتب حدیث کی دستیابی سے اس بدگمانی اور مفروضے کے تاروپود بکھر گئے ہیں۔ چنانچہ صحیفہ ابی ہریرہ امام بن مہبہ جو (۵۸ھ) سے قبل کی تالیف ہے، ہل چکا ہے۔ اس کے چوتھے ایڈیشن میں جو ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد دکن میں چھپا ہے ناشر نے اپنے مقدمے میں تفصیل سے ان مسائل سے بحث کی ہے۔ (مترجم)

کی تھی کہ ۱۔ فقہ کی تاریخ خاصی واضح ہے اور ایک طرح سے یہ تاریخ مدون بھی ہو چکی ہے۔ (۳) لیکن ایک تیسرے نقطہ نظر سے یہ ادعا محض غیر صحیح ثابت ہوتا ہے یعنی ایسے بیرونی اثرات کی موجودگی جو اسلامی نظام قانون کی پیدائش اور حیرت انگیز تیزی سے اس کی ترقی میں حصہ دار سمجھے گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ (مسلمانوں کے) ارتقاء قانون کی یہ تیزی (ان کی) ملکی فتوحات کی تیزی سے کسی قدر کم ہے۔ اگر حقلیہ کو چھوڑ دیں تو عربوں کی ساری فتوحات رسول خدا کی وفات سے ایک سو سال سے بھی کم عرصے میں حاصل ہو گئی تھیں۔ پھر بھی ارتقاء قانون کی تیزی جاذب توجہ ہے۔

یہ امر نمایاں کیے جانے کے قابل ہے کہ اسلامی قانون کی اہم ترین کتابیں، مذاہب فقہ کی عین پیدائش ہی کے ساتھ یا کم و بیش اسی زمانے میں مرتب ہو گئیں اور ہجرت پر پوری دو صدیاں بھی نہ گزری تھیں کہ مسلمانوں کے ہاں ایسی کتابیں وجود میں آ گئیں جن پر آج تک عملاً کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ بعد کی کتابیں یا تو محض ان کی اعادہ ہیں یا بے مصرف بکواس، شاید ہی ان میں کوئی نئے تصورات یا بار آور ارتقاء کے کوئی جراثیم پائے جاتے ہوں۔

اس کے ثبوت کے لیے مالکی اور شافعی مذاہب کی دو بنیادی کتابیں، المدونہ اور کتاب الام کافی ہیں (مؤلف کو کتب حنفی سے واقفیت نہیں معلوم ہوتی، ورنہ امام محمد شیبانی المتوفی ۱۸۹ھ/۸۰۲ء کی کتاب الاصل، جو المبسوط بھی کہلاتی ہے کیا بہ لحاظ ضخامت اور کیا بہ لحاظ قدر و قیمت مذکورہ دونوں کتابوں سے کم نہیں، پھر وہ ان دونوں سے قدیم تر بھی ہے (مترجم) مالکی مذہب کی کتاب یعنی المدونہ کا مؤلف جو بھی رہا ہو مگر یہ یقینی ہے کہ وہ کم از کم بنیادی حصے کی حد تک امام مالک المتوفی ۱۷۹ھ/۷۹۵ء کے شاگرد ابن القاسم کے دروس پر مبنی ہے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیں کہ اس کا ایک اچھا خاصہ حصہ بانی مذہب (امام مالک) کے بعد کا ہے، تو بھی بہر حال وہ امام شافعی المتوفی ۲۰۴ھ/۸۲۰ء کی کتاب الام کی معاصر ہے۔ یہ واضح رہے کہ ایک نئے فقہی مذہب کے

۱۔ یہ مضمون رسالہ De gids ۱۸۸۳ء میں چھپا۔ اسنو کہ ہورخردینے کے مجموعہ مقالات موسومہ Verspreide Geschriftوں کی جلد دوم میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

بانی بننے سے قبل امام شافعی خود بھی امام مالک (نیز امام محمد شیبانی (مترجم) کے شاگرد رہے ہیں۔ اس طرح بہر حال ہم ایک ایسے زمانے میں رہتے ہیں جب کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات پر جو ۱۱ھ/۶۳۲ء میں ہوئی پوری دو صدیاں بھی نہیں گزری تھیں۔

چنانچہ جو شخص ان دونوں کتابوں (المدونہ اور الام) کی محض ورق گردانی ہی کر لے۔ اسے فوراً پتا چل جائے گا کہ:

(الف) یہ کتابیں اپنی ترتیب اور اپنے افکار علمی میں ان تالیفوں سے کہیں فائق ہیں جو بعد کے زمانوں میں تدریس یا اطلاق قانون کے لیے زیر استعمال رہیں۔ ان میں ایسے استدلال اور ایسی توجہیں ملتی ہیں جن پر اس وقت سے اب تک کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ خاص کر المدونہ..... جسے میں زیادہ جانتا ہوں کیونکہ علاوہ اور وجوہ کے اس سے مراجعہ آسان تر ہے..... یہ کتاب بعض وقت واقعی ایک ایسی غذائے ذہنی پیش کرتی ہے جو کسی مختصر خلیل کسی منہاج الطالبین کسی لب اللباب وغیرہ میں کبھی نہیں ملے گی۔

(ب) خود فروعی مسائل کے حل میں ان بنیادی کتابوں کے مؤلف اتنی دور جا چکے ہیں کہ سچ مچ یہ پوچھنا پڑتا ہے کہ متقدمین کے مستند نظریے کے مطابق، بنیائے مذاہب کے شاگردوں کو جس محدود اجتہاد کی اجازت رہی ہے وہ کس امر کے متعلق رہی ہوگی؟ یہ بات خاص کر آپ پر صادق آتی ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ فقہ نے اپنے آغاز سے لے کر عروج کو پہنچنے تک اپنے ارتقاء میں جو راستہ طے کیا وہ ایک حیرت انگیز تیزی سے طے ہو گیا۔ مگر یہ

۱۔ وہ ساری غیر معمولی تکتہ آفرینی جو رضاعی رشتہ داری کے متعلق ہے، اس میں موجود ہے حتیٰ کہ مسئلہ خنثی بھی ۱۳۳۲ھ کی طباعت کی ج ۵ ص ۳۰ تا ۳۲ میں یہاں کتابیہ عورت سے نکاح کے نتائج کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ (ایضاً ۶ تا ۸) یہ حصہ واقعی بڑا دلچسپ ہے مثال کے طور پر ایسی عورت کو بعض صورتوں میں مجبور کیا جائے گا کہ مسلمانوں کے قانون کے مطابق پاکی حاصل کرے۔ خود المدونہ سے بھی مماثل مثالیں بہ آسانی فراہم کی جاسکتی ہیں۔

کیسے ہوا؟ اس مرحلے پر یہ مسئلہ نہایت تاریک ہو جاتا ہے کیونکہ جن یادگاروں (المردونہ اور الام) کا ہم نے ابھی ذکر کیا، ان کے پہلے بہت کم کتابیں ایسی تالیف ہوئیں جو اب تک باقی ہوں۔ مثال کے طور پر بانیان مذاہب فقہ کے سرآمد امام ابو حنیفہ کی ۱ (فقہی) تالیفیں ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ اس کے علاوہ جو سب سے قدیم متن ہمیں معلوم ہے بشرطیکہ وہ اصلی بھی ہو، امام زید بن علی (فوت ۱۲۰ھ) کی کتاب المجموع فی الفقہ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے زیادہ سے زیادہ ایک سو سال بعد کی تالیف ہے۔ اس بحث میں جو متن ہمارے لیے سب سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے، وہ امام مالک کی کتاب الموطا ہے۔ اس کے اصلی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس میں حدیثیں بھی ہیں اور رواج یا عرف مدینہ کے متعلق مشاہدات بھی۔ رہا قرآن کی تدوین (یعنی نزول (مترجم)) سے لے کر مذاہب فقہ کی بنیاد پڑنے تک کا زمانہ جو ایک سو سال پر مشتمل ہے اس کے آثار اب کچھ بھی باقی نہیں ہیں۔ ۲

بہر حال ۱۱۰ھ/۶۳۲ء میں [رسول اکرم کی وفات کے وقت] عرب عبارت تھے قبائل کے ایک مجموعے سے جس میں ربط (ارتکاز کم پایا جاتا تھا اور جو اسلامیت سے کم یا زیادہ آشنا تو ہو چکے تھے لیکن ان کا معیار ثقافت، خصوصاً مذہبی اور قانونیاتی نقطہ نظر سے ان ملکوں کے مقابلے میں جنہیں وہ بہت جلد فتح کرنے والے تھے، بہت پست تھا، مگر

۱. اُن کے دو بڑے شاگردوں میں سے امام ابو یوسف کی کتاب الخراج باقی ہے اور امام محمد الشیبانی کی من جملہ دیگر تالیفوں کے ایک تالیف کے کچھ ٹکڑے کا جامعہ برلن کے رسالے Ms. Mitteilung des seminars die orcxetal cochen sprachen میں ترجمہ ہوا ہے لیکن یہ المدونہ اور الام کے مقابلے میں کمتر درجے کی تالیفیں ہیں (مولف کو مجلس احیاء المعارف العلمانیہ، حیدرآباد دکن کے کارناموں سے آگاہی نہیں معلوم ہوتی ہے جس نے صاحبین کی کوئی نصف درجن کتابیں چھاپ ڈالی ہیں۔ اس فرانسیسی مقالے کی اشاعت کے بعد جامعہ قاہرہ سے امام محمد کی کتاب الاصل کی طباعت شروع ہوئی ہے۔ (مترجم)

۲. حضرت جابرؓ کی کتاب الحج حضرت علیؓ کے فتاویٰ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کی کتابیں جو فقہی چیزیں تھیں، ان کا اب صرف نام باقی ہے۔ ۵۸ھ سے قبل کی تالیف صحیفہ ہمام بن منبہ البتہ موجود ہے۔ اسی طرح ہمام کے شاگرد معمر بن راشد کی الجامع لیکن یہ دونوں آخر الذکر کتابیں فقہ سے زیادہ حدیث سے متعلق ہیں۔ (مترجم)

دو صدیوں سے بھی کم عرصہ بعد اس مذہب کے نام سے جو ان کو اتنی مشکل سے اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھا، افکار انسانی کی وہ عجیب و غریب پیداوار شکل پذیر ہوئی، جسے ”فقہ“ کہتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسا بھی ہو جو اس کی داد نہ دے پھر بھی وہ افکار انسانی کی ایک قابل ذکر جدوجہد یقیناً ہے لیکن یہ کیسے اور کن اثرات کے تحت وجود میں آیا، خاص کر پہلی صدی ہجری میں؟ یہ بات ہمیں معلوم نہیں اور فقہ کے آغاز کے سلسلے میں یہ معمہ ہے اگر اس کی پیدائش نفی محض سے ہوئی تو افکار اسلامی کی داد دینی پڑے گی اور چاہے یہ بات کتنی ہی کم قرین قیاس کیوں نہ ہو، اس کی تردید کرنا، اس کے برعکس صورت حال ہونے کا ثبوت دینا، اس کی موجودہ حالت میں سخت دردمندی کا باعث ہے۔

(۱)

اس موضوع پر بحث کرنے سے پہلے میں ناظرین کی توجہ تاریخ آغاز فقہ کے سلسلے میں ایک اور معمے کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جسے داخلی معمہ کہہ سکتے ہیں اور سب سے زیادہ بڑا معمہ یہ سنی اور غیر سنی فقہ کا بالکل ایک ہونا ہے، جسے آج تک کسی نے غالباً معمہ نہیں خیال کیا۔

یہ معلوم ہی ہے کہ شیعہ فقہ، سنی فقہ سے صرف چند اہم باتوں میں مختلف ہے (یعنی قانون وراثت، متعہ، ولد الحرام کا رشتہ اپنی ماں سے) باقی سارا شیعہ نظام فقہ سنی فقہ سے اتنا ہی اختلاف رکھتا ہے جتنا سنی مذاہب فقہ خود آپس میں فرق دیکھتے ہیں۔ یہ یکسانی ایاضی (یعنی خوارج) کی فقہ میں اور بھی زیادہ واضح ہے۔ جو کہنا چاہیے سنی فقہ سے تقریباً بالکل ہی اختلاف نہیں رکھتی۔

اب صورت حال اپنے ذہن میں تازہ کیجیے۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے تیس ہی سال بعد دو بڑے دینی اختلاف پوری قوت کے ساتھ رونما ہو چکے تھے۔ ان اختلاف کرنے والوں اور سنیوں کے درمیان بڑی خوریز لڑائیاں ہوئیں، یہ تو کوئی بھی قبول نہ کرے گا کہ نظام فقہ اس ربع صدی ہی میں شکل پذیر ہو گیا ہو جو (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور ان دینی اختلافات کے درمیان واقع ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ

(سنی، شیعہ اور خوارج تینوں کے نظام ہائے فقہ میں) نہ صرف قانونی حل ایک ہی ہیں بلکہ فردی امور کی حد تک مسائل سے بحث کی تفصیلات، بلکہ کتب فقہ کی تیویب تک میں وہ یکساں ہیں۔ یہ امر مجھے بڑی حیرت میں غرق کر دیتا ہے، یہ فقہ کی تشکیل داخلی کے متعلق ایک ناقابل ادراک معما ہے۔

(۲)

اگر اثرات کے متعلق گفتگو کی جائے (خواہ وہ ادبی ہو یا اخلاقی، سیاسی ہو یا مذہبی وغیرہ) تو کم از کم دو چیزوں میں اچھی طرح امتیاز کرنا چاہیے، یعنی جو چیز اخذ یا نقل ہو سکتی ہے وہ یا تو مواد ہوگا یا روح (اسپرٹ) اور بسا اوقات دونوں کو نقل اور بعض وقت چوری کہا جاسکتا ہے مثلاً گوئٹے کی لافانی نظم ”ہرمان اور دوروتیا“ (Hermann und Dorathea) مواد کی حد تک ایک پیش پا افتادہ چند سطر کی قصے ۱ سے ماخوذ ہے۔ بایرن ۲ کی قابل تعریف نظم ”قین“ (Cain) یعنی ہابیل کا بھائی قابیل (توریت کی کتاب ”پیدائش“ کی چند آیتوں سے ماخوذ ہے، لیکن اس مواد پر جو خیال آرائی کی گئی ہے وہ ان دونوں میں ان کے اصل ماخذ و مصدر سے متج نہیں ہے۔ لافونٹین (La fontaine) کی منظوم اخلاقی کہانیاں ۳ (Fables) یا راسین (Racine) کی نظم ”اندروماک“

۱۔ وہ قصہ یہ ہے کہ چند خانماں برباد پناہ گزین ہرمان کے گاؤں سے گزرتے ہیں تو ہرمان ان میں دوروتیا کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ ہرمان کا باپ ایک مالدار ہمسایہ لڑکی کو بہو بنانا چاہتا ہے لیکن بعد میں گاؤں کے پادری وغیرہ کی کوشش سے باپ رضا مندی دے دیتا ہے اور عاشق و معشوق شادی کے بعد ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ یہ جرمن شاعر گوئٹے (Goethe) ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۲ء میں فوت ہوا۔ (مترجم)

۲۔ لارڈ بایرن Lord Byron انگریز شاعر زمانہ ۱۷۸۸ء تا ۱۸۲۳ء (مترجم)

۳۔ لافونٹین ۱۶۳۱ء تا ۱۶۹۵ء مشہور فرانسیسی شاعر اس نے کلیلہ و دمنہ اور گلستان و بوستان کے انداز پر جو اخلاقی کہانیاں لکھی ہیں ان میں زیادہ تر جانوروں کو ہیرو بنایا گیا ہے۔ بھیڑیا اور بکری کا بچہ، لومڑی اور سارس وغیرہ وغیرہ پر اس کی پر لطف کہانیاں ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ (مترجم)

(Andromaque) ۱۔ کے مواد کے ماخذوں کے متعلق بھی کوئی چاہے تو اسی قسم کے ملاحظیات پیش کر سکتا ہے۔ اس کے برخلاف مثلاً تقلید شکن رومان پسندی بھی، قدامت پسند ”کلاسیکیت“ ہی کی طرح ادبیات میں ایک بڑا روحانی یا جذباتی دھارا رہی ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے مولفوں کو متاثر کیا ہے، بلا لحاظ اس کے کہ وہ کس موضوع سے بحث کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا کوئی احمقانہ بات نہیں کہ وکٹور ہوگو ۲۔ کوئی رومان پسندانہ ناولک تنزی ۳۔ کے نام سے لکھ سکتا تھا یا راسین کسی رومان پسندانہ ناولک کا موضوع لے کر اسے قدامت پسندانہ ”کلاسیکی“ انداز میں برت سکتا ہے جیسا کہ اس نے ترکی حرم سرا کے ایک واقعہ ۴۔ کے متعلق کیا ہے۔

قانون میں بھی ہم بالکل اسی طرح کی صورت حال سے دو چار ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر برطانوی ہند میں انگریز حکام عدالت بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات

۱۔ راسین ۱۶۳۹ء تا ۱۶۹۹ء فرانس کا حزن نگار شاعر۔ اندروماک ایک بیوہ ہے جس پر بادشاہ پیروس (Pyrrus) عاشق ہو جاتا اور دھمکا تا ہے کہ اگر وہ نہ مانے گی تو اندروماک کے بیٹے کو قتل کر دیا جائے گا، مگر پیروس کی منسوبہ ایک دوسری عورت مارے حسد کے بادشاہ ہی کو مروادیتی ہے اس طرح یہ قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ راسین سے پہلے بھی اس کہانی کو لاطینی میں درجیل (Virgile) اور یوری پیڈ (Euripide) اپنے اپنے انداز میں لکھ چکے تھے۔ (مترجم)

۲۔ (Victor Hugo) فرانس کا رومان پسند شاعر زمانہ ۱۸۰۲ء تا ۱۸۵۵ء (مترجم)

۳۔ (کورنی Cornuille) تالی فرانسسی حزن نگار شاعر زمانہ ۱۶۰۶ء تا ۱۶۸۳ء نے Lecid کے نام سے قدامت پسندانہ انداز میں ایک ناولک لکھا تھا جس میں ایک ایسی ہی قصہ کو اپنایا ہے جس میں سدی رذریق ایک جاگیردار کی لڑکی پر عاشق ہو جاتا ہے، لڑکی کا باپ لڑکے کے باپ کو کسی بات پر پٹواتا ہے، اس کے انتقام میں لڑکا اس جاگیردار کو مار ڈالتا ہے، اس کے باوجود لڑکی سدی رذریق کے عشق میں مبتلا رہتی ہے جب رذریق عربوں پر ایک بڑی فتح پاتا ہے تو لڑکی اپنے باپ کے قاتل عاشق سے شادی منظور کر لیتی ہے۔ (مترجم)

۴۔ غالباً ”بایزید“ نامی ناولک مراد ہے جو راسین نے ۱۶۷۲ء میں لکھا تھا اس میں سلطان ترکی کی بیوی اپنے دیور پر عاشق ہو جاتی ہے اور قتل و خون کے ذریعے ناولک کے کردار دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ (مترجم)

یہ کہ خود مسلمان حکام عدالت جن کی تربیت انگریز اہل قانون کی نہج پر ہوئی تھی، فقہ کا اطلاق انگلستان کے قانون نظائر (Case Law) کے انداز پر کرتے تھے، حالانکہ ان دونوں نظام ہائے قانون کا مادہ اور روح دو بالکل ہی مختلف اصلیتیں رکھتے تھے۔

اس تصور کی وضاحت کے لیے ہم اوپر دی ہوئی مذکورہ سادہ مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسلام نے بھی فکری تصور اور مواد کی حد تک دیگر قانونی یا نیم قانونی اور نیم مذہبی نظاموں سے کوئی چیز مستعار لی ہے؟

اس طرح کی اخذ و عاریت اگر ہوئی بھی ہے تو ظاہر ہے کہ صرف ان ممالک سے ہو سکتی ہے جنہیں نہ صرف مسلمانوں نے فتح کیا تھا، بلکہ جو مدینہ منورہ سے باہر اور اس سے دور افکار اسلامی کے مرکز بھی بن گئے تھے اور ان نو مسلموں کے باعث جو کسی نہ کسی حد تک معیارِ ذہنی کے مالک ہوں اور اس دھارے کے باعث جو ان کا (سابقہ) قانون اور ان کا (سابقہ) مذہب منہاج فکر اور مسائل کے حل کے متعلق مہیا کرتا تھا۔ اسی بنا پر ہماری یہ بحث نظام ہائے قانون کے صرف چار گروہوں ۱ کی حد تک محدود رہے گی۔

۱۔ پارسیوں کا نیم قانونی نیم مذہبی نظام

۲۔ ۳ قانون روم اور قانون کلیسائی جس حد تک وہ شام اور مصر میں معروف تھے۔

۳۔ تالمود (یہودی قانون)

(۳)

(۱) اس بحث میں ہم پارسی مذہب کا زیادہ ذکر نہ کریں گے، اس موضوع پر سب سے اہم تحقیق گولڈ سیہر (Goldziher) کی رہن منت ہے جو فرانسیسی ”رسالہ“ تاریخ

۱۔ گولڈ سیہر نے ایک مقالہ اسلام پر بدھ مت کے اثر پر انگلستان کے رسالہ مستشرقین Iras میں شائع کیا ہے مگر یہ اثر فقہ پر نہیں بلکہ تصوف پر رہا ہے۔

مذہب Alhr ۱۹۰۱ء جلد ۴۳ صفحہ نمبر ۱۰۰۰ میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا اثر زیادہ تر مادی ہے اور وہ بھی فقہ کی حد تک بہت قلیل چیزوں تک محدود رہا ہے۔ مثلاً نمازوں کی تعداد کا پانچ ہوتا، مسواک، کتے سے حقارت کا برتاؤ۔ اس کے برعکس پارسیوں کے ہاں کتے کا بڑا احترام تھا وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہم گولٹ سیبر کے اس خیال سے بھی اتفاق کر سکتے ہیں کہ ایرانی علمائے دینیات نے اپنے قبول کردہ نئے مذہب یعنی اسلام میں اپنے پرانے روایاتی نقطہ ہائے نظر داخل کر لیے تھے۔ لیکن یہی مؤلف فقہ کی جبکہ اس کا بہ حیثیت مجموعی تصور کیا جائے روح پر اپنے ان خیالات کا اطلاق کسی طرح نہیں کرتا۔

غرض اس بارے میں ہمارے موجودہ معلومات بہت محدود ہیں اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ پر پارسی اثرات اصل میں جیسے بھی بہت محدود۔ یوں بھی اس مسئلے پر ہمیں بہت زیادہ معلومات حاصل ہو بھی نہیں سکتیں کیونکہ پارسیوں کی مقدس (یعنی مذہبی) ادبیات کا ایک بڑا حصہ اسلامی حملے کے نتیجے میں ضائع ہو گیا۔ چنانچہ ژند اویتا کے اکیس ہزاروں میں سات قانون سے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ ان میں بھی صرف ایک کامل ملتا ہے اور باقی کے محض چند ٹکڑے ہیں۔ جو مکمل نیک موجود ہے، وہ بندیداد (Vandidad) ہے جو زیادہ تر عبادتی طہارت اور مختلف دیگر مسائل سے متعلق ہے اور سب انتہائی

۱۔ حال میں اس موضوع پر ایک اطالوی مقالہ بھی شائع ہوا ہے لیکن وہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ مؤلف نے ہماری دریافت پر جواب دیا کہ انہیں مقالہ نگار یا رسالے کا نام بھی معلوم نہیں جامعہ روما کے پروفیسر لیوی دیل لاویدا (Levi della Vidla) نے ازراہ عنایت لکھا ہے کہ غالباً یہ اطلاع غلط فہمی پر مبنی ہے اگرچہ پروفیسر پالیارو (Pagliaro) نے ساسانی قانون پر کئی مقالے لکھے ہیں لیکن ان میں فقہ پر اثر پڑنے کا کوئی ذکر نہیں۔ (مترجم)

۲۔ یہ صحیح ہے کہ عہد تابعین و مابعد میں بہ کثرت فقہاء و علماء نو مسلم زادے ملتے ہیں جن کی پوری تربیت اسلامی ماحول میں ہوئی تھی اور جو صرف عربی میں لکھتے پڑھتے تھے۔ لیکن تازہ نو مسلموں میں فقہاء قضاۃ یا متکلمین کا کوئی سراغ کم از کم مجھے نہیں ملا ہمارے کرم فرما اپنی خواہش کو واقعہ قرار دے دیتے ہیں۔

۳۔ غالباً اصل میں سکندر اعظم مراد تھا، اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مسلمانوں نے ایرانیوں کی کتابوں کو چھیڑا ہے۔ فتح خیبر کے بعد تورات کے جو نسخے مال غنیمت میں ملے تھے، خود جناب رسالت اب ☆

بے ترتیبی کی حالت میں ۱۔ اور یہ بے ترتیبی اس سے کہیں زیادہ ہے جو فقہ میں پائی جاتی ہے۔ اگر سرسری اور سطحی تاثرات کی بناء پر میں کوئی رائے ظاہر کرنے کا مجاز سمجھا جاؤں، تو میری رائے میں فقہ کے تمام ظاہری خط و خال ہوں یا اس کی روح ان دونوں میں کسی حد تک بھی پاری قانون کے اثرات قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اس میں فقہ کے جیسے طویل، دقیق اور مفصل احکام نہیں پائے جاتے، جسے مویشگانی کرنے والے (Casuistiques) فقہاء نے قانون ربانی کی اساس پر مرتب کیا ہو۔ کیا پارسیوں کے پاس ایسا کوئی ادب (لٹریچر) پایا بھی جاتا تھا؟ میں اس سے واقف نہیں۔ ۲

(۴)

کیا پھر یہ ممکن ہے کہ کسی ایسے اثر کا پتا چلتا ہو جو قانونِ روم نے فقہ پر ڈالا ہو؟ چونکہ اس قانون کے متعلق پوری واقفیت ہے اس لیے یہ دشوار نہیں کہ اس سے لیے ہوئے مادی حصے کو منصہ شہود پر لایا جائے مگر ماہرین نے اس وقت تک جو فردِ حساب تیار

☆ نے یہودیوں کو واپس دلا دیے تھے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مذہب اور مذہبی معلومات کو اگر مٹھی بھر پجاری اپنی اجارہ داری بنالیں اور عوام میں ان کے پھیلنے میں مانع آئیں تو چھوٹے سے چھوٹا اتفاقی حادثہ بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیتا ہے خود کردہ راجہ علاج (مترجم)۔

۱۔ ژند اویتا کا فرانسیسی ترجمہ از دارمش تیزر (Darmeteler) جلد دوم ص ۳۰۳ نیز دیا چہ۔

۲۔ بے شبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی تنظیمات میں ساسانی عام کشوری قانون سازی کا اثر پڑا، لیکن میرے علم میں اس پہلو کا کسی نے بھی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ (مسعودی نے یہ ضرور صراحت کی ہے کہ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عراق و ایران میں وہاں کا پرانا نظام مالکداری ہی برقرار رکھا، گویا وہ اسلامی قانون میں جذب کر لیا گیا۔ اسی طرح محدثین اور مورخین سب نے بیان کیا ہے کہ ایران میں صرف خاص شاہی کی جاگیریں اور ڈاک وغیرہ دیگر منافع عامہ کی جائدادیں بھی عہد خلافت میں مرکزی حکومت کی ملکیت سمجھی جاتی رہیں اور ان کے متعلق خلفاء اپنی صوابدید پر عمل کرتے رہے، ایرانی دراہم اور سکہ سازی بھی برقرار رہی۔ ایسی اور بھی جزئی تفصیلیں مل سکیں گی۔) (مترجم)

کی ہے۔ وہ کافی مایوس کن ہے۔ یہ نہیں کہ اس امر میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ ان میں اور فقہ میں چند مشابہتوں کا پتا چلایا گیا ہے۔^۱ لیکن میری نظر میں یہ آغاز فقہ کی گتھی کو حل نہیں کرتا۔ ایک لمحے کے لیے اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ دونوں نظام ہائے قانون

۱۔ کاروسی (Caruse) کا نظریہ یہ ہے کہ ”اسلامی قانون بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک رومی قانون ہے۔ جس میں بہ مشکل کوئی تبدیلی ہوئی ہو (کذا) وہ بہ الفاظ ہیوگ Hugues La france judicial سے اخذ کرتا ہے۔ جس نے عامیانہ خیالات کے ایک ۱۸۷۸-۷۹ء کے ایک مختصر مضمون میں مذکورہ بالا حماقت دکھائی ہے۔ کاروسی کی علمی قدرو قیت کو نالینو (Nalline) نے پر زور طور سے مشتبہ قرار دیا ہے البتہ بعض معقول مشابہتیں وہ ہیں جو سانٹیلانا Santillana نے اپنی فرانسیسی کتاب مسودہ قانون واجبات تونس Avant Imjet du code Tunisie des obligationn میں اپنے قابل داد ترجمہ ”مختصر الخلیل“ میں نہایت محتاط طور پر (مماثل) قانون روما کے حوالوں اور حاشیوں میں بتائی ہیں۔ اس کے علاوہ موزان کی کتاب الجزائر کے اسلامی قانون پر مطالعات (Morand, Etudes da droit muouلمان algerian) جسوں یعنی اوقات کے سلسلے میں اشمیت کی قبضہ اسلامی قانون Schmidt Die Occupatie im islamisch on reche مطبوعہ جرمن رسالہ دیر اسلام (Der Islam) ۱۹۱۰ء بوسی کی اطالوی کتاب ”بیزنٹینی اور اسلامی قانون شفعہ کے باہمی تعلقات کی تحقیق“ Buosi Riceerce interne etterela zione fre vetratto Revue Hist. byzantine e musulmano میں فرانسیسی ”رسالہ تاریخ قانون“ (roussier) ۱۹۳۳ء ص ۳۲۳ وما بعد میں تنقید کی ہے۔ فون کریم کی جرمن کتاب ”مشرق کی ثقافتی تاریخ عہد خلافت میں۔ Von kremer, Cutturge schichte des oriens unter den chalifen جلد اول ص ۵۵۲ وما بعد یہ کتاب اگرچہ اب فرسودہ ہو گئی ہے لیکن اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ فقہ کے تعلقات (یہودی) تالمود اور قانون روما کے ساتھ جو رہے ہیں۔ اس نے ان کو اچھی طرح محسوس کیا ہے اور اس مسئلے پر زور دیا ہے کہ حنفی قانون حضانت میں قانون روما سے رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس مولف نے یہ خیال کر لیا کہ اس نے اس مسئلے کو حل کر دیا ہے نیز دیکھو کتاب بالا جلد دوم ص ۱۵۸ وما بعد میں ایک اہم عبارت (حوالہ اول میں اس قول کو اساس بنایا گیا ہے کہ یتیم کا مال بچپن سال کی عمر کے بعد اس کے سپرد کیا جانا چاہیے۔ حوالہ دوم میں فون کریم نے یہ لکھا ہے کہ موالی جب قاضی اور مفتی مامور ہونے لگے تو انہوں نے اپنی سابقہ (غیر مسلم) ثقافت کی چیزیں فقہ میں داخل کرنی شروع کی ہوں گی خاص کر نو مسلم یہودیوں نے تالمود سے استفادہ کیا ہوگا لیکن فون کریم نے اس دعوے کا کوئی ☆

کے مماثل قواعد جن کو اگر بہ حیثیت مجموعی جانچیں تو ان میں ایک بہت ہی خفیف تناسب معلوم ہوتا ہے فقہ میں قانونِ روما کی راہ سے داخل ہو سکے تو اس کے باوجود یہ امر اپنی جگہ برقرار رہتا ہے کہ فقہی مواد کا مجموعہ اس کے اصولی نظریے کم از کم وہ نظریے جو فقہ کو اس کی خصوصی ہیئت عطا کرتے ہیں، قانونِ روما کے ذرا بھی مرہون منت نہیں ہیں۔ عبادات کا تو ذکر ہی کیا، اگر معاملات میں ان بنیادی خیالات کو لیا جائے جن پر نکاح، طلاق، غلامی، جہاد، ربا (سود) معاہدات غز (غیر یقینات کے متعلق) نظامِ وراثت، شہادت و ثبوت، آداب القاضی کے نظریے پر مبنی ہیں، تو ان بنیادی معاملات کے بارے میں فقہی احکام اور قانونِ روما کے احکام میں قطعاً کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔

یہ تو مواد کا حال ہے رہی روح، تو فقہ اور قانونِ روما کی روح ایک دوسرے سے اور بھی زیادہ دور ہیں۔ فقہ کی دو بنیادی خصوصیتیں ایسی ہیں جو قانونِ روما کی روح سے بالکل ہی مغائر ہیں۔

(الف) اولاً فقہ جسے فقہاء نے وضع اور مرتب کیا ہے، ایک الہیاتی مجموعہ ہے جس میں قانونِ اخلاق، عبادات، دینیات، عام معاملات سب ہی غیر متفک طور پر ایک دوسرے سے مربوط اور مخلوط ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی ”قانون“ ۱ کا ذکر کرنا خطرے سے خالی نہیں (اگرچہ یہ کہنا درست ہو گا کہ مختلف مسلمان قوموں کے قانونی ادارات موضوعہ (Institutions Juridiques positives) پائے جاتے ہیں کیونکہ قانون کا تصور فقہاء کے ذہن میں ۲ کبھی بھی اس الہیاتی

☆ ثبوت نہیں پیش کیا کہ کوئی نو مسلم کبھی قاضی و مفتی مقرر کیا گیا ہو نو مسلموں کی اولاد اسلامی مدارس میں تعلیم و تربیت پاتی تھی جس میں بیرونی اثرات اس میں کم و بیش ناپید ہو جاتے۔

۱ یعنی خالص دنیا دارانہ انسان ساز احکام دیوانی و فوجداری، جن کی اساس میں خدا اور وحی کو کوئی دخل نہ ہو۔ مترجم

۲ اس کی تردید میں یہ یاد دلایا جاسکتا ہے کہ فقہانے کم از کم قانونِ فوجداری کے اس حصہ کو جو قتل، زنا، شراب نوشی وغیرہ پانچ سات ”حدود“ سے متعلق ہیں چھوڑ کر غیر محدود مسائل تعزیر کو امام کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور یہ ”سیاست شرعیہ“ ترمیم و تبدل کی اچھی خاصی آزادی ہے۔ مترجم

مطرح نظر سے (جسے امتِ اسلامی پر حکمراں رہنا چاہیے) جدا نہیں ہو سکتا، ہر فعل، وہ عباداتی ہو یا قانونی، وقت واحد میں ایک اخلاقی اور دینی صفت سے بھی متصف رہتا ہے۔

یہ سب قانون روما کی روح کے شدید مخالف و متضاد ہے۔ اور جو چیز عجیب ہے وہ یہ ہے کہ الپین (Ulpian) نے قانون روما کی جو مشہور و معروف تعریف (لاطینی میں) کی ہے، وہ قانون روما سے کہیں زیادہ فقہ پر صادق آتی ہے کہ ”علم قانون کے معنی ہیں خدائی نیز انسانی چیزوں کی معرفت“ کیونکہ اس تعریف کے برخلاف روما میں خالص دنیوی قانون Jus اور ہمہ گیر مذہبی قانون Fas میں ابتدائی زمانے ہی میں اور ہمیشہ کے لیے تفریق ہو گئی تھی اور ایک ’عظیم ترقی تھی جو انسانی ذہن نے حاصل کی۔ یہ ارتقاء مسلمان فقہاء کے ہاں کبھی ہوا ہی نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ یہ ان کے نظام کی اساس ہی سے تضاد رکھتا تھا۔

(ب) استنباطات یا مہمل مفروضات میں مویشگانی اور اس کی اساس پر معمولی تفصیلات تک کی بحث، ایک ایسی چیز ہے جس کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ ابتدا ہی سے فقہ کی ممتاز ترین خصوصیتوں میں رہی ہے اور ہم کو یقین نہیں کہ ایسی کوئی چیز قانون روما کی کتابوں یا خود عہد متاخر کے بیزنطینی قانون کی کتابوں مثلاً ”قوانین شاہی“ (Basiliques) ۳ میں مل سکے گی۔ اس

۱۔ دیکھو ایرگ (Ihring) کی جرمن کتاب ”قانون روما کی روح“ فرانسیسی ترجمہ جلد اول ص ۲۶۶ ۲۶۷ تا ۵۲۳۳۵۔

۲۔ یہ امر دریافت طلب ہے کہ ذہن انسانی کی اس ”ترقی“ سے انسانیت نے فائدہ زیادہ اٹھایا یا نقصان؟ مترجم

۳۔ اس سے مراد اپنے جیٹی نین کے مجموعہ قوانین کا مرمرہ یونانی ترجمہ ہے جو ساٹھ کتابوں پر مشتمل تھا اور شہنشاہ باسیلیوس (نوت ۸۸۶ء) اور اسکے بیٹے ہوف (نوت ۹۱۲ء) کے زمانے میں مکمل ہوا۔ اب صرف جزء محفوظ ہے۔ مترجم۔

(رومی قانون) میں حقائق و واقعات کے ساتھ ربط نہایت عمیق اور مستحکم رہا ہے اور غالباً یہی چیز ہے جس نے اسے دیر پا قدر و قیمت عطا کی ہے۔
اس طرح اب یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ اپنی روح کی حد تک فقہ نے رومی قانون سے کچھ بھی اخذ نہیں کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو مادی چیزیں اخذ کی گئیں ان کی اہمیت کیا رہی ہے؟ مادی اور روحی امتیاز جو ہمیں اتنا زیادہ اہم نظر آتا ہے، فاضل بزرگ گولٹ سیبر نے بالکل نہیں کیا ہے اور غالباً سائنٹیا نا کی دکھائی ہوئی قریبوں [یا مشابہتوں] سے متاثر ہو کر اس نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، مادہ فقہ میں بے تکلف لکھ مارا کہ ”اسلامی قانون سازی کے ماخذ صرف رومی قانون کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتے۔“

اتنی مستند شخصیت (گولٹ سیبر) کے خلاف آواز بلند کرنا خطرے سے خالی نہیں، پھر بھی اس دعوے کے متعلق میں مندرجہ ذیل ملاحظات پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں:

اولاً یہ کہ گولٹ سیبر نے (جس نے پاریسی مسائل کا بذات خود مطالعہ کیا ہے) اس مسئلے (یعنی رومی قانون سے تعلقات) کا خود مطالعہ نہیں کیا اور اس نظریے کے متعلق اس نے خود اپنی کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے اور جو مماثلتیں دکھائی گئی ہیں، اگر وہ دس گنی بھی زیادہ ہوتیں، تب بھی کتب فقہ میں حل کیے ہوئے مسائل کے مقابلہ میں دریا میں قطرے سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان حالات میں یہ کیوں نہ خیال کیا جائے کہ اکثر صورتوں میں مماثلت محض اتفاقی ہے، کیونکہ کسی سوال کے ممکنہ حل جو ذہن انسانی میں آسکتے ہیں وہ محدود ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف نظام ہائے قانون یا عبادتی

-
- ۱۔ مولف نے اپنے اس حسن ظن کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ کیا دیرپائی کے معنی ہر روز کی تبدیلی کے ہیں؟ شہنشاہ جسٹینین (Justinian) کی آئے دن کی من مانی تبدیلیوں سے کون نالاں نہیں۔ مترجم
- ۲۔ دیکھو ایرنگ کے ملاحظات (کتاب بالا ج: ۱ ص ۴۲ نیز ص ۵۶ تا ۵۷) موشگافانہ مستبہاطات کے متعلق ایسے مستبہاطات جو کمزوری کی علامت ہیں۔ اس لیے آدمی کو حقائق اور واقعات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(دینی) ایک ہی حل اختیار کریں۔

اور ایسا بار بار پیش آیا ہے، مثلاً سانٹیلانانے مختصر التحلیل (ترجمہ جلد دوم ص: ۸۱، ۷۱۶، ۷۱۸، ۷۱۹) کی ذیل کی عبارت کے متعلق مماثل رومی احکام کا حوالہ دیا ہے:

”اگرہ کسی ضرر مثلاً موت، مارپیٹ یا قید کا ڈر، باندھ دیے جانے یا بیڑیاں پہنا دیے جانے، کسی مردانہ قوت والے آدمی کو سر بازار دھپہ مار دینے، زیر اگرہ شخص کے بیٹے یا اولاد کو موت کی دھمکی دینے، یا اس کی جائیداد کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دینے پر مشتمل ہے لیکن اس پر اتفاق رائے نہ ہو سکا کہ اگرہ قرار پانے کے لیے آیا یہ ضروری ہے کہ یہ ضرر شدید بھی ہونا چاہیے یا نہیں۔

میری دانست میں اس کا ہر شخص اعتراف کرے گا کہ اگرہ کی تعریف غیر محدود

۱۔ گولٹ سیبر نے پاریس کے مذہبی اثر کی مثال بطور رد عمل کے دی ہے یعنی پارسیوں کی توڑ پر عداوت ان کے طرز عمل کے خلاف طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا، لیکن اگر کسی طرز عمل کے موافق اور مخالف طریقوں کو اثر پڑنے کا کافی ثبوت خیال کیا جاسکتا ہے، تو اولیائی یا دلیل الی (a priori) کے طور پر اس طرح اس بات کا امکان دوگنا ہو جاتا ہے کہ جو بات محض اتفاقی بھی ہوئی ہو اسے براہ راست اثر قرار دیا جائے۔ بجز اس کے کہ وہ کوئی بہت ہی چھوٹی ذیلی چیز ہو جو (اسلامی نظام کی اپنی) خصوصیت ہو (اور کسی دوسرے نظام میں اسکے موافق یا مخالف بھی کوئی چیز نہ ملتی ہو)۔ [دلیل الی گویا ”ان“ (اگر ایسا ہو تو) کے مفروضہ سوال کا جواب دیتی ہے۔ مترجم]

ایک فرضی مثال لو۔ اگر مستقبل کے ماہرین علم یہ خیال کرنے لگیں۔۔۔ کہ بیسویں صدی کے پروٹسٹنٹ اسکے پابند تھے کہ مقدس جمعہ (گڈ فرایڈے) کو گوشت ضرور کھائیں، حالانکہ غذا کے متعلق ان پر کوئی مذہبی پابندی تھی ہی نہیں (جو کہ حقیقت میں صحیح ہے) مگر چونکہ مقدس جمعہ کے دن گوشت نہ کھانا تمام کیتھولکوں کے ہاں زیر عمل تھا، اس بنا پر مستقبل کے یہ ماہرین یقینی طور پر یہ نتیجہ اخذ کریں کہ پروٹسٹنٹوں نے کیتھولکوں کی توڑ پر اور کیتھولکیت کی مخالفت میں یہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اسکے برخلاف پروٹسٹنٹوں کے ہاں طلاق کا وجود اصل میں اس بنا پر ہرگز نہیں ہے کہ باقاعدہ طور پر ہر امر میں رومن کیتھولکوں کی مخالفت کرتے ہیں، بلکہ وہ ایک معاشرتی ادارہ ہے جو اپنی احتیاج کے باعث دنیا میں اچھا خاصا پھیلا ہوا ہے اور پروٹسٹنٹ مذہب نے کسی طرح بھی اس کی سفارش نہیں کی ہے۔

طریقوں پر نہیں کی جاسکتی۔ یہ ایک معمولی پامال چیز ہے اور جو مثالیں دی گئی ہیں وہ عادتاً ہر شخص کے ذہن میں آسکتی ہیں۔ بجز سر بازار دھپہ مارنے کے اور واقعہ یہ ہے کہ خاص اس مثال کے متعلق قانونِ روما کے کسی حکم کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ مسلمان فقہاء نے یہ مثالیں کسی رومی عبارت ہی سے نقل کی ہیں تو اس سے یہ کہاں مترشح ہوتا ہے کہ رومی قانون نے فقہ پر اثر بھی ڈالا ہے (یعنی مثال دینا الگ چیز ہے اور متاثر ہونا اور کسی رومی قاعدے کو قبول کرنا الگ۔ مترجم)

اصل میں اخذ و عاریت قرار دینے سے پہلے ایک دوسری ہی چیز کے ثابت کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ا۔ مثلاً ترکی کا مجموعہ قانونِ مدنی سوئٹزرلینڈ کے مجموعہ

۱۔ چند مماثلتوں کے متعلق اس کا ثبوت دیدیا گیا ہے کہ فلاں قاعدہ اسلام میں قانونِ روما سے تعلق پیدا ہونے کے قبل ہی پایا جاتا تھا، اسی کی ایک مثال برگسٹریسر (Bergstruesser) نے جرمن رسالہ ”دیر اسلام“ (Der Islam) بابت ۱۹۲۵ء ص ۸۱ میں دی ہے [مولف نے اسکی تفصیل نہیں دی ہے مترجم برگسٹریسر کی حوالہ بالا عبارت جرمن سے ترجمہ کر کے یہاں شامل کرتا ہے۔ رسالہ مذکور کی چودھویں جلد میں ص ۸۱ تا ۸۶ پر ”اذکار قانونی کا آغاز اور ان کی خصوصیات اسلام میں“ کے عنوان سے ایک مقالہ ہے جس کا اختتام مندرجہ ذیل الفاظ پر ہوتا ہے: ”خرید و فروخت سے متعلقہ بعض معینہ [اسلامی] احکام کو منظم شکل دینے کے سلسلے میں ہم اس رومی تصور سے دوچار ہوتے ہیں Quae Pondere numero mensura constant (= ایسی چیز جو وزن، عدد اور کیل یعنی ناپ کی حد تک معلوم ہو) (خواہ numero کے بغیر ہی کیوں نہ ہو) مشہور تابعی سعید بن المسیب (۱۹ھ تا ۹۴ھ جو مدینہ کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے ایک تھے) کے ہاں مل جاتا ہے۔ اتنے ابتدائی زمانے میں رومی علم کا اثر مدینے کے ایک متقی شخص [سعید بن المسیب] پر پڑنے کو تاریخی نقطہ نظر سے کیسے معقول قرار دیا جاسکتا ہے؟ جبکہ ہر شخص ایسی کوشش کرے گا کہ پرانے اسلامی علم قانون کے دوسرے رخ، یعنی احکام و قواعد کے ایک نظام کی شکل میں مدون ہونے کو بھی ایک اندرونی (مسلمانوں ہی کی) کوشش سمجھے، جیسا کہ پہلے رخ، یعنی ملک کے موجود الوقت مروجہ زمانہ جاہلیت سے چلے آنے والے [احکام کو ”مسلمان بنانے“ کے متعلق ہوا“ مترجم۔ یہ اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ سعید بن المسیب کی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول پر مبنی تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کی کتاب نمبر ۳۵ باب نمبر ۲ میں ہے ”من اسلف فی شئ ففی کیل معلوم و وزن معلوم الی اجل معلوم“ یعنی اگر کوئی شخص کوئی چیز ادھار دے تو اسے معلوم ناپ اور معلوم وزن (مقدار) میں معلوم مدت کے لیے ہونا چاہیے)

قانون مدنی کا ترجمہ ہے، اور وہ اپنی سوئزر لینڈی اصل سے بہت ہی شاذ صورتوں میں اختلاف کرتا ہے اور یہ مجموعہ واقعی اہم مسائل کے متعلق ہے۔ اس قانون میں سوئزر لینڈ کا اثر ہی نہیں بلکہ اس کی چوری کہی جاسکتی ہے۔ اسی طرح البانیا کا مجموعہ قانون مدنی فرانسیسی اور اطالوی اور بعض صورتوں میں سوئزر لینڈی اور جرمن قوانین سے ماخوذ ہے اور ان کے احکام کو گڈنڈ کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ اس سے مستقبل کے یورپی ماہرین قانون کے لیے یہ ثابت کرنا آسان ہوگا کہ یہ البانوی قانون براہ راست اخذ و عاریت پر مشتمل ہے اور پوری پوری عبارتیں ترجمہ کر کے نقل کر دی گئی ہیں، صرف بعض نادر واقعات اور منسوخی بیج کے قوانین اس سے الگ ہیں۔ چنانچہ مستقبل کے ان ماہرین قانون میں سے ایک عربی دان مصری قاعدے سے واقفیت حاصل کر کے یہ ثابت کر سکتا ہے کہ البانوی قانون اصل میں اس مصری حکم کا لفظی ترجمہ ہے۔ جہاں تک قانون شفعہ کا تعلق ہے ہم کو یہ کہنے کا حق ہے کہ منسوخی بیج میں البانوی قاعدہ پر مصری قانون سازی کا اثر پڑا ہے، مگر ہمارے علم میں موجودہ حالت میں اس نوعیت کی قطعاً کوئی تحقیقات عمل میں نہیں آئی ہے جو فقہ کے کسی حصے پر رومی قانون کے اثر پڑنے کے متعلق رہی ہو۔ ا۔

لیکن اگر کسی صورت میں اثر پڑا بھی ہو یا اخذ و عاریت عمل میں آئی ہو تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ یہ اخذ و عاریت عمل میں کس طرح آئی۔ کوئی شخص بھی ساری چیزیں اپنے دماغ سے نہیں نکالتا اور نہ نفی محض سے، فقہائے اسلام بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اگر اخذ و عاریت عمل میں آئی بھی ہے تو ایک چیز یقینی ہے جو ہمیشہ یقینی رہے گی، وہ یہ کہ فقہاء نے اپنی تعمیر (یعنی فقہ) کو ایک خصوصی ترتیب اور ایک مخصوص ہیئت عطا کی ہے اور اس بارے میں وہ قانون روما کے ذرا بھی مرہون منت نہیں۔ فقہ نے اپنی جبلت کے متعلق قانون روما سے کچھ بھی نہیں لیا ہے۔

۱۔ میں نے شفعہ کی مثال عمدہ اس لیے دی ہے کہ بوسی (Bussi) نے اپنی اطالوی تالیف میں اس سے بحث کی ہے اور البانوی قانون کے ماخذ بتائے ہیں۔ بوسی کی اس کتاب پر روئے کی [مذکورہ صدر] تنقید بھی دیکھی جائے جس میں، عمدہ ملاحظات پیش کیے گئے ہیں، اگرچہ فی نقطہ نظر سے وہ ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کے ہیں مگر نتیجہ کی حد تک دونوں میں اتفاق نظر آتا ہے۔

(۵)

قانون کلیسائی مسلمانوں کے فتح کردہ رومی صوبوں میں جس صورت میں بھی پایا جاتا تھا، وہ بھی فقہ کی تشکیل میں حصہ لے سکا ہو گا ۲، لیکن مختصین نے اس مسئلے کا مطالعہ کیا ہی نہیں ہے ۳۔

اس بارے میں ہم ایک عام ملاحظہ یوں پیش کر سکتے ہیں کہ کسی ”مذہبی“ قانون کا تصور ایک ایسی چیز ہے جو ہم [یعنی عیسائی اہل مغرب] کو فقہ کی روح و روحان سے

۱۔ بقیہ صفحہ گزشتہ: میں خیال کرتا ہوں کہ اس مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے ادبی ماثلیں بے سود نہ ہوں گی، مثلاً راسین (Racine) کی تالیف Phedre کا ہلر (Schiller) نے جرمن میں ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ نہایت ”وفادار“ اور خاصا عمدہ ہے۔ لیکن [فرانسیسی] اصل کے مقابلے میں بہت گھٹیا ہے۔ ہلر نے صرف نقل پر اکتفا کیا ہے۔ مگر راسین کے پیش نظر ایک اور ہی چیز تھی۔ راسین نے عہد قدیم سے جو چیزیں مستعار لی ہیں، ان سے ہر شخص واقف ہے لیکن بہر حال اس نے [دوسروں کی چیزیں] حرف بحرف نقل نہیں کی ہیں۔ حال میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے (دیکھو Perrie Universelle مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۳۹ء ص: ۴۹۴) کہ راسین کا جملہ آریان: میری بہن ”اصل میں گارینے (Garnier) کی تالیف Hippolite سے مستعار لیا گیا ہے، لیکن یہ قابل ملاحظہ ہے کہ گارینے کے تین مصرعے راسین نے دو مصرعے بنا ڈالے ہیں: اس طرح دونوں کو ایک ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے، اس میں نوع اول کی اخذ و عاریت بالکل نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے نوع کی مثالیں پائی جاتی ہیں، یعنی ذیلی تفصیلات کی اخذ و عاریت لیکن ان کو ایک ایسے نظام قانون میں سمویا گیا ہے جو قانون روما کے نظام سے بالکل ہی مختلف ہے اور یہ ایسے قواعد کے تحت ہوا ہے جو فقہ کی اپنی روح کے مطابق ہیں۔

۲۔ بعد میں تو ہمیں یہ نظر آئیگا کہ فقہ ہی نے شام کے قانون کلیسا پر رد عمل کیا ہے، دیکھو نالینو کا اطالوی مضمون رسالہ ASD ۱۹۳۳ء ص: ۵۱۲ وما بعد میں۔

۳۔ البتہ خیال پڑتا ہے کہ میں نے جرمن تالیف Zhisman Bzzantinioces Kirechenrocht (بیزنطینی کلیسائی قانون) میں کسی ایسے قاعدے کا حوالہ پڑھا ہے جو حنفی فقہ کے قانون جبر و اکراہ کی مدہم یاد دلاتا ہے مگر یہ تالیف اس وقت میرے پیش نظر نہ ہونے سے کوئی ٹھیک حوالہ نہیں دے سکتا۔

قریب تر کر دیتا ہے۔ اس لیے اس بات کی اہمیت پر زور دینا چاہیے چاہے باہمی اثر اندازیاں کتنی ہی کمزور کیوں نہ رہی ہوں۔ اس طرح قانون کلیسا اور قانون اسلام کے درمیان ساخت و بنیاد کے متعلق چند مماثلتیں نمایاں کی جاسکتی ہیں لیکن اگر اس مذہبی اصل و اساس سے قطع نظر کر لیا جائے تو پھر میرا اثر یہ نہیں ہے کہ ان کی مماثلت و متوازنیت زیادہ دور تک جاتی ہے۔ فقہ اور مثلاً رومن کی تھلکوں کے قانون کلیسائی میں اختلافات قابل لحاظ ہیں، یہ اختلافات بتاتے ہیں کہ یہ دو ایسے نظام ہیں جن میں موافقت بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان اختلافوں میں سے چند یہ ہیں:

(۱) قانون کلیسائی کوئی غیر تغیر پذیر نظام نہیں اور کلیسا کو پوری طرح اعتراف ہے کہ چند موضوعوں کی حد تک وہ ارتقاء حاصل کر سکتا ہے اور اس نے ایسے ارتقاء کا موقع دیا بھی ہے (مثلاً نکاح کے بارے میں) مسلمانوں کے نظام کے ثبات و غیر تبدیل پذیری کی سی کوئی چیز اس میں نہیں پائی جاتی۔

(۲) قانون کی تشکل پذیری کی حد تک فقہ اور قانون کلیسا میں بڑا تباہی ہے۔ قانون کلیسا محض ماہرین قانون کا وضع کردہ نہیں ہے، بلکہ اس کے دوسرے ماخذ بھی ہیں۔ پوپ کے صادر کردہ اوامر اس بارے میں ایک فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں، اس کے برخلاف کوئی فقہی حکم کبھی کسی حکمران کی طرف سے مرتب اور نافذ نہیں کیا گیا۔ اور نہ وہ قرآن و حدیث کے سوا کسی اور ماخذ پر مبنی ہے اور کسی کشوری (سیاسی) یا مذہبی اقتدار نے

۱۔ [یہ مفروضہ بھی دلیل کا محتاج ہے، بیشک قرآن و حدیث کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہیں کیا جاسکتا لیکن اولاً فقہاء کے مستبطہ حلال و حرام میں اختلاف رائے سے کون واقف نہیں۔ مثلاً جھینگے شافعیوں کے ہاں حلال ہیں، حنفیوں کے ہاں حرام، کیا شراب اور جھینگہ حنفیوں کے ہاں مسادی گناہ کا باعث سمجھے جائیں گے؟ استعمالی زیور پر حنفیوں کے ہاں زکوٰۃ ہے، شافعیوں کے ہاں نہیں، کیا اس عدم ادائی زکوٰۃ کی بنا پر شافعیوں کو مرتد قرار دیکر ان سے جنگ کی جائے گی؟ مباحات ہی نہیں مستحب و مکروہ کے متعلق عموم المبلوئی کے اثر سے کون واقف نہیں؟ کیا حضرت عمر نے عراق و ایران میں وہاں کا قدیم نظام مالکداری بلا ترمیم کے عہد اسلامی میں بھی باقی نہیں رکھا اور مصر و شام میں خفیف ترمیم کی اور ان مختلف صوبوں کے قوانین اختلاف پر مستزاد معاہدات اطاعت کا شرطوں سے بعض وقت مزید استثناء نہیں پیدا ہو گئے؟ مترجم]

بھی کبھی فقہاء کے فیصلوں کو منسوخ نہیں کیا ۲، اسی طرح اسلام میں ایسی عدالتیں بھی نہیں جن کے فیصلے [سب کے لیے] واجب التعمیل ہوں۔

(۳) اسلامی قانون اصولاً ہر مسلمان کی پوری انفرادی زندگی اور امت کی اجتماعی زندگی سب پر حاوی ہے۔ حوائج ضروری اور نماز سے لے کر جہاد اور مالیات عامہ تک، نیز نکاح، بیع و شراء اور وصیت، ہر چیز اس کے احاطہ میں ہے۔ قانون کلیسا میں ایسا نہیں ہے۔ کشوری اقتدار کی موجودگی میں اس نے کبھی مطالبہ نہیں کیا کہ سارے مسائل کا اختیار سماعت مذہبی عدالتوں کو حاصل ہو، یا قانون کلیسا کے احکام ہمہ گیر اور عیسائیوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر مسئلے پر اثر انداز ہوں۔ مثال کے طور پر فقہ کا ایک اساسی مسئلہ احکام وراثت ہے۔ کلیسا اس کو ذرا بھی ناپسند نہیں کرتا کہ کسی کی تھلک کی وراثت اسلامی احکام کے مطابق (جیسا کہ مشرق قریبہ کے اکثر عیسائیوں میں رائج ہے) یا کسی اور نظام قانون کے مطابق وارثوں میں تقسیم ہو۔ اسی طرح کلیسا نے ایسے غیر تبدیل پذیر مذہبی احکام بھی نہیں دیے ہیں جو کھانے کے طریقے، دانت کے خلال، اور لباس ۳ وغیرہ پر مؤثر ہوں۔

(۴) آخری (فرق) یہ ہے کہ قانون کلیسائی میں، غالباً قانون روما کے اثرات کے تحت [دنیا دارانہ] قانونیت، فقہ اسلامی کے مقابلے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں دینیاتی اخلاق الگ چیز ہے، اور قانون کلیسائی الگ چیز۔ کوئی [مسلمان] مفتی کسی ”اخلاقی“ مسئلے کا جواب بھی اسی طرح دے گا جس طرح کسی قانونی مسئلے کا، لیکن یہ نہ کسی ماہر قانون

۱ متعلقہ صفحہ گزشتہ: [عراق کے قدیم نظام مالکداری کو حضرت عمرؓ نے قبول کر کے اس کو فقہ کا جز بنا دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے خلاف نہ تھا لیکن قرآن و حدیث سے ماخوذ و مستنبط بھی نہ تھا۔ انتظامی قوانین کی اکثریت عام فقہاء کی مستنبط نہیں بلکہ خلفاء اور حکمرانوں کی نافذ کردہ ہے۔ مترجم]

۲ [فقہاء میں اختلاف کی کمی نہیں جو فقہ کو غیر تبدیل پذیر بنانے میں مانع ہے۔ اس سلسلہ میں اندرون اسلام کے ”تصادم قوانین“ کی طرف بھی اشارہ کیا جاسکتا ہے، یوں بھی اجماع کتنے امور پر ہے اور کیا متراجماع سے سابق اجماع منسوخ نہیں ہو جاتا؟ مترجم]

۳ [ڈنر اور دربار کے لباسی مراسم کو چھوڑ بھی دیں تو خود پادریوں، راہبوں اور راہبات کے لباس کی عیسائی پابندیاں اسلام سے کہیں زیادہ ہیں۔ مترجم]

کلیسائی کے لیے ضروری ہے کہ وہ دینیاتی اخلاقیات کا بھی متخصص ہو اور نہ کسی رہنمائے ضمیر کے لیے کہ وہ قانون کلیسائی کا ماہر ہو۔ دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ ۱۔
ان تمام وجوہ سے میرے خیال میں یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اسلامی اور کیتھولک نظام ہائے فکر بہت متفاخر ہیں اور ان دونوں نے الگ الگ اصولوں پر ترقی پائی ہے اور ایسے نتیجوں پر پہنچے ہیں جن میں باہم مشابہت نہیں، ان دونوں نظاموں کی روح ایک نہیں ہے۔

(۶)

ہمارا موضوع بحث یہ تھا کہ فقہ کے آغاز کے معنی سے بحث کی جائے، شاید گزشتہ بحث سے یہ خیال کیا جائے کہ ہم اس سے بہت دور جا پڑے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ ہم نے قانون رومہ بلکہ خود قانون کلیسائی کے عام اصولوں اور فقہ کی روح میں جو بتائیں نمایاں کیا ہے وہ ہمیں اس کا موقع دیتا ہے کہ یہودی تالمود اور فقہ کی روح میں جو عمیق مماثلت ہے اسے بہتر طور سے سمجھ سکیں۔
جب کوئی ایسا شخص تالمود اُکھولتا ہے جسے کتب فقہ سے بھی شناسائی ہو تو وہ ان

- ۱۔ [خوی اور تقویٰ میں اسلامی فقہ میں بھی امتیاز کیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ عیسائی کلیسائی قانون کے مقابلے میں خوی کا میدان اسلام میں وسیع تر ہے۔ مترجم]
- ۲۔ تالمود گویا یہودی فقہ کا نام ہے، اس کے لفظی معنی سیکھنے سکھانے کے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو عربی اور اردو کے تلمیذ اور تلمذ میں ملتا ہے، اس سے مراد امشا اور اس کی شرح گمارہ (جمہرہ) کا مجموعہ ہے۔ امشا سے مراد دوسری صدی عیسوی کے اواخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت یا تعلیم کا جو روایاتی مفہوم یہودیوں کے ہاں لیا جاتا تھا اس کا مجموعہ ہے۔ اس کے چھ باب ہیں: (۱) سرائیم یعنی نماز و عبادت اور زراعت و مالکداری یعنی زکوٰۃ (۲) معید یعنی یوم سبت ایام عید و صوم کے احکام (۳) نشیم یعنی قانون ازدواج (۴) نسکین یعنی قانون دیوانی و فوجداری (۵) قدسیم یعنی قربانی اور مطعومات و مشروبات کا قانون (۶) طہوروت یعنی رسی پاکی و ناپاکی۔ اس تالیف کے داؤنیشن ہیں، تالمود یروشلم تقریباً چوتھی صدی عیسوی میں لکھی گئی اور تالمود بابل جو اس سے ضخیم ہے پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں۔ مترجم بحوالہ بروکھاس

– (Konversationslexikon)

دونوں مختلف الصنف تالیفوں کی مشابہت دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے بلکہ ابتداء میں بے اختیار یہی پکار اٹھتا ہے کہ ”یہ تو ایک ہی چیز ہیں!“ یہ تاثر کچھ بھی غلط نہیں ہے۔ میرے علاوہ دوسروں نے بھی یہی محسوس کیا ہے، خود تالمود کے [فرانسیسی] مترجم ثواب (Schwab) نے بھی جسے عین اسی زمانے میں منہاج الطالبین [فقہ شافعی، مولفہ نووی] سے بھی اس کے فرانسیسی ترجمے کے ذریعہ واقفیت ہوئی تھی، ان کی مماثلت محسوس کی (اس کا ذکر ترجمہ تالمود کی جلد نہم کے دیباچے میں کیا ہے)۔ اسی طرح یہ بے وجہ نہیں کہ [ہالینڈ کے] بڑے مستشرق، اسنوک ہورخروینے نے جب کبھی فقہاء کا ذکر کیا تو ان کو ”مسلمان رہیوں“ (de mohammedan nsche Rabbijnen) کے نام سے یاد کیا ہے جیسا کہ اس کے مجموعہ مقالات (Verspeide Gschriften) میں نظر آتا ہے۔

ان کی ذیلی تفصیلات میں پائی جانے والی مماثلتوں سے قطع نظر باہمی مماثلت کے عام نکات حسب ذیل ہیں:

(الف) تالمود اور فقہ دونوں کا دو ایسے احکام دہندہ مذہبی نظاموں سے سابقہ ہے جو بوقت واحد عبادت اور قانون دونوں پر حاوی ہیں اور جو امت متعلقہ کے لیے زندگی بسر کرنے کا ایک کچی طرز عمل مہیا کرتے ہیں۔

(ب) دونوں صورتوں میں اساس ایک ہی ہے، یعنی وحی الہی، دونوں کا پورا ڈھانچہ ایسے ماہران قانون کی کوششوں سے کھڑا ہوا ہے جن کے فرائض منصبی اور جن کا اس کام میں حصہ ہر دو مذہبوں میں مشابہ ہے۔ چنانچہ اسلام اور یہودیت کسی میں بھی نہ پجاری پائے جاتے ہیں نہ خالص دنیا دارانہ قانون ساز افسر، اور نہ ایسی عدالت ہائے بالا جن کے فیصلے (عدالت مرافعہ کی طرح ماتحت

۱۔ میں نے صرف تالمود یروشلم کا حوالہ دیا ہے جس کا ترجمہ ثواب نے گیارہ جلدوں (پاریس ۱۸۷۱ء و ما بعد) میں کیا ہے۔ گو یہ صحیح ہے کہ اس کی جلد اول میں تالمود بابل کی کتاب برکوت (Berkoth) شامل ہے۔

۲۔ جیسا کہ میرے رفیق کار پروفیسر برون شویگ (Brunschwig) نے مجھے توجہ دلائی، یہ امر اس بنا پر اور بھی حیرتناک ہے کہ اگر توریت اور قرآن کا سرسری مقابلہ کیا جائے تو مماثل مناظر نہیں ہوتا۔

عدالتوں کے لیے) واجب التعمیل ہوں۔

(ج) دونوں (تالمود اور فقہ) کے ماہران قانون کی روح عمل ایک ہی ہے یعنی موشگافی کا رجحان۔ اس سلسلے میں اگر اسلامیات کا معلم تالمود کی ورق گردانی کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک مانوس سرزمین میں پاتا ہے۔ وہ اسے نسکون و اطمینان کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اس کے برخلاف قانون

کسی کدو کاوش کے بغیر تالمود کی یہ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں: عورت کے نقائص میں (ج: ۸ ص: ۱۰۰) ”کھال پر مسہ چاہے بغیر بال کے ہو“ شامل کیا گیا ہے (فتح القریب میں جانوروں سے مقاربت کی حرمت) کا ذکر ہے، چاہے وہ مچھلی ہی کیوں نہ ہو۔“ یہ بھی وہی طرز استدلال (ہے)۔ ”اگر طلاق نامہ کسی بچے کے سپرد کیا جائے اور وہ اسے متعلقہ عورت کے حوالے کرنے سے قبل بالغ یا گونگا گویا، یا اندھا پیام رساں بیٹا یا مجنون عاقل ہو جائے یا کافر ایمان لے آئے تو بھی طلاق نامہ درست ہوگا، لیکن اگر طلاق نامہ کسی بھلے چنگے گویا شخص کے سپرد کیا گیا تھا جو گونگا بہرا ہو جائے اور پھر بعد میں گویائی بحال ہوئی ہو یا کسی بیٹا شخص کے سپرد کیا گیا تھا جو اندھا ہو گیا اور پھر بعد میں اس کی بینائی بحال ہوئی ہو، یا کسی عاقل کے سپرد کیا گیا جو مجنون ہو گیا پھر بعد میں اس کی عقل بحال ہوئی، تو ایسا طلاق نامہ درست رہتا ہے“ (ج: ۸ ص: ۲۷۲) تالمود کی یہ عبارت پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ ہو فقہ کی کوئی کتاب ہے۔ یہی حال عبارت ہائے ذیل کا ہے: ”اگر شوہر یہ کہے کہ اگر وہ موجودہ بیماری سے مر جائے تو اس کی بیوی کو طلاق ہے پھر اس بیمار کو کفن پہنا کر کسی بڑے پتھر کے نیچے رکھ [کر چکل] دیا جائے، یا اسے سانپ ڈس لے اور اس طرح اس کی موت واقع ہو تو طلاق نامہ بے اثر ہوگا کیونکہ موت اس پہلی [طلاق نامہ بھیجنے کے وقت] بیماری سے نہیں واقع ہوئی لیکن اگر وہ یہ کہے کہ وہ موجودہ بیماری سے چنگا نہ ہو تو طلاق کبھی جائے پھر اسے کفن پہنا کر کسی بڑے پتھر کے نیچے رکھ دیا جائے یا اسے سانپ ڈس لے اور وہ مر جائے تو طلاق نامہ درست ہے کیونکہ وہ اپنے بستر مرض سے چنگا ہو کر اٹھا ہی نہیں“ (ج: ۹ ص: ۵۲) ”اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی طرف سے جو اس کے گھر میں یا اپنے صحن میں تھی طلاق نامہ پھینکے تو طلاق مکمل ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ اس کے گھر یا اپنے صحن میں بیوی کی طرف طلاق نامہ پھینکے خواہ اس وقت وہ بیوی کے ساتھ ایک ہی بستر میں کیوں نہ ہو تو یہ مؤثر طلاق نہ ہوگی، البتہ اگر وہ طلاق نامہ بیوی کی انگلیا یا اس کی سوئی دھاگے کی پٹاری میں پھینک دے تو طلاق ہو جائے گی“ (ج: ۹ ص: ۵۸) اگر بیوی مکان کی چھت پر ہو اور شوہر وہاں طلاق نامہ پھینکے تو جوں ہی طلاق نامہ چھت

(☆)

رومایا قانون کلیسائی کا کوئی ماہر اسے پڑھتا ہے تو ناگواری اور پریشانی محسوس کرتا ہے۔

غرض دوسرے نظاموں کے برعکس ہمیں یہاں دو ایسے نظاموں میں ایک عمیق ذہنی مماثلت نظر آتی ہے جن میں سے ایک اسی طرح دوسرے پر اثر انداز ہو سکتا ہے جس طرح قانون رومایا قانون کلیسائی۔ اس کو رد کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ فقہ میں اسی روح کا بڑا اثر نظر آتا ہے جو تالمود میں جاری و ساری ہے اور جو ہمیں دوسرے نظام ہائے قانون میں نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ مادی اخذ و عاریت کے سلسلے میں لوگوں نے اس کا ثبوت پیش کیا ہے کہ تالمود نے فقہ پر اثرات ڈالے ہیں۔ ا۔

علاوہ برآں یہی وہ پہلو ہے جس کے زیر بحث اثر کا معین مسائل کے سلسلے میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ متووخ ۲ (Mittwoch) نے نماز کے متعلق، وین زنک ۳

(☆) کی فضا میں پہنچے گا، خواہ وہ چھت پر نہ پڑے تو طلاق ہو جائے گی۔ اگر شوہر اوپر ہو اور بیوی نیچے اور شوہر طلاق نامہ اوپر سے پھینکے تو جیسے ہی وہ چھت کے جیز سے جدا ہوگا طلاق واقع ہو جائیگی چاہے [نیچے پہنچنے سے قبل] وہ پانی سے دھل یا آگ سے جل ہی کیوں نہ جائے“ (ج: ۹ ص: ۶۳) اس طرح جلدوں کی جلدیں نقل کی جاسکتی ہیں مگر موجودہ مقالہ اسلامیات کے محصلوں سے متعلق ہے، اس لیے فقہ کی کتابوں سے اسکے مماثل مثالوں کی نقل غیر ضروری ہے۔

۱۔ میں قرآن کے بعد کے زمانے کے اثرات کا ذکر کر رہا ہوں، ممکن ہے قرآن میں بھی اس طرح کے کچھ نقوش ہوں، مثلاً فجر کے سلسلے میں حیض و حیض اسود (سفید اور سیاہ ڈوریوں) میں امتیاز کر سکنے کا مشہور مسئلہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے وہ ہمیں تالمود کی کتاب برکوت (Berakoth) (ج: ۱ ص: ۱۳) کی یاد دلاتا ہے جس میں لکھا ہے ”صبح صادق اس لمحے سے شمار کی جائے جبکہ نیلے کو سفید سے -- یا ربی الی عازر (Eliazer) کے مطابق نیلے کو سبز سے (جو کہ زیادہ دشوار ہے) -- امتیاز کیا جاسکے۔“

۲۔ برلین کا ڈیجی کی روکداد Sitzungsberichte Prtass Akid-d-Wissenschofen

۳۔ اور جرمن رسالہ ”دیر اسلام (Der Islam)“ بابت ۱۹۱۰ء میں [اول الذکر میں] (☆)

Wensinck نے طہارت کے متعلق بیاوبلوکسی (Bialoblocki) نے نکاح اور امور عائکہ (خاندان) کے متعلق، لامنس (Lammens) نے تصویروں کے متعلق اور وایدہ (Vajda) نے مختلف چیزوں کے متعلق اس مسئلے کے مطالعے میں حصہ لیا ہے۔

بے شبہ یہ بات ممکن ہوگی کہ اس تلاش کو مزید وسعت دیجائے، اس موضوع پر تالمود کے سرسری مطالعے میں ذیل کی چیزوں پر میری نظر پڑی ہے اور بے شبہ ان میں مزید اضافہ ہو سکے گا۔

(۱) اگر کوئی شخص راستہ چلتے روٹی وغیرہ غذا کے ٹکڑوں پر سے گزرے تو انہیں ایک طرف ہٹا دے اور روندنے سے بچائے (ج: ۲: ص: ۱۶۰) اس سے مسلمانوں

(☆) ص: ۱۰۱ تا ۱۰۲ پر ایک مختصر رسالہ ہے ”استنباء یا استنظار کے متعلق شرعی احکام کا ماخذ“ اس میں بتایا ہے کہ جب کھلے میدان یا صحرا میں استنجا کیا جائے تو قبلے کی طرف منہ اور پیٹھ نہ کی جائے۔ اس کے مماثل یہودیوں کو یروشلم کے متعلق یہ حکم ہے (کتاب برکوت ۶۱/الف) کہ بیٹھ جانے سے قبل ستر کا کپڑا نہ ہٹائے اور سیدھے ہاتھ سے استنجا کی ممانعت کے مماثل احکام برکوت (۶۲/ب) میں ہیں۔ استنجا کی جگہ ”عوذ باللہ“ یا ”النجث والنجائث“ پڑھنے کے بجائے برکوت (۶۰/ب) میں فرشتوں سے حفاظت کی درخواست کی تعلیم دی گئی ہے۔ آخر الذکر جلد میں ص ۲۸۶ تا ۲۹۲ پر لیشنسکی (Leszensky) کی جرمن کتاب ”ملک عرب میں یہودی“ مطبوعہ برلن ۱۹۰۳ء کی تنقید ہے اور ضمناً یہ دعویٰ کرویا گیا ہے کہ اسلام اصل میں یہودیت اور عیسائیت سے ماخوذ ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا ہے۔ مترجم

۱۔ Materien Zum islam ... Eherecht, etc. (یعنی ”اسلامی قانون وراثت وغیرہ..... کے متعلق مواد) نامی کتاب بہت فرسودہ اور سطحی ہے مجھے تو اس میں خود تالمود کے متعلق ایک غلطی نظر آئی۔ مزید برآں مولف مسلسل ان احکام کو ساری فقہ کی طرف منسوب کرتا چلا جاتا ہے جو محض کسی ایک مذہب فقہ کی خصوصیت ہیں۔

۲۔ رسالہ ژورنال آزیاتیک ستمبر-اکتوبر ۱۹۱۵ء (پاریس) Journal Asialique

۳۔ رسالہ ژورنال آزیاتیک (پاریس ۱۹۳۷ء ہورویٹس (J. Horowitz) (رسالہ دیر اسلام ۱۹۱۸ء) کے مطابق اسناد حدیث اصل میں یہودی چیز ہے مگر پھر وہی کہتا ہے (۴۷) کہ اس کا امکان ہے کہ اس کے برعکس اسلام ہی کا [اس بارے میں] یہودیت پر اثر پڑا ہو (رسالہ مذکور ص ۳۹ تا ۴۷) اس جرمن مقالے کا عنوان ہے ”اسناد روایت کی قدامت اور اصلیت“ مترجم۔

کی عادت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ا۔

(۲) ”یوم کفارہ (Kippour) کا روزہ رکھنے پر بچوں کو مجبور نہ کیا جائے، بلکہ روزے

کے وجوب کی عمر کو پہنچنے سے ایک یا دو برس پہلے سے رفتہ رفتہ اس کو عادی بنایا جائے، تاکہ وہ مذہبی احکام کی تعمیل کے عادی ہو سکیں۔ (ج ۵ ص: ۲۵۰)۔ اس سے نہ صرف روزہ رکھانے میں مسلمانوں کی عادت یاد آتی ہے، بلکہ نماز کا عادی بنانے کے متعلق [آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے] صریح احکام بھی۔

(۳) تالمود (ج ۵ ص ۱۲۱) اور دیگر مقامات میں نیم آزاد غلام کا ذکر ملتا ہے۔ یہ خصوصیت فقہ اور تالمود میں مشترک ہے۔

(۴) تالمود (ج ۹ ص ۵۴ و مابعد) میں طلاق بالمعاوضہ کا ذکر ہے، جو خلع کی یاد دلاتا ہے۔

(۵) جو چیزیں پڑی ہوئی پائی جائیں (لقطہ) ان کے متعلق تالمود (ج ۱۰ ص ۸۵ و مابعد) کا نظریہ اسلامی قانون کے نظریے سے متعدد مماثلتیں رکھتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ہر جانہ اور ضامن (ج ۱۰ ص ۱۰ و مابعد) میں بھی ایسا ہی ہے۔

(۶) قاضی اور گواہ بننے کی صلاحیت ان لوگوں سے سلب ہو جاتی ہے (ج ۱ ص ۲۵۵) جو رد کھیلتے ہیں، جو سود پر قرض دیتے ہیں اور جو شرط بد کر کبوتروں کو اڑاتے ہیں، اس طرح کی ممانعتوں کی فہرست فقہ میں بھی ملتی ہے۔ ۲۔

مگر ہمیں یہ بات چھپانی نہیں چاہیے کہ ان مماثلتوں کی فہرست میں گو کہ مزید اضافہ ہو سکتا ہے پھر بھی حقیر و قلیل ہی رہتی ہے اور اس کی توقع نہ رکھنی چاہیے کہ آئندہ کوئی سنسنی خیز دریافت عمل میں آ سکے گی کیونکہ دونوں طرف کی معلومات اچھی طرح

۱۔ عملدرآمد و رواج کے سلسلے میں اس کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے کہ (تالمود ج ۱۰ ص ۹۹) استاد کی عزت باپ سے زیادہ کرنی چاہیے۔

۲۔ اسی طرح عورت کے نفقے کے سلسلے میں اس کے حقوق کی فہرست (تالمود ج ۸ ص ۸۰) سے اس اسلامی فقہ کے احکام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے، رشتہ داریوں کی چند فہرستیں (مثلاً ج ۷ ص ۱) بالکل اسی طرح دی گئی ہیں جیسی فقہ میں ہیں۔

معلوم ہیں اور اس سلسلے میں دوبارہ وہ بات دہرائی جاسکتی ہے جو ہم نے اوپر قانون روما کے سلسلے میں بیان کی ہے کہ اتفاقات اور صورت حال کی معروضی یکسانیت کا بھی اس میں حصہ ہوگا کہ یہ مثالیں پیدا ہوں اور اسی تناسب سے اخذ و عاریت کی تعداد گھٹ جائے۔ یہ وہ پہلی، خالص اور منفی وجہ ہے جس کے باعث یہ خیال رد کر دینا پڑتا ہے کہ فقہ اصل میں تالمود ہی ہے ا۔ ایک دوسری اثباتی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں مجموعہ ہائے احکام میں نہایت عمیق اختلافات پائے جاتے ہیں جس کی بنا پر یہ کسی طرح نہیں خیال کیا جاسکتا کہ جو چیز زمانے میں موخر ہے وہ خواہ مخواہ قدیم چیز کی نقل ہی ہے۔ یہ اختلاف تین قسم کے ہیں، جن کی چند مثالیں دینے پر ہم اکتفا کریں گے۔

(۱) ادارات کی تشکیل پذیری

(۲) خود نفس ادارات

(۳) ان ادارات کا طریقہ اظہار

(۱) اگرچہ ان دونوں (یہودی اور اسلامی قانون کی) صورتوں میں وہ حصہ جو ماہران قانون (ریوں اور فقیہوں) نے لیا ہے، اساسی اہمیت رکھتا ہے پھر بھی اس تشکیل کا نظریہ باہم مختلف ہے۔ چنانچہ یہودیوں کے ہاں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اصول فقہ کی یاد دلائے اور ایسی کوئی چیز تو قطعاً نہیں ہے جو احکام میں حدیث جیسا قابل لحاظ حصہ لینے والے امر کے مماثل ہو۔ مسلمان فقہ کے چار ماخذ قرار دیتے ہیں اور یہودی صرف دو تسلیم کرتے ہیں: ایک کتاب مقدس، دوسرے فقہاء کا اجتہاد اور یہ دونوں ماخذ ہائے قانون یہودیوں کے ہاں کسی نظریے کا موضوع نہیں بنے، یہ چیز اسلامی قانون ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے اگر اصول فقہ کا وجود کوئی فضیلت و برتری ۲ ہے تو فقہ کی ایک

۱۔ یہ عمانویل وانج E. Deutsch کی رائے کا خلاصہ ہے، جو ہیوز (Hughes) کی ڈکشنری آف اسلام میں مقالہ تالمود کے تحت نقل ہوئی ہے۔

۲۔ [توانین و احکام تو دنیا کی ہر قوم میں ملتے ہیں لیکن ان سے الگ محض نفس قانون یا علم قانون پر مسلمانوں سے پہلے دنیا کی کسی قوم نے توجہ نہیں کی، نہ یونانیوں نے، نہ رومیوں نے، نہ چینیوں نے، نہ مصریوں نے، نہ بابلیوں نے، نہ ہندوؤں نے۔ مترجم]

اور برتری یہ ہے کہ اس کی تشکیل حیرت انگیز تیزی سے عمل میں آئی۔ میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ وہ درحقیقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ڈیڑھ یا زیادہ سے زیادہ دو صدی کے عرصے میں تقریباً مکمل طور پر مرتب ہو گئی، جبکہ تالمود کو مکمل ہونے میں بیت المقدس کی تباہی کے بعد تقریباً چار سو برس لگے اور اس کا ابتدائی تحریری آغاز تو اس سے بھی کئی صدی قبل ہو چکا تھا۔

(۲) ان واقعات کے جواب میں یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ فقہ نے تالمود سے اخذ کیا ہوگا کیونکہ تالمود سے مخصوص اداروں میں سے کوئی بھی فقہ میں نہیں پایا جاتا۔ مسلمان اس پر مجبور تھے کہ اپنے سارے ادارے خود ہی وضع کریں اور اگر کہیں فقہ میں کسی قدیم نظام ہائے قانون سے کوئی حقیر اخذ و عاریت نظر آتی ہے تو یہ اخذ و عاریت ایسی ہے جو ان اداروں کو ان کے ماضی کی مخصوص ہیئت کبھی عطا نہیں کرتی۔

مثال کے طور پر یہودی عبادات میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی جو اسلام نے نقل کی ہو۔ صوم رمضان اور یوم کفارہ (Kippour) کے یہودی روزے میں نمایاں اختلافات ہیں اور ان دونوں میں ذرا بھی مماثلت نہیں۔ میدان قانون یعنی معاملات کا بھی یہی حال ہے۔ نظام وراثت دونوں میں کلیۃً مختلف ہے۔ ادارہ نکاح میں ان دونوں کی مشابہت اس سے زیادہ نہیں جو کسی دوسرے نظام قانون سے ملتی ہے۔ بیوہ بھاج سے دیور کا جبری نکاح کرنا Levirath اور Halitza یعنی دیور کے انکار پر بیوہ کا جوتا نکالنا تالمود کا مخصوص ادارہ ہے جو اسلامی قانون میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ یہودیوں کے ہاں طلاق نامے کا جو نظریہ ہے وہ مسلمانوں کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا اور اس بارہ میں مسلمانوں کا نظام طلاق ذرا بھی تالمود کا مرہون منت نہیں، وہ عربی خالص اسلامی اور

۱۔ اسی طرح فقہ میں ایسی کوئی چیز نہیں جو نذر خدا (Oblation) اور کاہن یعنی پجاری سے مشابہ ہو اور جن سے تالمود وغیرہ میں ہر گھڑی سابقہ ہے۔

۲۔ توریت کی کتاب تثنیہ باب ۲۶ آیات ۱۰ تا ۱۵ کی طرف اشارہ ہے کہ اگر دیور اپنی بیوہ بھاج کے ساتھ نکاح سے انکار کرے تو بیوہ جوتا اتارے اور اپنی اس بے حرمتی پر دیور کے منہ پر تھو کے۔ (مترجم)

اپنی آپ نظیر (Suis generis) ادارہ ہے اور اس ادارے میں اسلام خلوت صحیحہ کو قانونی اہمیت دیتا ہے، یہودیوں کے ہاں ایسی کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح جرم زنا کا ذکر (جو بوقت واحد قانونِ عالمہ، قانونِ حدود و تعزیرات اور اخلاق سب ہی سے تعلق رکھتا ہے) جس شدت و کثرت سے مسلمان فقہاء کرتے ہیں، تالمودیوں کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا، اس بحث کو اور بھی طول دیا جاسکتا ہے مگر اسکی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اس طرح اسلام اور یہودیت میں مختلف مولفوں کی نمایاں کردہ اخذ و عاریتیں نہ صرف تعداد میں قلیل ہیں بلکہ یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ ان (دونوں کے) اداروں میں مماثلت پائی ہی نہیں جاتی۔

(۳) ایک تیسرا اختلاف جو ظاہری ہیئت کا ہے جو اس کا ثبوت ہے کہ تالمود کا اثر فقہ پر بس دور ہی سے پڑا ہوگا، چنانچہ دونوں کے مجموعہ ہائے احکام جس طریقہ پر پیش کیے گئے ہیں، ان میں یکسانیت نہیں ہے اور اس بارے میں بھی فضیلت اس کو حاصل ہے جو تیز تر مرتب ہوا۔ (یعنی فقہ)۔

یقیناً مجھے اس بے ترتیبی کی شکایت ہے جو فقہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہے پھر بھی اگر کوئی فقہ کے دور آغاز کی کتابوں مثلاً المدونہ یا کتاب الاما کو تالمود سے مقابلہ کرے تو ان کی وضاحت بیان اور خوبی ترتیب پر تعجب ہوگا اور دونوں کا فرق آنکھوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ فقہ کی بے ترتیب سے بے ترتیب کتاب بھی اس بارے میں تالمود سے بہتر ہی ہوگی۔

پروفیسر برون شوینگ (Brunschwing) نے بہت صحیح میری توجہ منعطف کرائی کہ اس فرق کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ تالمود میں بحث و استدلال کے مختلف مدارج بیان ہوتے ہیں اور فقہ میں حکم یا احکام، بلکہ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اگرچہ دونوں مجموعہ ہائے احکام میں قانون، اخلاق اور مذہب گڈمڈ ہیں، جن کے باعث ان میں مشابہت نظر آتی ہے، لیکن یہودی مجموعے میں ہگادہ (Haggada) بھی شامل ہے جس سے مراد زبان زد قصے (Folklore) روایات، متفرق مشاہدات و ملاحظات، اور چھوٹی کہانیوں کا مجموعہ ہے

۱۔ امام ابو یوسف کی کتاب الخراج اس سے مستثنیٰ ہے۔ امام مالک کی موطا بھی خالص حد تک اچھی ترتیب کی حامل ہے۔

جن کا براے نام بھی کتب فقہ میں ذکر نہیں ملتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں نظاموں میں سے ایک کو دوسرے کی محض توسیع نہیں خیال کیا جاسکتا، نیز جدید یورپی نقطہ نظر سے ایک اختلاف کی بنا پر ضمناً جدید تر (اسلامی نظام) کی قدیم تر (یہودی نظام) پر فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

(۷)

اب اس بحث کے نتیجے پیش کیے جاتے ہیں:

جہاں تک رومی، کلیسائی اور پارسی قانونوں کے اثرات کا تعلق ہے، بہت آسان بات ہے۔ میرے نزدیک اصولاً اگر یہ مجموعہ ہائے احکام قطعاً موجود نہ بھی ہوتے تو بھی مادی طور پر فقہ وہی رہتی جو آج ہے۔

لیکن تالمود کے متعلق بھی یہی رائے قرار دینا اتنا آسان نہیں ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے لائسنس کی رائے کو صحیح قرار دینے پر مائل ہونا پڑتا ہے، مثلاً جب وہ مدینے کے یہودیوں کے متعلق کہتا ہے ۲۔ کہ: ”ہم خیال کرتے ہیں کہ ان بد نصیبوں کا ایک قابل لحاظ حصہ مسلمانوں کی صف میں چلا گیا اور ان مرتدوں (کذا) اور ان کی اولاد نے اسلامی قانون کی تشکیل میں حصہ لیا جس میں تالمود سے استفادہ (Inspiration) ناقابل انکار نظر آتا ہے ۳۔ پھر بھی جب اس کو متعین طور پر بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس

۱۔ بلا کسی کد و کاوش کے جمع کی ہوئی چند مثالیں یہ ہیں: (ج ۵ ص ۲۵۳) دیوانے کتے کی علامتیں (ج ۷ ص ۱۷۴) ایک ربی کا لطیفہ جو خواجہ فروش کا بھیس بدل کر اپنے ایک محبوس رفیق سے ملے جاتا ہے (ج ۵ ص ۲۷۶) ایک اغوا شدہ عورت کا اچھا جواب (ج ۱۱ ص ۱۸۳) شہر روم کی تعمیر کا نہایت افسانہ خیز تذکرہ، وغیرہ۔ جہاں تک تالمود کے اسلوب کی بے ترتیبی کا تعلق ہے، خود اس کا ترجمہ اپنے دیباچوں میں لکھتا ہے کہ اس کے ابواب میں منطقی تسلسل بالکل نہیں پایا جاتا۔ اس لیے اسکی مثالیں دینے میں کوئی فائدہ نہیں۔ خود ہشنا (یعنی یہودی فقہاء کی شرح) میں تو حد سے زیادہ بے ترتیبی ہے مثلاً ج ۸ ص ۲۸۲ کتاب الطلاق کے بعد یک بیک اس قرض کا ذکر آتا ہے جو کسی کا ہن یا کسی لیوی (غریبی عہدیداروں) کو دیا جائے۔

۲۔ لائسنس Lammens کا مضمون پارلیس کے ژورنال آزیا تک ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۵ء ص ۲۷۵ تا ۲۷۶۔

۳۔ یہ ادعا خلاف حقیقت ہے، نو مسلم یہودیوں کی تعداد خاص کر مدینہ میں بہت ہی کم ہے (۶۶)

میں ناکامی ہوتی ہے اور عام تاثرات کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا، کیونکہ نہ صرف اس کی تاریخی شہادتیں مفقود ہیں کہ یہودی اثرات اس طرح سرایت کر سکے ہوں بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، خود مادی حصہ یعنی مماثلات کی معین صورتیں بھی قلیل بلکہ اقل قلیل ہیں۔ میرے خیال میں یہ معنہ لانیئل ہی رہتا ہے اور ہم دو متبادل صورتوں میں سے کبھی ایک کی اور کبھی دوسری کی طرف بے نتیجہ طور پر مائل ہوتے رہتے ہیں، ان میں سے ایک کو گونے کی نظم ”پرومیٹیا (Promothea) کی یہ بیت خوب واضح کرتی ہے۔

Hast due nicht alles selbst vollendet

کیا تو نے ہی یہ سب کچھ انجام نہیں دیا

Du heilig gluhend Heraz?

اے پیارے دل رعنا؟

[یعنی مسلمانوں نے سب کچھ تنہا خود ہی انجام دیا۔ مترجم] یہ تصور عمرانیاتی نقطہ نظر سے کچھ زیادہ صحیح نہیں ہو سکتا، گو یہ حقیقت ہے کہ اس کے خلاف بھی ہمارے پاس کوئی براہ راست شہادت موجود نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ گونے کے ”فاوسٹ“ ا کے برخلاف، فقہ اس پر اکتفا نہیں کرتی کہ تالمود ہی کی کبھی ہوئی بات کو ذرا الفاظ بدل کر دہرا دے۔ nur mit ein Bischen undern Worten جن میں فرق اس سے زیادہ نہیں جتنا -- (فاوسٹ کی ہیروئین) مارگریٹ خفانہ ہو۔ مارگریٹ کے عاشق اور اس کی نصیحت کرنے والے پادری کے الفاظ میں!

غرض میں عجب گونگو کی حالت میں ہوں اور بعض وقت اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بڑی حد تک ٹھیک نہ ہوگا کہ فقہ کو ایک ایسی چیز سمجھا جائے جو خالص اسلامی الاصل اور مسلمانوں کی ساختہ پرداخت ہو جسے اس کے اولین مفکرین نے قرآن اور پرانے عرب ادارات (رواجات) ۲ کو چھوڑ کر بغیر (یا تقریباً بغیر) کسی بیرونی مادی امداد

(☆) اور پھر عبداللہ بن کعب الاحبار وغیرہ کا اثر تفسیر میں ہے نہ کہ فقہ میں۔ دلی تمنا کو تاریخی واقعہ قرار دیدینے سے حقائق بدل نہ جائیں گے۔

۱۔ [گونے کی مشہور نظم جس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے، اس میں فاوسٹ اپنی روح جوانی اور مسرت کے حصول کے معاوضے میں شیطان کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ مترجم]

۲۔ اس بارے میں مبینہ بہت ہی اہم ملاحظیات پیش کیے ہیں دیکھو اس کا مضمون کتاب Racille di di scritti میں [ترجمہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۵۳ء مجھے تو نظر آتا ہے کہ ہم دونوں کے مطالعات ایک دوسرے کی اچھی خاصی تکمیل کرتے ہیں۔

کے خود وضع کیا ہو؟ اس نقطہ نظر سے وہ اسلام کا ایک نچوڑ اور ایک شاہکار ہوگا اور اس کی تخلیق اپنی آپ نظیر اور بڑی غیر معمولی چیز ہوگی۔

میرے ان جملوں سے وہ جذبہ منسوب نہ کیا جانا چاہیے جس کے تحت ہر متخصص اپنے ہی مطالعات کی اہمیت اور دلچسپی کے بارے میں مبالغہ آرائی کرتا ہے۔ وہ جذبہ یہاں بالکل نہیں ہے۔ اولاً میں نے ان کا ذکر بہت ہی غیر متیقن طور پر محض ایک محتمل چیز کی حیثیت سے کیا ہے اے، دوسرے میرا تخصص فقہ میں بہت ہی معمولی اور دوسری چیزوں سے بہت کم ہے اور آخری یہ کہ میں اس کا قائل ہوں کہ (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) اسلام کی تکمیل میں یہودیت کا بہت بڑا اثر رہا ہے اور یہ حیثیت مجموعی مجھے یہ بداہتہ نظر آتا ہے کہ ترقی یافتہ یہودیت اور ترقی یافتہ اسلام میں جو باہمی مشابہتیں ہیں وہ ہر نقطہ نظر سے ان سے زیادہ حیرت ناک ہیں جتنی [اسلام اور] عیسائیت میں ہیں۔ بعض نقطہ ہائے نظر سے تو یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ اسلام سے مراد وہ یہودیت ہے جس میں عالمگیری رجحان ہو۔

لیکن جو کچھ بھی کہا گیا، اس سے قطع نظر، اور اگر عربوں اور یہودیوں کی نسلی مماثلت سے استدلال نہ کیا جائے، میں خود عمرانیات میں نسل کے حیاتیاتی اثر کا قائل نہیں، یا بہت کم قائل ہوں۔ حاصل بحث یہ ہے کہ ڈیڑھ صدی سے کچھ ہی مدت میں مسلمانوں نے قرآن اور ماقبل اسلامی ادارات سے، کم و بیش تنہا ایک اثر انداز مجموعہ قوانین مرتب کر لیا، ممکن ہے کہ تالمود کا اثر اس کی روح پر ہوا ہو لیکن فقہانے جو کچھ انجام دیا وہ اپنی امتیازی خصوصیتیں رکھتا ہے اور یہ حیثیت مجموعی میری نظر میں ان کی محنت کا ثمرہ یہودی ماہرین قانون سے کہیں برتر نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس طرح فقہ کو اسلام کی ایک ایسی تخلیق قرار دینا چاہیے جو تقریباً اسی کی ساختہ پرداختہ ہے۔

(معارف اعظم گڑھ - مارچ ۱۹۵۸ء و اپریل ۱۹۵۸ء)

۱۔ یہ محسوس ہوگا کہ دلیل ائی یا اولیاتی نقطہ نظر سے a priori تو میری یہ خواہش تھی کہ فقہ اور تالمود میں اس سے بہت زیادہ قریبی رشتہ ثابت کر سکوں مگر یہ واقعہ کہ مجھے اس میں مایوسی ہوئی، شاید میری بیان کردہ باتوں کی قدر و قیمت کا ایک ثبوت ہو۔

۲۔ [مولف نے اس یقین کے وجہ نہیں بیان کیے ہیں، شاید ڈارے کی انگریزی کتاب "اسلام کی یہودی اساس" (Torrey, Jewish Foundation of Islam) کی طرف اشارہ ہو جس میں بڑی مضحکہ خیز لہجہ میں یہودی کی گئی ہیں۔ مترجم]

اسلام اور علم ہیئت کے نئے مسائل

جون ۱۹۶۷ء میں رصد گاہ پاریس کے قیام پر تین صدیاں گزریں، اس تقریب میں وہاں ایک نمائش ہوئی۔ اس علم سے اپنی ناواقفیت کے باوجود اس کی روز افزوں اہمیت مجھے وہاں کشاں کشاں لے گئی۔

نمائش میں پرانا سامان بھی تھا اور جدید ترین آلات بھی مثلاً چاند ہی نہیں دیگر ستاروں کی سطح کے کس طرح فوٹو لیے جاتے اور ان کی مٹی کی تحلیل کی جاتی ہے (ان کی روشنی کے رنگ کی مدد سے) اور وہاں کے پہاڑ اور غارناپے اور گئے جاتے ہیں۔

نمائش میں ایک عربی اصطراب (جس پر کوئی خط کی عبارت سے گمان ہوتا ہے کہ اندلس سے آیا ہوگا) اور علم ہیئت کا ایک فارسی مخطوطہ بھی رکھے گئے تھے۔ جہالت تو نہ ہوگی، تعصب ہی ہوگا کہ اور چیزوں کے برخلاف ان دونوں پر توضیحی چٹیاں نہ تھیں، مگر بہر حال فرنگی سامان کو چھوڑ کر اگر کسی اچھی چیز نے وہاں جگہ پائی تو وہ اسلامی چیزیں ہی تھیں۔

مجھے معلوم نہیں سب سے پہلی اسلامی رصد گاہ کب اور کہاں کھلی تھی۔ کہتے ہیں کہ ابن رشد نے اندلس میں دور بین کے بغیر ہی سورج میں دھبوں کا پایا جانا معلوم کیا تھا۔ بیسیوں ستاروں کے نام آج بھی فرنگی زبانوں میں عربی ہی میں ہیں۔ برطانیہ سے رصد گاہ گرینچ کا ملاحوں کے لیے جو سالنامہ شائع ہوتا ہے اس کا آدھا نام آج بھی عربی میں ہوتا ہے: ٹائیکل المناک (المناخ عربی لفظ ہے) اس کا ایک نسخہ اتفاق سے میز پر

ہے اور اس میں دوران سال میں مشہور و ممتاز ستاروں کے نظر آنے کا زمانہ اور آسمان پر مقام ایک جدول میں درج ہیں۔ اس فہرست کے ستاروں ناموں میں سے سینتالیس عربی میں ہیں۔ مثلاً Achernar (آخر النہر) Aldebaran (الذیران) Alphard (الفرد) Alphecca (الفکہ) Altair (الطیر) Betelgeuse (ابط الجوزاء) Diphda (ضفدع) Famalhaut (فم الحوت) Markab (مرکب) Minkar (منقار) Suhail (سہیل) Vega (نر واقع)۔ ایسی ایک مکمل تر فہرست میں نے ابن قتیہ کی کتاب الانواء کے ضمیمے میں شائع کی ہے۔ اور ہمارے اجداد نے اس طرح آسمان پر اپنے کام سے اپنے امٹ نام لکھ دئے تھے اور اب؟ اب چاند کی بلدیہ اپنے ہاں کی گلیوں کے نام تجویز کر رہی ہے لیکن ہیئت دانوں کی بستی میں ہمارا کوئی ہم مذہب گویا بستا ہی نہیں ہے۔

غالباً وہی چار سال میں آدمی چاند پر چڑھ جائے گا۔ ممکن ہے امریکی ہو یا روسی یا کوئی اور فرنگی ممکن ہے کچھ عرصہ بعد سیاحوں میں کوئی مسلمان بھی آجائے۔ چاہے وہ اسلامی مملکتوں میں سے کسی کا باشندہ نہ ہو بلکہ روسی یا امریکی رعیت ہو۔ ہمارے بنییت دانوں اور طیارہ سازوں کو اس میں حصہ لینے کی نوبت نہ بھی آئے تو ہمارے فقہاء کو ایک سوال کا جواب جلد دینا ہوگا۔ چاند پر نماز کس قبلے کی طرف رخ کر کے پڑھی جائے؟ زمین کا قبلہ تو میری دانست میں وہاں کام نہیں دے سکتا اَیْنَمَا تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ: (جدر بھی مڑو ادھر خدا کا چہرہ موجود ہے) اپنی جگہ صحیح ہے لیکن توحید کے حامل مذہب میں چاند والوں کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مرکز یا قبلہ قرار دینا پڑے گا۔ اس سوال کا جواب بعد میں بعید تر ستاروں میں پہنچیں بھی تو کام دے سکے گا۔ دو ایک سوال ہوئے، جامعہ استنبول کے طلبہ نے دریافت کیا تو میں نے عرض کیا تھا کہ چاند کے ہر ماہ روشن ہونے والے حصے کے وسط میں ایک کعبہ قمری قرار دینا، پھر اسے وہاں بنانا مناسب ہوگا۔ یہ کعبہ کم از کم کعبہ ارضی کے محاذی تو ہو جائے گا۔

ہوائی مسافروں کا وقت نماز و افطار :

ایک اور عملی مسئلہ اب ہر روز پیش آرہا ہے، زمین کے گول ہونے کے باعث آفتاب کے طلوع و غروب کا وقت ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا، استوا پر جہاں محیط ارضی سب سے زیادہ طویل ہے۔ ہر ہزار میل پر ایک گھنٹے کا فرق ہو جاتا ہے۔ اس کے آگے قطب کی طرف جتنا بڑھیں گے، وقت کا اتنا فرق اس سے بھی کم تر مسافت پر ہونے لگتا ہے۔ کلکتہ اور لندن میں طلوع یا غروب آفتاب میں کوئی ساڑھے پانچ گھنٹے کا فرق ہے۔ ہوائی جہازوں کی تیز رفتاری کا اب یہ عالم ہے کہ یہ مسافت سات آٹھ گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے اور موجودہ زیر تعمیر طیارے آجائیں تو شاید تین چار گھنٹے ہی کافی ہو جائیں گے (پیئرس سے استنبول کو ایک گھنٹہ کافی ہونا بتایا جا رہا ہے) اس کا نتیجہ؟ فرض کیجیے کہ لندن سے سحری کر کے صبح کے سات بجے اڑیں اور سات گھنٹوں کی پرواز کے بعد لندن کے ۱۲ بجے لیکن کلکتہ کے ساڑھے انیس بجے (شام کے ساڑھے سات بجے) کلکتہ میں اتریں تو افطار کس وقت پر کیا جائے؟ لندن کے حساب سے یا کلکتہ کے حساب سے؟ اس پرواز میں غالباً سورج راستے میں طیارہ والوں کو ڈوبتا ہوا نظر آچکا ہوگا، فرض کیجیے کہ آفتاب چھ بجے ڈوبا۔ جب کہ لندن میں مسافر نے مشکل سے پانچ گھنٹے اساک کیا ہے۔ تو یہ روزہ بہت مختصر ہوگا، (کلکتہ پہنچنے کے بعد دوسرے دن یہاں بحث نہیں اور نہ یہ ٹالنے والا جواب کافی ہے کہ سفر میں روزہ معاف ہے) اس کے برعکس کلکتہ سے لندن جانے کے لیے صبح سات بجے اڑیں اور سات گھنٹوں کی پرواز کے بعد لندن پہنچیں تو کلکتہ میں تو ۱۴ بجیں گے لیکن لندن میں صبح کے ساڑھے آٹھ ہی بجے ہوں گے۔ اور اگر اس دن لندن میں موسم بہار کے باعث آفتاب شام کے چھ بجے ڈوبتا ہو تو مزید ساڑھے نو گھنٹے انتظار کرنا ہوگا، اور سحری اگر صبح چار بجے کی تھی تو پرواز شروع ہونے تک کے تین گھنٹے، پرواز کے سات گھنٹے اور افطار تک کے مزید ساڑھے نو گھنٹے (۳+۷+۹/۴، جملہ ۱۹/۲ گھنٹے کا روزہ ہوگا، جو بہت زیادہ ہے۔ یہ تو آج کل پیش آرہا ہے اور وہ دن قریب ہے کہ کلکتہ سے صبح کے سات بجے اڑیں تو چھ گھنٹے کی

پرواز کے بعد جس مغربی ملک میں پہنچیں گے وہاں بھی صبح ہی کے ساتھ ہی ہوں گے، (بات یہ ہے کہ محیط ارضی چوبیس ہزار میل ہے) اس لیے خط استوا پر فی گھنٹہ ہزار میل کی مسافت سے پرواز کریں تو زمین کی گردش محوری کی رفتار اور ہماری رفتار پرواز یکساں ہونے سے مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے کے لیے سورج اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا۔ کلکتہ اور لندن خط استوا سے دور ہیں اس لیے اس سے بھی سست تر رفتار طیارہ سے وہی نتیجہ نکلتا ہے اور اگر طیارے کی رفتار زمین کی اپنی رفتار سے تیز تر ہو جائے، جیسا کہ فوجی طیاروں میں اب ہو بھی چلا ہے۔ تو مسافر کو راستے میں آفتاب ”مشرق“ میں ڈوبتا نظر آئے گا۔ اور مثلاً کلکتہ سے صبح کے ساتھ ہی نکلیں تو سات گھنٹوں کی پرواز کے باوجود مغربی منزل مقصود میں قبل از وقت پہنچیں گے، یعنی صبح کے مثلاً چار بجے ہوں گے اور آفتاب ابھی نکلا ہی نہ ہوگا، اور اگر مغرب سے مشرق کو جائیں تو آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا مشاہدے میں آئے گا۔ جس کا احادیث میں ذکر ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین، اللہ ہی سب سے بہتر خالق ہے، بابرکت وہی ہے۔ بچارہ انسان تو ناجیز ہی رہے گا۔

گذشتہ سال ایک صاحب رمضان میں شاید ڈھاکہ سے جینوا آئے تھے، انہیں ایسا ہی ”حادثہ“ پیش آیا۔ ان کی فتویٰ طلبی پر کیا جواب دیں؟ منزل روانگی کے وقت کے حساب سے وہ افطار کریں یا منزل ورود کے؟ اسی طرح سیلون سے روس کو، ارجنٹائن سے کنیڈا کو پرواز کریں تو وقت کا اتنا کثیر فرق ہوتا ہے کہ آدمی دم بخود ہو جاتا ہے۔ غالباً معقول جواب یہی سمجھا جائے گا کہ دوران پرواز میں منزل روانگی کا وقت ہی نماز اور روزہ کے لیے ملحوظ رکھا جائے، مقامی وقت نہیں، یعنی نہ دوران پرواز کے جگہ جگہ بدلنے والے وقت کا، نہ منزل ورود کا، اگر ایسا نہ کریں تو اسپونٹیک کے مسافر کو جو زمین کے گرد گھومتا ہے روزانہ آٹھ آٹھ مرتبہ سورج کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور تین گھنٹے میں اس کے لیے چوبیس گھنٹوں کی نمازیں اور روزہ رکھنا معقول نہیں ہو سکے گا۔

ہجری عیسوی تقابلی جنتریاں :

جہاں ان حال و مستقبل کی چیزوں پر توجہ کی ضرورت ہے وہیں ماضی کے تحقیقات کی نظر ثانی و تصحیح کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہنا چاہیے، تاکہ اگر کوئی انسانی غلطی ہوئی تھی تو وہ برقرار نہ رہے بلکہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ العصمتہ للہ، غلطی سے مبرا تو صرف خدا کی ذات ہے مثلاً ان دنوں میں ہجری سنہ کی مطابق تاریخیں عیسوی سنہ میں معلوم کرنے کے مسئلے پر کام کر رہا ہوں، یورپ میں کم از کم ساڑھے تین برسوں سے اس کام کے لیے تقابلی جنتریاں بنائی جانی شروع ہوئی ہیں۔ گزشتہ چودہ سو برس سے، جب سے کہ ہجری سنہ شروع ہوا ہے، محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان اور ذیقعدہ ہمیشہ اور ہر سال تیسے ہوتے ہیں، ذی حجہ کے سوا باقی دوسرے مہینے اٹیسے، اور صرف ذی حجہ بعض قواعد کے تحت کبھی تیسرا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ فرنگی ”تحقیق“ (جس میں اور تو اور خود رمضان بھی ہمیشہ تیسرا ہوتا ہے) میں نے انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اسپینی، اطالوی، رومانوی اور روسی (اور ان کے ترجموں) میں پڑھی ہے اس طرح کا ایک ترجمہ اردو میں ایک پرانے رفیق پروفیسر خالدیؒ نے انجمن ترقی اردو کے لیے شائع کیا تھا، وہ اس وقت یہاں نہیں ہے کہ تحقیق کر سکوں، مگر خوف ہے کہ انہوں نے بھی وہی کیا ہوگا جیسا کہ ایک ترکی ”فاضل“ نے کیا ہے۔

اس پر روئیں یا نہیں؟ ان مغربی محققوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بعض وقت مسلسل تین تین مہینے تیسے، یا تین تین مہینے اٹیسے بھی ہوتے ہیں اور یہ علم ہیئت کے مسلمات میں سے ہے اور مشاہدہ بھی، رصد گاہ استانبول کے رکارڈ میں لکھا ہے کہ ابھی چند سال قبل ترکی میں ایک مرتبہ مسلسل چار مہینے تیسے ہوئے۔

بہر حال مذکورہ تقابلی جنتریوں کی غلط نویسی کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کسی پرانی اسلامی کتاب میں کسی واقعے کی تاریخ دن کی صراحت کے ساتھ ہو اور ان فرنگی ملاؤں کی

۱۔ تقویم ہجری و عیسوی - مرتبہ ابو النصر محمد خالدی ایم اے (عثمانیہ) دہلی ۱۳۱۹ھ کراچی ۱۹۵۲ء۔
(مرتب)

جنتری میں وہ دن مذکورہ نہ ہو تو اسلامی مورخ غلط بیان یا کم از کم سہل انگار قرار پاتا ہے جنتری غلط نہیں سمجھی جاتی (مثلاً میرے سامنے اس وقت کا تنویر کی ایک ایسی فرانسیسی تقابلی جنتری ہے جتہ الوداع ۱۰ھ میں جمعہ کے دن ہوا تھا، لیکن یہ جنتری کہتی ہے کہ اس سال جمعہ کے دن ذی حجہ کی آٹھویں تھی، یا یہ کہ امام حسینؑ کی شہادت ۱۰ محرم ۶۱ھ کو جمعہ کے دن ہوئی۔ لیکن یہ جنتری اسے جمعہ نہیں بدھ قرار دیتی ہے۔

کیا یہ ضرورت نہیں کہ مسلمان ہیئت دان ایسی تقابلی جنتری خود بنائیں اور صحیح تر بنائیں؟

اسی مذکورہ علمی کام کے سلسلے میں محمود پاشا فلکی کی شہرہ آفاق کتاب ”نتائج الافہام“ اور اس کی فرانسیسی اصل کو بھی دیکھا۔ اس کتاب پر ”سیرۃ النبی“ میں شبلی مرحوم اور سید سلیمان ندوی مرحوم نے کافی اعتماد کیا، اور اس کی شاخوئی کی ہے، گزشتہ صدی کے اس سب سے بڑے مسلمان ہیئت دان پر مجھ جیسے اس علم سے نابلد شخص کی طرف سے تنقید ایک بیجا جسارت سمجھی جائے گی۔ لیکن میں اپنی تنقید کو تردید نہیں سوال کے طور پر ہیئت دانوں اور مورخوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، گاہ باشد کہ کو دک نا داں الخ.....

وہ لکھتے ہیں کہ:

(۱) ولادت نبوی ۲۰ اپریل ۵۷۰ء کو ہوئی اور یہ کہ اسلام سے پچاس سال قبل سے نبی (کیسہ گری) کا مکہ میں رواج باقی نہ رہا تھا، بلکہ خالص قمری سال پایا جاتا تھا۔

(۲) ہجرت میں رسول اکرمؐ کا مدینہ میں ورود مبارک یوم عاشوراکو ہوا، جو محرم میں نہیں ربیع الاول میں پایا جاتا ہے اور

(۳) رسول اکرمؐ کے فرزند ولید حضرت ابراہیمؑ کی وفات ۲۹ شوال ۱۰ھ کو ہوئی۔

دلیلین؟ ولادت نبوی کے متعلق چوتھی پانچویں صدی ہجری کے مسلمان ہیئت دانوں نے جو زائچے بنائے ہیں ان سے یہی ثابت ہوتا ہے، ولادت مبارک کے دن غفر ستارے کے طلوع کا ذکر تو میں نے بعض حدیثوں میں پڑھا ہے (جس سے محمود فلکی

نے بحث نہیں کی ہے) لیکن دوسرے ستاروں کے قرآن السعدین کا یا ان کے فلاں فلاں مقام پر ہونے کا ذکر نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی حدیث میں میری نظر سے گزرا ہے، گمان یہ ہوتا ہے کہ اولاً ہمارے ان پرانے مسلمان زانچہ نویسوں نے ایک مفروضے کی اساس پر ولادت نبوی کی تاریخ خود معین کی اور پھر اس تاریخ کا زانچہ بنا ڈالا، لیکن اگر ابتدائی مفروضہ ہی غلط رہا ہو تو اس کا نتیجہ کیسے صحیح ہو جائے گا؟ پہلا ہجری سال ۶۲۲ء سے ہونا معلوم و معین ہے، رسول اکرمؐ کی ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں ہوئی مروی ہے۔ اس مبارک واقعہ کے چالیس سال اور چھ ماہ بعد بعثت ماہ رمضان میں ہوئی۔ پھر مزید بارہ سال چھ ماہ بعد ہجرت نبوی تو ہوئی لیکن سنہ ہجری کا آغاز بعثت کے بارہ سال تین ماہ بعد ہی ہو گیا۔

غرض ۴۰ سال چھ ماہ ۱۲ سال تین ماہ سے باون ۵۲ سال نو ماہ ہوتے ہیں، ۶۲۲ء میں سے باون سال ہی حذف کریں تو ۵۷۰ء ہونا چاہیے ۵۷۰ء نہیں بلے سب لوگ جانتے ہیں کہ کبیسہ گری (نسی) کو منسوخ کرنے کا حکم حجۃ الوداع میں دیا گیا، ولادت نبوی حجۃ الوداع تک نہ بھی لیں تو، ولادت سے ہجرت تک کے باون سالوں میں مکہ میں نسی ہوتی رہی اور اس مدت کو خالص قمری شمار کرنا صحیح نہ ہوگا، کہ باون قمری سالوں کے اکاون شمسی سال قرار دیے جاسکیں اگر زانچہ بنانے والوں نے کسی سہو سے باون کبیسہ والے سالوں کو باون قمری سال فرض کیا اور پھر اس مفروضے کی اساس اس کی معاون چیزیں ڈھونڈ نکالیں کہ کسری کا سنہ جلوس کون سا تھا، سنہ سکندری کی کیا تاریخ تھی، وغیرہ تو یہ ساری چیزیں ثبوت کی محتاج ہوں گی تاریخی واقعے کی اساس نہیں، گھڑیاں توپ کے چلنے پر درست کی جاتی رہیں اور توپ بھی ان ہی گھڑیوں کی اساس پر چلتی رہے تو وقت کے صحیح ہونے کا کیا ثبوت؟

دوسرا مسئلہ: مدینہ منورہ میں ورود مبارک یوم عاشورا کو ہوا۔ محمود فلکی نے لکھا ہے کہ سیرۃ حلبیہ میں کسی حافظ بن ناصر الدین کا بیان ہے کہ ”قدم المدینۃ یوم عاشوراء“ (عاشورا کے دن مدینہ تشریف لائے) اور اس کی صحت کا یہ ثبوت کہ یہ میرے حساب میں تو یہ جولائی ۵۶۰ء کا واقعہ ہے۔ (مرتب)

حدیث بخاری اور مسلم میں ہے۔ فلکی پاشانے اسی پر استغنا کی اور بخاری و مسلم میں تحقیق نہ کی، ان ماخذوں میں باوجود تلاش کے مجھے یہ الفاظ نہ ملے (مفتاح کنوز السنۃ نامی حدیثوں کے انڈکس میں بھی اس کا ذکر نہ ملا) بخاری و مسلم میں ملے تو یہ الفاظ کہ ”قدم النبی علیہ السلام فرأی الیہود تصوم یوم عاشوراء“ (نبی علیہ السلام مدینہ آئے تو دیکھا کہ یہودی عاشورے کے دن روزہ رکھتے ہیں) یا یہ حدیث کہ ”دخل المدینة و اذ اناس من الیہود یعظمون عاشورا و یصومونه“ (مدینہ تشریف لائے تو حال یہ تھا کہ وہاں کچھ یہودی عاشورے کا احترام کرتے اور اس دن روزہ رکھا کرتے تھے) حافظ ناصر الدین صاحب کو غلط فہمی ہوئی اور ان کی عبارت غلط فہمانی کا باعث ہوئی ہے ورنہ بخاری و مسلم کی روایتوں کا اطلاق محرم ۲ھ پر بھی بغیر کسی دشواری کے ہو سکتا ہے اور غالباً ہونا بھی چاہیے۔ بخاری و مسلم کی ایک اور روایت سے بھی اس خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ ”ارسل النبی علیہ السلام غداة عاشوراء الی قری الانصار من اصبح مفطرا فلیتمہ بقیة یومہ ومن اصبح صائما فلیصم“ (عاشورے کے دن نبی علیہ السلام نے چاشت کے وقت انصار کی بستیوں میں آدمی بھیجے کہ جو کوئی ناشتا کر چکا ہو تو بھی وہ باقی دن روزہ رکھے) ہجرت کے دن ورود نبوی قبا میں دوپہر کے وقت ہوا۔ اسی دن سویرے روزے کا حکم بھیجنا ممکن نہیں اور ساری غلطی حافظ ناصر الدین کے سہو پر مبنی معلوم ہوتی ہے اس پر مزید بحث نیچے آتی ہے۔

تیسرا مسئلہ: فرزند نبوی حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے دن سورج گرہن ہوا تھا۔ فلکی پاشانے اسے ۲۷ جنوری ۶۳۲ء مطابق ۲۹ شوال ۱۰ھ کو قرار دیا اور اس پر بہت اصرار بھی کیا ہے۔ کشافہ (اسکاؤٹنگ) کے زمانے میں علم ہیئت کی جو شدید تعلیم حاصل کی تھی وہ اتنے بڑے علمی مسئلے میں کام نہیں دیتی۔ اس لیے خود حساب کر کے علم الیقین کے ساتھ بیان کرنے کی جگہ مجبور ہوں کہ غیروں کی خوشہ چینی کروں، ذمہ داری ان ہی پر ہے بہر حال فرانسیسی میں گمنام پادریوں کی ایک پرانی متداول کتاب ہے۔ ”تقابلہ تاریخیں معلوم کرنے کا فن“ (L-Art de vérifier les dates) اس کی جلد اول میں

حضرت عیسیٰؑ کے زمانے سے اب تک سارے چاند گرہنوں کی تاریخ و تفصیل دی گئی ہے۔ عہد نبویؐ کے مدنی دور کے گرہنوں کا ذکر اس کتاب میں جلد اول صفحہ (۶۳) پر ہے۔ فی الحال کوئی اور ماخذ معلوم نہیں جس کی مدد سے صحت کی جانچ کر سکیں۔ اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ محمود فلکی کا بیان کہ حضرت ابراہیمؑ بن رسول اللہؐ کی وفات ۲۹ شوال ۱۰ھ کو ہوئی چاہیے۔ اس کی کوئی سند اسلامی تاریخوں میں نہیں ملتی۔ اس واقعے کے متعلق جو اختلاف رائے ہے، اس کا خلاصہ بلاذری کی انساب الاشراف (ج ۱ ص ۲۴۹ تا ۲۵۲ طبع مصر) اور ابن عبد البر کی الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ج ۱، سوانح نمبر ۱ طبع حیدر آباد دکن) میں ملتا ہے۔ ابن عبد البر نے اور روایتوں کے ساتھ یہ ضعیف روایت بھی نقل کی ہے کہ یہ وفات ذی الحجہ ۵ھ میں ہوئی۔ سورج گرہن چونکہ قمری مہینے کے آخر ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس لیے مراد ذی الحجہ کی آخری تاریخ ہی ہوگی اگر اس روایت میں مکہ والوں کی کبیسہ گری ملحوظ رکھی گئی ہے تو یہ ۲۱ یا ۲۲ مارچ ۶۳۰ء کو ہونا چاہیے اور اگر کبیسہ گری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ خاص قمری سال کی تاریخ مراد ہے تو یہ ۱۸ یا ۱۹ اپریل کو ہوا ہے۔ مگر مذکورہ فرانسیسی کتاب کی جدول میں اگست ۶۲۹ء اور اگست ۶۳۰ء کو تو سورج گرہن بتائے گئے ہیں۔ لیکن مارچ یا اپریل ۶۳۰ء میں کوئی نہیں ابن عبد البر کی دوسری روایت جس سے سارے ہی سیرت نگار متفق ہیں یہ ہے کہ یہ ذی الحجہ ۸ھ اصل میں صاحبزادے کی ولادت کی تاریخ ہے۔

سورج گرہن بخاری وغیرہ سب کے مطابق ان کی وفات کے دن ہوا، یہ وفات بلاذری کی ایک روایت میں ۱۷ دن کی عمر میں ہوئی۔ یعنی صفر ۹ھ کے آخر میں کمی حساب سے یہ ۱۹ مئی ۶۳۰ء کو اور خالص قمری حساب سے تقریباً ۱۷ جون ۶۳۰ء ہوگا۔ ان دونوں تاریخوں میں دنیا میں کوئی سورج گرہن نہیں ہوا، دوسری روایت جو مصعب اور ابن اسحاق کی ہے، وفات کو اٹھارہ ماہ کی عمر میں بتاتی ہے۔ یعنی جمادی الآخرہ ۱۰ھ جو کبیسہ اور غیر کبیسہ دونوں حسابوں سے ایک ہی تاریخ یعنی ۲۳ ستمبر ۶۳۱ء کو ہوتی ہے اور اس تاریخ کو بھی کوئی سورج گرہن دنیا میں نہیں ہوا، تیسری اور آخری روایت سولہ ماہ کی عمر میں وفات کی ہے اور بلاذری نے صراحت بھی کی ہے کہ یہ ربیع الثانی کی آخری

تاریخ کو پیش آئی۔ یہ تین اگست ۱۳۱۱ء کے معادل ہے اور واقعی اس تاریخ کو ایک سورج گرہن ہوا بھی ہے۔ ابوداؤد کے مطابق سخت گرم دن کا واقعہ ہے اور اگست میں گرمی ہی ہوتی ہے۔ پیش نظر فرانسیسی جدول کے مطابق یہ گرہن ”اپسین کے جنوب اور وسطی افریقا“ میں نظر آسکتا تھا۔ کتاب میں عرب کی صراحت نہیں ہے۔ لیکن غالباً اس میں کوئی مانع بھی نہیں، واحد پیچیدگی یہ ہے کہ بخاری کے مطابق یہ صبح چاشت کے وقت کا واقعہ ہے اور فرانسیسی جدول میں گرہن پارلیس کے حساب سے بعد ظہر ڈھائی بجے شروع ہوا، یعنی مدینہ منورہ میں عصر کے وقت، میں نہیں جانتا فرانسیسی جدول میں کوئی سہو ہے یا نہیں، مگر فی الحال اسی کو قبول کرنا پڑتا ہے محمود فلکی نے شوال ۱۰۱۱ھ مطابق ۲۷ جنوری ۱۳۱۲ء کو جو ذکر کیا ہے، وہ اس فرانسیسی جدول کے مطابق ”جنوب مشرقی افریقا سے مشرقی ایشیا تک“ دیکھا جاسکتا ہے، اور پیرس کے حساب سے صبح ساڑھے چھ بجے شروع ہوا تھا۔ یہ مدینہ منورہ میں کوئی نو بجے چاشت کا وقت ہوگا، لیکن جنوری سخت سردی کا زمانہ ہے اور یہ ابوداؤد کی صراحت کے خلاف ہے۔ معلوم نہیں سہو قلم ہے یا کیا کہ اپنی فرانسیسی اور عربی دونوں کتابوں میں محمود فلکی نے لکھا ہے کہ یہ سورج گرہن آدھی رات کے بعد تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا۔ کیا سورج گرہن کبھی رات کو بھی ہوتا ہے؟ کیا آدھی رات کے بعد کبھی ساڑھے آٹھ بجے بھی پہنچتے ہیں؟ فرانسیسی کتاب تو ان فرنگیوں ہی کے لیے لکھی اور فرانس اور بلجیم دو مقاموں کے علمی رسالوں میں بیک وقت شائع ہوئی۔ اس میں تو فرنگی حساب ہی ہونا چاہیے، عربی حساب نہیں کہ چھ بجے آدھی رات ہوتی ہو۔

یہودی سنہ :

اوپر محمود فلکی کے اس بیان کا ذکر آیا کہ ہجرت نبوی میں ورود مبارک عاشورا کے

۱۔ واقدی نے ۱۰ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ لکھا ہے۔ قمری مہینہ کی ۱۰ تاریخ کو سورج گرہن ہو نہیں سکتا۔ مہینے کے صرف آخر میں ہو سکتا ہے۔ غالباً آخر ربیع الاول کو مؤلف یا کاتب کے سہو قلم نے عاشور ربیع الاول کر دیا اور ربیع الاول کو کوئی گرہن نہیں ہوا۔

دن ہوا، جو یہودیوں کے یوم تشری نہیں بلکہ عید الفصح کے مترادف ہے۔ اور محرم میں نہیں بلکہ ربیع الاول میں ہوتا ہے۔

نفس قصہ یہ معلوم ہوتا ہے بخاری و مسلم وغیرہ کی جن احادیث شریفہ میں عاشورے کے دن مسلمانوں کے روزہ رکھنے کے حکم کا ذکر ہے۔ وہاں نہ صرف اس کی صراحت ہے کہ اسلام سے پہلے قریش بھی (حتیٰ کہ مند احمد بن ضبل ج ۶، ص ۱۶۲ کے مطابق خود رسول اکرم بھی) زمانہ جاہلیت میں مکہ معظمہ میں اس دن روزہ رکھا کرتے تھے، بلکہ یہ بھی کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے فرعون سے نجات پانے کے شکرانے میں ہے۔ اور ارشاد نبوی ہوا ہے کہ یہودیوں سے زیادہ مجھے سزاوار ہے کہ اس دن شکرانہ باری تعالیٰ بجالاؤں۔ محمود فلکی نے فرنگی کتابوں سے بہ آسانی یہ معلوم کر لیا کہ یہودیوں کے ہاں دو بڑی عیدیں ہوتی ہیں: ایک یوم کپور (کفارہ) جس میں چوبیس گھنٹے کا طویل روزہ رکھنا فرض ہے۔ یہ تقریب ماہ تشری کی دس تاریخ کو ہوتی ہے لیکن اس کا تعلق فرعون کے ڈوب مرنے سے نہیں ہے۔ بلکہ یہودیوں کے ہاں بحر احمر کو عبور کرنے کی تاریخ ۱۵ نیسال کو ہے، اسے عید الفصح کہتے ہیں۔ لیکن اس دن کوئی روزہ نہیں رکھا جاتا۔

ان حالات میں محمود فلکی نے احادیث میں بیان شدہ فرعون سے نجات کے عنصر کو اہمیت دی، روزہ رکھنے کو نظر انداز کر کے ہجرت نبوی میں مدینہ تشریف آوری کو (جو حافظ ناصر الدین کے مطابق عاشورے کے دن ہوئی) یوم کپور کی جگہ عید الفصح کے مترادف قرار دے دیا، عید الفصح موسم بہار میں آتی ہے۔ ربیع الاول کے لفظی معنی بھی موسم بہار پر دلالت کرتے ہیں۔ لہذا یہ سب ٹھیک بیٹھتا ہے اور چونکہ کم محرم اھ کا تطابق ۱۶ جولائی ۶۲۲ء سے سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے دو شنبہ ۸ ربیع الاول تک (۶۷) دن ہوتے ہیں۔ اور اسے انہوں نے ۳۰ ستمبر ۶۲۲ء کے مطابق قرار دے دیا۔

مگر اس استدلال میں (غلطیاں تو کہنے کی مجھے جرأت نہیں) کئی گھٹیاں مجھے نظر آتی ہیں۔

(۱) یہودی عید الفصح ماہ نیشان میں ہوتی ہے۔ اور نیشان کا مہینہ موسم بہار میں آتا ہے، اور اپنے معنی کے لحاظ سے ربیع الاول بھی موسم بہار پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن خود محمود فلکی اسے ماہ ستمبر کا مہینہ قرار دیتے ہیں۔ ستمبر میں خزاں اور پت جھڑ کا موسم ہوتا ہے بہار کا نہیں۔ بہار کا آغاز تو نوروز یعنی مارچ کے مہینہ میں ہوتا ہے اگر فرض بھی کر لیں (جیسا کہ محمود فلکی کو اصرار ہے کہ اہل مکہ اسلام سے پچاس سال قبل ہی سے کسی کو ترک کر چکے تھے) کہ ربیع الاول کا زیر بحث زمانے میں موسم بہار کا آنا ضروری نہیں کیونکہ قمری مہینے جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ تو بھی یہودی نisan کا بہار میں آنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہودی اپنے قمری سال میں لوند کا مہینہ بڑھاتے رہتے ہیں لہذا ان کا ماہ نisan ستمبر میں نہیں آسکتا، دوسرے الفاظ میں ان کی عید الفصح ربیع الاول ۱ھ میں یعنی ستمبر ۶۲۲ء میں ہو نہیں سکتی یہاں یہ مکرر کہتے چلوں کہ ربیع الاول ۱ھ اگر تخیل کی نسی کے بعد سے حساب کر کے چلیں تو ۱۳ ستمبر سے شروع ہوتا ہے لیکن اگر مکہ والوں کے نسی والے حساب پر باقی سمجھیں، کہ ابھی اسے رسول اللہ نے منسوخ نہ فرمایا تھا۔ تو یہ ربیع الاول ۲۰ مئی سے شروع ہوا تھا۔ مکی حساب کا محرم واقعی نisan یعنی عید الفصح کے مطابق ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محرم میں نہیں بلکہ ربیع الاول (مطابق یہودی ماہ سیوان) میں مدینہ تشریف لاتے ہیں۔

(۲) یہودی عید الفصح ماہ نisan میں ہوتی ہے جو ان کے سال کا ساتواں مہینہ ہے، (تشری، ہاشیوان، کسلو، تہیت، شباط، آوار، نisan، یایار، سیوان، تموز، آب، ایلول) ان کے ہاں بھی قمری سال رائج ہے اور وہ بھی ہر تیسرے سال ایک تیرہواں لوند کا مہینہ بڑھاتے ہیں۔ یہ اضافہ ماہ آوار کے بعد دیا دار کے نام سے ہوتا ہے لیکن چاند ہو کہ نہ ہو، سال کا آغاز کبھی کسی اتوار، بدھ یا جمعہ کے دن نہیں ہو سکتا، اگر رویت ہلال سے ایسا ہو بھی جائے تو نئے سال کی تاریخ ایک دن متاخر کر دیتے ہیں اور سال کبھی ۳۵۳، کبھی ۳۵۴ اور کبھی ۳۵۵ دن کا ہو جاتا ہے۔ چاہے علم ہیئت مانے یا نہ مانے، غرض ان کے سال کا آغاز جو ماہ تشری سے ہوتا ہے۔ کبھی ستمبر اور کبھی اکتوبر میں واقع ہوتا ہے، ہجرت میں رسول اکرمؐ کی مدینہ تشریف آوری اگر واقعی ستمبر میں ہوئی تھی تو یہ ماہ تشری کے

مطابق تو ہے، ماہ نisan کے نہیں، مار کی یہودی تقابلی جنتری کے مطابق جو جرمن میں ہے، (G.Makler, vergleihung go tubellen, wien 1888, P77) یکم تشری ۱۳۸۳ یہودی کے مطابق تاریخ ۱۱ ستمبر ۱۹۲۲ء ہے۔ بعد کے خاص قمری حساب سے یکم محرم ۱۳۸۵ھ کے مطابق تاریخ ۱۶ جولائی ۱۹۲۲ء سمجھی جاتی ہے۔ دو شنبہ کا دن لانے کے لیے محمود فلکی نے ورود مدینہ ۸ ربیع الاول کو قرار دیا ہے۔ یہ چونکہ یکم محرم سے (۶۷) دن بعد کا واقعہ ہے اس لیے ۱۶ جولائی کے (۶۷) دن بعد ۲۰ ستمبر کو پیش آنا چاہیے۔ یعنی ماہ تشری میں، عید کپور کے دو دن پہلے، نہ کہ عبور دریا و غرق فرعون کی عید الفصح کے موقع پر، لیکن اگر مکہ کے کبیسہ والے حساب سے لیں تو ہجرت نبوی ماہ مئی میں ہوگی۔ ماہ ربیع الاول ۲۰ مئی ۱۹۲۲ء جمعرات کے دن شروع ہوا تھا، ۱۲ ربیع الاول مطابق ۳۱ مئی بھی پیر ہی کو ہے۔ لہذا اسلامی پرانی روایات کی توثیق ہوتی ہے اور محمود فلکی کے بیانات غلط ثابت ہوتے ہیں۔ ماہ مئی مدینہ منورہ میں خاصی گرمی کا ہوتا ہے اور کتب سیرت میں صراحت ہے کہ رسول اکرمؐ کی آمد کے وقت خاصی گرمی تھی اور انصار دن چڑھنے پر گرمی کے باعث مزید انتظار کیے بغیر گھروں میں واپس چلے گئے تھے۔ جبکہ حضورؐ کی آمد آمد ہوئی، ماہ مئی یہودی ماہ سیوان میں شروع ہوا تھا۔ جس کو نہ تشری کے روزے سے اور نہ عید الفصح کی تقریب سے کوئی تعلق ہے۔

(۳) یہ امر کہ عاشورا کو یوم کپور کے مترادف سمجھنا چاہیے عید الفصح کے نہیں۔ اس کی تائید میں کئی باتیں ہیں:

(۱) یوم کپور ماہ تشری کی دسویں کو ہوتا ہے اور ”عاشورا“ کے لفظی معنی بھی دسویں دن ہی کے ہیں اور جہاں تک میں جانتا ہوں، اسلامی ادبیات و روایات میں اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عاشورا محرم کی دسویں کو ہوتا ہے۔

(ب) یوم کپور کے موقع پر یہودیوں کے ہاں روزہ رکھنا فرض ہے اور حدیث شریف میں صراحت ہے کہ یہودی عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے۔

(ج) یوم کپور کو فرعون سے نجات پانے سے قطعاً بے تعلق قرار دینا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، مجھے عبرانی زبان اور یہودی ادبیات سے واقفیت کا مطلق دعویٰ نہیں، اب سے پینتیس (۳۵) سال پہلے (۱۹۳۳ء میں) جرمنی میں کچھ عبرانی سیکھی تھی۔ اب تو حروف تہجی بھی مشکل سے یاد ہیں، بہر حال میرے سامنے ۱۹۱۱ء میں پیرس میں چھپی ہوئی ایک کتاب ہے۔ جس میں عبرانی دعائیں فرانسیسی ترجمے کے ساتھ دی گئی ہیں، اور کتاب کا نام ہے: ”سال کے سارے دنوں میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی کتاب“ "Doctre, Atuel de Prieres pour tous les jours de l'annee" اس میں ماہ تشری کی دسویں کو یوم کپور کے موقع پر جو دعا پڑھی جاتی ہے اس کے آخری الفاظ (عبرانی میں صفحہ ۶۴۲ پر اور فرانسیسی میں صفحہ ۶۴۳ پر) یہ ہیں: مقرا قدیس ذکر لیصبات مصریم۔ (یعنی اے تو نے اس عید کو ”مقدس گردانا ہے کہ وہ مصر سے نجات کی یاد دلاتی ہے“) جب یہودیوں ہی کے مطابق یوم کپور کو مصر سے نجات کی یاد سے تعلق ہے تو پھر ہمیں تعجب کیوں ہو کہ حدیث شریف میں رسول اکرمؐ نے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(د) مشرکین مکہ میں بھی اور یہودیوں کے ہاں بھی قمری مہینہ راج تھا۔ اس لیے مہینوں کا آغاز مذکورہ بالا یہودی استثناءوں کے ساتھ ایک ہی زمانے میں ہوتا تھا۔ دونوں کے ہاں لوند مہینہ بڑھانے کا رواج تھا۔ لیکن عرب اسے ختم سال پر ڈی جہ کے بعد اور محرم سے پہلے بڑھاتے تھے تو یہودی وسط سال میں چھٹے مہینے آوار کے بعد اور ساتویں مہینے نیسان سے پہلے، مزید برآں وہ لوند کا تیر ہواں مہینہ انیس سال میں چھ مرتبہ (تیسرے، چھٹے، آٹھویں، گیارہویں، چودھویں اور انیسویں سال) بڑھاتے ہیں۔ جس کے بعد زمانہ اپنے پرانے حال پر واپس آجاتا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مکہ والوں کی نسی میں یہ عمل کبھی تین برس میں ایک بار اور کبھی دو ہی برس میں ایک بار کر کے تینتیس سال میں

بارہ مرتبہ ۱۔ لوند کا مہینہ بڑھایا جاتا اور اس طرح خالص قمری اور لوند والے مہینے
 مکرر اپنی اصلی حالت پر واپس آتے (اور بظاہر یہ تیسرے، چھٹے، نویں،
 گیارہویں، چودھویں، سترہویں، بیسویں، بائیسویں، چھپسویں، اٹھاسویں،
 تیسویں اور تینتیسویں سال کے اختتام پر بڑھائے جاتے، کم از کم فلکیاتی
 ریاضیات کے نقطہ نظر سے اسی طرح بڑھانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ قمری اور
 شمسی سال میں ایک قمری مہینہ کے اضافے کے ذریعہ سے فوراً تطابق پیدا
 ہو جایا کرے اور مزید انتظار کیے بغیر جیسے ہی ایک مہینہ کا فرق ہو اس کا اضافہ کر
 لیا جائے) ان فرقوں کے باعث اگر کسی زمانے میں عربی اور یہودی سالوں کا
 آغاز ایک ہی زمانے سے ہوا بھی تھا تو یہ ضروری نہیں رہتا کہ وہ ہر زمانے میں
 یکساں رہیں اور اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ مشرکین مکہ کا محرم اور یہودیوں کا
 تشری الگ الگ زمانے میں آئیں۔ ہم ابھی اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ایک حساب
 سے (جو ہماری رائے میں غلط ہے) ربیع الاول ۱۰ھ میں تشری ہی کا مہینہ
 چل رہا تھا اور اگر محمود فلکی کی اس تجویز کو قبول کر لیا جائے (جو ہماری رائے میں
 درست نہیں) کہ رسول اکرمؐ کا مدینہ میں ورود مسعود ۸ ربیع الاول ہی کو ہوا، تو
 اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ تشری کی آٹھویں کو وہاں پہنچے تھے۔ لہذا یوم
 کپور کو ابھی دو دن باقی تھے۔ حافظ بن ناصر الدین کی روایت پھر بھی غلط ہی
 رہے گی کہ رسول اکرمؐ کی آمد ہی عاشورا کے دن ہوئی، ساری مذکورہ دشواریوں
 کے غیر اہم ہونے کی اساس پر نظر انداز کر کے اگر یہ قرار ہی دے لیا جائے کہ
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے وقت مکہ والوں
 کا ربیع الاول چل رہا تھا اور یہودیوں کا ماہ تشری، تو اس کی توجیہ دشوار نہ ہوگی

۱۔ اصل میں تیس کا دور تھا اور اس میں گیارہ مرتبہ نیسی ہوتی تھی لیکن سال کے بارہ مہینوں کی کامل
 گردش کے لئے میں نے بائیس (۲۲) سال کا ذکر کیا ہے۔ بیسویں سال کی نیسی نئے دور کا آغاز
 کرتی ہے۔ اس فرق کی اہمیت یہ ہے کہ ہر دور میں نیسی کرنے کی سالوں کی ترتیب مقرر ہے جیسا
 کہ آگے تفصیل میں ہے۔

آپ ماہ محرم میں مکہ معظمہ میں عاشورا منا کر مدینہ آئے تو دیکھا کہ حقیقی عاشورا ابھی شروع نہیں ہوا ہے تو اس اسلامی اصول کی بنا پر (جو بخاری و ترمذی وغیرہ میں صراحت کے ساتھ مروی ہے کہ براہ راست وحی نہ آتی تو رسول اکرم اہل کتاب کے عمل کے مطابق عمل فرماتے) یہ حکم دیا کہ عاشورے کا روزہ ۱۰ ربیع الاول ۱ھ کو یہودیوں کے یوم کپور کے موقع پر رکھا جائے۔ غرض یہ امکان تو ہے لیکن ہماری ناچیز رائے میں وہ قابل رد ہے صحیح تربات یہی ہوگی کہ مدینہ آنے کے کچھ عرصہ (چند ماہ) بعد جب یوم کپور آیا تو رسول اکرم نے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ اس کے بعد جلد ہی رمضان ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہو گئے اور عاشورا کا روزہ نوافل میں شامل ہو کر رہ گیا۔

خلاصہ :

اس ساری نظر خراشی کا منشا ایسی مثالیں دینا ہے کہ کس طرح ہمارے علم ہیئت میں بھی ہماری میراث ماضی کی ہر وقت نظر ثانی اور جانچ پڑتال ہمیں کرتے رہنے کی ضرورت ہے بے سوچے سمجھے دہراتے رہنا طوطا مینا کا تو کام ہو سکتا ہے۔ مسلمان اہل علم کا نہیں۔

اگر اس مقالے کے ناظرین میں کوئی ہیئت داں ماہر فن بھی ہوں تو ان سے التماس ہے کہ میری غلطیوں پر متنبہ فرمائیں۔ علم کی خدمت بھی ہوگی، میری شکر گذاری کا باعث بھی ہوگا۔

(مفت روزہ صدق جدید لکھنؤ۔ ۲۹ ستمبر تا ۱۰ نومبر ۱۹۶۷ء)

ماخوذ معارف اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۶۷ء

اسلام میں انسانی خون کا احترام

دنیا کے مدبرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ”اگر کسی قوم کی تہذیب اور ثقافت کا معیار معلوم کرنا ہو تو جنگ میں دشمن کے ساتھ اس قوم کے سپاہیوں کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرنا چاہیے۔“ چنانچہ جب ہم اس کسوٹی پر اسلام اور اس کے قبیحین کو کس کر دیکھتے ہیں، تو مسلمان سب سے ممتاز، بلند حوصلہ اور فیاض دکھائی دیتے ہیں۔ یوں تو آج مغرب اور مہذب دنیا میں بھی ایک باقاعدہ قانونِ جنگ موجود ہے لیکن یہ اس لیے تشنہ اور غیر منصفانہ ہے، کہ اس کا دائرہ عمل صرف ”مہذب“ یعنی یورپین اقوام تک محدود ہے۔ جہاں تک غیر یورپین اور کمزور قوموں کے ساتھ رواداری اور نرمی برتنے کا تعلق ہے سو اسکی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کے خلاف یہ کمزور قوموں پر انسانیت سوز مظالم کرنا لازمی سمجھتے ہیں۔

اس کے برعکس اسلام کے عقیدہ عدل و انصاف کی رو سے نہ تو کسی غیر ملکی کو دوسرے پر فوقیت دی جاسکتی ہے اور نہ اپنے فرائض کو ادا کرنے اور نہ کرنے والوں کے مابین کوئی فرق و امتیاز روا رکھا جاسکتا ہے اور اگرچہ یہ امر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے اور یہ امر محض نظریہ ہی تک محدود نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کیا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ان لوگوں کے قتل کے معاملے کو پیچھے جنہیں دشمن کی طرف سے

بطور ضمانت مسلمانوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور اسلام کے ابتدائی دور میں انہیں قتل کر دینے کے واقعات عام ہو گئے تھے، اُس زمانے میں بازنطینی سلاطین اور مسلمانوں کے مابین جو معاہدات طے ہوا کرتے تھے ان کی تعمیل و تکمیل کی ضمانت کے طور پر فریقین اپنے کچھ لوگوں کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیا کرتے تھے اور معاہدات میں خصوصیت کے ساتھ یہ شرط شامل کی جاتی تھی کہ اگر بازنطینی سپرد کردہ مسلمانوں کو شہید کر دیں گے تو مسلمان بھی بطور انتقام بازنطینیوں کو ہلاک کر دینے کے مجاز ہوں گے۔

اس سلسلہ میں تاریخ اسلام کے دو واقعات پیش کر دینے کافی ہوں گے۔ ایک واقعہ امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں پیش آیا تھا، اور دوسرا خلیفہ منصور کے زمانے میں اور اُن دونوں واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ ”اگرچہ بازنطینی سلاطین نے معاہدہ کے خلاف فیصلہ صادر کیا اور یہ فیصلہ اس بناء پر کیا گیا کہ مسلمانوں کے قتل کے ذمہ دار وہ بازنطینی نہیں جو دار الخلافہ میں موجود ہیں، بلکہ اس فعل کی ذمہ داری بازنطینی سلاطین پر عائد ہوتی ہے۔ اور قرآن اُن بے گناہ بازنطینیوں کو مستوجب سزا قرار نہیں دیتا۔“

پھر شریعت اسلامی کی رو سے دوران جنگ میں عورتوں، بچوں اور اُن لوگوں کا قتل ممنوع ہے جو مقابلہ پر نہیں آتے۔ حتیٰ کہ اگر دشمن مسلمانوں کے بچوں اور مسلمان عورتوں کو قتل بھی کر دیں تو بھی مسلمان ان کے بچوں اور ان کی عورتوں پر تلوار اٹھانے کے مجاز نہیں۔ مختصر یہ کہ مسلم قوم ہی وہ پہلی اور واحد قوم ہے جس نے دنیا کے روبرو حقیقی معنوں میں بین الاقوامی جنگی قانون پیش کیا ہے۔

یہ چیز محتاج بیان نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی علوم دینیہ میں بہت اہمیت رکھتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی، نظریہ اور عمل کی ایک ایسی مثال پیش کرتی ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر مرحلہ میں شمع ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صرف ہمارے مذہب اور عقائد یا بالفاظ دیگر خدا اور بندے کے درمیان تعلقات کی نوعیت ہی سے روشناس نہیں کیا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ریاست کی بنیاد بھی رکھی، افواج کی قیادت بھی فرمائی اور بین الاقوامی قانون پر عملدرآمد بھی کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اور جنگ

کے زمانوں میں غیر ملکی تعلقات سے متعلق جو طرز عمل بھی اختیار فرمایا، وہ طرز عمل اسلام کا قانون ہے۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات کی ممانعت فرمادی وہ آج بھی ممنوع اور خلاف شریعت ہے۔

بہر حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ریاست قائم فرمائی تھی وہ بے مقصد نہیں تھی۔ ہجرت کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اُس وقت وہاں کوئی حکومت موجود نہیں تھی، بلکہ حکومت کی جگہ یہودیوں، نصرانیوں، بُت پرستوں، مظاہر قدرت کے پرستاروں اور مسلمانوں کے ایسے چھوٹے بڑے قبائل موجود تھے، جو باہم جنگ و جدل میں مصروف رہتے تھے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لے جانے کے چند ہی ہفتہ بعد وادی مدینہ میں آپ کی زیر قیادت وفاقی انداز کی ایک شہری حکومت قائم ہو گئی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو آپ کی قائم کی ہوئی وہ حکومت جو ابتداءً صرف مدینہ طیبہ تک ہی محدود تھی پورے جنوبی فلسطین کے متعدد حصوں اور جنوبی عراق تک وسیع ہو چکی تھی۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس دس لاکھ مربع میل کے علاقہ کی تسخیر میں دشمن کو جو جانی نقصان پہنچا اس کا اوسط ہر ماہ ایک آدمی کی ہلاکت سے زیادہ نہیں تھا، اور خود مسلمانوں کا نقصان جاں تو اس سے بھی کم تھا، اور تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا مذکور نہیں جس سے پتا چلتا ہو کہ ہند اور پاکستان کے مجموعی رقبہ کے برابر رقبہ کو فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کو میدان جنگ میں اپنے پانچ سو سپاہیوں کا اتلاف جاں بھی برداشت کرنا پڑا ہو۔ پھر دس سال کی مدت میں دس لاکھ مربع میل کی تسخیر سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ تسخیر کا اوسط روزانہ ۲۷۳ مربع میل رہا ہے مسلمان انسانی خون کے احترام میں جس قدر پیش پیش تھے اُس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ مفتوح اقوام کو اس امر کا احساس تک بھی نہیں ہوتا تھا کہ اُن پر کسی دوسری قوم کی حکومت قائم ہو گئی ہے، اس کے برعکس وہ خود کو آزاد اور سر بلند محسوس کرتی تھیں اور اسی لیے اس تمام زمانہ میں غدر و بغاوت اور سازش کا ایک واقعہ بھی رونما نہیں ہوا۔

بین الاقوامی اسلامی قانون کا مفہوم اور بنیادی مقصد قومی تعصبات کو دُور کر کے

یہ امر لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہے کہ وہ سب آدم و حوا کے فرزند اور ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اسلام سے قبل مذہب کا تصور بھی قومیت تک محدود تھا مثلاً ہندو ہونے کے لیے کسی ہندو گھرانے میں پیدا ہونا ضروری تھا، اور غیر ہندوؤں کے لیے ہندو مذہب اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اور دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذاہب کا بھی، جو انسان کو خدا کی جانب آنے کی دعوت دیتے تھے، یہی حال تھا۔ لیکن اسلام ہی دنیا کا وہ اولین مذہب ہے جس نے رنگ و نسل اور ملک و وطن کی حدود کو نظر انداز کر کے تمام لوگوں کو خیر اور فلاح کی راہ پر چلنے کی دعوت دی۔ اس نے بے وجہ کی خاندانی بزرگی اور بالاتری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کردار و عمل کی اچھائی کو بڑائی و بزرگی کا معیار قرار دیا۔

اسلام جو دنیا کے سارے باشندوں کو ایک کنبہ اور برادری کے رشتہ میں منسلک کر دینا چاہتا ہے، اس کی نظر میں تمام نئی نوع انسان برابر ہیں۔
اسلام کی اس وسیع منظری کی بدولت ہی اسلام کا جو جنگی بین الاقوامی قانون وضع کیا گیا، اس کے وامن میں سب کو بلا امتیاز مذہب و ملت اور رنگ و نسل کے پناہ دی گئی۔ اور ہمیشہ ہی انسانی خون کے بہانے سے پرہیز کیا گیا کیوں کہ اسلام کے نزدیک کسی ایک بے گناہ کا خون ساری دنیائے انسانیت کا خون ہے۔
(ماہنامہ دارالعلوم۔ دیوبند۔ نومبر ۱۹۵۷ء)

اسلامی جہاد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو ہجرت سے قبل مکہ میں کیا کچھ اذیت نہ دی گئی اور جیسے جیسے یہ ہجرت کرتے جاتے تھے ان کی جائیداد منقولہ کس طرح قرق نہ ہوتی گئی۔ جب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرماتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کثیر رقیں امانت تھیں ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتقاماً ہی ساتھ لے کر مدینہ فرار ہو سکتے تھے مگر آپ نے جو کچھ کیا اس سے خود بیسویں صدی کے مہذب انسان کو (چاہے گورا ہو یا کالا) شرمنا پڑتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں تشریف فرما ہیں۔ ابو جہل کی سرداری میں تعداد میں تنکنا، ساز و سامان میں دس گنا دشمن کا لشکر چڑھائی کرتا ہے۔ مورخ بلاذری نے ”انساب الاشراف“ میں ایک کم معروف مگر اہم تفصیل درج کی ہے اور لکھا ہے:

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے لشکر کو کہلا بھیجا کہ مکہ واپس چلے جائیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ٹکرانا نہیں چاہتے۔ جب ادھر سے انکار ہوا، تو مجبوراً لڑائی کرنی ہی پڑی۔ تنگنے دشمن کو شکست فاش دینے کے بعد جب ستر اسی آدمی گرفتار ہوئے تو ان سب کو تلوار کے گھاٹ اتارنے میں کوئی امر مانع نہ تھا اور شاید مسلمان حق بجانب

ہوتے مگر مقصد انتقام تھا نہ درندگی و خونخواری۔ اگر ان سب کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو شاید وہ بھی افراد کی فطرتوں میں تفاوت کے باعث مقصد کو فوت کر دیتا اس لیے قیدیوں سے برتاؤ بھی مختلف رہا۔ شریفوں کو محض اس وعدے پر چھوڑ دیا کہ آئندہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گے۔ اسلحہ فروش مالداروں سے فدیہ میں ہتھیار مانگے گئے، سرمایہ داروں سے رقم مانگی گئی، پڑھے لکھوں سے کہا گیا کہ ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ صرف دو قیدیوں کو جو بدر کی چڑھائی کے اصل ذمہ دار تھے اور ہر طرح کے جبر و طنز وغیرہ کے ذریعے سے ہچکچانے والوں کو بھی درغلا کر لائے تھے اور جن کی افتاد طبع سے اس کی توقع ہی نہ تھی کہ کسی نرمی یا رعایت سے وہ کچھ بھی متاثر نہ ہوں گے صرف ایسے دو آدمیوں کو مستقبل کے خوف سے سزائے موت دی گئی۔“

بنو نضیر کے یہودیوں نے بد عہدی سے گزر کر غداروں کا اقدام کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے ہجرت کے بعد راضی خوش اپنی شہری مملکت کا سردار تسلیم کیا تھا۔ لیکن جب ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے محلے میں گئے اور دھوپ سے بچنے کے لیے ایک برج کے سائے میں تشریف فرما ہوئے (ان اللہ کے بندوں کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی تھی کہ اپنے صدر مملکت کو کسی گھر میں بٹھا کر گفتگو کریں) تو برج پر سے ایک بڑا پتھر گرا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی تدبیر ہوئی۔ جب ہر طرح کی سرزداری اور جنگی مقادمت کے باوجود ان کو صرف یہ سزا ملی کہ کہیں اور چلے جائیں (اور پورا مال و متاع ساتھ لے جائیں حتیٰ کہ مسلمانوں کے دیے ہوئے قرضے بھی واپس حاصل کر لیں) تو اس رعایت کا بدلہ یوں دیا کہ سارے عرب کو مدینے پر چڑھا لائے

اور معرکہ خندق میں مسلمانوں کے ”کلیجے منہ کو آ گئے۔“ اس انتہائی نازک اور زندگی موت کی کش مکش میں اندرون مدینہ بنو قریظہ نے عین دم آخر غدار کی اور چاہا کہ مسلمانوں پر اندر سے ٹوٹ پڑیں (اور خندق وغیرہ کا سارا دفاعی نظام بے کار کر دیں) انہیں بڑی فراست سے ایک ون روکا گیا اور دوسرے یوم سبت (سنیچر) تھا جس میں یہودی اس زمانے میں جنگ نہ کرتے تھے۔ تیسرے دن عربوں کے حرام مہینے (ذیقعد تا محرم) شروع ہو رہے تھے۔ اس طرح لڑائی ختم ہو گئی۔ پروفیسر وینسک نے (جو غالباً یہودی تھا) یہ معقول سوال کیا ہے کہ بنو نضیر کے ساتھ رعایت کے تلخ تجربہ کے بعد کیا بنو قریظہ کی قوت بھی انہی مخالفوں کی طاقت میں اضافے کے لیے چھوڑ دی جاسکتی ہے؟ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی نری دکھائی اور فرمایا کہ:

”ان یہودیوں ہی کے ایک سابق دوست اور حلیف کو سچ

ظہرایا جائے اور وہ جو بھی فیصلہ کرے وہ نافذ کیا جائے۔“

اگر بنو قریظہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بناتے تو شاید رحمۃ للعالمین کا مظاہرہ ہوتا۔ بہر حال اس سچ نے بھی کوئی خاص سختی نہ کی اور صرف یہ حکم دیا کہ:

”توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مغلوب دشمن سے

برتاؤ کا جو حکم دیا گیا ہے (دیکھو توریت کتاب ثثنیہ فصل ۲۰،

فقہہ ۱۰ تا ۱۲) وہی عمل میں لایا جائے۔“

گویا یہودی اپنے دشمنوں سے جو برتاؤ کرتے ہیں وہی برتاؤ ان سے کیا جائے۔

فتح مکہ شاید انسانی جہاد کا کمال ہے۔ اکیس سال سے مسلسل اہل مکہ مسلمانوں کو روز افزوں بے وجہ ستاتے چلے آ رہے تھے۔ اس کی داستان سے سب واقف ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کو جہاں سے جلا وطنی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کیا گیا تھا فاتحانہ واپس آئے جو برتاؤ عمل میں آیا اس کا بیسویں صدی کا

”مہذب“ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ فوجی دستے شہر کی طرف بڑھے تو اس منادی کے ساتھ کہ

”جو اپنے گھر میں بیٹھ رہے اسے امان ہے، جو ہتھیار ڈال دے اسے امان ہے، جو حرم کعبہ میں چلا جائے اسے امان ہے جو سردار شہر ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اسے امان ہے۔“

شہر پر قبضہ مکمل ہو جانے کے بعد بستی کی ساری آبادی بلائی گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ وہ کس برتاؤ کی توقع کرتی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کے قتل عام کا حکم دے سکتے تھے۔ ساری جائیداد لوٹ کر لے لینے، سارے لوگوں کو غلام بنانے کا بھی فیصلہ فرما سکتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ فرمایا کہ:

”جاؤ تم، تم پر کوئی گرفت نہیں۔ تمہیں چھوڑ دیا جاتا ہے“

اس نفسیاتی لمحہ میں فوراً ہی بکثرت لوگ مسلمان ہو گئے۔ ان میں سب سے پہلے ایک مشہور متروک سردار عتاب تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ہے چند لمحہ پہلے جب حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی تو عتاب نے کہا تھا:

”خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ آج زندہ نہیں ہے ورنہ وہ اس

نہیق ہمار یعنی حضرت بلالؓ کی اذان کو برداشت نہ کر سکتا۔“

جب عفو عام کے اعلان پر سب سے پہلے عتاب نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے اسلام کا اعلان کیا تو اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ مشہور تابعی حایت البتانی نے لکھا ہے کہ قبل ہجرت مکی کے لوٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کرتے اور آپ پر سنگباری کرتے اور آپ ابوسفیان کے گھر میں مہس جاتے تو وہاں آپ کو امن مل جاتا۔ فتح مکہ کا یہ اعلان اسی کی شکرگزاری میں تھا۔

”اچھا میں تمہیں مکہ کا گورنر مقرر کرتا ہوں“

تو مفتوحہ شہر وہیں کے ایک نو مسلم کٹر دشمن کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور چند دن بعد مدینہ واپسی ہوتی ہے تو مدینہ کا ایک واحد سپاہی تک وہاں احتیاطاً چھوڑنا غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ولمثل هذا فليعمل العاملون۔

(ہفت روزہ صدق جدید لکھنؤ - ۲۶ جنوری ۱۹۶۸ء)

بارِ دیگر یہی مضمون ۷ فروری ۱۹۶۹ء میں بھی شائع ہوا)

اکابرین

www.KitaboSunnat.com

امام محمدؒ کی بارہ سو سالہ یادگار وفات ترکی میں

امام محمد بن الحسن بن فرقد الشیبانی کی ستاون سالہ جوان عمری میں ۱۸۹ھ میں بمقام ری (طہران) وفات ہوئی جب یہ شہر ہارون رشید کا دار الخلافہ تھا، اور امام محمد اس کے قاضی القضاۃ تھے، اس پر اب پورے بارہ سو سال گزر چکے ہیں۔

امام محمد صاحبین یعنی امام ابو حنیفہ کے دو بڑے شاگردوں (اور بازوؤں) میں سے ایک ہیں۔ دوسرے صاحب امام ابو یوسف ہیں، امام اعظم ابو حنیفہ نے فقہ (اسلامی قانون) کی ایسی خدمت کی کہ آسمان پر چڑھ کر ثریا کے تارے توڑ لیے، انہوں نے فقہ کی تدوین کے لیے ایک اکاڈمی قائم کی، لیکن فقہ پر انہوں نے بظاہر کوئی کتاب نہیں چھوڑی جو ان کی اپنی تالیف ہو، امام ابو یوسف کا تحریری کارنامہ بھی محدود ہے، ایک چھوٹی سی (لیکن اہم) ”کتاب الخراج“ لکھ کر اسمیں اسلامی سرکاری مالیے کی وضاحت فرمائی ہے، ”الررد علی سیر الادزاعی“ لکھ کر قانون بین الممالک کے مباحث میں حصہ لیا، ان کی طرف منسوب ”الخارج فی الخلیل“ کا ایک مخطوطہ استانبول میں ہے، لیکن یہ فقہ کا ایک پہلو یا فقہ کی کسی جامع کتاب کا محض ایک باب ہے۔

اس کے برخلاف امام محمد نے ایسی کتابیں چھوڑی ہیں جو قانون کے سارے پہلوؤں پر حاوی اور مفصل و ضخیم ہیں، ان حالات میں امام محمد کو فقہ حنفی کا ”تحریری بانی“ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا۔ بعد کے سارے حنفی فقہاء ان ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ ان کے استادوں میں امام مالک ہیں تو شاگردوں میں امام شافعی بھی ہیں (اور امام شافعی کے ایک بڑے شاگرد امام ابن حنبل ہیں) اس طرح تمام فقہی مذاہب کے منتسب آپ کا ادب کرتے اور آپ کی یادگار میں ذوق و شوق سے شریک ہیں۔ ایران کو یہ خصوصیت ہے کہ یہ وہاں کے قاضی القضاۃ تھے اور وہیں جبل طبرک پر دفن ہوئے (بعض روایتوں میں رنبویہ کا بھی ذکر آتا ہے، کوہ طبرک آج تک موجود معروف ہے اور طہران کے مضافات میں وہاں آجکل ایک دوست طالب علم عفان سلجوق کی اطلاع کے مطابق سینٹ سازی کا کارخانہ قائم ہے، رنبویہ غالباً رنگ اور بو کا مرکب کوئی گلستاں تھا، اور شاید کوہ طبرک ہی پر ہارون رشید نے اسی مدفنا مقام پر ان کو دفن کرنے کا حکم دیا ہو)۔

امام محمد ۱۳۲ھ کے ہنگامہ خیز سال میں پیدا ہوئے جب توتنی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء کے مصداق امویوں کے زور کا خاتمہ کر کے عباسی برسر اقتدار آ رہے تھے، کچھ بڑے ہوئے تو اس زمانہ کے سب سے بڑے علمی مرکز کوفہ (سابق حیرہ) میں تعلیم پائی، پھر جب بغداد بسایا گیا تو وہاں نظر آتے ہیں، مکہ جا کر ابن عیینہ سے، مدینہ جا کر امام مالک سے، دمشق (بیروت؟) جا کر امام اوزاعی سے، ایران جا کر حضرت عبداللہ بن مبارک سے تعلیم پائی (یہ دارالاسلام کی اس زمانے میں بڑی جامعات یعنی یونیورسٹیاں تھیں، امام محمد ان سب کے سند یافتہ تھے) گویا ایک نہیں چھ چھ ڈاکٹریٹ کی تھیں، پھر خود تعلیم دینی شروع کی، غالباً بغداد میں۔

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ جس مسجد میں یہ درس دیتے تھے، اور ان کی کتابیں ان کے شاگردان کے سامنے پڑھ کر اپنے نسخوں کی تصحیح کرتے، اور تشریح پوچھ کر پوری طرح مؤلف کا منشاء سمجھتے اور اس سے کتاب کی روایت کی اجازت حاصل کرتے، وہاں ایک

بدخو ہمسایہ کتاب الدولہ کا مؤلف ابن الراوندی ۱۔ بھی آیا کرتا تھا۔ وہ عہدِ اویہی دن اور وہی وقت مقرر کرتا جو امام محمد مقرر کرتے۔ جب دونوں جماعتیں مسجد میں ایک ساتھ شروع ہوتیں تو راوندی کے شاگرد چیخ پکار کرتے اور شور مچاتے، اس لیے امام محمد نے اپنی درس گاہ بدل دی اور ایک دوسری مسجد میں درس دینے لگے۔ یہ پچاس سال کے تھے جب قاضی القضاۃ امام ابو یوسف کا انتقال ہو گیا۔ ہارون رشید کو امام محمد سے بہتر کوئی بدل نہ مل سکا۔ اس نے رقبہ کو (جو اب شام میں ہے) دار الخلافت بنایا تو یہ بھی ساتھ گئے، اس زمانے میں ایک شیعہ بغاوت ہوئی، اس کے سرغنہ کو ہارون رشید نے تحریری اطمینان دلایا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دے تو اس کو جان کی امان دی جائے گی۔ جب یہ لوگ گرفتار ہو کر آئے تو ہارون رشید نے ان کو قتل کرنا چاہا۔ امام محمد نے امان یافتہ کے قتل کو حرام بتایا، ہارون رشید نے لاکھ سیاسی مصلحتیں بتائیں لیکن یہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس پر خلیفہ نے جھلا کر سامنے رکھی ہوئی دوات ان پر پھینک ماری اور ان کے عہدے سے ان کو برطرف کر دیا۔ چند روز کے بعد جب غصہ ٹھنڈا ہوا اور رقبہ کی جگہ ری (طہران) کو دار الخلافہ بنانا طے ہوا تو امام محمد کی طلبی ہوئی۔ چنانچہ وہ ہارون رشید کے ساتھ گئے اور وہیں وفات پائی اور دفن ہوئے۔ عام تذکرہ نویس تاریخ وفات ۱۸۹ھ بتانے میں متفق ہیں لیکن میرے علم میں کسی نے دن اور مہینے کی تعیین نہیں کی ہے البتہ کتب خانہ سعیدیہ (حیدر آباد دکن) کے موجودہ ناظم الحاج محمد عبدالغنی صاحب کی اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ کتب خانہ میں ایک قلمی عرائس نامہ (یا اعراس نامہ) ہے جو کم از کم دو سو سال قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں ہے کہ امام محمد کی وفات ۱۴ جمادی الآخرہ ۱۸۹ھ دوشنبہ کے دن ہوئی۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریر کو غلط سمجھا جائے گو اس کتاب کے مؤلف کا ماخذ ہم کو معلوم نہیں ہے۔

۱۔ یہ غالباً مشہور محمد ابن الراوندی نہیں ہے جس کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے۔ اس کا تعلق غالباً اس راوندیہ فرقے سے ہے جس کے متعلق مروج الذہب میں مسعودی نے لکھا ہے کہ اسکے عقیدہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا حق (بطور وراثت) حضور کے چچا حضرت عباس اور پھر ان کی اولاد کو حاصل ہوا۔

امام محمد کو کم عمری ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ کردری، طاشکوپری زادہ وغیرہ متعدد مولفوں نے یہ دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ امام محمد کے ہاں دس رومی (یونانی) لونڈیاں تھیں جو عربی میں اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ جب امام محمد تالیف کے کام میں مشغول ہوتے تو انکے سامنے پانی سے بھرا ایک پیالہ ہوتا اور یہ لونڈیاں ان کو ”علم“ (غالباً فقہ) پڑھ کر سناتی رہتی تھیں۔

امام محمد شیبانی کہلاتے ہیں مگر وہ اس قبیلے کے مولود نہیں مولی تھے۔ معلوم نہیں کسی دوسرے عرب قبیلے کے فرد تھے یا خدا نے انہیں غیر عرب لوگوں میں پیدا کیا۔ ان کے والدین دمشق کے باشندے اور فوج میں ملازم تھے لیکن خود یہ واسطہ (عراق) میں پیدا ہوئے۔

الکفوی نے (جو کریمیا، روس، کے شہر کفہ کے سپوت گزرے ہیں) حنفی فقہاء کا ایک ضخیم تذکرہ لکھا ہے جو میرے علم میں تاحال چھپا نہیں ہے، استنبول میں اس کے مخطوطے میں لکھا ہے کہ امام محمد نے (۹۹۰) تالیفیں کیں، لیکن اب دس بارہ سے زیادہ نہیں ملتیں، کچھ چھپی ہیں، کچھ چھپ رہی ہیں، اور الامالی الکلبانیات کے سوا (جس کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے اور جو چھپ بھی گئی ہے) باقی کل موجود کتابوں کے نسخے استانبول میں ہیں۔

ترکی جشن اور نمائش مخطوطات امام محمد:

اپنی موجودہ گئی گزری حالت میں بھی ترکی میں اسلامیات کا جتنا ذوق و شوق ہے وہ نہ عرب ممالک میں نظر آتا ہے نہ عجم میں۔ چونکہ جمادی الآخرہ اس سال گرمائی تعطیلات میں پڑ رہا ہے اس لیے بارہ سو سالہ جشن استانبول میں ۱۰ مئی ۱۹۶۹ء یعنی ماہ صفر میں منایا گیا۔ استانبول یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات، استانبول ہی کے معہد عالی اسلامیات اور ترکی کے سارے معہد ہائے عالی اسلامیات کے طلبہ کے وفاق (فیڈریشن) نے مل کر یہ جشن منایا، اور استانبول کے مرکزی کتب خانہ مخطوطات (سلیمانہ کتب خانہ سی) میں دو ہفتوں تک کتابوں کی نمائش ہوئی۔

جشن میں چار پانچ تقریریں ہوئیں، امام محمد کے حالات، امام محمد کا درجہ تدوین فقہ حنفی میں، امام محمد کا ماحول اور علمی کارنامہ، امام محمد کے معاصر، یورپ میں قانون کی حالت، آخر الذکر تقریر اپنی دلچسپی کے باعث ذرا تفصیل کی محتاج ہے۔ ڈاکٹر صالح طوغ جامعہ استانبول کے شعبہ اسلامیات کے ایک نو عمر استاد ہیں، شعبہ قانون کے بھی گریجویٹ ہیں اور اسلامی حکومت کے آمد و خرچ (زکوٰۃ) پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ہے، انہوں نے بتایا کہ امام محمد کا معاصر مغربی یورپ (جرمنی، فرانس، اٹلی) میں سب سے بڑا بادشاہ شارلمان تھا، لیکن وہاں کوئی معاصر بڑا ماہر قانون نہیں ملتا۔ اس زمانے میں قانون نام تھا عرف و عادت اور رسم و رواج کا چاہے وہ احوال شخصی (نکاح طلاق) کے متعلق ہو یا کاروبار اور معاملات کے متعلق، مرو کو طلاق کا غیر محدود حق تھا، لیکن مطلقہ عورت کو نکاح ثانی کی اجازت نہ تھی۔ نکاح میں عورت یا تو اس کے سر پرستوں سے خریدی جاتی تھی یا چوری اور لوٹ میں پکڑ لائی جاتی تھی، تعدد زوجات نہ صرف عوام میں بلکہ عیسائیوں اور پادریوں میں بھی رائج تھا۔ جو تحریری قوانین تھے وہ چند شاہی احکام پر مشتمل تھے جو زیادہ تر شارلمان نے اپنی صرف خاص کی جاگیروں کے انتظام کے متعلق دیے تھے ”کاپی پولا ریا“ نامی ایک زمانہ مابعد کی تالیف ہے، ایک باب شارلمان کے ایسے احکام پر بھی ہے، یہ تھی دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) کے یورپی قانون کی حالت۔

ظاہر ہے کہ اس کا امام محمد کی کتاب الاصل سے (جس میں ساٹھ باب ہیں اور جو مخطوطہ مراد ملا استانبول میں آٹھ جلدوں میں اور تقریباً پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے) کیا مقابلہ، کتاب الاصل کا مقابلہ رومن قانون کی مشہور کتاب ”مجموعہ قوانین جسٹی نین“ بھی نہیں کر سکتی، جسٹی نین رومی (بیزنطینی) بادشاہ تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک سے پانچ سال قبل اس کی وفات ہوئی۔ استانبول کی مشہور مسجد آبا صوفیا اسی نے بنائی تھی۔ یہ پہلے ایک بت خانہ تھا۔ جسٹی نین نے جبراً اس پر قبضہ کر کے اسے عیسائی کلیسا بنایا۔ سلطان محمد ثانی نے ۱۵۵۳ء میں استانبول فتح کیا تو صلیب پرستی کے مرکز کو خدا پرستی کا معبد بنایا۔ جسٹی نین نے رومی قانون کی تالیفوں

میں اختلافات دیکھ کر ایک کمیٹی بنائی کہ وہ ان سے انتخاب کر کے قابل عمل و مناسب احکام کا ایک مجموعہ تیار کرے (اسے فتاویٰ عالمگیریہ سے مشابہ کہا جاسکتا ہے) ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اچھ نہ تھی، اس کے برخلاف امام محمد کے سامنے کوئی نمونہ تھا ہی نہیں، ان کے استاد امام مالک کی موطا فقہ کی کوئی کتاب نہیں، زید بن علی کی کتاب المجموع اگر موجود تھی بھی تو اتنی مختصر کہ روزمرہ کی ضرورتیں بھی اس سے پوری نہیں ہو سکتیں۔

نمائش کتب:

استانبول کی مساجد و مدارس اور خانقاہوں میں ایک سو سے زیادہ کتب خانے تھے۔ اب ان سب کو یکجا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ سلیمانیہ کتب خانہ عمومی میں اب (۹۲) کتب خانے اکٹھا ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ توپ قابی سراے، جامعہ استانبول، ملت، بایزید، کوپرولو، راغب، مرآء، نور عثمانیہ، اسکدار، وغیرہ کے کتب خانے ابھی مستقل عمارتوں میں ہیں۔ سلیمانیہ کتب خانہ عمومی میں اب ڈیڑھ لاکھ سے کم قلمی کتابیں نہ ہوں گی۔ جامعہ کے کتب خانے میں بیس پچیس ہزار مخطوطات ہیں۔ دوسرے کتب خانوں میں سے ہر ایک میں کئی کئی ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ آرشیف کے نام سے سرکاری وثائق و دستاویزات کا ایک تاریخی ذخیرہ ہے جس میں چوالیس (۴۴) ملین دستاویزیں اور رجسٹر ہیں۔

امام محمد کی یادگار میں انکی تالیفوں کے جو مخطوطے ہیں ان کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اسکی کچھ تفصیل بے محل نہ ہوگی:

(۱) کتاب الآثار کے (۱۵) نسخے ہیں۔ بروکلان اور فواد سزگین کی فہرستوں کے مطابق باقی دنیا میں اس کے مزید (۳) نسخے ہیں۔ اس میں فقہی احادیث ہیں اور یہ چھپ بھی گئی ہے۔

(۲) کتاب الاصل جس کو کتاب المسوط بھی کہتے ہیں، ۲۲ نسخے تھے۔ قدیم ترین نسخہ ۶۳۹ھ کا احمد بن محمد اللطیفی الاصفہانی کا لکھا ہوا ہے، باقی دنیا میں ۱۰

اور نسخے ہیں۔ اسکی ایک درمیانی جلد مصر کے قبطی پروفیسر شفیق شحانہ نے کچھ عرصہ ہوا چھاپی تھی۔ اب دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن میں کامل اشاعت ہو رہی ہے اور تاحال دو جلد چھپ چکی ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب کے دنیا کے کسی نسخے میں وقف اور ادب القاضی ہی نہیں حج کا باب بھی نہیں ہے حالانکہ سرخسی وغیرہ اپنی شروح میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ کتاب الاصل کا خلاصہ الحاکم المروزی نے المختصر الکافی کے نام سے مرتب کیا، اس کا ایک بہت پرانا ۴۹۶ھ کا لکھا ہوا قلمی نسخہ نمائش میں رکھا گیا تھا۔ دائرۃ المعارف کی تازہ اشاعت میں حج کا باب اسی المختصر الکافی سے لے کر کتاب الاصل میں شامل کیا گیا ہے۔ سیر صغیر کا ذکر نیچے آتا ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کتاب الاصل کے متعدد ابواب (طہارۃ، صلوٰۃ، صوم، زکوٰۃ، جنایات، سیر) سوال جواب کے طور پر مرتب کیے گئے ہیں۔ مثلاً کتاب السیر میں ”قلت ارایت قال“ کے امام ابو یوسف کا ایک سوال اور امام ابو حنیفہ کا دیا ہوا اس کا جواب ہوتا ہے۔ اس طرح اس باب میں آٹھ سو سے کچھ زائد سوال اور اتنے ہی جواب ہیں۔ میرا تاچیز گمان یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون کی اکاڈمی کی یہ رپوٹیں ہیں اور امام محمد نے ان کو بحکم محفوظ کر دیا۔ ان میں ان کو کسی حذف یا اضافے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ باقی ابواب میں صرف احکام کا مجموعہ ہے جیسا فقہ کی ہر کتاب میں ہوتا ہے۔ سرخسی نے اپنی کتاب المہبوط میں لکھا ہے کہ امام محمد نے اپنی اکثر تالیفوں کو ایک سے زائد بار از سر نو لکھا اور نئے اڈیشن میں اتنی ترمیم کی کہ اس کو سابق سے کوئی تعلق ہی نہ رہا۔

اس نمائش میں ایک نئی چیز یہ نظر آئی کہ کتاب الاصل کے دو مختلف سٹ ہیں، ایک سٹ میں جو اکثریت پر مشتمل ہے، کتاب السیر اسی سوال و جواب کے بیچ پر ہے لیکن دوسرے سٹ مثلاً مخطوطہ جاء اللہ نمبر ۵۷۶ میں یہ

باب عام ابواب کی طرح احکام کی تفصیلات کا مجموعہ ہے۔ دونوں قسم کے مخطوطوں کا سرسری مقابلہ کیا تو ذیلی ابواب اور فصلوں میں بھی کافی فرق نظر آیا جس میں حذف و اضافہ بھی ہے۔ زندگی ہے تو ان شاء اللہ اس کی مزید تدقیق کی جائے گی۔ دوسرے اہل علم بھی اس غلطی کو حل کرنے کی کوشش فرمائیں۔ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس کتاب کے ابواب مستقل کتابوں یا رسالوں کے طور پر بھی ملتے ہیں۔ ابن ندیم وغیرہ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اور کتاب الصلوٰۃ، کتاب الکسب، کتاب الحیل وغیرہ اب بھی مستقل مخطوطات کی صورت میں ملتی ہیں۔

(۳) جامع صغیر کے (۱۳) نسخے تھے۔ باقی دنیا میں (۷) دوسرے نسخوں کا پتا چلتا ہے، یہ کئی بار چھپی ہے۔ اس کی بہت سی شرحوں میں ایک سرخی نے بھی لکھی ہے، جس کا دنیا میں واحد نسخہ استنبول میں ہے۔

(۴) جامع کبیر کے (۴) نسخے تھے۔ (۲) اور نسخے باقی دنیا میں ہیں۔ احیاء المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے اسے بھی چھاپ دیا ہے۔

(۵) کتاب الحج کے یہاں دو نسخے تھے۔ باقی دنیا میں مزید (۲) نسخے ہیں۔ اس میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے فقہی اختلافات کا ذکر ہے جس سے مراد مالکی اور حنفی مذاہب ہیں۔ یہ کتاب بھی حیدرآباد میں چھپ گئی ہے۔

(۶) کتاب الزيادات کے (۴) نسخے تھے، (۲) اور باقی دنیا میں ہیں، یہ آجکل مصر میں وہاں کے ایک نوجوان عالم چھاپ رہے ہیں۔ بہ ظاہر یہ کتاب الاصل کا تتمہ و مکملہ ہے۔

(۷) کتاب زیادات الزيادات کا جس کو سابق الذکر کا ضمیمہ کہنا چاہیے ایک نسخہ تھا، دنیا میں اس کا (۱) مزید نسخہ معلوم ہوا ہے۔ سرخی کی شرح نکت زیادات الزيادات کے ساتھ اسے بھی احیاء المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے

چھاپا ہے۔

(۸)

کتاب السیر الصغیر دنیا میں ناپید سی ہے۔ یہ قانون بین الممالک یعنی جنگ و صلح کے احکام پر مشتمل ہے۔ سرخی نے لکھا ہے کہ اس کی تالیف پر امام محمد کے استاد امام اوزاعی نے تنقید کی کہ اس میں احادیث کا ذکر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کا بطور نظائر ذکر نہ ہونے کی وجہ سے کتاب ناقص ہے۔ اس پر امام محمد نے کتاب السیر الکبیر تالیف کی۔ اس کتاب السیر الصغیر کا اب تک پتا کہیں نہ چلا۔ لیکن مذکورہ بالا کتاب المختصر الکافی الحاکم الروزی نے متعلقہ باب کا عنوان کتاب السیر الصغیر دیا ہے اور اس کی شرح جو البسوط للسرخی کے نام سے موجود و مطبوع ہے اسکی جلد دہم صفحہ (۱۳۳) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جہاں لکھا ہے کہ ”سیر صغیر کی شرح مکمل ہوئی“، لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ کتاب الاصل میں سیر کا باب مروزی اور سرخی کے اس سیر صغیر سے بالکل مختلف ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کتاب الاصل کے باب السیر کے خلاصے میں مروزی کو مناسب یہ معلوم ہوا کہ مولف امام محمد ہی کا مختصر رسالہ سیر صغیر نقل کر دیں۔

(۹)

کتاب السیر الکبیر کا اب کوئی نسخہ نہیں ملتا۔ صرف اس کی شرح جو سرخی نے کی ہے متداول ہے۔ اس کے بیسیوں نسخے ملتے ہیں۔ دائرة المعارف حیدرآباد دکن نے عرصہ ہوا اسے چار جلدوں میں چھاپا تھا۔ چند سال قبل سرخی کی یادگار نمائش میں اس کے سارے نسخے استانبول میں جمع کیے گئے تھے، اس دفعہ اس کا صرف ایک نسخہ جو الحصری کا نقل کردہ بیان کیا گیا ہے، کتب خانہ داماد ابراہیم پاشا سے لا کر نمایاں کیا گیا تھا۔ یہ ۸۷۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ممکن ہے نقل النقل ہو۔

(۱۰)

امام محمد کی طرف ایک عقیدہ بھی منسوب ہے جسے کسی نے منظوم کیا ہے اسکے

کئی نسخے تھے لیکن یہ ذرا مشتبہ ہی ہے۔

(۱۱) الخراج فی الحیل کا ایک نسخہ کتب خانہ شہید علی پاشا سے آیا تھا۔ کتاب الاصل میں بھی حیل کا باب ہے۔ لیکن ان دونوں میں مشابہت نظر نہ آئی۔ زیر نمائش نسخے میں مسائل عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ مروی ہے۔ میں نے تحقیق نہیں کی، اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ امام محمد ہی کی تالیف ہے۔ یا امام ابی یوسف کی یا خود امام ابو حنیفہ کی، سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ حیلہ ہائے شرعی کی اس کتاب پر کسی نے ہارون رشید کے یہاں چغلی کھائی اور امام محمد کو زندیق قرار دیا۔ پولیس آئی، پچنامہ ہوا، اور امام محمد کی ساری کتابوں کو ضبط کر کے ان کی فہرست لکھی گئی۔ انسپٹر نے کتاب الحیل کو کتاب الخلیل (گھوڑوں کی کتاب) پڑھ کر غصے سے ایک طرف پھینک دیا، اور اس کو مال غنیمت میں داخل نہیں کیا۔ اس طرح امام محمد کی خدانے لاج رکھ لی، اس کے مماثل ایک قصہ کتاب الاکراہ کے متعلق ہے جس میں یہ بحث ہے کہ اگر کوئی ظالم بادشاہ جان کی دھمکی دے کہ کسی سے اسکی منکوحہ خوبصورت بیوی کو طلاق دلائے تو اس کا کیا اثر ہوگا۔ ہارون رشید سے درباریوں نے کہا اس باب میں امام محمد نے خلیفہ کو ڈاکوؤں سے مشابہ قرار دیا ہے۔ اس پر پولیس نے ان کا گھر محاصرے میں لے لیا، امام محمد کے ایک شاگرد نے کسی ہمسایہ کے مکان کی چھت سے امام محمد کے مکان میں کود کر اس رسالے کو گھر کے کنوئیں میں پھینک دیا اور پولیس تلاشی کے بعد ناکام واپس گئی۔ امام محمد نے دوبارہ وہ مسائل لکھنے چاہے مگر طبیعت مائل نہ ہوئی۔ چند دن کے بعد اس کنوئیں کو صاف کرانے کے لیے مزدور بلایا۔ اس نے دیکھا کہ ایک کتاب ایک ابھرے ہوئے پتھر پر پڑی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب دوبارہ مل گئی اور اس پر امام محمد کو بڑی مسرت ہوئی۔

(۱۲) کتاب الموطا جو امام مالکؒ سے سنی ہوئی فقہی حدیثوں پر مشتمل ہے، اسکے

(۲۱) نسخے نمایاں کیے گئے تھے۔ دنیا میں اس کے مزید (۳) نسخے ملتے ہیں۔

اس تفصیل سے ناظرین کو استانبول کے کتب خانوں کی ثروت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اگر ساری دنیا کے کتب خانے ایک طرف رکھے جائیں اور استانبول کے کتب خانے ایک طرف تو بھی استانبول کا پلہ بھاری رہے گا۔

امام محمد کی کتاب الامالی جسے الکلیسیات بھی کہتے ہیں استنبول میں نہیں ہے۔

کتب خانہ آصفیہ کے نسخے کی اساس پر اسے حیدرآباد میں چھاپا گیا ہے۔

دوسری کتابوں میں سے کتاب الرأی اور کتاب الاصول ان کی طرف منسوب

ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک لاپتا ہیں۔ کتاب الاصول کا ایک جملہ کہ ”امام محمد کے

مطابق فقہ کے اصول یعنی مصادر چار ہیں“۔ ابو الحسین البصری المعزلی نے اپنی کتاب

المعتمد میں نقل کیا ہے، مولانا ابوالوفاء الافغانی مدظلہ نے لکھا ہے کہ سرخی کی کتاب

الاصول اسی امام محمد کی کتاب الاصل کی شرح ہے لیکن مجھے اس میں تامل ہے کیونکہ سرخی

نے اپنی کتاب کے دیباچے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ امام محمد کی کتاب کی شرح ہے (جیسا

کہ اپنی دوسری تالیفوں کی تمہید میں وہ ہمیشہ بیان کرتے ہیں) بلکہ یہ لکھا ہے کہ امام محمد

کی مختلف کتابوں کی شرح کر چکا ہوں لیکن ان کے طرز استدلال کو سمجھنے کے لیے ایک

مستقل کتاب اصول فقہ پر ضروری ہے۔ اس لیے یہ کتاب املاء کراتا ہوں۔ اور کتاب

کے اندر امام محمد نے کہا کہ..... اور ”اس کی اساس یہ ہے کہ.....“ کا طرز، جو

ان کی دوسری کتابوں میں ہے، اس میں نہیں ملتا۔ میری ناقص رائے میں یہ امام محمد کی

کتاب کی شرح نہیں بلکہ شمس الائمہ سرخی کی اپنی تالیف ہے۔

یہ ہیں مختصر حالات امام محمد کے جشن کے جو ترکی میں منایا گیا۔ ممکن ہے دیگر خفی،

شافعی اور مالکی ممالک بھی اپنا فریضہ یاد کریں۔ جامعہ پارلیس کے کلیہ قانون میں بھی

توقع ہے کہ قریب میں مماثل جشن ترتیب دیا جائے گا۔

(معارف اعظم گڑھ - جون ۱۹۶۹ء)

مولانا روم کی سات سو سالہ برسی

معارف وہ پہلا رسالہ تھا جس نے سال بھر سے زیادہ ہوا کہ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی متوقع سات سو سالہ برسی پر علمی اداروں کی توجہ منعطف کرائی تھی۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۶ ربیع الاول ۶۰۳ھ کو بلخ (افغانستان) میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ ایران میں گزارا، پھر ترکی میں سکونت پذیر ہو گئے اور ۵ جمادی الآخری ۶۷۲ھ کو بمقام قونیہ وفات پائی۔ آپ کا مزار اب تک باعثِ برکات و فیوض ہے۔ کمالی دور کی آندھی جب کچھ تھی تو حکومت نے اس کے بند دروازے پھر سے کھول دیے اور ”مولانا میوزیم“ کے دیکھنے کے لیے ٹکٹ کے ذریعہ ہزاروں امیر و غریب روزانہ اندر جاتے اور لحد مبارک پر فاتحہ پڑھ کر برکت اندوز ہوتے ہیں۔

معارف میں سال بھر قبل سات سو سالہ برسی کی جانب توجہ دلانے کے باوجود اب تک اس کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی اور اس سے دل پر چوٹ لگی کہ خط کے ذریعہ مکرر توجہ دہانی کے باوجود نہ تو زندہ دلان پنجاب کو اس قومی میراث کی خبر لینے کی فرصت ہوئی اور نہ علی گڑھ کی جامعہ اسلامیہ اور حیدر آباد اکاڈمی نے اس کا کوئی جواب دیا۔ یہ ٹیس اس بناء پر اور بھی بڑھ گئی کہ ان خطوط پر روما، جینیوا، گوٹلنک اور مانٹس نے فوراً توجہ کی اور دھوم دھام سے جلسے کر کے اس کا ثبوت دیا کہ رومی مسلمانوں کا نہیں ان فرنگیوں کا مال ہے۔ **اللہم صل علی محمد و آلہ**

آج چند سطریں پارلیس کی تقریب کے متعلق لکھی جاتی ہیں شاید ناظرین کے لیے باعث دلچسپی ہوں۔ ۵ جمادی الآخری ۱۴۳۷ھ جمعہ ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کے مطابق ہوتی

ہے یہاں مسلمانانِ مقیم فرانس کی ایک انجمن ہے جس کا نام Centre Cultural Islamico ہے۔ اس نے پارلیس میں اس تقریب کے منانے کا اہتمام کیا اور چند مقامی مسلمان اہل علم کے علاوہ فرنگی مستشرقین کو بھی تقریر کرنے کی دعوت دی اور بفضلِ خدا بہت شاندار جلسہ ہوا۔ صدارت انجمن کے ایک ممتاز رکن نجم الدین (افغانی) نے کی۔ ایک رکن علی مظاہری (ایرانی) نے حیاتِ رومی پر مقالہ سنایا۔

پروفیسر ماسینیون نے ”رومی کا حصہ اسلامی تصوف کے ارتقاء میں“ پر تقریر کی۔ پروفیسر فتحی اولکو (ترک) نے ”رومی ترکوں کے ہاں“ اور پروفیسر ماسینیون نے ”رومی ترکوں کے ہاں“ اور پروفیسر ماسینیون نے ”رومی ترکوں کے ہاں“ پر مقالہ پڑھا۔ عام شرقیہ و استاذ ادبیات فارسی نے ”فرانسیسی ادبیات میں رومی کا ذکر“ پر مقالہ پڑھا۔ عام دلچسپی کے لیے ایک مقالہ ”قونیہ کی سیر“ پر مادام ویراکوزین نے پڑھا، تھریٹاش خانم (ایرانی) نے مثنوی کے اشعار سنائے۔ ان کا فرانسیسی ترجمہ ویراکوزین نے سنایا، گرمی محفل کے لیے حکایت نے بشنوسی گئی اور ایک مشہور نے نواز نے گرامافون کے ریکارڈ سے لوگوں کو محفوظ کیا۔ سب سے زیادہ مؤثر قرآن مجید کی تلاوت تھی۔ جس سے پتھر کے دل بھی دہل گئے۔ ایک لبنانی عالم شیخ صبحی صالح نے موقع کی مناسبت سے اللہ نُور السموات الایۃ کی تلاوت کچھ اس پر درلجن سے کی کہ ہفتوں گزر جانے کے بعد بھی لوگ اس کا ذکر کرتے اور داد دیتے رہے۔ آدھی رات کو جلسہ خیر و خوبی سے اختتام کو پہنچا، حاضرین میں کئی سفیر بہ کثرت اساتذہ مختلف ملکوں کے بہت سے گورے، کالے، ساونے، پیلے سب ہی موجود تھے۔ جلسہ میوزے گیمے میں ہوا۔ اس جلسہ گاہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی اجازت وزیر اعظم فرانس سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ مولانا کے متعلق ایک مختصر نمائش بھی فوٹو کے ذریعہ ترتیب دی گئی۔

صدر جلسہ نے بتایا کہ مولانا روم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں ہیں۔ اس لیے نسلِ ایرانی بلخ میں پیدا ہوئے۔ (اس لیے وطنِ افغانی) ایران میں پرورش پائی اور فارسی میں اظہار خیال کیا، اس لحاظ سے ایرانی اور قونیہ رہ پڑے اور وہاں وفات پائی، اس کے اعتبار سے ترکی ہیں۔ آپ کی تعلیم قرآن مجید کی تفسیر اور حدیث نبوی کی تشریح تھی۔ ایک سچے مسلمان اور صوفی کی حیثیت سے آپ سارے انسانوں کی

میراث اور ساری دنیا کے لیے باعثِ نازش ہیں۔ وغیرہ وغیرہ
 دوسری تقریروں اور مقالوں کا خلاصہ آسان نہیں۔ تقریریں مختصر اور ٹھوس تھیں۔
 ترکی میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ہمیشہ سے جو قدر رہی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ
 سلاطین آل عثمان کی تاج پوشی مولانا کے احفاد ہی میں سے کسی نہ کسی بزرگ کے ہاتھوں
 سے ہوتی تھی۔ مثنوی کا ترکی ترجمہ ہر گھر میں رہتا ہے اور قرآن مجید کے بعد اسی کی
 سب سے زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔

جلے میں بہت سے بیرونی پیام بھی جو موصول ہوئے تھے سنائے گئے، ایک
 حضرت ولد چلی کا تھا جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سب سے معمر اور سب سے
 زیادہ محترم بزرگ ہیں۔ آپ کا دستخطی پیام عربی خط میں بسترِ علالت سے ترکی سے آیا
 تھا۔ بلدیہ قونیہ نے مولانا کے ہمسایوں کے جذباتِ محبت کے اظہار کے لیے ایک طویل
 تار بھیجا تھا۔ استنبول کے ایک بزرگ نے بھی جو شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں
 تار پر پیام بھیجا تھا۔ ترکی، لبنان، اردن، افغانستان و ایران وغیرہ کے وزرائے تعلیم اور
 اکاڈمیوں نے اپنی وابستگی کا یقین دلایا۔

پاریس ریڈیو نے اس یادگار کے نظام العمل کو نشر کیا اور سوئٹزر لینڈ کے ریڈیو
 نے بھی اسے لے کر نشر کیا۔ گوئنگن (جرمنی) کے جلے کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ
 اس کا آغاز ایک جرمن پروفیسر کی فارسی تقریر سے ہوا۔ روم میں مولانا روم کے خاص
 عقیدتمند پروفیسر باوزائی نے مولانا کے ادبی، صوفیانہ اور دوسرے پہلوؤں پر نہایت میر
 حاصل تقریر کی جو توقع ہے کہ عنقریب وہاں کے رسالہ مستشرقین میں چھپ جائے گی۔
 پاریس کی تقریروں کو بھی ”یاد رومی“ کے نام سے ایک رسالے کے طور پر یکجا چھاپنے کی
 تجویز ہے۔

(معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۵۳ء)

شمس الائمہ السرخسی

مشہور حنفی فقیہ شمس الائمہ سرخسی کی وفات ۴۸۳ھ میں ہوئی۔ سال رواں میں اس پر پورے نو سو سال گزرتے ہیں۔ اُن کی زندگی اور کارناموں کی یاد جہاں ہمارا اخلاقی فریضہ ہے، وہیں بہت سبق آموز بھی ہے۔ کیت کے لحاظ سے بے شبہ وہ سب سے بڑے حنفی مؤلف فقہ ہیں (ان کی کتاب ”المبسوط“ تیس جلدوں میں چھپی ہے) کیفیت کے لحاظ سے کمال پاشا زادہ نے ان کو مجتہدین کے طبقہ ثالث میں خصاف و طحاوی، اور کرخی و حلوانی کے ہم پایہ تسلیم کیا ہے (۱)۔

وہ اپنا نام اپنی کتابوں یا ان کے ابواب کے آغاز پر خود ہی ابو بکر محمد بن ابی سہل احمد لکھتے ہیں، اس لیے بعض سوانح نگاروں کا یہ بیان سہو سمجھنا چاہیے کہ ان کا نام محمد بن احمد بن ابی سہل تھا۔ غالباً وہ سرخس میں پیدا ہوئے، جیسا کہ ان کی نسبت سے ہویدا ہوتا ہے۔ یہ شہر تاریخ اسلام میں عرصہ دراز تک بڑا مردم خیز رہا ہے۔ متعدد مشہور فقہاء، طبیب، وزرا وغیرہ یہاں کی خاک سے پیدا ہوئے۔ آج کل یہ ایرانی روستی سرحد پر دونوں مملکتوں میں آدھا آدھا بٹا ہوا ہے؛ دریاے ہری رود اس کے بیچ میں سے گزرتا ہے۔

سوانح نگاروں میں سے متقدمین ان کی تاریخ ولادت بیان نہیں کرتے۔ متاخرین میں فقیر محمد جہلمی (۲) نے اور عبدالحی لکھنوی (۳) نے صراحت کی ہے کہ وہ ۴۸۳ھ میں پیدا ہوئے اور دس سال کی عمر میں باپ کے ساتھ، جو تجارت پیشہ تھے،

بغداد آئے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے اپنی سوانح عمریوں کی مشہور کتاب ”الفوائد البہیۃ“ میں سرخی کے اور حالات تو دیے ہیں، لیکن تاریخ ولادت بیان نہیں کی۔ لیکن چونکہ مزید حالات کے لیے انہوں نے اپنی قدیم تر کتاب (مقدمۃ الہدایہ) کا حوالہ دیا ہے، اس لیے گویا اس تاریخ کی وہ توثیق کرتے ہیں۔ اس تاریخ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سرخی کے استاد شمس الائمہ حلوانی کی وفات ۴۳۸ھ میں ہوئی، اور مشہور ترین و ممتاز ترین شاگرد ہونے کی حیثیت سے وہ نہ صرف استاد کے درسگاہ ہی میں جانشین ہوئے، بلکہ ان کے لقب ”شمس الائمہ“ کے بھی زبانِ خلق سے وارث قرار پائے۔ یہ بات کسی نوعمر طالب علم کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھی۔

حلوانی شہر بخارا میں درس دیتے تھے۔ لکھا ہے کہ سرخی سالہائے دراز تک ان کے درس میں حاضر رہے۔ سرخی نے اپنی ”شرح السیر الکبیر“ کے شروع میں صراحت کی ہے کہ میں نے حلوانی کے علاوہ شیخ الاسلام ابوالحسن علی بن محمد بن الحسین بن محمد السغدی (ف ۴۶۱ھ) سے بھی کتاب مذکور کا درس لیا۔ اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے، کیونکہ سغدی نے بھی ”السیر الکبیر“ کی ایک شرح لکھی تھی۔ ان کے تیس استادوں میں ابو حفص عمر بن منصور الہز از بھی ہیں؛ لیکن اُن سے سرخی نے ”السیر الکبیر“ کا درس اُن کے اس کی شرح لکھنے سے قبل لیا۔

ان کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ مولانا فقیر محمد نے انہی کی زبانی نقل کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مآخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن عبارت صاف عربی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں (۴):

”ایک دن کا ذکر ہے کہ طالب علم آپ سے اس کنوئیں پر جس میں آپ قید تھے، سبق پڑھ رہے تھے۔ ایک طالب علم کی آواز آپ نے نہ سنی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ ایک طالب علم نے کہا: وضو کرنے گیا ہے اور میں بہ سبب سردی کے وضو نہیں کر سکا۔ امام نے فرمایا کہ: عافاک اللہ، تجھے

شرم نہیں آتی کہ اس قدر سردی میں تو وضو نہیں کر سکتا؟ حالانکہ مجھ کو طابع علمی کے وقت بخارا میں ایک دفعہ عارضہ شکم کا لاحق ہوا تھا، جس سے مجھ کو چالیس دفعہ قضاے حاجت ہوئی۔ پس میں ہر دفعہ نالے سے وضو کرتا تھا؛ جب مکان پر آتا تھا تو میری دوات بہ سبب سردی کے جم گئی ہوتی تھی، پس میں اس کو اپنے سینے پر رکھ لیتا، جب وہ سینے کی گرمی سے حل ہو جاتی، تو اس سے تعلیقات لکھتا تھا۔“

ایک زمانے میں ان کے استاذ حلوانی نے ”صفہ أشرط الساعة ومقامات القيامة“ پر درس کا سلسلہ شروع کیا۔ سرخی نے اس املا کو قلمبند کیا، اور خوش قسمتی سے یہ کتاب محفوظ رہ گئی ہے۔ اس کا واحد نسخہ پیرس کے کتب خانہ عمومی میں (۵) ہے اس کی تمہید کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں:

سئل الشيخ الامام شمس الائمة (الحلواني)
رحمه الله عن مقامات القيامة و قيام الساعة:
هل ورد فيها حديث صحيح؟ قال: ورد
وهذا الحديث الواحد أسلم الأحاديث في
ذلك- وهو ما حدثني الفقيه أبوبكر محمد بن
على سنة خمس وأربع مائة

تاریخ سے یہ دقیق اعتنا سرخی نے اپنے استاذ ہی سے سیکھا تھا، جسے انہوں نے خود بھی جاری رکھا۔

ان کے قدیم ترین سوانح نگار ابن فضل اللہ العری (ف ۴۹۷ھ) نے انہیں ”متکلماً فقیہاً اصولیاً مناظراً“ لکھا ہے (۶)۔ فقہ اور اصول فقہ پر ان کی کتابیں چھپ گئی ہیں۔ ”صفہ اشرط الساعة“ کو شاید علم کلام کی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے اپنے ہمعصروں کے ساتھ علمی مناظروں کے کوئی اور آثار تو محفوظ نہیں

رہے لیکن ان کا قید کیا جانا اسی کا شاخسانہ سمجھنا چاہیے کہ حکمران وقت کی بھی پروا نہ کی اور حق کی خاطر قید گوارا کر لی۔ اس کے سوا ہمیں ان کی زندگی کے اور کوئی حالات معلوم نہیں، بجز اس کے کہ ان کے زمانہ قید کی ایک یادداشت میں (۷) ان کا درود ان الفاظ میں ظاہر ہوا ہے: ”الممنوع عن الاھل والولد والکتاب المجموعہ“ لیکن بیوی بچوں کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، حتیٰ کہ قید سے رہائی کے بعد بھی سوانح نگار اس کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔

اسباب حبس:

اپنی مختلف کتابوں کے دیباچوں، خاتموں یا دوران میں وہ خود بیان کرتے ہیں کہ یہ زمانہ قید کا املا ہے، یا کہ میں ان دنوں اوجہد کے قلعے میں قید ہوں۔ بالآخر جب رہائی ہوئی تو وہاں سے مرغیان چلے گئے، جہاں ایک زیر املا کتاب یعنی ”شرح السیر الکبیر“ کا مکمل مکمل فرمایا۔ لیکن کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس قید کا باعث کیا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (ذریفہ ”سرخس“) میں میفیتنگ نے تحریفِ مآخذ کر کے لکھا ہے ”غالباً انہیں اس لیے قید کیا گیا کہ اُم ولد کے نکاح کے متعلق انہوں نے حکمران وقت کے فعل پر شرعی نقطہ نظر سے اعتراض کیا تھا۔“ لیکن یہ گمان قابل رد ہے، اولاً اس لیے کہ سارے مآخذ صراحت کرتے ہیں کہ ان کا یہ اعتراض رہائی کے بعد کا واقعہ ہے؛ دوسرے یہ کہ حکمران خود تو کسی حینہ سے نکاح کرنے کا خواہش مند تھا نہیں کہ وہ اس فتوے پر ناراض ہوتا، اور تیسرے، مآخذوں سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ امام کی غائر بینی اور نکتہ رسی سے خفا ہونا تو درکنار وہ ان کا اور گرویدہ ہو گیا تھا۔

جامعہ استانبول کے ”عمومی ترکی تاریخ“ کے پروفیسر احمد زکی ولیدی طوغان نے ایک مرتبہ زبانی گفتگو کے دوران میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس زمانے میں ابو نصر احمد بن سلیمان الکاسانی نامی ایک بدطینت شخص تھا۔ یہ پہلے قاضی القضاۃ بنا، پھر وزیر؛ اور بالآخر بادشاہ کے حکم سے اس نے سزائے موت پائی۔ یہ سب کچھ اُسی کا کیا دھرا ہے۔ لیکن طوغان صاحب کے اس بیان سے اول تو قید کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، دوسرے

یہ شخص مغربی قرہ خانیوں کا وزیر تھا، اور ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اوز جند (جہاں سرخی قید رہے، اور جو مشرقی قرہ خانیوں کا پایہ تخت رہا ہے) اُس زمانے میں مغربی قرہ خانی خاقان کے زیر نگین رہا ہے۔

شہاب الدین المرجانی (ف ۳۰۷ھ) نے ”عرفۃ الحواقین فی عرفۃ الحواقین“ کے نام سے ترکستانی حکمرانوں کی جو تاریخ لکھی اور جو ۱۲۸ھ میں قازان میں چھپی تھی، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ خاقان شمس الملک نصر (۳۶۱ھ - ۳۷۳ھ) جس نے ۳۶۱ھ میں فقیہ ابوالبرہم اسماعیل بن شیث الواکلی الصفار کو سزائے موت دی تھی، غالباً اُسی نے سرخی کو بھی قید کیا تھا۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، سرخی ۳۸۰ھ میں قید سے رہا ہوئے اس اثنا میں ان مغربی قرہ خانیوں کے تین حکمران تخت نشین رہ چکے تھے۔

- ۱۔ نصر ۳۶۰ھ تا ۳۷۳ھ
- ۲۔ اس کا بھائی خضر خان ۳۷۳ھ تا ۳۷۴ھ
- ۳۔ اس کا بیٹا احمد بن خضر خان ۳۷۴ھ تا ۳۸۷ھ

سرخی کی سی بااثر اور ممتاز شخصیت ان تین حکمرانوں کے دور میں مسلسل قید رہی ہو، یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی۔

ہیفیتک (حوالہ بالا) نے قید کو ”خاقان حسن“ کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب رہا ہوئے تو انہوں نے مرغینان میں ”امیر حسن“ کے مہمان رہ کر اس کے محل کی دہلیز پر ”شرح السیر الکبیر“ کے باقی حصے کی تکمیل کی۔ خاقان حسن اور امیر حسن کیا ایک ہی شخص ہیں؟ بے شک سوانح نگار ابن قطلوبغا نے امیر حسن کا ذکر کیا ہے لیکن خاقان کو یا تو کاشغر میں رہنا چاہیے تھا یا اوز جند میں کہ یہی دونوں پایہ تخت بیان کیے جاتے ہیں۔ مرغینان جیسے صوبائی شہر میں قصر شاہی کا ہونا درست نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس زمانے میں ایک خاقان مغربی قرہ خانیوں کا حکمران تھا (۳۶۷ھ - ۳۹۵ھ)۔ اس کا پایہ تخت کاشغر اور ذیلی پایہ تخت اوز جند ہی تھا۔ حال میں کچھ پرانے کاغذات دستیاب ہوئے ہیں، جو کاشغر کے انگریز قنصل نے دہلی بھیج دیے تھے (غالباً اب بھی وہیں ہوں

گے۔ ان میں امیر الحسن بن سلیمان ارسلان قراخاقان نامی حکمران کے ایک شخص کو یارکندہ (یارکند) کا قاضی نامزد کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ اس دستاویز کی تاریخ مٹ سی گئی ہے، ۴۷۳ھ اور ۴۹۴ھ دونوں پڑھے جاسکتے ہیں (۹)۔ لیکن یہ خیال آرائی اس بنا پر قابل قبول نہیں کہ خود سرخسی کے اپنے بیان کے مطابق جب وہ قید سے رہا ہوئے، تو مرغینان میں امام سیف الدین ابراہیم بن اسحاق (بعض مخطوطوں میں: سیف الدین ابوالبراہیم اسحاق بن اسماعیل) کے مہمان رہے اور انہی کے گھر پر انہوں نے تدریس و املا کا ماقبی کام سرانجام (۱۰) کیا۔ یہ ممکن ہے کہ مرغینان کے امیر یعنی گورنر کا نام حسن ہو، اور اُم ولد کے نکاح کا مشہور واقعہ بھی اسی سے متعلق ہو۔ لیکن خاقان حسن کے متعلق، جس کا نام ہیفینگ نے لیا ہے، کسی ماخذ میں صراحت نہیں ملتی۔

اس سلسلے میں ممکن ہے کہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم، سابق صدر شعبہ دینیات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا خیال صحیح ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں صلیبی جنگوں کے باعث عالم اسلامی میں بحران تھا۔ ہر روز نئے نئے ٹیکس لگ رہے اور بے پناہ مظالم ہو رہے تھے؛ سرخسی نے بعض ٹیکسوں کو ناجائز قرار دیا، اور گویا عدم ادائیگی حاصل کی تحریک کی قیادت کی تھی۔ اس پر قید ناگزیر تھی۔ مجھے سرخسی کے ایک سوانح نگار محمود بن سلیمان الکفوی کے ہاں اس کا تائیدی مواد ملا ہے (۱۱)۔ فرماتے ہیں: فی فتاویٰ قاضی خان فی فصل من یوضع فیہ النذور: السلطان الجائر اذا أخذ صدقہ الأموال الظاہرة، اختلفوا فیہ۔ والصحیح ما قال أبو جعفر أنه یسقط الزکاة عن أربابہا، ولا یؤمر بالاداء ثانیاً، لأن له ولاية الاخذ، فصح أخذہ و ان لم یضع الصدقة فی موضعها؛ وان أخذ الجبايات أو أخذ مالا بطریق المصادرة، ونوی صاحب المال عند الدفع الزکاة، اختلفوا فیہ۔ قال بعضهم: لاتصح۔ وقال شمس الأئمة: الصحیح أنه یجوز فتسقط عنه الزکاة۔“ یعنی سرخسی کی رائے میں ناجائز محصول کی ادائیگی کے بعد جائز محصول کی ادائیگی کا وجوب باقی نہیں رہتا۔ مولانا فقیر محمد کے الفاظ ہیں (۱۲): ”جب آپ کو ظالم نے قید کر کے اُوز جند کی طرف بھیجا..... الخ“ اس

سے گمان ہوتا ہے کہ آپ کو بخارا میں قید کر کے اوز جند جلا وطن کیا گیا تھا۔
زمانہ قید کی قابل رشک علمی سرگرمی:

قلعہ اوز جند کے سپاہی اور افسر احکام حکومت کے تابعدار تو تھے، لیکن امام سرخی جیسی زاہد و دیندار شخصیت سے عقیدت اور احترام کے برتاؤ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ ابتدائی زمانہ جس نفسی کیفیت میں بھی گذرا ہو، لیکن بعد میں تو کوئی نہ کوئی مشغولیت پیدا کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ سرخی کی عرصے سے خواہش تھی کہ امام محمد شیبانی کی ”کتاب الاصل“ کا جو خلاصہ ”المختصر“ (نیز ”الکافی“، یا ”المختصر الکافی“) کے نام سے محمد بن احمد الحاکم المروزی نے کیا تھا، اس کی شرح لکھیں۔ زمانہ قید میں عقیدتمندوں نے اس کی یاد دلائی، اور خود سرخی کے الفاظ ہیں:

”وقد انضم الى ذلك سؤال بعض الخواص من
 أصحابي زمن حبسي، حين ساعدوني لأني أن
 اسلي عليهم ذلك- فأجبتهم اليه، وأسأل الله
 التوفيق-“ ۱۳

امام محمد کی ”کتاب الاصل“ ابھی چھپی نہیں (بجز ایک باب کے) مخطوطہ عاطف و استانبول، (نمبر ۷۴۲ تا ۷۴۵) کی چاروں جلدوں کی ضخامت ۲۵۳ + ۲۳۶ + ۲۷۳ + ۲۷۳ = ۱۰۰۳ ورق ہے۔ مروزی کی ”المختصر الکافی“ کے مخطوطہ فیض اللہ (نمبر ۹۲۳) میں ۶۰۱ ورق ہیں۔ سرخی نے اس آخر الذکر کی جو شرح ”مبسوط“ کے نام سے لکھی تھی، وہ مصر میں بڑی تقطیع کی تیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے جس کے جملہ ۶۳۳۵ صفحے ہیں۔ اسی طرح سرخی نے امام محمد کی ”جامع صغیر“، ”جامع کبیر“، ”زیادات“ اور ”زیادات الزیادات“ کی شرحیں بھی اسی قید خانے میں املا کرائیں۔ ان میں سے آخر الذکر احیاء المعارف حیدرآباد کی طرف سے چھپی ہے۔ ”شرح جامع کبیر“ کا ایک ٹکڑا مصر میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔

بعد ازاں انہوں نے قید ہی میں اصول فقہ پر ایک کتاب املا کرائی، تاکہ امام محمد

کی کتابوں کی شرح میں جو باتیں بیان کی گئی تھیں، ان کے اصول اور اساسات بھی معلوم ہو جائیں۔ یہ کتاب بھی دو جلدوں میں احیاء المعارف حیدرآباد نے شائع کر دی ہے۔

قید کے آخری زمانے میں انہوں نے امام محمد کی ”سیر کبیر“ کی، جو قانون بین الممالک کی ایک اہم کتاب ہے اور جس کا یونیسکو کی جانب سے ترجمہ بھی ہو رہا ہے، شرح الماکرانی شروع کی۔ اسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے (۳۶۸+۳۱۳+۳۳۹+۳۸۸=۱۳۰۸ صفحوں کی چار ضخیم جلدوں میں) شائع کیا ہے، اور اب ایک نیا ایڈیشن مصر میں بھی چھپ رہا ہے۔ سرحدی کتاب کے باب الشروط تک (جو چوتھی جلد سے صفحہ ۶۰ سے شروع ہوتا ہے، یعنی ۱۰۸۰ صفحات کے اختتام تک) پہنچے تھے کہ بالآخر انہیں رہائی ملی۔ جیسا کہ ذکر ہوا۔ باقی الماکرانی کے ۳۲۸ صفحے انہوں نے مرغینان پہنچ کر دس دن میں مکمل کرائے۔

قید کی مدت:

اس عظیم الشان کام کی بعض تاریخیں معلوم ہیں:

- ۱۔ ”مبسوط“، ج ۲، ص ۱۲۴ سے شروع ہونے والی کتاب المعامل کا آغاز
چهارشنبه ۱۲ ربیع الاول ۱۲۶۶ھ
- ۲۔ ”مبسوط“، ج ۳، ص ۲۸۷ سے شروع ہونے والی کتاب الرضاع کا آغاز
پنجشنبه ۱۲ جمادی الآخر ۱۲۷۷ھ
- ۳۔ ”اصول الفقہ“ کا آغاز
شنبه ۱۲ شوال ۱۲۷۹ھ
- ۴۔ ”شرح السیر الکبیر“ کا آغاز
دوشنبہ یکم ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ (ایک روایت میں)
- ۵۔ قید سے رہائی
جمعہ ۲۰ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ
- ۶۔ قید کے مقام یعنی شہر اوزجند سے روانگی
یکشنبه ۱۲ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ
- ۷۔ مرغینان میں آمد
چهارشنبه ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ

- ۸۔ مکرر آغاز املا، تکمیل کار کے لیے چار شنبہ ۲۴ ربیع الآخر ۱۲۸۰ھ
- ۹۔ ”شرح السیر الکبیر“ کے املا کی تکمیل جمعہ ۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۸۰ھ

ان تاریخوں میں پیچیدگیاں بھی ہیں۔ مثلاً نمبر (۳) غالباً ۲۹ شوال ہے، (جسے سلح آخری تاریخ) سے تعبیر کر کے روز شنبہ تو بیان کیا گیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ مہینا تیس کا ہوا، اسی لیے نمبر (۴) میں یکم ذی قعدہ یکشنبہ کی بجائے دو شنبہ کو لکھا ہے، لیکن نمبر (۳) کی تصحیح نہ کی۔ مزید برآں یہ بھی قرین قیاس نہیں کہ ”اصول الفقہ“ اور ”شرح السیر الکبیر“ دونوں کا املا ایک ساتھ شروع ہوا ہو۔ رہا دنوں کا تفاوت، تو اس کے متعلق فرنگی مؤلفوں نے ہجری عیسوی سنین کے تطابق کی جو جنتریاں شائع کی ہیں وہ پورے طور پر قابل اعتماد نہیں۔ وہ ہجری مہینے کی پوری مدت (۲۹) دن (۱۲) گھنٹے (۴۴) منٹ (۲/۱۰) سیکنڈ کا حساب کر کے یکم محرم تو ٹھیک بتا دیتے ہیں، لیکن سال کے (۳۵۴) دنوں کو بارہ مہینوں میں بانٹنے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ ہر سال محرم تیس دن کا ہوگا، جو ظاہر ہے کہ کسی طرح مطابق واقعہ نہیں۔ اس لیے وسلفڈ اور کاتوز کی جنتریوں میں زیر بحث تاریخوں کے جو دن بیان ہوئے ہیں، وہ بعض صورتوں میں سرخی کے بیان کے مطابق ہیں اور بعض میں نہیں۔ انتیس کو ابر کے باعث رویت نہ ہو، تو سرخی کے زمانے میں اس کے اثرات بھی پڑنے ناگزیر تھے۔ اس سے قطع نظر، نمبر (۱) اور (۲) بھی دشواری پیدا کرتے ہیں۔ نمبر (۱) کے مطابق کتاب المعامل جو ستائیسویں جلد میں ہے، ۱۲۶۶ھ میں شروع ہوئی اور نمبر (۲) کے مطابق ”کتاب الرضاع“ جو تیسویں میں ہے، ۱۲۷۷ھ میں شروع ہوئی۔ گویا تین جلدیں گیارہ سال میں تمام ہوئیں۔ ساری تیس جلدیں اس رفتار سے کہیں (۱۱۰) سال میں پوری ہوتیں پھر یہی نہیں یہ تاریخ ۱۲۷۷ھ مصر کے ایک مخطوطے (۱۴) میں ہے۔ مصر ہی کے ایک دوسرے مخطوطے (۱۵)، نیز استانبول و دمشق کے (۱۶) مخطوطوں میں سال ۱۲۷۹ھ ہے۔ دوسرے لفظوں میں تین جلدیں گیارہ نہیں، تیرہ سال میں املا کرائی گئیں، گویا ساری کتاب ”المبسوط“ (۱۳۰) میں پوری ہوئی، یہ سارا عرصہ قید میں گذرا، اور رہائی مزید ایک سال بعد ۱۲۸۰ھ میں ہوئی، یعنی (۱۳۱)

سال قید میں گذرے۔ حالانکہ ولادت ۴۰۰ھ میں اور وفات ۴۸۳ھ میں بیان ہوئی ہے۔ اس طرح یہ سارا واقعہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ ”اصول الفقہ“ کا آغاز ۲۹ شوال ۴۷۹ھ کو ہوتا ہے اور ایک اور بیان کے مطابق ”شرح السیر الکبیر“ کا آغاز ایک دن بعد کیم ذی قعدہ ۴۷۹ھ کو ہوتا ہے، اور جب اس کے چار ماہ میں دن بعد رہائی ہوئی ہے، تو اس وقت ”اصول الفقہ“ تمام ہو چکی تھی (اس کے ۸۰۰ مطبوعہ صفحے ہیں)، اور ”شرح السیر الکبیر“ کے (۱۲۸۰) صفحے بھی املا ہو چکے تھے یعنی چار ماہ میں دن میں دو ہزار سے زائد صفحے املا کرائے گئے، بعد ازاں مرغینان میں مکرر کام شروع کیا، تو صرف دس دن میں (۳۲۸) صفحے املا کرائے گئے۔ اگر روزانہ (۳۲) صفحے املا کرنا ممکن ہے تو مبسوط کی تین جلدوں کے (۷۸۳) صفحے گیارہ یا تیرہ سال (یعنی ۳۸۹۴ یا ۴۶۰۲ دن) میں کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے ”مبسوط“ (۸۰:۸) میں سرخی خود کہتے ہیں کہ دو سال سے قید میں ہوں۔ اگر دو سال میں ساڑھے سات، آٹھ جلدیں مکمل ہو سکتی ہیں (جن میں ۱۷۰۲ صفحے ہیں) تو تین جلدوں (کے ۷۸۳ صفحوں) کو گیارہ یا تیرہ سال کیوں لگیں۔

میری رائے میں اصل قصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمبر (۱) کے ۴۶۶ھ کا تعلق اصل میں ”مبسوط“ کے آغاز سے ہے جو کسی سہو سے ستائیسویں جلد میں آ گیا ہے۔ مثلاً ستائیسویں جلد املا کراتے وقت درود دل کے تحت سوچا کہ کب سے یہ کام چل رہا ہے اور خیال کیا کہ اس ابتلا کی یادداشت ان آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑی جائے جو اس پر پڑھیں گی، اور جب یاد آیا کہ یہ ۴۶۶ھ سے شروع ہوا تو املا کراتے ہوئے کہا ہو گا کہ اسے کتاب کے آغاز میں لکھ لو۔ ظاہر ہے کہ طالب علموں نے اس وقت تو ستائیسویں جلد ہی میں استاد کے الفاظ نقل کرنا تھے، اگرچہ خواہش یہی ہو گی کہ گھر جا کر مناسب اصلاح کر لیں گے۔ فرض کیجیے کہ ”مبسوط“ کا موجودہ متن اس طالب علم کی بیاض پر مبنی ہے جو (۱) گھر جانے کے بعد بھول گیا کہ تاریخ کی تصحیح کرنی ہے، یا (۲) وہ خود اس دن موجود ہی نہ تھا اور اس نے کسی رفیق کا نسخہ مستعار لے کر اس دن کا املا نقل تو کر لیا، لیکن رفیق

سے یہ تحقیق نہ کر سکا کہ استاد نے زبانی کیا کہا تھا، یا (۳) وہ املا میں موجود تو تھا، لیکن کسی وجہ سے استاد کا وہ جملہ کتاب کے آغاز میں نقل کرنے کی ہدایت پر مشتمل تھا، مثلاً اس لیے کہ وہ درس میں کچھ دیر سے پہنچا، یا (۴) ابتدائی مسودات املا کی بعد میں ترمیم ہوئی اور یہ ترمیم ایک دو نسل بعد ہوئی۔ غرض متعدد امکانات ہیں۔

ان امکانات کی تائید دو تین واقعات سے ہوتی ہے:

(الف) ”مبسوط“ میں تاریخ کے ساتھ درود کا اظہار تو دو جگہ پر ہے، لیکن بلا تاریخ اپنے قید و بند پر اظہار درد، مجھے دو نہیں، مندرجہ ذیل سولہ مقاموں پر ملا ہے:

(۱) آغاز کتاب پر ”مبسوط“ ۴، ۳، ۲: ۱

(۲) آخر المناک ۱۹۲: ۴

(۳) آخر النکاح ۲۲۹: ۵

(۴) آخر اللعان ۵۹: ۷

(۵) آخر الایمان ۲۴۱: ۷

(۶) آخر شریکۃ الکاتب ۸۰: ۸

(۷) آخر کتاب الولاء، بحق مافی البطن ۱۲۵: ۸

(مطبوعہ نسخے میں تو نہیں، لیکن بعض مخطوطوں میں مثلاً کو پرولو،

استانبول، کتاب السرقة کے آخر میں بھی ایک یادداشت ہے)

(۸) آخر کتاب السیر ۱۴۴: ۱۰

(۹) دردوران بیوع ۱۰۸: ۱۲

(۱۰) آغاز کتاب القسمة ۲: ۱۵

(۱۱) مطبوعہ نسخے میں تو نہیں لیکن توفیقائی احمد ثالث کے مخطوطے میں ادب القاضی کے آخر میں۔

(۱۲) ایضاً، در آخر کتاب الرجوع عن الشہادات

(۱۳) ایضاً، در آخر کتاب الاقرار

(۱۴) ایضاً، در آخر کتاب الوکالۃ

(۱۵) آغاز کتاب المعاملۃ ۱۲۴:۲۷

(۱۶) آغاز کتاب الکسب (۲۴۴:۳۰)، نیز آغاز کتاب الرضاع ۲۸۷:۳۰

(ب) ان میں سے چھٹے مقام پر وضاحت ہے: ”بما ملاء المحصور المعاتب والمحبوس المعاقب وهو منذحولین علی الصبر مواظب“ یعنی دو سال سے قید میں ہیں۔

(ج) جتنے قدیم مخطوطے ملے ہیں، ان سب میں صراحت ہے کہ وہ محمود ابن احمد بن عبد السید الحصری کا نسخہ ہیں یا اس سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ صاحب سرخسی سے تین نسل بعد دمشق میں آئے تھے۔ ممکن ہے ان کا تعلق سرخسی کے شاگرد ابو بکر محمد بن ابراہیم الحصری کے خاندان یا کسی شاگردوں کے خاندان سے ہو۔ وہ کسی سیاسی انقلاب میں ترکستان چھوڑ کر شام آئے اور اپنے ساتھ کتابوں کا جو ذخیرہ لائے، اس میں ان کے جد کے مسودات (”کتاب المبسوط“ کے متعلق) بھی ہوں گے، جن کی انہوں نے تہیض کی تاکہ درس و فقہات میں کام آئیں؛ ابن قطلوبغا نے تاج التراجم میں لکھا ہے کہ جمال الدین ابو الحامد محمود بن احمد بن عبد السید بن عثمان بن نصر بن عبد الملک الحصری کی ولادت بخارا میں جمادی الاولیٰ ۵۴۶ھ میں ہوئی اور وفات ۸ صفر ۶۳۶ھ کو، ”ونسخ بخطه

المبسوط و شرح السیر (الکبیر) وغیرہما.....“

غرض گمان ہوتا ہے کہ سرخسی ۴۶۶ھ سے ۴۸۰ھ تک قید کی ابتلا میں رہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے کہ ان کا قید کا یہ زمانہ ہم بے قیدوں سے لاکھ درجے بہتر گذرا، اور انہوں نے ہمیں اسیر منت فرمایا۔

تاریخ وفات عام طور پر ۴۸۳ھ بیان کی جاتی ہے۔ بعض جگہ ”فی حدود اقصین“ اور بعض جگہ ”حدود خمس مائۃ“ کے مبہم اور تخمینہ الفاظ بھی ملتے ہیں لیکن ابن قطلوبغا، کفوی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ ”فخرج فی اخر عمره الی فرغانہ“ ہم جانتے ہیں کہ خود سرخسی کے بیان کے مطابق وہ ۴۸۰ھ میں علاقہ فرغانہ کے شہر

مرغیان میں جا بٹھرے تھے، لہذا سال وفات ۴۸۳ھ ہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے تو ماہ جمادی الاولیٰ کی صراحت کی ہے، لیکن اپنا ماخذ نہیں بتایا۔ یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ یہ اختلاف بھی قدیم ہے، استانبول کے مختلف مخطوطوں پر ان کے سابقہ مالکوں نے سرخسی کی تاریخ وفات لکھی ہے، کسی میں کچھ، کسی میں کچھ، مگر بہر حال یہی تین تاریخیں ہر پھر کر سامنے آتی ہیں۔ ایک معین اور دو تخمینہ۔

قید کی سرگذشت:

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ انہیں ”فی الحب“ ایک کنوئیں میں قید کیا گیا تھا یہ اندھا کنواں، بے آب گڑھا ہو گا جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت یوسف کے حال میں مذکور ہے ممکن ہے یہ کسی کمرے کے اندر رہا ہو، تاکہ بارش اور برف باری سے بھی محفوظ رہے، اور قیدی کے فرار کا امکان بھی نہ ہو۔ لیکن خود مؤلف کے درد ہائے دل میں جہاں کئی بار اس کی صراحت موجود ہے، وہاں صرف اتنا ہے:

- (۱) فی الحبس بأوزجند (مبسوط، ۲/۱)
- (۲) (زمن حبسی (ایضاً)، ۳/۱)
- (۳) المحبوس عن الجمع والجماعات (ایضاً، ۱۹۲/۳)
- (۴) المحصور عن الا نطلاق للبتلی بوحشة الفرات کتبہ العبد البری من النفاق (ایضاً، ۵۹/۷)
- (۵) المحصور فی طرف من الآفاق (ایضاً، ۲۴۱/۷)
- (۶) المحصور المعاتب والمحبوس المعاقب (ایضاً، ۸۰/۸)
- (۷) الممتحن بأنواع البلاء یسأل اللہ تعالیٰ تبدیل البلاء والجلء بالعز والعلاء (ایضاً، ۱۲۵/۸)
- (۸) المحصور بتزویر اهل السخف (فی آخر ”کتاب السرقہ“، ایک مخطوطے میں)
- (۹) المتکلم بالحق المنیر المحصور لا جله شبه الاسیر (مبسوط،

(۱۳۴/۱۰)

(۱۰) الملتمس لرفع الباطل الموضوع، المنفى لا جله المحصور الممنوع، عن الادل والولد والكتاب المجموعه (ايضاً، ۱۰۸/۱۲)

(۱۱) المحبوس فى موضع الاشرار (درآخز"كتاب الاقرار، ايك مخطوطه مى)

(۱۲) أملاه المستخلص من السجن موضع الملاة، المنتظر لتمام الفرج والاقالة (درآخز كتاب الوكالة، ايك مخطوطه مى)

(۱۳) اسليتها وأنا فى السجن محبوس، وعن أسباب الخلاص فى الدنيا مأبوس، (درآخز"شرح زيادات الزيادات")

(۱۴) أملاء يوم السبت سلخ شوال سنة ۴۷۹هـ فى زاوية من حصار أوزجند (درآغاز"اصول الفقه")

(۱۵) المبلى بالهجرة الحصر، المجفو من جهة السلطان الخطير وقد كان الافتتاح باوزجند فى آخر أيام المحنة عند هبوب النعمة وكان ابتداء الاملاء باوزجند فى يوم الاثنين غرة ذى القعدة سنة ۴۷۹هـ فى دارالشيخ الصابر الزكى الملقب بأسير كون أبى على بن ابى القاسم الى تمام باب الامان، ثم أمرنا بالكتابة فى حصار اوزجند الى أول كتاب الشروط، وتبين الخلاص فى يوم الجمعة عشربتين من شهر ربيع الاول سنة ۴۸۰هـ، وقد خر جنا من اوزجند يوم الاحد سلخ شهر ربيع الاول سنة ۴۸۰هـ و دخلنا بمرغينان يوم الاربعاء العاشر من شهر ربيع الآخر ونزلنا فى دارالشيخ الامام الاجل الزاهد سيف الدين أبى ابراهيم اسحاق بن اسماعيل فابتدأ كتاب الشروط فى داره يوم الاربعاء

الرابع العشرين من شهر ربيع الآخر و تم بعون الله وقوته في داره يوم الجمعة الثالث من جمادى الاولى سنة ١٢٨٠ هـ والحمد لله تعالى۔ انتھى كلام شمس الائمہ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (”مخطوط“، شرح السیر الکبیر“ کتب خانہ عاطف استانبول کا خاتمہ)

ان سارے اقتباسات سے گمان ہوتا ہے کہ اولاً انہیں واقعی ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا پھر ان کی ریاضت اور صبر سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ حالت میں اصلاح عمل آئی ہوگی۔ ایک زاویے یعنی چھوٹے سے حجرے میں بند رہے، اس کے بعد کسی افسر اور معتمد حکومت کے مکان میں زیر نگرانی رکھے گئے، اور دوبارہ قلعے میں لائے گئے شاید اس لیے کہ ملک کی آئے دن کی جنگوں جھگڑوں میں دشمن انہیں نہ لے اڑیں۔ بالآخر رہا کیے گئے۔

عام طور پر طریقہ املا کا تھا۔ سوانح نگار لکھتے ہیں کہ طلبہ ”من أعلی الجب“ کنوئیں کے منڈیر پر بیٹھے یادداشتیں لکھا کرتے تھے لیکن مذکورہ بالا درددل نمبر (۴) میں ”أملاء المحصور“ کے بعد ”کتبہ العبد البری من النفاق“ کا جملہ تشویش پیدا کرتا ہے۔ کس نے لکھا؟ کیا اس سے وہ شاگرد مراد ہیں جو معتوب شاہی کے پاس حاضر ہونے سے نہیں ہچکچاتے؟ یا اسے ”کتبہ“ پڑھنا چاہیے یعنی ”لکھوایا“ نہ کہ ”لکھا“؟

طریقہ املاء:

مبسوط وغیرہ کتابوں کے کوئی دس ہزار صفحے سرخسی نے شاگردوں کو املا کرائے اوپر درددل نمبر (۱۰) میں وہ صراحت کرتے ہیں کہ بیوی، بچوں اور کتابوں تک سے محروم ہوں۔ ان کی املا کرائی ہوئی کتابیں سوائے ”اصول الفقہ“ کے، ساری کی ساری امام محمد شیبانی کی کتابوں کی شرحیں ہیں۔ امام محمد کی کتابوں میں سے جو ہم تک پہنچی ہیں، ان کا سرخسی کی شروع سے مقابلہ کیا جائے، تو نظر آتا ہے کہ امام محمد ہی کے الفاظ کو سرخسی املا میں دہراتے اور مناسب اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرح کرتے

وقت اصل متن سامنے ہو تو بہت سی تحت الشعور باتیں یاد آ جاتی ہیں، اور بات میں بات پیدا ہو جاتی ہے۔ متن کہیں مشکل ہو تو شرح میں اطباء و تفصیل کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس لیے شرح تو شارح کی ایج ہے۔ لیکن امام محمد کے اصل الفاظ کے ہزار ہا صفحات کو کس طرح دہرایا؟ سوانح نگاروں کو اصرار ہے کہ یہ سب انہیں حفظ تھا۔ کیا اسے حسن ظن سمجھا جائے؟ اس سے یہ بات کہیں آسان ہے کہ شاگرد کتاب ساتھ لائیں اور پڑھیں اور استاد اس کی اساس پر شرح لکھوائے۔ نہ درد دل نمبر (۱۰) غلط اور نہ سوانح نگاروں کا بیان غلط۔ کیونکہ شاگردوں کو تو کتاب حاصل کرنے کی ممانعت نہیں تھی؛ اور اگر کنوئیں کے قیدی استاد کی آواز شاگرد سن سکتے ہیں تو شاگردوں کی آواز بھی استاد سن سکتا ہے کہ فاصلہ دونوں طرف سے یکساں ہے۔ ”شرح السیر الکبیر“ میں کئی بار ذکر ہے ”فی بعض النسخ“ یا ”فی نسخة قدیمة“ یہ بھی اسی قیاس کی تائید کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ متعدد شاگردوں کے ہاتھ میں کتابیں ہوتی تھیں۔

املا کے وقت کتنے شاگرد حاضر رہتے تھے، معلوم نہیں۔ کفوی نے ان کے بڑے شاگردوں کے نام یہ لکھے ہیں: برہان الانمہ عبدالعزیز بن عمر بن مازہ، شیخ الاسلام الامام محمود بن عبدالعزیز الاوزجندی، الشیخ الامام رکن الدین ابو محمد الخطیب مسعود بن الحسن بن الحسین بن محمد بن ابراہیم الکشافی، عثمان بن علی بن محمد البکندی (یہ شاگردوں میں سب متاخر فوت ہوئے)۔ ان کے علاوہ اوپر ذکر شدہ الحصری۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ زمانہ قید میں کون حاضر رہے؛ ان شاگردوں میں شیخ الاسلام اوزجندی کا اس نوع کا تعلق ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

ان کی تالیفیں، جو چھپ گئی ہیں، ان میں سے ”مبسوط“، ”شرح السیر الکبیر“، ”اصول الفقہ“ اور ”شرح زیادات الزیادات“ کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مخطوطات میں سے ”اشرط الساعۃ“ کا پیرس میں اور ”شرح الجامع الکبیر“ کے ایک کٹڑے کا مصرع میں ہونا بھی لکھ چکا ہوں۔

جو کتابیں ناپید ہیں، ان میں سے ”شرح مختصر الطحاوی“ کے متعلق ابن قطلوبغا نے لکھا ہے: ”رأیت قطعة منه“۔ ”شرح الجامع الصغیر“ اور ”شرح الزیادات“ کا

ذکر خود انہوں نے ”شرح السیر الکبیر“ میں جا بجا کیا ہے۔ خصاف کی کتابوں کی جو شرح الصدر الشہید نے کی، اس میں ان کی ”شرح النفقات للخصاف“ اور ”شرح ادب القاضی للخصاف“ کا ذکر ہے، جیسا کہ مولانا ابوالوفا افغانی نے تحریر فرمایا ہے۔ کشف الظنون میں لکھا ہے کہ ”الفوائد“ سرخسی اور حلوانی کی تالیف ہے؛ اس کا مفہوم واضح نہیں۔ ”کشف الظنون“ میں سہو بیانی کی بھی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

بعض وقت اور کتابوں کے بھی حوالے ملتے ہیں، لیکن یہ عام طور پر ”مبسوط“ کے مختلف ابواب ہی کی الگ اشاعت ہوتی ہے مثلاً ”کتاب الکلب“، ”کتاب الجحش“ وغیرہ۔ ان کو مستقل تالیف شمار کرنا درست نہیں۔

مؤلف کی شخصیت:

امام سرخسی کو اہل ہند سے کافی واقفیت معلوم ہوتی ہے۔ ”شرح السیر الکبیر“ وغیرہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ وہ مثالوں میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ سن بلوغ کی قدرتی علامتوں کے متعلق لکھا ہے (۱۶) کہ اس بارے میں ترکوں اور ہندیوں میں فرق ہے ممکن ہے کسی زمانے میں ان کے پاس کوئی ہندی الاصل لونڈی رہی ہو۔

انہیں علم تاریخ سے بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ سیرت النبی کی قانونی اہمیت سے وہ خوب باخبر ہیں۔ یوں بھی کتاب کے املا میں جا بجا خود اپنے حالات کی طرف اشارہ کرنا ذوق تاریخ ہی کی دلیل ہے۔ یہ چیز ممکن ہے، انہوں نے امام محمد سے سیکھی ہو، جو کثرت سے تاریخی واقعات سے مسائل استنباط کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنے کم عمر معاصر عالم و اقدی کا بھی کثرت سے حوالہ دیتے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں جو امام محمد نے یہ ذوق اپنے رفیق درس اور بعد کے استاد امام ابو یوسف سے حاصل کیا ہو۔ ان کا ایک دلچسپ واقعہ ابن خلکان نے ”وفیات الاعیان“ میں لکھا ہے، ایک دن ابو یوسف کو آنے میں دیر ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ ابن اسحاق کے پاس سیرت النبی وغیرہ کے لکچر سننے گئے تھے۔ تو ابو حنیفہ نے طنز سے پوچھا، اچھا یہ بتاؤ کہ طالوت کی فوج کے سپہ سالار کا نام کیا تھا؟ (مراد یہ تھی کہ ان معلومات سے آخر فائدہ کیا ہے؟) ابو یوسف نے کہا، میں مجمع عام میں کہوں گا

کہ ابو حنیفہ جیسے امام کو یہ تک نہیں معلوم کہ غزوہٴ احد پہلے ہوا یا غزوہٴ بدر (اور فقہ میں سنت نبوی سے استدلال میں مقدم و موخر طرزِ عمل کی بڑی اہمیت ہے) اس پر ابو حنیفہ چپ ہو گئے۔

سرخسی کی کتاب میں ہم عصر معاشرتی اور معاشی معلومات بھی کثرت سے ملتے ہیں، جن سے مورخ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ بخارا کے مکانات کا کونے کے مکانات سے مقابلہ کیا ہے (۱۷)۔

سرخسی سیاسی قیدی تھے اس لیے جب وہ اپنی سیاسی بصیرت کا جا بجا مظاہرہ کرتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں ہوتا مثلاً سب جانتے ہیں کہ رسول اکرم نے صلح حدیبیہ بظاہر ہر کر کی تھی لیکن کوئی سیرت نگار یا سیاست نگار مولف ہمیں نہیں بتاتا کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ اب امام سرخسی کی توجیہ (۱۸) کو پڑھیے اور سردھنیے: لَأنَّه كَانَ فِيهِ نَظَرٌ لِّلْمُسْلِمِينَ لَمَّا كَانَ بَيْنَ أَهْلِ مَكَّةَ وَأَهْلِ خَيْبَرَ مِنَ الْمَوَاطَاةِ عَلَى أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَوَجَّهَ إِلَى أَحَدِ الْفَرِيقَيْنِ أَغَارَ الْفَرِيقَ الْآخَرَ عَلَى الْمَدِينَةِ۔ فَوَادَعَ أَهْلَ مَكَّةَ حَتَّى يَأْمَنَ مِنْ جَانِبِهِمْ إِذَا تَوَجَّهَ إِلَى خَيْبَرَ۔ یعنی مدینے کا محل وقوع مکہ اور خیبر کے بیچوں بیچ ہے اور اس وقت نہ صرف دونوں ہی دشمن تھے، بلکہ ان دونوں دشمنوں کے درمیان سمجھوتا بھی تھا کہ اگر پیغمبر اسلام ایک پر حملہ کریں، تو دوسرا مدینے پر دھاوا بول دے۔ اسی لیے رسول اکرم نے اہل مکہ سے ان کی منہ مانگی شرطوں پر صلح فرمائی، تاکہ خیبر پر حملہ کرتے وقت ادھر سے اطمینان رہے۔

”شرح السیر الکبیر“ میں خاص کر اور اپنی دوسری کتابوں میں بھی عام طور پر سرخسی جب کبھی امام محمد کی کسی ذاتی رائے کی توجیہ کرتے ہیں تو فقہ کے اصول کلیہ سے استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں سرخسی سے متعلق مقالہ نگار ہیفینگ کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ”سرخسی اپنی اس کوشش کے باعث ممتاز ہیں کہ وہ قانون کے عام اساسات (اصول کلیہ) کو نمایاں کرتے ہیں“۔

خاتمہ:

یہ چند معلومات جو پیچیدگیوں سے خالی نہیں، اہل علم کے ملاحظے میں پیش ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو دلچسپی ہوئی، اور تلاش کی فرصت بھی، تو اپنی تحقیقات سے وہ ان میں اصلاح و اضافہ کر سکیں گے۔ یہی علم کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس مقالے کے سلسلے میں دارالکتب المصریہ کے محترم مدیر، اور اسی طرح کلیۃ الآداب دمشق کے عزیز پروفیسر صبحی صالح نے قاہرہ اور دمشق کے مخطوطات ”کتاب المبسوط“ وغیرہ کو میری خاطر دیکھنے اور تفصیلات لکھ بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ جزا ہما اللہ خیر الجزاء۔ نیز مجھے معلوم ہوا ہے کہ جامع ازہر میں بھی ”مبسوط“ کے مخطوطے ہیں، لیکن ان سے استفادے کی تاحال کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ واللہ عاقبہ الامور۔

حواشی

- ۱۔ ”بیان طبقات المجتہدین والمقلدین“ مخطوطہ انقرہ: ۶۲ ب
- ۲۔ حدائق الحنفیہ: ۲۰۵
- ۳۔ مقدمۃ الہدایۃ: ۱۸
- ۴۔ حدائق الحنفیہ: ۲۰۷
- ۵۔ عربی نمبر ۲۸۰۰، مجموعہ، ورق ۴۴۲ ب تا ۴۶۵ ب، ۳۱ سطروالی بڑی تقطیع پر
- ۶۔ مسالک الابصار: مخطوطہ آیا صوفیا ۳۴۱۹، جلد پنجم، ص ۲۸
- ۷۔ المبسوط: ۱۰۸: ۱۲
- ۸۔ تاج التراجم، نمبر ۱۵۷
- ۹۔ دیکھو: BSOS, LONDON, 111, 151.8, BARTHOLD: THE BUGHRA KHAN

MENTIONED

- ۱۰۔ شرح السیر الکبیر: جلد چہارم کا خاتمہ
- ۱۱۔ دیکھیے، کتاب اعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار، مخطوطہ اسعد آفندی، استانبول: نمبر ۵۴۸، ورق ۹۱ الف
- ۱۲۔ حدائق الحنفیہ: ۲۰۵
- ۱۳۔ المبسوط: ۴:۱
- ۱۴۔ دارالکتب، فقہ حنفی، ۴۹۰
- ۱۵۔ دارالکتب، فقہ حنفی، ۹۴۳
- ۱۶۔ شرح السیر الکبیر، ج ۱، ص ۳۶۶
- ۱۷۔ مبسوط ج ۱۵، ص ۳۰
- ۱۸۔ شرح السیر الکبیر: ۲۰۱:۱

کتابیات

- ✽ ابن فضل اللہ العمری (ف ۴۹۷ھ): مسالک الابصار (مخطوطہ آیا صوفیا و توقفاہی، استانبول)
- ✽ ابن قطلوبغا (ف ۷۸۷ھ): تاج التراجم (طبع جرمنی)، سوانح نمبر ۳۸
- ✽ ابو الوفا الافغانی (ہمارے محترم معاصر) نے ”اصول سرخی“ اور ”شرح زیادات الزیادات“ کو مرتب کرتے وقت مقدمے میں سرخی کے حالات دیے ہیں۔
- ✽ النعمی الغزالی (ف ۱۰۰۵ھ): الطبقات السنیہ (مخطوطہ کی۔ جامع استانبول)
- ✽ حاجی خلیفہ (ف ۱۰۶۷ھ) کشف الظنون۔

- طا شکویری زادہ (ف ۹۶۸ھ): مفتاح السعاده (طبع حیدرآباد)، ج ۲، ص ۵۵-۵۶
- عبدالقادر بن ابی الوفا القرشی (ف ۷۷۷ھ)، الجواهر المفضیہ (طبع مصر) ج ۲، ص ۲۹۔
- عبدالحی کھنوی (ف ۱۳۰۳ھ): الفوائد السببہ (طبع مصر) ص ۱۵۸-۱۵۹؛ انہی کی ”السعیۃ شرح شرح الوقایۃ“ (طبع دہلی) ص ۳۲ انہی کی: ”عمدة الرعاۃ فی حل شرح الوقایۃ“ (طبع لکھنؤ) ص ۴۱؛ انہی کی: مقدمۃ الہدایۃ للمرغینانی“ (طبع دہلی)، ص ۱۸
- فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری: حدائق الحنفیہ (اُردو) (طبع لکھنؤ): ص ۲۰۵-۲۰۷
- الکفوی محمود بن سلیمان (ف ۹۹۰ھ): کتاب اعلام الاخیار (مخطوطہ اسعد آفندی، استانبول)
- کمال باشا زادہ الرومی (ف ۹۴۰ھ): طبقات المجہدین والمقلدین (مخطوطہ انقرہ ۷۶۸ھ، در مجموعہ)
- الکوثری محمد زاہد (جن کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا) بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن الشیبانی
- محمد منیب دباغ زادہ عیثی (ف ۱۲۳۸ھ): تیسیر السیر فی شرح السیر الکبیر (مخطوطہ جامعہ استانبول) کا دیباچہ؛ انہی کی: ”شرح السیر الکبیر کا ترکی ترجمہ“، طبع استانبول کا دیباچہ۔
- الرجانی شہاب الدین (ف ۱۳۰۷ھ): عرفۃ الحواقین فی عرفۃ الحواقین (طبع قازان) ص ۲۷
- النجہ صلاح الدین (ہمارے معاصر ہیں): شرح السیر الکبیر کے نئے ایڈیشن کا دیباچہ

Brockelmann, GAL + Supplement, 1, 172, 373 Encyclopaedia of Islam, s.v.

Sarakhsiby Heffening.

Flugel, Classen der hanefitischen Rechtsgelehrten, p. 270-358 (p. 275,

303-4, 301-2, 305-7, 320, 322)

Hamidullah, contributin de l'Iran a la botanique et a la science juridique:

Dinawari et Sarakhsi, in: Pensee Chiite, Paris, vol. 1, 13-18.

Heffening, Das islamische Fremdenrecht, appendix.

Schacht, Sur la transmission de la doctrine dans les ecoles juridique de

l'Islam, in: Annales de l'Institut d'Etudes Orientales,

Algiers, 1952, X, 399-419;

: Aus den Bibliotheken

von Konstantinopel und Kairo;

: Aus Kairiner

Bibliotheken;

: Aus orientalischen Bibliotheken

(نذر عرشی۔ مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد)

مجلس نذر عرشی، نئی دہلی۔ (۱۹۶۵ء)

امام سرخسی کی نو سو سالہ برسی

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بلند بانگ دعویٰ کرنے والے عمل میں بیٹے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ بھی ایک عظیم ملی میراث پر مطعون ملت ترکی ہی نے توجہ کی اور امام سرخسی کی یادگار بین الاقوامی طور پر منائی۔ اس کی روداد لکھنے سے پہلے ایک اور یادگاری جشن کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو گزشتہ سال ترکی ہی میں منایا گیا تھا۔

آج سے بارہ تیرہ سال قبل معارف کے دو نمبروں میں میں نے عرض کیا تھا کہ ابو حنیفہ دینوری اپنے زمانے تک اسلام ہی کا نہیں، ساری دنیا کا سب سے بڑا نباتاتی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب النبات جو اپنے فن کی ایک جامع انسائیکلو پیڈیا ہے، چھ ضخیم جلدوں میں تھی، جن میں ایک جلد استنبول میں ملی، اس کے بعد ایک اور جلد تیل (Yale امریکہ) میں ملی۔ اس حنفی المذہب مفسر، مورخ، ریاضیاتی (وغیرہ، وغیرہ ہمہ داں عالم) کی وفات ۳۸۲ھ میں ہوئی۔ توجہ دلانے پر بھی اور ملک تو غافل رہے، مگر جامعہ استنبول کے شعبہ طب نے اس کی وفات کی گیارہ سو سالہ سالگرہ منائی۔ ان تقریروں کے علاوہ جو جامعہ استنبول کے مجملہ حیاتیات میں چھپ گئی ہیں، اس موقع پر وہاں ایک اعلیٰ نمائش بھی ہوئی تھی جس میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے وہ تمام نباتاتی مخطوطے جو استنبول کے کتب خانوں میں تھے، جمع کیے گئے تھے، ان میں بہت سے بالتصویر تھے، ابن سینا کی کتاب الشفا کا حصہ نباتات خاص طور سے قابل ذکر ہے، اس میں سات سو سے زائد جڑی بوٹیوں کی رنگین اور نہایت نفیس مطابق اصل تصویریں

ہیں۔ یہ کتب خانہ آیا صوفیہ میں ہے۔

بار بار توجہ دلانے کے باوجود خفی اور عربی ملکوں کو امام سرخی جیسی عظیم شخصیت کی نو سو سالہ سالگرہ وفات منانے کی توفیق نہیں ہوئی اور اس کو بدنام ترکی کی جامعہ انقرہ کے کلیۃ الہیات نے ۳۰ مارچ ۱۳۸۳ھ کو منایا۔ اس میں بیرونی ممتاز اہل علم میں پروفیسر شاخت نے جن کے نام سے معارف کے اکثر ناظرین واقف ہوں گے، شرکت کی۔ اس یادگار جشن میں ”نمائش سرخی“ بھی ہوئی، جس میں سرخی کی تالیفوں کے مخطوطے جمع کیے گئے تھے۔ ان کا تذکرہ کرنے سے پہلے امام سرخی کی مختصر سوانح عمری بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ معارف کے ذریعہ انکی اشاعت سے ہندوستان میں بھی امام سرخی کی یادگار منانے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے۔

سوانح عمری:

ممتاز ترکی فقیہ کمال پاشا زادہ نے اپنی کتاب ”بیان طبقات النجہدین والمقلدین“ میں لکھا ہے کہ سرخی کو خفاف، طحاوی، کرنی اور حلوانی کے ساتھ مجتہدین کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا جاسکتا ہے یعنی امام ابو حنیفہ اور صاحبین (ابو یوسف و محمد شیبانی) کے بعد ان کا نمبر آتا ہے۔

علمی قابلیت کے لحاظ سے اگر انہیں یہ درجہ حاصل ہے تو علمی پیداوار کے لحاظ سے وہ شاید سب سے آگے ہیں۔ ان کی کتاب المبسوط ہی تیس جلدوں میں بڑی تقطیع کے (۶۳۳۵) صفحوں میں ہے اور جیسا کہ آگے عرض کیا جائے گا، یہ ان کی واحد تصنیف نہیں۔

مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے مقدمۃ الہدایہ میں اور مولانا فقیر محمد جہلمی نے حدائق الحنفیہ میں صراحت کی ہے کہ سرخی کی ولادت ۸۰۰ھ میں ہوئی۔ امام سرخی نے اپنی کتابوں کے دیباچے وغیرہ میں اپنا نام ابو بکر محمد بن ابی بھل احمد سرخی تحریر کیا ہے۔ اس لیے بعض سوانح نگاروں کا اختلافی بیان ناقابل توجہ ہے۔ مقدمۃ الہدایہ اور حدائق الحنفیہ ہی میں یہ بھی ہے کہ تجارت کے سلسلہ میں انکے والد جب بغداد آئے تو نو عمر (دس

سالہ) امام بھی ساتھ تھے۔ پھر بخارا میں سالہا سال تک شمس اللائمہ عبدالعزیز حلوانی کے درس میں شریک رہے۔ ان کے شاگردوں میں سرخسی کے پایہ کا کوئی نہ تھا۔ اس لیے اہل علم نے انہیں نہ صرف استاد کی مسند درس پر بٹھایا بلکہ استاد کے لقب شمس اللائمہ کا بھی وارث قرار دیا۔ اس لحاظ سے وہ شمس اللائمہ ثانی ہیں لیکن شمس اللائمہ کا نام سن کر اہل علم کا ذہن اولاً سرخسی ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے، جب تک کہ دوسرے صاحب لقب کی صراحت نہ ہو۔

ان کے سوانح نگاروں میں سے سب سے قدیم ابن فضل اللہ العمری ہے، اس کی مسالک الابصار کی جلد پنجم (مخطوطہ آیا صوفیہ) میں ان کو فقیہ، اصولی، متکلم، مناظر اور ان علوم میں سارے ہمعصروں پر فائق بتایا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ کسی بات پر خفا ہو کر حکمران وقت نے ان کو شہر اوز جند کے قلعے کے ”جُب“ (اندھے کنوئیں) میں قید کر دیا، جہاں وہ سالہا سال محبوس رہے، لیکن پھر کنوئیں کی منڈیر پر طلبہ کو آنے کی اجازت مل گئی تو سرخسی کنوئیں کے اندر سے درس املا کرایا کرتے تھے، جس کے مجموعے نے متعدد کتابوں کی صورت اختیار کی۔ مولانا فقیر محمد کے بیان میں اتنا اضافہ ہے کہ بخارا میں گرفتار کر کے اوز جند میں جلاوطن کیا گیا تھا۔

یہ صحیح پتا نہیں چلتا کہ کس حکمران نے اور کس جرم میں امام سرخسی کو قید کیا تھا۔ اس کے لیے صرف قیاس کو کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اس زمانہ میں بخارا اور اوز جند علم دوست سامانیوں کے جانشین قرہ خانی خانوادے کے قبضے میں تھے، لیکن اس خانوادے کے نہ سارے حکمرانوں کے نام معلوم ہیں اور نہ تاریخ حکمرانی۔ طرہ یہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس خاندان کے افراد میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور مشرقی اور مغربی قرہ خانی دو خود مختار ملک بن گئے، مگر ان کی سرحدیں اکثر بدلتی رہیں، چونکہ اوز جند انتہائے مشرق میں چین کی سرحد کے قریب ہے، اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ مشرقی خانوادے کی کارستانی تھی، لیکن قید کی وجہ کا کہیں پتا نہیں چلتا، خود سرخسی نے کتاب المسموط کے مختلف ابواب کے آغاز یا اختتام پر پندرہ سولہ مرتبہ اصول الفقہ کے شروع زیادات الزیادات کے آغاز اور آخر میں، نیز شرح السیر الکبیر کے آخر میں اپنی قید کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اسباب کی طرف مبہم سا اشارہ کیا ہے، مثلاً سلطان کو کلمہ خیر کی

نصیحت، زندگی و بد قماش لوگوں کی سلطان کے پاس ان کی جھوٹی چغلی وغیرہ۔ اس سے زیادہ وضاحت نہیں ملتی، اس سلسلہ میں استاذ الاساتذہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا بیان دل کو لگتا ہے کہ اس زمانے میں بد انتظامی اور مالی اتھری کے باعث بے شمار نئے نئے ٹکس لگ رہے تھے، غالباً سرخسی نے فتویٰ دیا کہ وہ ناجائز ہیں اور ان کی ادائیگی واجب نہیں، اس طرح وہ عدم ادائیگی محاصل کی تحریک کے ”سرغنہ“ قرار پائے۔ ایسی حالت میں وہ حکومت کی نگاہ میں جس ظلم کے بھی مستوجب قرار پائیں کم ہے۔ کتاب المبسوط جلد دہم صفحہ ۲۱ میں ان کا ایک بیان بھی ہے، جس میں وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ ”ہمارے زمانے کے اکثر محصول ناجائز ہیں، جو ان کی مقاومت کرے اور ادا نہ کرے وہ ثواب کا مستحق ہے“، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور اس کے خوشہ چیں البوزہرہ اور صلاح الدین الہنجد کا یہ گمان یا بیان لغو ہے کہ ام ولد لونڈی کے لیے نکاح سے قبل عدت کے ضروری ہونے کا جو فتویٰ سرخسی نے دیا اس پر وہ معتب ہوئے تھے، ابن فضل اللہ وغیرہ جو ان معلومات کا ماخذ ہیں، اس واقعہ کے ضمن میں اس کی صراحت کرتے ہیں کہ یہ قید سے نکلنے کے بعد کا واقعہ ہے اور امیر البلد خود کسی کی ام ولد سے نکاح کرنا نہیں چاہتا تھا، بلکہ اپنی امہات ولد کو آزاد کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس فتویٰ پر اس کی برہمی کی کوئی وجہ نہ تھی۔

قید کی آپ بیتی کے سلسلے میں مبسوط (جلد ۷ صفحہ ۲۴۱) میں فرماتے ہیں کہ دنیا کے ایک دُور دراز کونے میں مجھے قید کیا گیا ہے (ج ۸ ص ۱۰) میں ارشاد ہوتا ہے کہ دو سال سے صبر پر عامل ہوں۔ (ج ۱۲ ص ۱۰۸) میں ہے کہ بیوی بچوں اور کتاب ہر چیز سے ممنوع ہوں، مبسوط کے مطبوعہ نسخے میں تو نہیں لیکن متعدد قلمی نسخوں میں کتاب الوکالہ کے آخر (ج ۱۹) میں یہ وضاحت ہے کہ

المتخلص من السجن موضع الملاة المنتظر لتمام

الفرج والا قالة۔

قید خانہ جیسی طویل کرنے اور تھکا دینے والی جگہ سے تو نجات ملی

ہے لیکن کامل رہائی اور معافی کا انتظار ہے۔

(ج ۲ ص ۱۲۶) کتاب المعامل کے آغاز میں تاریخ الملا، چہار شنبہ ۱۲/ربیع الآخر ۴۶۶ھ اور (ج ۳ ص ۲۸۷) کتاب الرضاع کے آغاز میں پنجشنبہ ۱۲/جمادی الاخریٰ ۴۷۷ھ میں بھی ہے لیکن ایک مخطوطے کے سوا باقی سارے میں پچیس مخطوطے جو میں نے دیکھے ہیں، ان میں ۴۷۹ھ کی تاریخ بتائی گئی ہے، اس مسئلے پر ہم نیچے بحث کریں گے۔

یہ تو مبسوط میں قید کے متعلق اشارات تھے، اصول فقہ کے آغاز میں بھی لکھا ہے ”حصار اوز جند کے ایک زاویے میں سنچر سلخ شوال ۴۷۹ھ کو املا کرایا گیا۔“

نکت زیادات الزیادات کے آخر میں تاریخ تو نہیں ہے لیکن یہ دلخراش جملہ ہے ”یہ اس زمانے کی تالیف ہے جب میں قید خانہ میں محبوس اور رہائی پانے کے اسباب سے مایوس ہوں۔“

سب سے زیادہ تفصیل اور ساتھ ہی پیچیدگی شرح السیر الکبیر کے خاتمے میں ہے، اس کے بعض مخطوطوں میں لکھا ہے کہ اس کتاب کے املا کا آغاز دو شنبہ غرہ ذیقعدہ ۴۷۹ھ کو کسی ابوعلی الحسین بن ابی القاسم الملقب بہ امیرگون کے مکان میں ہوا۔ ابواب امان کے اختتام کے بعد حکم ہوا کہ تدریس مکرر اوز جند کے حصار میں ہو، اور جب ابواب شروط کے آغاز پر پہنچے تو ۴۸۰ھ جمعہ کے دن جب ربیع الاول کے دس دن باقی تھے، رہائی عمل میں آئی۔ اس کے دس دن بعد اتوار سلخ ربیع الاول کو اوز جند سے روانہ ہوئے، چہار شنبہ ۱۰/ربیع الآخر کو مرغینان پہنچ کر امام سیف الدین ابو ابراہیم اسحاق بن اسماعیل کے گھر مہمان ہوئے اور لوگوں کی خواہش پر چہار شنبہ ۲۴/ربیع الآخر کو ابواب الشروط سے مکرر املاء کرانا شروع کیا اور کل دس دن میں جمعہ ۳/جمادی الاولیٰ ۴۸۰ھ کو پورا کر دیا۔ یہ واضح رہے کہ شرح السیر الکبیر کے حیدر آبادی طباعت اول میں (۱۳۰۸) صفحے اور مذکورہ ابواب الشروط سے کتاب کے آخر تک (جلد چہارم میں) ۳۲۸ صفحے ہیں جو صرف دس دن میں املا کرائے گئے ہیں۔

اس میں پیچیدگیاں یہ ہیں کہ مذکورہ بالا تصریحات کے مطابق اصول الفقہ کا آغاز سلخ، شوال ۴۷۹ھ کو اور شرح السیر الکبیر کا آغاز اس کے ایک ہی دن بعد غرہ،

ذیقعدہ ۴۷۹ھ کو ہوا۔ ایسی حالت میں اصول الفقہ کے مطبوعہ تقریباً ساڑھے سات سو صفحے کیا صرف ایک دن میں املا کرا دیے گئے؟ اور اگر اصول اور سیر دونوں کتابوں کا املا ساتھ ساتھ جاری رہا تو ان دونوں کے (۱۳۰۸ + ۷۳۴) جملہ (۲۱۴۲) صفحے کیا صرف پانچ ماہ میں روزانہ (۱۳) صفحوں کے اوسط سے املا کرائے گئے؟ جو قیاس میں نہیں آتا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ کہیں آغاز کی جگہ یہ اتمام کی تاریخ تو نہیں؟

یہ بھی یاد رہے کہ مبسوط کا آخری باب (ج ۳۰ ص ۲۸۷) ۱۲ جمادی الآخرہ ۴۷۹ھ (مگر سارے ہی مخطوطات کے مطابق ۴۷۹ھ) میں املا کرایا گیا، اس تاریخ اور مذکورہ بالا غرہ ذیقعدہ کے درمیان تین مہینے سترہ دن ہوتے ہیں، اسی وقفے میں کم از کم نکت زیادات، الزیادات بھی املا کرائی گئی اور غالباً جامع صغیر، جامع کبیر اور زیادات کی شرحیں بھی۔

تصنیفیں:

اب تک مبسوط، اصول الفقہ، شرح السیر الکبیر، نکت زیادات، الزیادات چار کتابوں کا ذکر ہوا، جو سب چھپ چکی ہیں، شرح جامع صغیر، شرح جامع کبیر اور شرح زیادات، تین اور کتابوں کا ذکر ان کی اصول الفقہ اور شرح السیر الکبیر میں کئی بار آیا ہے، جامع کبیر کا ایک ٹکڑا جو کتاب الدیات پر ختم ہوتا ہے، مصر میں ہے، شاخت نے بروصہ اور آیا صوفیہ (استانبول) میں دو نسخوں کا ذکر کیا تھا، لیکن میری تحقیقات میں یہ غلط ثابت ہوئے۔ شرح جامع صغیر کا ابھی ابھی پتا چلا ہے، آئندہ نمائش کے سلسلے میں اس کا ذکر آئے گا۔ خود سرخسی نے اپنی مبسوط (ج ۲۰ ص ۸ تا ۷) میں مشترکہ کفالت کی متناسب ذمہ داری کے ایک مسئلے پر جو ”فقہی ریاضیات کا سب سے پیچیدہ مسئلہ“ ہے، اپنی ایک تالیف کا ذکر کیا ہے۔

ابن قطلوبغا کی تاج التراجم میں ہے ”میں نے ان کی شرح مختصر الطحاوی کا ایک ٹکڑا دیکھا ہے۔“ لیکن اب تک اس کتاب کا کوئی پتا نہیں چلا، کتاب النفقات للخصاف اور کتاب ادب القاضي للخصاف کی شرحیں بھی سرخسی کی جانب منسوب ہیں، جیسا کہ

مولانا ابوالوفاء الافغانی مد فیضہ نے اصول سرخسی کے دیباچے میں لکھا ہے، ان کی تالیف کا زمانہ معلوم نہیں، یہ تینوں اب ناپید ہیں۔ یہ سب دس کتابیں ہوئیں جن کے متعلق کوئی شبہ نہیں۔

”کشف الظنون میں یہ عجیب بیان ہے، ”سرخسی اور حلوانی کی کتاب الفوائد“ معلوم نہیں اس سے کیا مراد ہے۔

سرخسی کی کتاب ”الشرائط الساعۃ ومقامات القیامۃ“ اغلباً قید سے پہلے کی تالیف ہے کیونکہ اس کا جو مخطوطہ پارلیس میں ہے اس کے آغاز میں اس کی صراحت ہے کہ یہ سرخسی کے استاد عبدالعزیز الحلوانی کا املاء ہے، جن کی وفات ۴۴۸ھ میں ہوئی اور اس وقت تک سرخسی کی قید کا کوئی سوال پیدا نہ ہوا تھا۔

ان کی طرف کتاب الحیض، کتاب الکلب وغیرہ کی جو شرحیں منسوب ہیں، وہ کوئی مستقل کتاب نہیں، بلکہ ان کی کتاب المبسوط ہی کے مختلف ابواب ہیں۔

وفات:

عام طور پر پرانے سوانح نگاران کی وفات ۴۸۳ھ میں بتاتے ہیں، عبدالقادر القرشی نے الجواهر المضية میں (فی حدود التسعين واربع مائۃ) چار سو نوے سے کچھ پہلے کا مبہم لفظ استعمال کیا ہے۔ مقریزی کی ”تذکرہ“ کا مجھے پتا نہیں چلا، کیونکہ وہ ناپید ہے، مگر اس کے حوالے سے مولانا ابوالوفاء الافغانی نے اصول سرخسی کے دیباچے میں ”فی حدود الخمسمائۃ“ ۵۰۰ھ سے پہلے کا مبہم بیان نقل کیا ہے، مولانا عبدالحی لکھنوی نے فوائد بیہ میں ۴۸۳ھ میں وفات بتائی ہے، لیکن مقدمۃ الہدایہ میں لکھا ہے کہ ”جمادی الاولیٰ ۴۹۴ھ میں وفات پائی اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ۴۸۳ھ میں۔“

میرے نزدیک ۴۸۳ھ زیادہ قرین قیاس ہے، کیونکہ ابن قطلوبغا اور کفوی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ ”عمر کے آخری حصہ میں علاقہ فرغانہ تشریف لے گئے۔“ اوپر گزر چکا ہے کہ ۴۸۰ھ میں اوزجند سے نکلنے کے بعد مرغینان بھی جا بے تھے، جو علاقہ فرغانہ ہی کا ایک شہر ہے، سالہا سال کی قید اور غیر صحت بخش زندگی کو اپنی قوت

ایمانی سے وہ تحمل اور صبر کے ساتھ برداشت تو کرتے رہے لیکن اس نے ان کی صحت برباد کر دی ہوگی، ۸۳ سال اچھی خاصی عمر ہے، اس لیے ۲۸۳ھ میں وفات ہوگئی ہوگی۔
نمائش:

پہلی تجویز یہ تھی کہ پوری مملکت ترکی سے سرخی کی تالیفوں کے تمام مخطوطے انقرہ لائے جائیں، لیکن مبسوط جیسی ضخیم کتاب کے استنبول ہی میں کوئی تیس نسخے ہیں، ساری تالیفوں کو پورے ملک سے لاتے ایک ویگن بھر کتابیں ہو جاتیں، اس لیے مجبوراً یہ طے ہوا کہ انقرہ میں صرف مطبوعہ کتابوں کی نمائش ہو اور غیر مطبوعہ تالیفوں کے فوٹو رکھے جائیں لیکن غیر مطبوعہ کتابوں میں صرف اشراط الساعۃ کا فوٹو رکھا جاسکا، بڑی نمائش استنبول میں کی گئی، کیونکہ بڑا ذخیرہ وہیں ہے اور شہر کے کتب خانوں سے مخطوطوں کو نمائش گاہ میں لانا آسان بھی تھا۔

انقرہ کی مجلس ۳/ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ (۱۵/ اپریل ۱۹۶۳ء) کو ہوئی اور نمائش کا افتتاح استنبول میں ۱۶/ ذی الحجہ (۲۸/ اپریل) کو ہوا، جو دس دن جاری رہی، نمائش میں بہ ترتیب حسب ذیل کتابیں تھیں۔

امام محمد شیبانی کی کتاب الاصل کا ایک مکمل نسخہ تھا کیونکہ اساسی کتاب یہی ہے، پھر الحاکم الروزی الشہید کی المختصر الکافی کا ایک مکمل نسخہ جو کتاب الاصل کا خلاصہ ہے اور اسکی شرح سرخی نے مبسوط کے نام سے الما کرائی تھی، مبسوط کے تیس سے زائد مکمل یا نامکمل مخطوطے تھے، ان میں قدیم ترین مخطوطہ توپ کپورائے سے آیا تھا جو صفر ۵۱۶ھ کا مکتوبہ ہے، ۶۲۲ھ وغیرہ ساتویں صدی کے متعدد نسخے تھے۔

اصول فقہ کے (۱۱) نسخے تھے، جن میں سے قدیم ترین نسخہ مکتوبہ ۶۵۲ھ کتب خانہ نور عثمانیہ کا تھا، شرح الزیادات کے (۳) نسخے جن میں قدیم ترین ۶۱۳ھ کا تھا۔ شرح السیر الکبیر مولف کی آخری تالیف ہے، اس کے (۴۵) مکمل یا نامکمل نسخے تھے، ان کو تین زمروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(الف) دو ٹکڑے جو کتب خانہ فاتح سے آئے تھے، ان کے آغاز کی عبارت یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ امام سرخی
(بالقالبہ) کے الماء کی ایک نشست یکم
ذیقعدہ ۸۷۹ھ کو امیر کوہ [غالباً]
امیرگون [لقب والے افسر کے مکان
میں جو سکہ سالار نامی گلی میں ہے،
[امام سرخی] نے کہا کہ سیر کبیر امام محمد
شیبانی کی آخری تالیف ہے.....

بسم اللہ الرحمن الرحیم
مجلس من املاء الشيخ
الامام الاجل الزاهد امام
الائمة ابی بکر محمد بن ابی
سهل السرخسی فی غرة ذی
القعدة سنة تسع و سبعین و
اربعمائة فی دارالشيخ الصاین
(؟ الصابر) الزکی الملقب
بامیر کوہ باوزجند فی سکه
سالار: قال الامام الاجل الزاهد
اعلم بان السیر الکبیر آخر
تصنیف صنفه محمد.....

ان دو مخطوطوں میں سے ایک بہت چھوٹی تقطیع کے ۸۷ اوراق پر مشتمل تھا، گویا
ایک نشست میں الماء کرائے ہوئے درس کی یادداشت تھا، دوسرے ٹکڑے میں ۴۰۸
اوراق ہیں، چھوٹا ٹکڑا بہت قدیم ساتویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا تھا۔ بد قسمتی سے اس
کے آغاز اور وسط کے چند اوراق ضائع ہو گئے تھے، بعد میں کسی نے (غالباً مذکورہ
دوسرے ٹکڑے سے) ان کی تکمیل کی تھی۔

(ب) کوئی بیس مخطوطے جن کو اساسی نسخہ قرار دیا جاتا ہے (دائرة المعارف حیدرآباد
کا ایڈیشن اس کے مطابق ہے) ان میں قدیم ترین مخطوطہ ۸۶۶ھ کا تھا، اسکی
خصوصیت یہ ہے اس کے شروع میں مجلس الماء کا کوئی ذکر نہیں بسم اللہ کے بعد ہی اس
طرح شروع ہوتا ہے کہ

”سرخسی نے کہا کہ سیر کبیر امام محمد شیبانی کی آخری تالیف ہے“

لیکن کتاب کے خاتمے میں یوں لکھا ہے کہ

”اس کا آغاز اوزجند میں مصیبت کے آخری دنوں میں ہوا، جب

کہ نعمت کی ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی اور اتمام مصیبت کے اختتام پر مرغینان میں امام سیف الدین ابراہیم بن اسحاق کے مکان پر ہوا۔

(ج) تقریباً بیس مخطوطے جن کو امام حمیری کا مرتبہ نسخہ بتایا جاتا ہے، ان میں قدیم ترین مخطوطہ ۱۱۱۰ھ کا تھا، جو کسی زمانے میں استنبول میں قاضی خاں کا دستخطی نسخہ رہ چکا تھا، اسی سے یہ سارے نسخے نقل کیے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ چھٹی صدی ہجری کا یہ قدیم نسخہ اب ناپید ہے، اس کے مقدمے میں بھی مجلس اطباء کا ذکر نہیں ہے، خاتمہ زیادہ معطل ہے، ”اس کا آغاز اوزجند میں دو شنبہ غرہ ذی قعدہ ۹۷۹ھ کو الشیخ الصائین (?) نے ترکی الملقب بامیر کوہ (ایک اور مخطوطے میں امیر کوہ، بعض مخطوطات میں امیر گون ہے غالباً یہی صحیح ہے، گون ترکی نام ہے جس کا تلفظ GUN گون، گاف کے زیر سے ہوتا ہے۔) ابوعلی الحسین بن ابی القاسم کے مکان میں ہوا۔“ یہ اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے۔

اس شرح سیر کبیر کا محمد نبی عیثیٰ نے ترکی میں ترجمہ کیا تھا، جواب سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے، عربی اڈیشن سے بھی سو سال قبل استنبول میں چھپ چکا ہے۔ اسی مولف نے تیسیر المسیر فی شرح السیر الکبیر کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں سرخی کی شرح السیر الکبیر کے بعض مشکل مقامات کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس آخر الذکر کتاب کے چار مخطوطے فراہم کیے گئے تھے، جن میں سے ایک خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔

سب سے اہم علمی خوشخبری اور نادر تحفہ یہ ہے کہ سرخی کی شرح الجامع الصغیر کا ایک مخطوطہ بھی فراہم کیا گیا تھا، اس کی تفصیل بے محل نہ ہوگی۔

یہ کتاب دنیا میں ناپید سمجھی جاتی تھی، لیکن استنبول کے ایک گمنام کتب خانے بغدادی رہبی آفندی میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس کی فہرست میں اس کا نمبر ۵۶۵

۱۔ ایک مخطوطے میں ”الصائر“ اور کم از کم تین میں الصائین ہے، صائین ایک ترکی لفظ ہے جو احترام کے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے اور ہمارے اردو کے ”سائیں“ کا رشتہ دار معلوم ہوتا ہے جو مقدس درویش یا فقیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہے، اس میں ۲۷۵ ورق اور ہر ورق میں ۲۵ سطریں ہیں، تقطیع متوسط ۱۰ انچ ہے، ۹۳۸ھ کا نقل شدہ ہے، سرورق پر چند مالکوں نے یہ عبارت لکھی ہے:

(۱) میں نے امام سرخسی کی اس شرح کا ایک ضخیم نسخہ وزیر قرہ مصطفیٰ پاشا ترزیفونی کے تعمیر کردہ مدرسے میں دیکھا، یہ پایہ تخت (استنبول) کے ارغاد بازار نامی محلے میں ہے، یہ شرح بہت نادر ہے ہدایہ کے حاشیہ نہایت میں اس شرح سے بکثرت مسائل نقل ہوئے ہیں۔

(۲) عبدالقادر محمد امین جو صوبہ اناطولیا کے صدر قاضی کا رتبہ رکھتا ہے، اس کا مالک بنا۔

خدائے کریم کی مہربانی کا طالب مصطفیٰ ہاشم العصر (؟) بن احمد مختار جو مکہ مکرمہ کے قاضی کا رتبہ رکھتا ہے۔ (۱۲۹۱ھ)

میں نے ممتاز عالم مرحوم مصطفیٰ آفندی المعروف بہ بستان زادہ کے تر کے سے

(۱) رأیت من هذا الشرح للامام السرخسی نسخة صحيحة في خزانة الكتب داخل المدرسة التي بناها الوزير ترزیفونی قرہ مصطفیٰ پاشا فی سوق ارغاد بازاری بدار السلطنة وهذا الشرح نادر جداً و صاحب النهاية فی حاشية الهداية ينقل مسائل كثيرة من هذا الشرح۔

(۲) استصحبه عبدالقادر محمد امين الملسرف (؟) برتبة صدر اناطولی۔

(۳) المستعطف من عواطف ربه الكريم مصطفیٰ هاشم العصر ابن احمد مختار المسرف (؟) برتبة مكة المكرمة ۱۲۹۱ھ

(۴) قد اشترايت هذا الكتاب من مخلفات اعلم العلماء

المرحوم مصطفیٰ آفندی
الشہیر بیستان زادہ۔ قدرہ
اربع مایۃ درہم۔ نور اللہ
مرقدہ و برد مضجعہ تحریرافی
اوائل رجب سنۃ عشرۃ
وآلف۔

یہ کتاب چار سو درہم میں خریدی، خدا
انکی قبر کو روشن اور ان کی آرام گاہ کو ٹھنڈا
رکھے، اوائل رجب ۱۰۱۰ھ کی تحریر
ہے۔

کتاب کا آغاز اس طرح ہے: ”بسم اللہ الرحمن الرحیم، قال الشیخ
الامام الاجل الزاہد ابو بکر محمد بن ابی سہل السرخسی رحمۃ اللہ
علیہ اعلم بان الجامع الصغیر تالیف محمد بن الحسن.....“
تقریریں:

- یوم سرخی میں رکی تقریروں کو چھوڑ کر حسب ذیل علمی مقالے پڑھے گئے:
- ۱۔ پروفیسر شاخت : امام سرخی کے حالات اور فقہاء میں ان کا درجہ۔
 - ۲۔ ناچیز (محمد حمید اللہ) : علم قانون بین الممالک کی تاریخ میں امام سرخی
کے کارنامے۔
 - ۳۔ ڈاکٹر صالح طوغ : امام سرخی کے خودنوشتہ بیانات کی روشنی میں انکی
سوانح عمری۔
 - ۴۔ پروفیسر طیب اوکیچ : امام سرخی کی شرح سیر کبیر کا ترکی ترجمہ جو محمد منیب
عیدیابی نے کیا۔
- ان تقریروں اور نمائش میں پیش کردہ مخطوطات کی مفصل فہرست وغیرہ کا مجموعہ
جامعہ انقرہ کتابی صورت میں (ترکی زبان میں) چھاپ رہی ہے۔

(معارف اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۶۲ء)

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی

صد سالہ یادگار ولادت

(۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ جمعہ تا ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ اتوار

مطابق ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء تا ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء)

جشن:

قرآن مجید میں حکم ہے: ”وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ“۔ اس کا اولین اطلاق جشن میلاد النبیؐ پر ہوگا کہ کسی نبی کی بعثت سے بڑھ کر کسی قوم کے لیے کیا چیز نعمت ہو سکتی ہے، (اور اس تحدیثِ نعمت کا ایک طریقہ بھی قرآن مجید نے بتا دیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ

وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

قرآن مجید میں مصر کے سالانہ ”یوم الزینۃ“ کا بھی ذکر ہے، اور مدین کے ”ثَمَنِي حَجَّج“ میں بھی سالانہ جشنوں کا ذکر ہے اور ان کی قرآن نے تسبیح نہیں کی ہے۔ ”العلماء ورثة الانبیاء“ کے مطابق تحدیثِ نعمت کے استحقاق میں علماء کی علمی خدمتیں بھی لازماً داخل ہو جاتی ہیں۔

”یہ تحریر حضرت مولانا محمد اشرف صاحب سلیمانی کے رسالہ ’البیان‘ (پشاور) میں شائع ہوئی تھی، ہم معارف کے ناظرین کی خدمت میں اس کو پیش کر رہے ہیں“

”معارف“

مرحوم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اردو کے علاوہ عربی میں بھی بہت کچھ لکھا ہے، معلوم نہیں عرب ممالک میں کسی کو ان کی یاد تازہ کرنے کی توفیق ہوئی یا نہیں، البتہ فرانس میں ان کی پیدائش کی صد سالہ یادگار منائی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ جامعہ پیرس نے ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ سے اردو کی کرسی قائم کر رکھی ہے، اور گارسین دتاسی سے لے کر وہاں اب تک اردو کی تدریس جاری ہے۔ علی گڑھ، پٹنہ، دہلی اور کراچی میں بھی یادگاری جلسے ہوئے ہیں اور اعظم گڑھ میں ہونے والا ہے۔

فرانس میں:

۲۵ نومبر ۱۹۸۴ء اتوار کو صبح کے نو بجے سے سوا نو بجے تک پندرہ منٹ فرانسیسی ٹیلی ویژن نے مولانا سید سلیمانؒ کی ولادت کی صد سالہ یادگار منانے کے لیے مختص کیے تھے، شروع میں چند منٹ قرآن مجید کی تلاوت مع ترجمہ عمل میں آئی، پھر افغانستان کے ایک سابق سفیر و وزیر عبدالغفور فرہادی رواں صاحب نے مرحوم کے متعلق کچھ باتیں بتائیں اور ان کے مزار کی چند تصویریں دکھائیں اور انکی اہم تالیفوں کے سرورق (ٹائٹل) دکھائے، بعد ازاں چند صفحوں کا ایک مضمون فرانسیسی میں جناب سید سالار الدین محمد نے (جو کاریکال کے باشندے اور مدرسۃ السنۃ شرقیہ میں فہرست نگار ہیں) سنایا، اس کے لکھنے میں غالباً ان کی فاضل بیوی بھی شریک رہیں۔

اسی دن ظہر کی نماز کے بعد پیرس کے محلہ اشالن گراڈ کی جامع مسجد میں (جو یہاں کے تقریباً تین ہزار مصلیوں کی گنجائش رکھنے والی سب سے وسیع مسجد ہے) رابطۃ الطلاب الاسلامیین کی طرف سے میرا کوئی دو ڈھائی گھنٹے طویل لکچر فرانسیسی میں ہوا۔ اسکا جملہ بہ جملہ عربی میں ترجمہ بھی ہوتا رہا۔ آخر میں حاضرین نے کچھ سوالات بھی کیے کہ انہوں نے پہلی دفعہ یہ نام سنا اور ان علمی کارناموں سے واقفیت حاصل کی، اس میں گورے، کالے، سانولے ہر ملک کے مسلمان مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

اس کے چند دن بعد ۱۲ دسمبر ۱۹۸۴ء کو یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جلسہ ہوا، صدر شعبہ جناب محمد عبدالماجد صاحب کے علاوہ اس ناچیز نے بھی فرانسیسی میں مرحوم

کے حالات بیان کیے اور ٹیلی ویژن والی تصویریں یہاں بھی دکھائی گئیں۔
 بریلوی بھائیوں کی ایک تبلیغی انجمن ہے، جس کی شاخیں لندن اور پیرس میں بھی
 ہیں، آخر الذکر نے بھی اسی زمانہ میں ایک جلسہ کیا، جس میں مجھ سے بھی اردو میں ایک
 تقریر کرائی گئی، اس سے اہل ہندو پاکستان کو بھی بہت سی چیزیں نئی معلوم ہوئیں۔
 یہاں جامعات میں چونکہ سیاسیات کی تعلیم بھی ہوتی ہے، اس کے لیے ایک
 ”مرکز تحقیقات بین الممالک“ نامی بڑا ادارہ معلومات جمع کرنے کے لیے قائم ہے، اس
 نے بھی طے کیا ہے کہ ماہ آئندہ یعنی فروری میں حضرت ممدوح کے حالات پر ایک جلسہ
 کرائے، ان شاء اللہ کارآمد ہی ہوگا۔

شخصیت:

ان کے والد بزرگوار جناب سید ابوالحسن اور دادا سید محمد شیر تھے، یہ علاقہ بہار کے
 ایک گاؤں دینہ میں پیدا ہوئے، جو شہر پٹنہ کے قریب ہے اور بڑا مردم خیز خطہ رہا ہے،
 نالندہ کی پرانی یونیورسٹی کے آثار قدیمہ اور گوتم بدھ کی تپسیا کا مقام بھی اسی نواح میں بتایا
 جاتا ہے۔

وہ جمعہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو پیدا ہوئے، اس کی معادل فرنگی تاریخ بعض لوگوں نے
 ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء لکھی ہے جو غلط ہے، جیسا کہ ابھی نیچے عرض ہوگا، ان کی تاریخ ولادت
 پر ایک قطعہ ان کے دادا کی طرف منسوب ہے جس میں کہا ہے:

بگفتا کہ بے داد شد مصرے شدہ مہر تاباں ز برج کمال

۱۳۱۱

۹-

۱۳۰۲

فرنگیوں نے تقابلی تقویموں کی جدولیں کئی صدیوں سے تالیف کرنی شروع کی
 ہیں، قدیم ترین لاطینی میں ہے، اب مغرب کی ہر بڑی زبان میں موجود ہیں اور ان ہی
 کا عربی اور اردو میں ترجمہ بھی ہوا ہے اور فرنگیوں کی غلطیوں کا اعادہ بھی ہوا ہے، بات یہ

ہے کہ ان فرنگی جابلوں نے سال بہ سال، ماہ بہ ماہ کی حقیقی رویت ہلال کی جگہ ایک من گھڑت اصول بنا کر اس پر عملدرآمد کیا ہے، وہ یہ کہ محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان، ذی القعدہ ہمیشہ تیسے ہوتے ہیں اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الاخریٰ، شعبان شوال ہمیشہ اُنیسے اور ذی الحجہ حسب حساب کبھی اثنیسا اور کبھی تیسہ ہوتا ہے۔ یہ اس لیے غلط ہے کہ ایسا نہیں ہوتا، بچہ بچہ جانتا ہے کہ رمضان کبھی اثنیسا ہوتا ہے، کبھی تیسہ، مشاہدہ ہے کہ کبھی چار چار مہینے مسلسل تیسے ہوتے ہیں، تو تین تین مہینے اُنیسے بھی ہوتے ہیں، فرنگی جدولوں میں دو تین دن کی غلطی ہو سکتی ہے، مثلاً تاریخ وفات ۱۲/ربیع الاول مطابق ۲۲ نومبر ان جدولوں میں نہیں ملے گی، ایک دن کا فرق ملے گا، یعنی ۲۱/نومبر سنچر بیان ہوگا۔

جو بھی ہو، ایک فرنگی جدول میں جو سامنے ہے، لکھا ہے کہ ۲۳/صفر ۱۳۰۲ھ واقعی جمعہ کے دن ہوا اور یہ معادل تھا ۱۴ دسمبر کا (اتفاق سے پیرس یونیورسٹی کا جلسہ ۱۲ دسمبر ہی کو ہوا) جو عیسوی تقویم کے لحاظ سے ٹھیک سو سالہ جشن کا دن تھا، ہجری حساب سے تین سال قبل صفر ۱۳۰۲ھ میں یادگار منانے کی ضرورت تھی، کسی کو تب وہ بات ذہن میں نہ آئی، ورنہ پیرس میں جواب ہوا وہ تب بھی ہو سکتا تھا، مرضی مولیٰ۔

سوانح:

ان کی تعلیم وطن میں ہوئی، پھر دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) میں ہوئی، وہ اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد انگریز نئے نئے حاکم بنے تھے، ان کو اسلام سے دشمنی بھی تھی اور تبلیغ عیسائیت کا شوق بھی، ایک طرف اسلامی اوقاف ضبط ہونے لگے، جس کے باعث اسلامی درسگاہیں بند ہونے لگیں اور دوسری طرف انگریزی زبان اور مشنری کالجوں اور کارکردگیوں کا اضافہ ہوا، اللہ جزائے خیر دے ان مسلمانوں کو جنہوں نے مسلمانوں کے دین و ایمان کو بچانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کیں، دیوبند، علی گڑھ، ندوہ، دارالعلوم حیدرآباد دکن اور جامعہ عثمانیہ میں شعبہ دینیات بنا۔ یہ سب اسی کوشش کی زنجیر کی کڑیاں ہیں، ندوہ کی تعلیم کے باعث عربی، فارسی ہی نہیں، سید

صاحب نے انگریزی بھی سیکھی، کہتے ہیں کہ کچھ عبرانی بھی پڑھی، اچھے مقرر تھے اور طالب علمی کے زمانہ ہی سے عربی کے خطیب بھی تھے۔

وہ جامع الکملات تھے، صاحب دل بلکہ صاحب سلسلہ صوفی بھی تھے، ادیب اور شاعر بھی، علوم دینی (قرآن، حدیث، فقہ، کلام) کی تعلیم پائی، تاریخ ہی نہیں، طب اور ہیئت سے بھی خاصی واقفیت تھی، ان کے علاوہ سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار ”الہلال“ کی ادارت میں بھی شریک رہے، تحریک خلافت کے سلسلہ میں مسلمانان ہند کے وفد میں شریک ہو کر لندن گئے، پھر ترکی میں جمہوریت قائم ہوئی تو انقرہ میں ”بیوک وطن مجلسی“ یعنی پارلیمنٹ نے قرار دیا کہ چونکہ خلیفہ کے فرائض منصبی اب پارلیمنٹ انجام دیتی ہے، اس لیے اب کسی ایک فرد کو خلیفہ بنانے یا رکھنے کی ضرورت نہیں، اس کے نتیجے کے طور پر مکہ معظمہ میں ایک عالمگیر کانفرنس ہوئی کہ اب خلیفہ کسے سمجھیں، کسے بتائیں؟ اس میں ہندوستان کا جو وفد گیا اس میں سید صاحب بھی شریک تھے۔

ان کے علم کی شہرت دور دور تک پھیلی، اسی لیے شاہ نادر خان مرحوم نے ان کو کابل بلایا، کہ وہاں کی تعلیم کی تنظیم جدید کے لیے مشورہ دیں، پونا کی یونیورسٹی میں استاد بھی رہے، بھوپال میں مفتی بنائے گئے، انگنت انجمنوں اور اداروں کی طرف سے لکچروں کے لیے بلائے جاتے رہے، یہاں تک کہ مدرسہ طیبہ جیسے فنی ادارے کے جلسہ تقسیم اسناد کے لیے مدعو ہوئے، آخر میں خود اپنے ہی قائم کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ کے ہو کر رہ گئے اور اس کے شہرہ آفاق ماہنامہ معارف کے ایڈیٹر بھی رہے۔

ان کی تالیفوں میں تنوع اور اُچّ نظر آتی ہے، قرآن مجید سے آغاز اسلام ہی سے ہر مسلمان عالم کو دلچسپی رہی، مگر ارض القرآن، یعنی قرآن میں جن مقامات کا ذکر ہے ان کے جغرافیہ کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی اور اس پر ان کی تالیف تاحال دنیا میں یگانہ ہی ہے۔ حدیث میں ایک طرف اس کی تدوین و تحریر کی تاریخ پر بنی راہیں کھولیں اور دوسری طرف سیرت النبیؐ پر جو پانچ جلدیں لکھیں (اور جو ہنوز ناتمام ہی کہی جاسکتی ہیں) وہ اردو میں مایہ ناز ہیں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف احادیث صحیحہ پر مبنی

واقعات کو درج کیا ہے، دوسری چیزوں کو نہیں۔
 فقہ میں وہ خفی تھے، لیکن وسعتِ قلبی کا یہ عالم کہ سوانحِ عمری لکھی تو امام مالکؒ کی، جو معلومات سے لبریز ہے۔

ہمالیہ تلے کے براعظم میں مسلمان عورتیں کس مہری کے عالم میں تھیں، سید صاحب کو ان پر بڑا رحم آتا تھا اور ہر طرح ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور پرانی مسلمان عورتوں کے کارناموں کو خوب اجاگر کرتے تھے۔ طالبِ علمی کے زمانہ ہی میں سیرت عائشہؓ لکھی اور ایسی کہ بعد میں اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور تا حال اپنے موضوع کی بڑی مستند کتاب شمار ہوتی ہے۔

طبقات الارض، طب اور علمِ ہیئت میں مسلمانوں کی خدمات ان کے خاص موضوع تھے، عرب و ہند کے تعلقات پر ظاہر ہے کہ ایک ہندی مؤلف ہی زیادہ بہتر لکھ سکتا تھا، جسے انہوں نے انجام دیا۔ لیکن ”عربوں کی جہاز رانی“ ایک ایسا اچھوتا موضوع تھا، جس پر خود عربی میں بھی کم ہی کچھ لکھا گیا ہے، قرآن مجید میں جہاز رانی کا بکثرت ذکر ہے، فرنگی غیر مسلم مؤلف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا نعوذ باللہ مولف سمجھتے ہیں، قرآن میں عام اور طوفانی وقت کی جہاز رانی کے ذکر سے یہ یقین کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ کے شخصی تجارب کا آئینہ دار ہے۔ زمانہ رسالت میں نہ صرف فوجی حمل و نقل کے لیے (معرکہ ایلہ میں) بلکہ بحری ڈاکوؤں کو سزا دینے کے لیے (ساحل جدہ پر) جہازوں کا استعمال ہو چکا تھا۔ عہدِ فاروقی میں جہازوں نے ہی مسلمانوں کو عمان سے مغربی ہند کے ساحلوں پر پہنچایا تھا۔

ان کے سیکڑوں مضامین علمی رسالوں میں چھپے، مخزن لاہور، علی گڑھ منتقلی اور ’الندوہ‘ کے ناموں سے اب نئی نسل ناواقف ہو گئی ہے، ان کے چند دلچسپ مضامین یہ ہیں:

(۱) اندھوں کی تعلیم کا طریقہ پہلے مسلمانوں نے ایجاد کیا، (الندوہ ۱۹۱۱ء)

(۲) انجیل برنابا، (ایضاً ۱۹۰۶ء)

- (۳) علمائے روس اور اصلاح نصاب عربی (ایضاً ۱۹۰۶ء)
- (۴) مستشرقین یورپ، چار قسٹیں (ایضاً ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء)
- (۵) ملک حبش میں ایک اسلامی حکومت، تین قسٹیں (الہلال ۱۹۱۳ء)
- (۶) ہندوؤں کی علمی اور تعلیمی ترقی مسلمانوں کے عہد حکومت میں، نو قسٹیں، (معارف ۱۹۱۸ء)
- (۷) سلطان ٹیپو کی چند باتیں۔ (ایضاً ۱۹۱۸ء)
- (۸) جاپان اور اس کا نظام تعلیم (ایضاً ۱۹۳۵ء)
- (۹) کیا رومن حروف ہیروگلیفی سے ماخوذ ہیں؟ (ایضاً ۱۹۳۲ء)
- (۱۰) عرب اور امریکہ (ایضاً ۱۹۳۹ء)
- (۱۱) معراج منامی یا جسمانی (ایضاً ۱۹۳۳ء)
- (۱۲) خطبہ اسناد طیبہ اسکول پٹنہ (ایضاً ۱۹۳۶ء)
- (۱۳) کیا خلقی معذورین کی پیدائش انصاف الہی کے خلاف ہے؟ (ایضاً ۱۹۳۵ء)
- (۱۴) برمک اور برمکی (ہارون الرشید کے زمانہ والے کا ہندی ”پرکھ“ سے ماخوذ) (ایضاً ۱۹۳۸ء)
- (۱۵) ایک غلطی کا اعتراف (ایضاً ۱۹۴۰ء)
- (۱۶) رجوع اعتراف (ایضاً ۱۹۴۰ء)

ان میں سے آخری دو پر خاص کر ناظرین کی توجہ منعطف کراتا ہوں۔ غلطی ہر کسی سے ہو سکتی ہے، لیکن اس کا برملا اعتراف کرنے کے لیے بڑی اخلاقی بہادری کی ضرورت ہوتی ہے، اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا، انہوں نے جب اپنی شہرہ آفاق کتاب ”عربوں کی جہاز رانی“ شائع کی تو میں نے فوراً خرید کر پڑھی اور اپنے ذاتی معلومات جو اس میں اضافہ طلب معلوم ہوئے، مرتب کر کے محترم سید صاحب کو بھیجے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے ان کو بلا ترمیم فوراً رسالہ معارف میں چھاپ دیا اور مجھے

بہت ہی محبت سے ایک خط لکھا کہ ”تم نے ہماری داد نہ دی کہ بحر عرب میں ہم نے کاغذی کشتی چلا دی۔“ میں بہت شرمندہ ہوا اور عریضہ لکھا کہ وہ مضمون اعتراض کے لیے نہ تھا، بلکہ طالب علمانہ سوال کی حیثیت رکھتا تھا۔

وہ بڑے بذلہ سنج بھی تھے، ایک بار وہ حیدر آباد دکن آئے اور جامعہ عثمانیہ میں ایک لکچر دیا، انہیں علم اہستقاق سے بڑی دلچسپی تھی، لکچر میں ضمناً ایک جگہ فرمایا کہ انگریزی لفظ ”جاء“ اصل میں عربی لفظ ”جاء“ سے ماخوذ ہے، میں سامعین میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا، اٹھ کر کہا: مولانا! میری دانست میں تو وہ اردو لفظ ”گھڑا“ سے لیا گیا ہوگا، فوراً فرمایا: ممکن ہے اسی سے گڑھا ہو۔“ ان ہی دنوں میں ایک اور ملاقات کا موقع ملا اور میں نے کچھ علمی سوال کیے، جواب کے بعد فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ تم سیرت النبیؐ پر ایک کتاب لکھو اور ہم بتائیں گے کہ کس سنج پر، میں نے کہا ”کیا آپ کی سیرۃ النبیؐ کے بعد اس کے لیے کوئی جگہ باقی ہے؟“ فرمایا: وہ بہت بڑی ہے، میں نے کہا آپ نے رحمت عالمؐ بھی لکھی، فرمایا: وہ بہت چھوٹی ہے، میں نے عرض کیا ”سیرت پاک ایک ایسا موضوع ہے جو کسی ایک آدمی کے بس کی چیز نہیں“ اس پر وہ چپ ہو گئے اور دوسرے لوگوں نے ان سے گفتگو شروع کر دی، مجھے بعد میں بہت افسوس رہا کہ ان کے تصور کی کتاب سیرۃ النبیؐ کا خاکہ کیوں نہ معلوم کیا، لیکن یہ اب بعد از وقت ہے، اللہ کی مرضی۔

مجھے حال میں جنوبی افریقہ جانے کا موقع ملا، جہاں مرحوم کے فرزند ارجمند سید سلمان ندوی ڈربن یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کے صدر ہیں، انہوں نے ایک بات یاد دلائی جو میں بھول گیا تھا، وہ یہ کہ جب میں ۱۹۵۰ء میں یکسالہ قیام کے بعد پاکستان سے فرانس واپس ہو رہا تھا تو سید صاحب کے ہاں جو اس وقت کراچی آچکے تھے، الوداعی ملاقات کے لیے گیا، صبح سویرے کا وقت تھا، وہ ناشتے پر تھے، نام سنا تو فوراً اندر بلا لیا اور نوجوان بچے (سید سلمان صاحب) سے فرمایا: ان کے لیے ناشتہ لے آؤ، میں نے عذر کیا کہ ناشتا کر چکا ہوں، پھر بھی اصرار کیا، میں نے کہا: کیا یہ ایک حکم ہے یا کوئی اور چیز؟ فرمانے لگے جی نہیں، یہ حکم ہے۔ ناشتا پر محبت سے فرمایا: کیوں جا رہے ہو؟ یہیں رہو، مجھے علمی نشریات میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے“ میں نے عرض کیا نشریات

کے مالی اور انتظامی حصے سے پنپنے کا مجھے تجربہ نہیں، رہا علمی عنصر، اس کے لیے خدا ڈاک کو زندہ رکھے، پیرس کے کتب خانے پاکستان سے زیادہ کارآمد اور ضروری ہیں، اس پر وہ چپ ہو گئے، اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔

ضروریات:

یہ صد سالہ یا دیگر جلے نشستہ و گفتندہ برخواستہ ہو کر نہ رہیں، ضرورت ہے کہ ان کا علم پھلے پھولے، اولاً ان کے مقالات کا مجموعہ شائع ہونا چاہیے، جواب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے ہیں، اس کے بعد ان کے عربی اور انگریزی ترجمے ہونے چاہئیں، فرانسیسی اور جرمن میں بھی ہو سکیں تو کیا کہنے، تراجم میں مقالے ہی نہیں، کتابیں بھی ہوں، جن میں سے چند کے (انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں) وفقنا اللہ لما فیہ رضاه۔

(معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۸۵ء)

ابوحنیفہ دینوری کی کتاب النبات

مؤلف:

دینوری نے کتاب النبات کے نام سے نباتیات کی جو انسائیکلو پیڈیا مرتب کی تھی وہ عربی زبان کے اُن شہکاروں میں سے ہے جو عرصہ سے ناپید ہیں۔ اس کا ایک ٹکڑا ابھی ابھی برآمد ہوا ہے اور وہی ان سطروں کے لکھنے کا محرک ہے۔

اس کے مؤلف ابو حنیفہ احمد بن داؤد بن وند کی ولادت شہر دینور میں ہوئی جو عراق عجم میں ہے۔ صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن تیسری صدی ہجری کے پہلے عشرے کا قیاس ہی وفات یا فوت (مجمع الادبا) کے بیان کے مطابق ۲۶ جمادی الاولیٰ ۲۸۲ھ کو ہوئی۔ اُن کے دادا کا نام وند ہے جس کے معنی پرانی فارسی میں ”فتیاب“ کے بیان کیے گئے ہیں۔

بنو امیہ کے خاتمہ کے بعد جب عباسیوں کی طویل حکومت میں مستحکم امن میسر ہوا تو جہاں کوفہ اور بصرے کی علمی خانہ جنگی کم ہوئی وہیں مکتب بغداد کے اصول خدما صفائیں پلنے والے عربی زبان کی بڑھتی ترقی میں اتنا حصہ لینے لگے کہ یہ دور تاریخ میں سنہرا دور سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے مؤلف کے ہمعصرین میں امام بخاری، امام احمد بن حنبل، امام قشیری، بایزید بسطامی، جاحظ، محمد بن حبیب، ابن قتیبہ، ابو زید بلخی اور دیگر ان گنت ممتاز شخصیتیں نظر آتی ہیں اور اپنے شعبے کی حد تک دینوری کا کارنامہ اور کاوش تحقیق بجز چند محدثین کرام کے کسی بھی بڑے سے بڑے مؤلف سے کم تو کیا کم ہی لوگ اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

ہمارے ”ہرفن مولیٰ“ مؤلف کو اگر تاریخ اور جغرافیہ سے دلچسپی تھی تو ساتھ ساتھ، ریاضی اور جبر و مقابلہ و ہیئت سے بھی، لسانیات اور بلاغت سے بھی، طب و نباتات سے بھی۔

لسانیات اور صرف و نحو کی تعلیم السکیت اور ابن السکیت سے پانے کا ذکر تو ہمارے مآخذ کرتے ہیں لیکن دیگر علوم کے متعلق وہ خاموش ہیں۔ اگر دیوری کی سب تالیفیں ملتیں تو ان میں ذکر کردہ اسناد سے اُن کے دیگر علوم کے اساتذہ کا بھی پتا چل جاتا۔ جہاں تک نباتیات کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی کتاب کی تالیف میں اپنے پیش روؤں سے بھی استفادہ کیا ہے اور ہم عصروں سے بھی اور خود ذاتی تحقیق اور مشاہدے سے بھی۔

ابن ندیم کے بیان کے مطابق ابوعلی الحسن بن عبداللہ الاصفہانی کے رفیق درس تھے اور الفرار^۱ کے راوی کا فرض بھی انجام دیا۔ یاقوت کے بیان کے مطابق دیوری اپنی زندگی ہی میں بطور انشاء پرداز کے جاحظ کے حریف تسلیم کیے جاتے تھے۔ علم ہیئت کے رصدی مشاہدے انہوں نے پچیس سال کی عمر میں کر کے اپنا سکہ بٹھا دیا تھا اور دیور میں ان کی خاتنی رصد گاہ اُن کے بعد بھی صدیوں کام دیتی رہی۔

اصل تالیف:

بعض حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ اصل کتاب النبات چھ ضخیم جلدوں میں تھی۔ مجھے اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ ہمیں اب جو تین باب دستیاب ہوئے ہیں ان کے اقتباسات ابن سیدہ کی کتاب المحصص میں بھی ہیں لیکن اس تناسب سے کہ ہماری (۷۴۰) سطروں میں سے وہاں صرف (۱۵۰) سطریں نقل ہوئی ہیں اور ابن سیدہ میں دیوری کی کتاب النبات کے جو اقتباسات ہیں وہ کم سے کم دو صفحاتوں کی جلد میں سما

۱۔ ایک غیر متعلق مگر دلچسپ اطلاع یہ عرض کرنی ہے کہ الفرار (التوفی ۳۰۷ھ) کی تفسیر قرآن مجید مل گئی ہے اور کتب خانہ وہبی آفندی استانبول (تفسیر نمبر ۶۶) میں موجود ہے مشتبہ تفسیر ابن عباس کو چھوڑ کر اب یہ محفوظ و موجود تفسیروں میں قدیم ترین ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ امام زید بن علی سے بھی قدیم تر۔

سکتے ہیں۔ یہ امر قابل وضاحت ہے کہ دینوری نے پودوں کے نباتاتی حالات زیادہ دیے ہیں اور متعلقہ اصطلاحات کی لسانیاتی اور صرفی و نحوی تشریح جو محض ضمنی ہے مختصراً دی ہے اور ابن سیدہ نے زیادہ تر صرف آخری حصہ کو نقل کر کے باقی کو ترک کر دیا ہے۔ ان حالات میں کتاب النبات کا چھ ضخیم جلدوں میں ہونا بعید از قیاس بالکل نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ کشف المظنون کا یہ بیان کہ ابن اخت غانم نے کتاب النبات کی شرح ساٹھ جلدوں میں لکھی تھی۔ حسن ظن سے بھی کام لیں تو ساٹھ کراسوں سے عبارت معلوم ہوتی ہیں۔

چند سال قبل ۱۹۱۰ء میں بریلاؤ (جرمنی) کے ایک طالب علم زلبر برگ نے ابن سیدہ و لسان العرب وغیرہ سے دینوری کے اقتباسات اکٹھے کر کے ایک مقالہ اپنے امتحان ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا تھا۔ جو ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۱ء میں اشٹرا سیورگ کے جرمن رسالے تسات شریف نیورا ہور یولوگی میں چھپا تھا۔ عربی زبان اور نباتیات دونوں میں درک رکھنے اور بعض اچھے اساتذہ کے خانگی جمع کردہ مواد سے بھی نوازے جانے کے باعث اس کے خیالات اصل تالیف کے متعلق دلچسپی کے حامل ہیں اسے البتہ ہمارے تازہ مخطوطے کا علم نہ تھا۔

اس کے پیشرو:

قبل اس کے کہ زلبر برگ کے کچھ اقتباس دیے جائیں اپنا ایک ناچیز خیال پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دیگر علوم و فنون کی طرح مسلمانوں میں نباتیات کا ذوق بھی قرآن مجید ہی سے پیدا ہوا ہوگا۔ دنیا کی مقدس اور الہامی مذہبی کتابوں میں سے کسی میں بھی نباتات کا اتنا کثیر ذکر نہیں ہے جتنا قرآن مجید میں ہے۔ ایک دو گھنٹے کی تلاش میں مجھے ایسے (۱۶۹) مقام ملے۔ ان کی مختصر تحلیل شاید بے محل نہ ہو۔

خدا سارے جہانوں کا آقا (رب العالمین) ہے تو عالم نباتات کا بھی وہی آقا ہے۔ یہی نہیں خدا نے اپنا وصف خود نحن الزار عون ، نحن المنشئون لے کے

۱۔ خدائے ذوالجلال کے یہ اوصاف سورۃ الواقعہ کی آیات نمبر ۶۳ اور ۷۲ میں بالترتیب بیان ہوئے ہیں۔ (مرتب)

الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قرآن میں بہ کثرت تذکرے مردہ زمین، زندہ زمین، ایک کا دوسرے میں مبدل ہونا اور اس کے اسباب دلچسپ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ آب پاشی کے ذرائع میں سے چشموں، ندیوں، کنوؤں، بارش، شبنم، کاریتوں، بادلوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ تو باغوں، کھیتوں، چراگاہوں، جنگلوں، سبزہ زاروں کا اُن کی زندگی کے مختلف اوقات میں بھی قسم قسم اور رنگ رنگ کے میوے کھجور، انجیر، انگور، انار کا نام آتا ہے تو غلوں ترکاریوں میں قثا، قوم، عدس، بصل، خردل، زنجبیل وغیرہ کا نیز چھلکوں، چھالوں کا کھجور کا تفصیلی ذکر، اس کا تنا اس کے گچھے، خوشے، گٹھلی، قلمیر، وغیرہ کا ذکر عرب ناظر و سامع کے لیے ناگزیر ہی تھا۔ انگور کی بیلوں، شراب، شہد، زیتون، روح و ریحان (زہرۃ الحیاۃ کے ذریعہ سے) پھولوں، کافور، من، زقوم، سدرہ بھی مذکور ہیں۔ لکڑی وغیرہ سے بننے والے سامان میں کرسی، تخت، دروازہ، سیڑھی، تیرکمان، تکیے، قالین، قلم، ریشم، لباس، کاغذ، پکوان کے برتن کے ساتھ ساتھ چرنے والے جانوروں میں اونٹ، بھیڑ، بکری، گائے، بیل (دودھ) گھوڑے، گدھے، خچر، بندر، سور، ہاتھی، گورخر، مڈی، نیز مکھی، شہد کی مکھی، مکڑی بھی مذکور ہیں۔ غلے کے کارواں، کشتیاں، ترو خشک ایندھن، لکڑی کا چھماق، ناگر، کٹائی، قحط، طوفان، طغیانی، غرض بیسیوں اور کے لمبے لمبے تذکرے ہیں۔ اگرچہ ہمارے مؤلف نے پیش نظر مخطوطے میں (جس کو جامعہ کیمبرج یا برلن اکاڈمی شاید شائع کرے گی صرف چار ہی مرتبہ قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے لیکن اس نکتے کی وارد شدہ اصطلاحات قرآن مجید میں بیسیوں ہی ہیں)۔

جاہلیت کا عرب شاعر باریک بینی کے لیے مشہور ہے تو وہیں اس کی زبان اتنی متمول نظر آتی ہے کہ وہ نباتات کے دقیق سے دقیق مسئلے کے لیے بھی کسی غیر زبان کے الفاظ کا محتاج نہیں ہوتا۔ بعد کے علمی ترقی یافتہ دور میں بھی چاہے فلسفہ منطق و طب وغیرہ میں عربوں کو بیرونی اصطلاحات و الفاظ قبول اور رائج کرنے پڑے ہوں لیکن فقہ ہی کی طرح نباتات میں بھی یونانی اور سنسکرت وغیرہ کا اثر ناپید ہے۔ بجز اس کے کہ عرب یا عربوں کی سفرگاہوں میں پیدا نہ ہونے والے پودوں کے نام ہوں، عربی زبان کا یہ کمال عجیب اور حیرت انگیز تو ہے لیکن لغو اور بے وجہ نہیں، بات یہ ہے کہ یونانیوں کے برخلاف

جو حضری اور شہ نشین ہو گئے، عرب میں بدویت اور خانہ بدوشی ہمیشہ باقی رہی اور اس بے برگ و گیاہ صحرا میں ہر پودہ، پودے کا ہر جزء وہاں کی انسانی اور حیوانی آبادی کو ہر وقت مطلوب ہوتا تھا۔ اس کے خوردنی یا ناخوردنی ہونے کی تحقیق آخری حد تک پہنچانی ناگزیر تھی۔ پھر کسی اور علمی مشغلے کی غیر موجودگی میں اندرونی لپک حساس طبیعتوں کو ان مشاہدات کو نظم میں منتقل و محفوظ کرنے کی ہر ترغیب بھی موجود تھی۔

دینوری اور اس کے ہم عصر نباتاتیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جہاں زلبر برگ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ان کی تالیفوں میں نہایت ترقی یافتہ فنی اور اصطلاحی الفاظ ہر قدم پر ملتے ہیں، وہیں وہ اس پر حیرت ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح ایک جاہل بدوی ریگستان میں اونٹ کے قدم کے نشان ہی کی طرح پودوں کی ساخت کے نازک سے نازک پہلو اور جزء کو بھی اسی صحت و وضاحت اور پرگوانداز میں منظر عام پر لاسکتا ہے۔“ پھر یہ پوچھتا ہے:

”بہر حال یہ کافی حیرتاک ہے کہ زمانہ قدیم کے سارے نباتاتی ادب میں ہماری کتاب کے صرف دو ہی مسائل پیش رو ملتے ہیں، یہ کیسے ہو گیا کہ مسلمان اس معاملہ میں اس قدر جلد ایچ بھرے یونانیوں کے برابر ہی نہیں ہو گئے بلکہ اُن سے بڑھ ہی گئے؟ دیگر قوموں کے نباتاتی ادب نے قوم کی ترقی کے زمانہ میں اپنی الگ فنی زبان پیدا کر لی لیکن یہاں معاملہ الٹا ہے، بدویوں کی زبان اس علم کے وجود میں آنے سے بھی پہلے تفصیلات تک کے لیے ایک خوب ہی پھیلے ہوئے ذخیرہ اصطلاحات کی حامل تھی۔“

فنی لغتیں:

عام لغتوں کے ساتھ ساتھ عربوں میں خصوصی ایک فنی لغتوں کا بھی کم از کم اصمعی کے دور سے روز افزوں شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کتاب الزرع والتمیل، کتاب الخیل، کتاب الابل کتاب الحیات، کتاب الوحوش، کتاب الحیوان، کتاب الانواء، کتاب الارض

والسما، غرض میسوں ہی نام اس سلسلہ میں لیے جاسکتے ہیں جن میں سے بعض اب تک محفوظ بھی ہیں۔ اُن کے متعلق زمانہ حال کے سب سے بڑے جرمن وراق یا کتب شناس بروکلمان نے ضمیمہ تاریخ ادبیات عربی ۱/۵۷۲ میں لکھا ہے کہ اس طرح کی یک فنی لغتوں پر لسانیات کے نقطہ نظر سے نہایت قیمتی ہونے کے باوجود یورپین زبانوں میں آج تک بہت ہی کم توجہ ہوئی ہے۔

ابتدائی عربی تالیفیں:

نباتات پر جن ابتدائی عربی تالیفوں کا پتا چلتا ہے، وہ ابن ندیم وغیرہ کے مطابق یہ ہیں:

(۱) ابو عمرو بن الحلاء (المتوفی ۱۵۹ھ) کتاب (بعد والوں کے ہاں اس کے بکثرت حوالے ہیں)

(۲) ابوزید (المتوفی ۲۱۳ھ) کتاب الشجر والکلاء (بحوالہ مزرہ سیوطی)

(۳) ابوزیاد الاعرابی (ہمعصر خلیفہ مہدی) کتاب النوادر (نباتات سے جزء آبجث)

(۴) الاصمعی (المتوفی ۲۱۶ھ) کتاب النبات والشجر (طبع بیروت)

(۵) ابن الاعرابی (المتوفی ۲۳۱ھ) کتاب النبات

(۶) ابونصر الباہلی (المتوفی ۲۳۵ھ) کتاب الشجر والنبات

(۷) ابن السکیت (المتوفی ۲۴۲ھ) کتاب النبات والشجر

(۸) ابو حاتم البستانی (المتوفی ۲۵۰ھ) کتاب الشجر والنبات

(۹) السکری (المتوفی ۲۷۵ھ) کتاب النبات

(۱۰) دینوری (المتوفی ۲۸۲ھ) کتاب النبات

ان کے علاوہ عام لغتوں میں بھی نباتات کا کافی ذکر ہے۔ خلیل (المتوفی

۱۶۰ھ) سیبویہ (المتوفی ۱۶۱ھ) الکسانی (المتوفی ۱۸۹ھ) الفراء (المتوفی ۲۰۷ھ)

ابو عبیدہ معمرز (المتوفی ۲۰۸ھ) ابو عبیدہ القاسم (المتوفی ۲۲۳ھ) ابو عمر البحر

(المتوفی ۲۲۵ھ) کے نام خاص طور پر اس سلسلے میں لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے ہر

ایک نے اپنے پیشروں اور اپنے ہمعصوروں کی کتابوں سے استفادہ کیا ہوگا اور حسب عادت مالوفہ، ان کی کچھ چیزیں بلا حوالہ نقل کی ہوں گی تو کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی کیا ہوگا اور بہ حیثیت مجموعی علم کو زندہ رکھنے اور اس کی مزید ترقی میں حصہ لینے کا سلسلہ جاری رہا ہوگا۔

افسوس ہے اب صرف تالیف نمبر ۴ صمعی کی کتاب النبات والشجر ملتی ہے۔ کوئی چالیس برس ہوئے جرمن مستشرق ناگلبرگ نے ابو زید کی طرف منسوب کتاب النبات والشجر شائع کی لیکن اب اندرونی شہادت کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ یا تو ابن خالویہ (المتوفی ۳۷۰ھ) کی تالیف ہے یا کسی اور کی۔

خوشہ چین:

ابو حنیفہ دینوری کی یادگار تالیف نے سب کے قلم توڑ ڈالے اور اس کے بعد صرف اسی کے حوالہ سے پودوں اور جڑی بوٹیوں کے ذکر ہونے لگے۔ یہ اقتباسات بہت سے ہیں اور انہی سے ایک ضخیم جلد دو تین سو صفحوں کی تیار ہو سکتی ہے۔

- (۱) ابن سیدہ: کتاب النخس نیز کتاب محکم
- (۲) ابن سجون الجامع فی الادویۃ المفردہ
- (۳) الغافقی: شرح العقاء (خلاصہ ابن میمون الاسرائیلی)
- (۴) الصغانی: العباب
- (۵) ابن منظور: لسان العرب
- (۶) فیروز آبادی: القاموس
- (۷) مرتضی زبیدی: تاج العروس
- (۸) ابن البیطار: مفردات الادویۃ
- (۹) ابن العوام: کتاب الفلاحت
- (۱۰) علی البصری: النہات علی الاغلاط
- (۱۱) یاقوت: معجم البلدان

(۱۲) المرزوقی: الا زمته والامکنته۔

میں خاص کر دینوری کے اقتباسات ملتے ہیں اور ابن سیدہ کی کتاب انھیں میں سب سے زیادہ ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے اس کتاب میں ایک ایک عنوان لیا گیا ہے جیسے انسان، زمین، اونٹ، پانی وغیرہ اور ان کے تحت جملہ متعلقہ ہزاروں الفاظ مختصر توضیح کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس کی بارہ پندرہ جلدوں کی ورق گردانی میں مجھے جن جن ابواب میں ابو حنیفہ دینوری کے اقتباس نظر آئے ان کی بنیاد پر اصل کتاب النبات کی فہرست مضامین یا کم از کم اس کی وسعت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ ابن سیدہ کی جلد (۱۲۱۰) میں نباتات و متعلقات کا ذکر ہے اور شاید یہ فرض کر لیا جاسکتا ہے کہ اصل کتاب النبات کی بھی ویسی ہی ترتیب ہوگی۔ البتہ ابن سیدہ کا مقصد انھیں میں کتاب النبات سے مختلف ہونے کے باعث کتاب النبات کے مواد کی انھیں میں تقسیم و انتشار بھی ناگزیر ہے، بہر حال انھیں میں دینوری کے اقتباسات زیادہ تر حسب ذیل ترتیب سے ہیں۔

کتاب النبات کی تحلیل:

انھیں میں جلد (۴) میں نباتی دباغت پر بہت دلچسپ اور اہم مواد ہے۔

انھیں میں جلد (۵) شہد، شہد کی کھیاں، کھانا، قے کرنا وغیرہ

انھیں میں جلد (۶) تیرکمان کا طویل ذکر

انھیں میں جلد (۷) اونٹوں کا چرنا، اور ان کی بیماریاں

انھیں میں جلد (۸) ہرن، پرندے، ٹڈی، کھیاں وغیرہ

انھیں میں جلد (۹) آب پاشی، اس کے برتن مثلاً ڈول وغیرہ، رسیاں، پانی رکھنے

یا لے جانے کا سامان جیسے مشک وغیرہ۔

انھیں میں جلد (۱۱۱۰) حسن تفصیل ذیل:

پودوں کے لیے مٹی کی ضرورت ہے حتیٰ کہ آبی نباتات کے لیے بھی زیر آب

زمین درکار ہے اور چٹانوں پر اگنے والے پودوں کے لیے بھی پتھر پر جمی ہوئی گرد ناگزیر

ہے۔ اسی لیے سب سے پہلے مٹیوں اور زمینوں کا تفصیلی ذکر ہے، آباد، غیر آباد، کم آباد، وبائی علاقے اور اس کے اسباب، موسم، اور محل وقوع کا اثر زمین پر وغیرہ بیان کرنے کے بعد ہمارا مؤلف پودوں کی ایک بڑی اور بنیادی تقسیم ہوئے ہوئے اور خودرو میں کرتا ہے۔ ہونے کے سلسلے میں ناگر اور دیگر ذرائع سے زمین کو تیار کرنے کی تفصیل آئی ہے، پھر وادیوں، طغیانوں اور سیلابوں کا ذکر ہے۔ آب پاشی کا ذکر ابن سیدہ نے جلد (۹) میں منتقل کر دیا ہے جو غالباً اصل میں یہاں ہونا چاہیے تھا۔ بارش کی پختروں کا بھی یہاں ذکر آتا ہے۔ لیکن دینوری نے اس پر کتاب الانواء کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی تھی۔ زمین کا ذکر دوبارہ کرتے ہوئے پھر اس کا ذکر ہے کہ کہاں پودے جلد اُگتے ہیں۔ کہاں دیر سے اور کہاں نباتی زندگی مشکل اور کہاں ناممکن ہے۔ پھر زرخیز زمین کی عام خصوصیتوں کی تفصیل آتی ہے اور مختلف رنگ کی مٹی کے ذکر کے بعد اساک باران، پانی کی قلت، موسم کا اچھا یا بُرا ہونا۔ کاشت میں غیر مطلوب جنگلی خودرو پودوں کا خود بخود اُگنا، وغیرہ بیان ہوئے ہیں۔

اس کے بعد گویا اصل کتاب شروع ہوتی ہے اور نباتات میں ترو خشک گھاس کا بیان کرنے کے بعد تنے والی نباتات یعنی درختوں کا ذکر شروع ہوتا ہے اور ان کے وہ اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں جو سب خاندانوں میں مشترک ہیں اور وہ بھی جو بعض بعض سے مخصوص ہیں۔ درختوں کا اُگنا، پھولنا اور اُن پھولوں کی خصوصیتیں بیان کرنے کے بعد درختوں کی ذیلی تقسیم یہ کی گئی ہے کہ کون سے پھلتے ہیں اور کن میں پھل نہیں آتا اور اس نوبت پر درخت کی ساخت، جڑ، تناؤ وغیرہ پر بحثیں کر کے تنے پر ہونے والے مضر اثرات، کیڑے اور گھن وغیرہ کا ذکر ہے اور کم عمر اور پرانے طویل العمر درختوں کی تفصیل ہے۔

تنے سے لیے جانے والے کاموں کی بحث میں بہت سے امور آتے ہیں اور تیرکمان سے بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر شاخوں تنوں کو کاٹنے اور کاٹنے پھوڑنے چیرنے کے آلات کی پوری تفصیل ہے اور ایندھن پر گویا یہ بحث ختم ہوتی ہے۔ بات میں بات ایندھن میں آگ کا ذکر آتا ہے۔ ایک باب اس پر ہے کہ کون سی لکڑیوں سے چقماق کا

کام (بجائے پتھر اور لوہے کے) لیا جاتا ہے اور دوسرے میں آگ کی داستان اس کی ولادت سے وفات تک ہے یعنی چنگاری، دھواں، راکھ، ان کے مختلف رنگ، اُن کے اسباب، گرمی کی زیادتی اور کمی، کڑی کا جلنے میں چٹخنا اور اس کا سبب، جنگلوں میں بعض وقت خود بخود آگ کا لگ جانا اور اس کے اسباب، آگ کو طویل عرصہ تک محفوظ رکھنا اور اس کے طریقے جن سے بارش اور طوفان میں بھی وہ محفوظ رہے وغیرہ وغیرہ یہ دونوں باب ہمارے مخطوطے میں ہیں اور ابن سیدہ میں بھی اسی ترتیب سے محفوظ ہیں، گو جستہ جستہ جملوں کی صورت میں۔

پھر درختوں کے جھنڈ اور جنگلوں کا ذکر ہے یہاں مؤلف اہم درختوں کا فرداً فرداً ذکر کرتا ہے۔ پھر بوئی جانے والی نباتات کا ذکر اس سلسلہ میں دوبارہ کیا ہے، بعد ازاں زراعت، زرعی امراض، فصل کاٹنے والے اُسانے اور گوداموں میں محفوظ کرنے وغیرہ کی پوری تفصیل ہے۔ اس کے بعد غلوں کا الگ الگ ذکر ہے۔ جیسے گیہوں، جو، سبزیاں، ترکاریاں وغیرہ۔

اس کے بعد پھلوں کا ذکر ہے۔ سب سے پہلے انگور اور اس کی کاشت اور ضمناً شراب سازی، شراب نوشی، بدستی اور اس کے نتائج بہت تفصیل سے آتے ہیں۔ کوئی زاہد تو اس رند پر کفر ہی کا فتویٰ دے دے کہ درخت رز کے عین بعد مقدس کھجور کا ذکر آتا ہے۔ عربی میں نخلیات اور ثمریات پر مواد کی کیا کمی ہو سکتی ہے البتہ تفصیل کی نہ مجھے ہمت ہے نہ ناظرین سے صبر تحمل ہو سکے گا۔ کھجور کے بعد سیب، بادام، پتے، انار وغیرہ بہ کثرت پھلوں اور میووں کا تفصیلی ذکر ہے۔

اس کے بعد گویا کتاب کا حصہ دوم شروع ہوتا ہے اور ایسے پودوں کا ذکر ہے جو چٹانوں، پتھریلی زمینوں، غیر مسطح یا مسطح میدانوں میں اُگتے ہیں، نیز وہ جو پانی میں یا پانی کے بہت قریب ہی اُگ سکتے ہیں، ضمناً اُن کا بھی ذکر آ گیا ہے جو سمندر کے کھاری پانی ہی میں اُگتے ہیں، حالانکہ عام طور پر کھاری پانی پودوں کے لیے زہر قاتل ہے، پھر مختلف ایسے پودوں کا ذکر ہے جن کے لیے محل پیدائش کی خصوصیت نہیں، نیز وہ پودے جن کے پتوں کی سبزی دیر تک رہتی ہے اور ان کی پت جھڑ دھوپ کا لے کے ختم پر

ہوتی ہے۔ پھر کاٹنے والی جھاڑیوں کا ذکر اور ان کی ذیلی قسمیں آتی ہیں، بیلوں اور زمین اور زمین پر پھیلنے والے پودوں کا بھی خصوصی ذکر ہے، مسواک اور ان درختوں کا جن سے وہ بنتی ہیں، الگ ذکر آیا ہے، اس کے بعد خوشبودار پودے آتے ہیں اور یہ تفصیل بھی کہ کون سے عرب میں نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ عطر سازی اور خوشبوؤں کی صنعت کا ذکر ناگزیر تھا اور ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد رنگوں کا ذکر اور رنگ سازی کی صنعت نیز بالوں کے خضاب میں کام آنے والے پودوں کی تفصیل ہے۔ پھر ایک اہم باب ان درختوں کے ذکر میں ہے جن سے عرق نکلتا ہے اور مختلف قسم کے گوند، لوبان وغیرہ کی تفصیل ہے۔

اس کے بعد ایسے پودوں کا ذکر ہے جن میں زیر زمین پھل آتا ہے یعنی جن کی جڑوں میں خوردنی و ناخوردنی گڈے نکلتے ہیں۔ یہ باب بھی ہمارے مخطوطے میں ہے۔

حظل اور دوسرے کڑوے پھلوں والے پودوں کے بعد کدو، کھیرے، پیاز اور دیگر طبی نباتات کا ذکر آتا ہے اور زہریلے پودوں کے ذکر کے بعد جانوروں کی غذا اور چراگا ہوں پر دینوری کے اقتباسات ختم ہو جاتے ہیں۔

بعض وقت حیرت بھی ہوتی ہے مثلاً آم کا ذکر دینوری کڑوے اور کھٹے پھلوں (حظل وغیرہ) کے ساتھ کرتا ہے کیا اب سے ہزار برس پہلے ہمارا تخمی آم واقعی اتنا ہی غیر ترقی یافتہ تھا۔ پان کا ذکر خوشبودار پودوں میں بھی ہے اور یقطین (کدو کی جنس) کے ساتھ بھی اور عجیب عجیب خوش فہمیاں اس سے وابستہ کی گئی ہیں۔

ابن سجن، الغافقی اور ابن البیطار کے ہاں زیادہ تر طبی مفاد کے اقتباسات ہیں، ان ممتاز طبیوں نے دینوری کو جو وقعت دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مختلف جڑی بوٹیوں کے متعلق اقتباسات میں دینوری کا بیان سب سے پہلے آتا ہے، غالباً ہمالیہ تلے کے براعظم کی طرح قدیم ایران و اندلس میں بھی ہر پڑھا لکھا مسلمان اپنے نصاب تعلیم میں طب کی کتابیں بھی پڑھتا تھا۔

پادری خاص کرمشتری آج بھی اس پر عامل ہیں، مجھے اپنے سفروں میں ہمیشہ افسوس ہوتا رہا کہ کیوں میں مبادی طب سے واقف نہیں کہ مریض بندگان خدا کی

جنگلوں، صحراؤں، وغیرہ میں کچھ ممکنہ خدمت کرنے اور اُن کی تکالیف کم کرنے میں حصہ لے سکتا، یہ ہماری جدید تعلیم ہے، مگر دینوری طب پیشہ چاہے نہ ہو، طب دان ضرور نظر آتا ہے اور ہر پودے کے ذکر میں اس کی طبی خاصیت ضرور لکھتا ہے۔

دینوری کا طریقہ بحث :

عربی تمدن اور ذوق کا عکس دینوری کی سطر سطر میں ہویدا ہے مثلاً جب چھماق کی لکڑیوں کا ذکر شروع ہوتا ہے تو وہ یکے بعد دیگرے ایسے ہر درخت کا نام لیتا ہے اور جن لوگوں نے اس کو دیکھا ہے ان کے منشور و منظوم بیانات درج کرتا ہے اور اگر اشعار اور ضرب الامثال میں کچھ محسوس ہوں یا نامانوس الفاظ و غریب اللغات ہوں تو اُن کی تشریح و توضیح کرتا ہے، جا بجا قصے اور لطیفے بھی آجاتے ہیں اور چونکہ ہر باب کے متعلق زبان کے جملہ متعلقہ اسماء و افعال کا یکجا کرنا مقصود ہے، اس لیے کچھ فضلیں عام ناظرین کے لیے خشک مگر لسانیات یا صرف و نحو کے طالب علم کے لیے معلومات کی کان بنی ہوئی بھی نظر آتی ہیں۔ مترادفات، اختلاف روایات، سابقہ مؤلفوں کی تردید و تصحیح سب ہی کچھ آتی ہے اور بعض دلچسپ اور اہم ترین معلومات محض ضمناً اور بہ ظاہر غیر متوقع مقام پر ملتے ہیں۔

موجودہ مخطوطے کی اصلیت :

مجھے یہ مخطوطہ ایک مجموعہ رسائل میں مدینہ منورہ میں ملا، اس کی صحت کو جانچنے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈتا ہوں۔ دنیا میں کہیں بھی اس کے کسی نسخے کا تاحال پتا نہیں۔ چند سال قبل کہتے ہیں کہ بیت المقدس میں اس کا ایک نسخہ تھا۔ جو ۱۹۳۹ء میں بھی لا پتا تھا۔ نہ معلوم امریکا پہنچ گیا ہے یا یورپ ابھی ابھی آکسفورڈ کے ایک استاد سے سنا کہ استانبول میں اس کے کسی نسخے کا پتا چلا ہے لیکن وہ استانبول کے دیگر قلمی نوادر کے ساتھ صندوقوں میں بند اناطولیہ میں تہ خانوں میں کسی جگہ چھپا ہوا ہوگا اور مجنون مغرب میں جنگ کا خطرہ گھٹنے تک اس سے استفادہ ممکن نہیں ہوگا۔

میں نے یہ کہا کہ ابن سیدہ، لسان العرب، ابن البیطار وغیرہ (مذکورہ صدر

خوشہ چینوں) نے دینوری کے اقتباسات جو سیکڑوں ہیں جمع کیے اور مدینہ منورہ کے مخطوطہ میں جو مسائل ہیں ان کو وہاں ڈھونڈنے کی کوشش کی جو کامیاب رہی۔ بیسیوں اقتباسات ایک یا زائد متاخر ماخذوں میں دینوری کے حوالہ سے ملے اور عبارت اتنی ہی ہو بہو اور یکساں ملی جتنی ایک ہی چیز کے متعدد ناقلوں کے ہاں ہو سکتی ہے۔ اس طرح کوئی شبہ نہیں رہتا کہ مدینہ کا مخطوطہ اصلی اور واقعی دینوری کا ہے، بعد والوں کے ہاں بعض جگہ حذف و خلاصہ ہے لیکن ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے یہ گمان ہو کہ مخطوطہ مدینہ کے ابواب بھی اصلی نہیں بلکہ اصل کا خلاصہ یا اقتباس ہوں۔

مخطوطہ مدینہ میں صرف تین باب ہیں اور جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا، پہلا باب چعماق کی لکڑیوں پر ہے۔ (جس میں آگ جھاڑنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے) دوسرا باب آگ اور شعلے اور دھوئیں اور راکھ کے رنگوں اور ان کے اختلاف کے اسباب پر ہے اور تیسرا باب زیر زمین پھلدار پودوں پر ہے۔

میں نہ تو نباتیات کا طالب علم ہوں اور نہ عربی ادب کا۔ محض عربی زبان کی کچھ واقفیت سے اس طرح کی فنی کتاب (جس میں بیسیوں نامعلوم پودوں کے نام اور دیگر اصطلاحیں ہیں) کو واحد مخطوطے کی مدد سے طباعت کے قابل بنانا بڑی جسارت ہے۔ بہر حال کسی اور اہل علم شخص کی آئندہ نظر ثانی کے بھروسہ پر خدا کا نام لے کر اسے ایڈٹ کر دیا گیا ہے۔ کام حسب دلخواہ نہیں ہوا، حوالے کی سب کتابیں نہیں ملیں۔ سفر نے الگ رکاوٹیں ڈالیں جب تک اصل کتاب چھپے یہ تعارف شاید اہل علم کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔

(معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۴۹ء)

”امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی“ کچھ اس تالیف اور اس کے مؤلف کے متعلق

استاذی المحترم مولانا الحاج الحافظ سید مناظر احسن گیلانی کی تالیف ”امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی“ ابھی ابھی کراچی میں طبع ہوئی ہے۔ عموماً مؤلف اپنے اساتذہ یا مشابہ اساتذہ علماء سے کوئی تعارف یا پیش لفظ حاصل کرتے ہیں۔ فاضل استاذ کی گراں مایہ تالیف ان کے سب سے ادنیٰ و حقیر تلمیذ کے پاس آئی ہے تو ایک پیش لفظ کے ذریعہ سے خود سعادت اندوز ہونے کے سوا اور تو کوئی سوال نہیں۔ اگر ناشر کا بیان نہ ہوتا کہ خود استاذ محترم نے مجھ سے کچھ لکھوا لینے کا حکم دیا ہے تو شاید اس طرح کی سعادت اندوزی کو بھی گستاخی سمجھتا۔ ”مشک آنست کہ خود بوید“ نہ کہ ”شاگردی پراند“

مؤلف کی سوانح عمری:

علماء کی بے نیازی اور کس نفس شہرہ آفاق ہے۔ اسی لیے باوجود ملک کے مؤلفین کی صہبِ اول میں ہونے کے استاذ محترم کی سوانح عمری کہیں چھپی ہوئی نہیں ملتی۔ اپنی معلومات درج کرتا ہوں تاکہ بعد والے کے لیے کچھ کام دیں۔

مناظر احسن (۱۳۱۰ھ) آپ کا تاریخی نام ہے۔ (میم کے زبر کے ساتھ) ماشاء اللہ اسم با مسمیٰ ہیں۔ خیال ہو گا کہ ابھی تو ”ساٹھا پاٹھا“ ہونے کو بھی ایک دو سال

۱۔ یہ کتاب نفیس اکیڈمی کراچی نے اپریل ۱۹۳۹ء میں دوسری مرتبہ شائع کی۔ (مرتب)

باقی ہوں گے۔ لیکن اہل علم کی بد قسمتی ہے کہ مولانا کی صحت بہت کمزور ہے۔ قلب کے اور دیگر عارضوں سے بارہا طویل عرصوں تک علیل و فریش رہے ہیں۔ خدا آپ کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

آپ کی ولادت صوبہ بہار میں گیلانی نامی گاؤں میں ہوئی۔ یا نسبت کے مزید اضافے کی جگہ آپ اپنے کو گیلانی ہی لکھتے ہیں۔ قطب الاقطاب گیلان سے نسبت گویا مقصود تھی۔ آپ کا تعلق نہ صرف بلند مرتبت شرفائے سادات سے ہے بلکہ علم و عمل بھی موروثی ہے۔ آپ کے بزرگوں کو غالباً علم ہیئت سے بھی خاص لگاؤ رہا ہوگا کیونکہ مکان میں ایک بہت پرانی اور عمدہ سنگ مرمر کی دھوپ گھڑی بھی دستیاب ہوئی تھی جو اوقات الصلاة کے لیے فرنگی گھڑیوں کی محتاجی سے بچاتی رہی ہوگی۔

آپ کی تعلیم متعدد دینی درس گاہوں میں ہوئی۔ بعض وقت ایسی صورتوں میں آدمی لا الہی ھو لاء ولا الہی ھو لاء ہو جاتا ہے۔ مگر مولانا میں علم و سیرت کی بڑی شان نظر آتی ہے کہ دیوبندی آپ کو اپنا کہتے ہیں تو بریلوی اپنا۔ ان دونوں مکاتب خیال کی انگریزی دور میں ملک میں جو ”مکافرت“ اور کشمکش تھی اس میں یہ اپنایا جانا حیرت انگیز ہے۔ مگر مولانا حقیقت میں ان دونوں سے بھی بالا ہیں یعنی آپ صرف مسلمان ہیں۔ رسول اللہ کسی کو نہ سنی شیعہ بنانے آئے تھے نہ خفی وہابی۔ بلکہ إِنَّ الدِّینَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَام کے ازلی پیغام کی تجدید کے لیے۔

جہاں حسن جمال سے فائز سرخ و سپید ہزاروں میں ممتاز و فائق تھے وہاں حسن

باطنی ۔

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارہ بلندی
(سعدی)

نوعمری ہی سے خطابت، انشاء پردازی اور شاعری، تینوں میں ہمسروں میں ممتاز رہے، کبھی گندہ سیاسیات میں حصہ نہ لیا۔ اس لیے زور بیان و خطابت کے لیے محافل و عظم میں آپ کے لیے زیادہ کشش رہی تو زور قلم اور نظم و نثر ٹھوس علمی اور بلند پایہ

جرائد کے سوا آپ کو کہیں اور نہ لے جاسکے۔

ایک مرتبہ فرما رہے تھے نو عمری میں میری ایک نظم کسی رسالے میں چھپی۔ برسوں گزر گئے میں خود اسے بھول بھلا گیا۔ پھر ایک مرتبہ ایک صاحب سے کہیں ملاقات ہوئی جو شاعر بھی تھے انہوں نے اپنے جس کلام کو فخریہ سنانے کے لیے بیاض میں سے انتخاب کیا وہ وہی بھولی بری نظم تھی۔ پہلی بیت ہی پر کھٹکا کہ یہ تو پہلے بھی کہیں پڑھی سنی ہوئی نظم ہے۔ دورانِ انشاد میں یاد آ گیا کہ چہ دلاور است دزدے کہ بلف چراغ دارد۔ اس سے کیا کہتے۔ صرف یہ کہا کہ ہاں بھی، نظم بہت اچھی ہے۔

ایک اور دفعہ ارشاد ہوا۔ مجھے ابتداءً علوم عقلیہ کا بڑا شغف تھا۔ حدیث وغیرہ سے دلچسپی نہ تھی۔ دیوبند میں شریک ہوا بھی تو ایک طرح سے غرور کے ساتھ کہ یہ بیچارے ہمیں کیا پڑھائیں گے۔ شیخ الحدیث کے درس میں پیچھے بیٹھتا تھا اور کچھ کھنچا کھنچا سا۔ چند دن گزرے تو استاذ نے خود توجہ کی۔ درس کے بعد ٹھہرایا اور پوچھا کہ کون ہو، تعلیم کا کیا حال ہے وغیرہ۔ میں نے عرض کی کہ علوم عقلیہ پڑھ کر آ رہا ہوں۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں ہیں اور حدیث شریف سنتے وقت بھی یہی حال رہتا ہے اس لیے ذرا پیچھے بیٹھتا ہوں۔ کہا اب آئندہ وسوسے نہیں ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ پھر اُس دن کے بعد سے الحمد للہ وسوسوں کا نام و نشان نہ رہا اور میں روز افزوں دلچسپی سے علوم حدیث کی تحصیل میں مشغول ہو گیا۔

ملک کے مختلف مراکز علم میں تحصیل، چشم بد دور قابل رشک حافظ اور ان سب کے ساتھ مطالعے کا ذوق اتنا کہ بیان سے باہر، اسی کا نتیجہ ہے کہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور پھر بھی ایک بحرِ ذخار نظر آتا ہے کہ موجیں مارتا، ناظر کے قلب و دماغ کو غرقاب کرتا سب پر چھاتا نظر آتا ہے، جامعہ عثمانیہ میں درس کے علاوہ مجھے پانچ سات دفعہ آپ کی تقریریں پبلک میں سننے کا موقع ملا ہے۔ کبھی سیرت النبیؐ کے مرغوب موضوع پر، کبھی اشتراکیت کی اسلامی نقطہ نظر سے چھان بین پر۔ جیسے جیسے تمہید کے بعد آگے بڑھتے ہیں، زور بیان بڑھتا جاتا ہے۔ اور جیسے جیسے زور بیان بڑھتا ہے، جوش بیان بھی۔ سننے والے مسحور رہتے ہیں تو خود خطیب بھی خطابت کے کیف سے سرشار۔ آواز گونجنے لگتی

ہے۔ خیالات کی مناسبت سے اعضاء میں تڑپ اور حرکت، گانے میں باجے، یا فوجی بینڈ میں ڈھول کی اثر انداز صداؤں کا آمیزہ کر دیتے ہیں۔ الفاظ ہیں کہ آبشار کی طرح بیش از بیش گرتے چلے جاتے ہیں بلکہ لغت خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ہر قدم پر نئے الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ خود بخود ڈھل ڈھل کر زبان سخاوت نشان پر نثار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور نئے الفاظ ہونے کے باوجود مانوس نہیں ہوتے۔ جیسے ایک دن ایسے ہی ایک موقع پر کہا ”ایک بڑا اچھلا ہے کہ چھوٹی مچھلیوں کو نگلتا جاتا ہے“ تقریر کی روانی کا یہ حال ہے کہ ملک کے تیز قلم سے تیز قلم مختصر نویس (اسٹینوگرافر) بارہا کوشش کرتے رہے مگر کبھی کامیاب نہ ہوئے کہ آپ کی رفتار بیان کا ساتھ دے سکیں۔

حیدر آباد میں آمد:

پہلی عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا، انگریز کے دورِ ستم میں ایک سیاسی پناہ گزین کی طرح پایہ تخت آصفیہ حیدر آباد کن میں تشریف لائے۔ بے کس و بے سہارا تھے۔ ذوق و عادت سے مجبور ہو کر حیدر آباد کی مشہور صد سالہ دینی درس گاہ جامعہ نظامیہ میں نام لکھا دیا جہاں تعلیم، قیام، طعام بلکہ کتب و لباس تک سب کو مفت ملتے تھے۔ لیکن حالات نے اس کا موقع نہ دیا کہ ان سہولتوں سے کچھ استفادہ کرتے۔ جلدی ہی جامعہ عثمانیہ قائم ہو گئی اور غالباً مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (وزیر امور مذہبی) کی توجہ سے آپ کو فنون و سائنس کی جماعتوں میں سنی طلبہ کو ”دینیات لازم“ پڑھانے کے لیے بطور لکچرار لے لیا گیا۔ اس کی ماہوار (۲۵۰ تا ۳۰۰) تھی۔

جامعہ عثمانیہ کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ ایک خود مختار دیسی ریاست ہونے کے باوجود انگریزی سفیر مقیم (ریزیڈنٹ) کی مرضی کے خلاف کوئی اہم کام مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جدید وضع کی جامعہ اور ذریعہ تعلیم انگریزی نہ ہو بلکہ اُردو، یہ گھریلو حیدر آبادی چیز نہ تھی، اس کے اثرات سارے برطانوی ہند کے نظام تعلیم پر پڑتے۔ انگریز کیوں منظور کرتا کہ اس کی بات کے چلتے انگریزی زبان پر کوئی سیرھی نظر بھی ڈال سکے۔ لیکن بہر حال انگریز نے اسے منظور بھی کیا تو اس تصور اور تیاری کے ساتھ کہ ”نظام کے خرچ

پر یہ تجربہ کرایا جائے اور اس کے ناکام ہونے پر برطانوی ہند کے سیاسی شورش کرنے والوں کو بتایا جائے کہ کسی ”کالی“ زبان میں جدید علوم کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔“

ملک کے اعلیٰ حکام میں جو رقابتیں ہر جگہ ہوتی ہیں، اس کے تحت بعض نہایت بااثر افسر ہمیشہ اس پر تلے رہے کہ یہ جامعہ چلے نہیں۔

قدامت پسندی اور نئی روشنی کی کشمکش نے نصاب ساز جماعتوں کو اس پر آمادہ نہ ہونے دیا کہ نصاب قومی ضروریات کے مطابق بنایا جائے بلکہ صرف اس پر کہ صرف زبان کی تبدیلی کے ساتھ برطانوی ہند کی جامعات ہی کا نصاب جاری ہو۔ طالب علم چاہے انگریزی میں کتابیں پڑھ کر دہریہ، غلامانہ ذہنیت والا اور اچھ سے عاری بنے یا اردو میں پڑھ کر۔۔۔ فرق تو کچھ نہیں بلکہ خطرہ ہی بڑھ جاتا ہے کہ دہریت وغیرہ اب عوام کی دست رس میں بھی آجائے۔ صرف اتنا ہوا کہ جملہ طلبہ کو چاہے فنون کے ہوں یا سائنس کے، مذہب و اخلاق پر بھی ہفتے میں دو گھنٹے لازمی طور پر لکچر ہوا کریں۔ سنیوں کے لیے دینیات لازم کے نام سے اور غیروں کے لیے اخلاقیات کے عنوان سے۔

دینیات لازم کے لکچرار کا فریضہ بڑا کٹھن اور نازک تھا۔ فلسفہ اور سائنس کے طلبہ اس سے آئے دن اور ہر سال سوال کرتے۔ بعض دق کرنے کے لیے اور بعض نیک نیتی سے ازالہ شبہات کے لیے۔ اور جو شخص خود ان جدید علوم سے بے بہرہ ہو وہ ان کی تقنی کیسے کر سکے۔ ابتداء میں صرف فطری ذہانت کام دیتی رہی ہوگی۔ پھر رفتہ رفتہ علوم کی کتابیں ترجمہ ہو کر لکچر دینیات کی دست رس میں بھی آتی گئیں اور وہ روز افزوں علوم جدیدہ کے مختلف پہلوؤں سے واقف بھی ہوتے چلے گئے۔ ان کے کمزور پہلوؤں سے آگاہی جوابی اعتراض میں کام دیتی تو ان کے وسائل اور حربوں سے واقفیت کے باعث انہیں حربوں کو اسلام کی تائید میں استعمال کرنا ممکن ہو گیا۔ جو کام اپنے زمانے میں امام غزالی نے کیا، وہی کام اس جماعت کے استاد کو کرنا پڑتا تھا اور کوئی احیاء العلوم ثانی چاہے ابھی تحریر میں نہ آئی ہو لیکن گزشتہ تیس سال سے سال بسال جامعہ عثمانیہ کے طلبہ اس جدید علم کلام سے مستفید و متاثر ہوتے رہے ہیں اور نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ ہالیہ تلے کے براعظم کی ڈیڑھ دو درجن جامعات میں سب سے کم دہریت اگر کسی جگہ پھیل سکی تو

وہ جامعہ عثمانیہ رہی ہے۔ اور اس کا سہرا بہت بڑی حد تک صرف مولانا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ کے سر رہا ہے۔

آپ کچھ عرصہ شعبہ دینیات میں رہے اور حدیث کا درس دیتے رہے اور غالباً انٹرمیڈیٹ میں مجھے اسی مضمون کے سلسلے میں چند دن شرفِ تلمذ کا راست موقع رہا۔ پھر وہ فنون و سائنس کے شعبوں میں دینیات لازم پڑھانے کے لیے بالکل منتقل ہو گئے تو راست تلمذ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بہت برسوں کے بعد مکرر مولانا جواب لکچرار سے ترقی کر کے ریڈر بن چکے تھے، (اور ۳۵۰ تا ۶۰۰ ماہوار پاتے تھے) دوبارہ شعبہ دینیات میں منتقل ہوئے مگر ایم۔ اے میں میرا مضمون فقہ تھا۔ اس لیے راست تعلق پھر بھی پیدا نہ ہو سکا۔ مختلف درمیانی اساتذہ کی وفات، پیرانہ سالی کی بنا پر خدمت سے سبک دوشی وغیرہ کے باعث آخر الامر مولانا ہی سب سے سینیئر ہونے کی بنا پر صدر شعبہ بنے۔ یہ دوسری جنگِ عالمگیر سے کچھ ہی دن پہلے کا واقعہ ہے اس وقت ان کی ماہوار (۵۰۰ تا ۱۰۰۰) ہو گئی۔ اور وہ فرسٹ گریڈ پروفیسر ہو گئے۔ علومِ دینیہ کا اعزاز جامعہ عثمانیہ میں کسی اور دینیوی علم سے کم نہ تھا۔

میں ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۵ء) میں جامعہ عثمانیہ شعبہ دینیات کا لکچرار فقہ بن کر مامور ہوا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی شعبہ قانون بین الممالک وغیرہ پڑھانے کے لیے منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح راست تلمذ کے بعد راست رفاقت بھی زیادہ دن نہ رہی لیکن ایک تو شخصی روابط، دوسرے ایک ہی عمارت میں ہم سب کا خدمتِ علم میں مشغول رہنا اور تیسرے نصابی و انتظامی مختلف کمیٹیوں میں آئے دن ملنے کا موقع اس دوری کو صرف نظری رکھتا ہے، واقعی نہیں۔ اور مولانا کی علمیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملنے لگا۔

اس پندرہ سولہ سالہ خدمتِ جامعہ نے بڑا فرق پیدا کر دیا تھا۔ اب اس مولوی میں جو دیوبند وغیرہ سے دستارِ فضیلت باندھ کر آیا تھا، اور اس پروفیسر میں جو ایک جدید وضع کی جامعہ میں درس دے رہا تھا، کوئی نسبت تھی تو شاید یہی کہ وہ پہلے بھی یکے مسلمان تھے اور اب بھی۔۔۔ لیکن جامعہ کے ماحول نے ان کو ایسی چیزوں کا موقع دیا جن کی کسی دینی درس گاہ میں نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ سہولت۔

اولاً جدید ذہنیت کے طلبہ کو پڑھانا تھا جس کا اوپر ذکر آیا۔ دوسرے ایک چھت کے اندر ڈیڑھ دو سو اساتذہ درس دیتے تھے جو بیسیوں ہی علوم و فنون پڑھاتے تھے۔ آئے دن بلکہ ہر روز ان سے علمی مباحث رہتے اور طلبہ سے کہیں زیادہ ان سے باہمی افادے، استفادے اور تبادلہ خیال کا موقع ملتا۔ مثلاً کبھی کوئی پروفیسر تاریخ پوچھتا، مولانا! مسلمانوں کی بحری زندگی پر میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور قرآن نیز تاریخ سے میں مواد لے چکا ہوں، اگر حدیث کا کچھ مواد آپ مہیا فرما سکیں..... کوئی پروفیسر فلسفہ، کوئی پروفیسر معاشیات، کوئی پروفیسر قانون آئے دن آپ سے ایسے مسائل پر مواد مانگتا جو کسی عام مولوی کو کبھی ڈھونڈنا ہی نہیں پڑتا۔ حیدرآباد کے بے نظیر کتب خانے، قلمی بھی اور مطبوعہ بھی اسلامیات کے لیے شاید استنبول اور قاہرہ کے بعد ساری دنیا میں تیسرے نمبر پر تھے۔ اور وہ ہر وقت دست رس میں تھے۔ کسی اور جگہ کے استاذ کو یہ سہولت کہاں ملتی۔

اب ایک نیا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کے فیضان کی رفتار و مقدار کو بہت بڑھا دیا۔ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں بعض شعبوں میں مابعد ایم۔ اے تحقیقات علمیہ کا ”ریسرچ ڈپلومہ“ قائم ہوا تھا اور پہلے ہی سال فقہ کے دو طلبہ اس میں لیے بھی گئے تھے لیکن پھر ایک طویل وقفہ رہا۔ مولانا کے صدر شعبہ بننے کے زمانے میں ایم۔ اے کے طلبہ کے لیے بھی ریسرچ لازمی کر دیا گیا۔ ہر سال تفسیر، حدیث، فقہ، اور کلام کے دو چار طلبہ ضرور ہوتے تھے۔ ان کے لیے اچھوتے عنوان تلاش کرنے اور ان سے تحقیقاتی کام لینے اور مقالہ لکھوانے کا کام زیادہ تر مولانا اپنے ہی متعلق رکھنے کا ایثار گوارا فرماتے تھے۔ شعبہ دینیات سے بھی اس طرح کے ڈیڑھ دو درجن مقالے مرتب اور منظور ہو گئے۔ ان میں سے بعض مختلف علمی رسالوں میں بہ اقساط یا کتابی صورت میں چھپے بھی ہیں۔ چند ایک تو کہنا چاہیے کہ لا جواب ہیں۔ مثلاً اصول فقہ کی تدوین کی تاریخ، اسلامی اصول معاشیات وغیرہ۔ دوسری عالمگیر جنگ کا زمانہ تھا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی جماعتیں بھی کھل گئیں اور کئی سال شوقین طلبہ آتے رہے جن میں سے غالباً دو کے مقالے منظور بھی ہو گئے۔ ایک تو ”قانون جنایات بر بنائے غفلت کا تقابلی مطالعہ“ اور دوسرے ”اسلامی

اصولِ معاشیات۔“ یہ مقالے اصل مع ترجمہ اُردو اور انگریزی دوزبانوں میں تیار ہوتے تھے اور ممتحنوں میں سے ایک یورپ یا امریکہ کا بھی ہوتا تھا۔

طلبہ سے اس طرح کا کام لینے میں اساتذہ کو بھی محنت اور مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور طلبہ کو ”تحفہ“ دیے ہوئے مواد کے بعد بھی بہت کچھ استاد کے پاس بچ رہتا ہے۔ ایسی ہی چیزوں سے مولانا اپنی بعض تالیفات تیار کرتے گئے اور ان میں سے کئی ایک اہل علم کے لیے چھپ کر منظرِ عام پر بھی آ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں متعدد علمی رسالے تھے نیز علمی انجمنیں اور ادارے یا دائرے بھی۔ خود شہر حیدرآباد میں مزید برآں رسالے اور ادارے تھے۔ ان سب میں مولانا کو حصہ لینا پڑتا اور ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا پڑتا۔ برطانوی ہند کے علمی رسالے ان کے علاوہ تھے۔

میں نے کئی بار مولانا سے عرض کیا کہ اپنے نشریات کا ایک مکمل ذخیرہ کسی کتب خانے میں فراہم کر دیں۔ کم از کم ایسی ایک یادداشت تیار فرمائیں کہ کون سا مضمون کس رسالے کے کس نمبر میں کہاں اور کب شائع ہوا۔ مولانا ان چیزوں سے مستغنی ہیں اور خوف ہے کہ مولانا سے آج کل قریب رہنے والے اس پر فوری توجہ نہ کریں تو بہت سے جواہر ریزے ناپید نہ ہو جائیں۔

کتاب ہذا:

قدیم زمانے کے اسلامی علماء کی طرح زیر نظر کتاب جامع ضرور ہے، مگر مانع نہیں۔ یعنی اس میں اپنے موضوع پر جملہ متعلقہ مواد تو جمع کر دیا گیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ دیگر معلومات کا بھی ضمن آ جانا ممنوع رہا ہو۔ اس میں معلومات کا انبار ہے، لطیف استنباطات کی بھرمار ہے اور صبر سے اور بار بار پڑھنے والے کو ہر قدم پر اور ہر دفعہ نئی نئی چیزیں ملتی ہیں۔

یوں تو کتاب اپنے موضوع پر مفید ترین معلومات کی حامل ہے لیکن اس کی اہمیت چودھویں صدی ہجری کے اس ثلثِ ثالث میں خاص کر اس کے مقامِ اشاعت

یعنی پاکستان کے لیے غیر معمولی ہے۔

کتاب میں اصل میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خانوادہ بنی امیہ جب اپنی غلطیوں کو نباہنے کے لیے مزید غلطیوں کا حکومت میں عداً اضافہ کرتا چلا گیا اور بالآخر اپنے خاتمے کے قریب اس کا پورا نظم و نسق پوری طرح ازسرتا پاسرا ہوا جسم بن گیا تو انقلاب ناگزیر بھی تھا اور ضروری بھی۔ خلفاء عباسیہ قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بن کر برسرِ اقتدار آئے۔ لیکن قوم کو جلدی ہی مایوس ہونا پڑا۔ بات یہ تھی کہ پرانے عہدہ داروں کی جگہ لینے کے لیے نعم البدل نو جوانوں کو منظم طور پر تربیت دینے اور تیار کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اور نتیجہ ع۔ گاؤ آمد و رفت تھا۔ عوام کی مصیبت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نئے حکمران بھی استبداد پسند تھے اور نئے افسر اور حکام عدالت بھی جاہل و رشوت خوار۔

عام حالتوں میں انقلاب اور جوابی انقلابوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا۔ بنی امیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے عوام میں جو شوریدہ سری پیدا کی گئی تھی وہ ہرنے من چلے ہوشمند کو تیار وسائل خانہ جنگیوں کے لیے مہیا کرتی۔

امام ابو حنیفہ نے بنی امیہ کے خلاف تحریک کے آغاز ہی کے وقت اس ضرورت کو بھانپ لیا تھا اور گویا ایک خانقاہ بنا کر وہیں مستقبل کے افسروں کو پوری تن دہی اور بے نفسی سے اپنی بساط بھر تیار کرنا شروع کیا۔ خلافت عباسیہ کے آغاز پر انہوں نے کئی سو افراد ایسے تیار کر دیے جو عالم باعمل تھے یعنی ان میں دین داری، دیانت داری اور ساتھ ہی فرائضِ نظم و نسق کی چداری بھی تھی۔

جب یہ ہو گیا تو انہوں نے رائے عامہ کو ہم نوا بنایا کہ جاہل و رشوت خوار افسروں کو بھی خدمت سے الگ کیا جائے اور استبداد پسند خلیفہ بھی روزمرہ کے نظم و نسق میں دخل نہ دے کہ دستور و آئین کا پابند رہے۔ امام ابو حنیفہ نے یہ اہم امر بھی طے کر لیا تھا کہ خود کوئی عہدہ بڑے سے بڑا بھی قبول نہ کریں۔ اس چیز کے باعث ان کی آواز میں بھی قوت آگئی اور ان کے مخالفین بھی بوکھلا گئے۔

امام ابو حنیفہ کو شہید ہونا پڑا۔ لیکن ان کے خون سے اسلام کی سوکھی ہوئی کیاری

سچ گئی اور پیاسی زمین سیراب ہوتے ہی ہری بھری ہو گئی۔ چنانچہ ان کی وفات پر شاید دس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کے شاگرد نظم و نسق پر چھا گئے اور امام ابو یوسف کی سرکردگی میں ڈیڑھ سو سالہ اسلامی مملکت کو تباہی سے بچا کر مزید چند سو سال تک ایک نئی اور زیادہ صحت و درزندگی بخشے کا سامان پیدا ہو گیا۔ اور جیسا کہ مولانا نے واضح فرمایا ہے (ص ۱۴) طبع جدید کا صفیہ، یہ بھی مجدد اول حضرت عمر بن عبدالعزیز کے فیض لائتا ہی کی ایک اور برکت نظر آتی ہے۔ یہ دور امام ابو حنیفہ کی عمر کے تاثر پذیر دور کا ہم عصر ہے۔

ہوا یہ کہ خلفاء بنی امیہ نے بعض مرتبہ، غالباً نیک نیتی سے، چند ایسے لوگوں کو قاضی مقرر کیا جو کردار تو عمدہ رکھتے تھے اور ہر طرح منصف مزاج اور بے لاگ قاضی بننے کے قابل تھے لیکن قانون سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ قدیم رومی روایات کے تحت (جوشام میں کچھ نہ کچھ باقی رہی ہوں گی) خلفاء نے یہ کیا کہ ان پڑھ قاضی کو پڑھے لکھے مشیر و مفتی مدد دینے کے لیے مہیا کر دیے اور اس طرح مقصد حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن بعد میں اس نظیر سے بے جا کام لیا گیا اور جاہل قاضی روز افزوں ہوتے گئے۔ مزید برآں کوئی مجموعہ قانون و نظائر ملک میں نہ تھا۔ استبداد پسند اموی خلفاء یہ چاہتے بھی نہ تھے۔ قاضیوں کے لیے ابتداء پوری نیک نیتی سے اجتہاد کی صلاحیت رکھنے کی ضرورت سمجھی گئی تھی تاکہ قرآن و حدیث سے مسائل استنباط کر لیا کریں۔ بعد کے زمانے میں یہ لفظ تو رہ گیا اور معنوں کی طرف توجہ نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر کی نظیریں الگ ہو گئیں۔ بلکہ بُرے قاضیوں کی صورت میں خود ان کے اپنے فیصلے مماثل صورتِ مقدمہ کے باوجود فریقِ مقدمہ کے بدلنے پر مختلف ہونے لگے۔ ابھی انگریزی دور میں کلکتہ، مدراس، بمبئی، لاہور وغیرہ کی عدالت ہائے عالیہ میں دہلی کی مرکزی کینئر لندن کی پریوی کونسل کی ترمیمی و اصلاحی شخصیت کی موجودگی کے باوجود جتنا اختلاف رائے تھا اس سے سب واقف ہیں اور اس سے ایک بہت ہی ہلکا تصور خلافتِ عباسیہ کے آغاز پر اسلامی قانون کے متعلق باہم متعارض نظائر کے متعلق کیا جاسکتا ہے۔

اس صورت حال کا (جس کا ذکر مولانا نے ص ۳۰۲ پر) (طبع جدید کا صفیہ؟) ایک جدید مصری تالیف کے واسطے سے کیا ہے لیکن جو رسائل البغاء میں ابن المقفع کے اصل

رسالے یعنی رسالہ فی الصحابہ کے شائع ہو جانے کے باعث راست و بلا واسطہ بھی کیا جا سکتا ہے، امام ابو حنیفہ نے علاج یہ سوچا تھا کہ سیاست باز تو فوجی انقلاب کی تیاریوں میں منہمک رہیں اور یہ اپنے شاگردوں کو لے کر دنیوی جاہ طلبی سے بے پروا ہو کر فقہ اسلامی کے انبار میں (جس میں بے لگام نظائر کے باہمی تعارض نیز علم حدیث کے کامل طور پر تا آں دم مدون و منسج نہ ہونے کے باعث متصادم؟ ایک مزید تعارض کے باعث مشکلیں بڑھ گئی تھیں) ایک نظام قائم کرنے کی کوشش کریں۔

انہوں نے اولاً حکومتی نقطہ نظر سے بے ضرر یعنی مسائل عبادات پر توجہ اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ایک ایک باب کو لے کر اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ جزئیات کو دلائل و شواہد کے ساتھ معین کرنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ حکومتی مسائل مال گزاری وغیرہ کو بھی مدون کیا۔ یہ یقیناً نقش اول تھا۔ لیکن ایک تو ایک کارکرد چیز (ترمیم و اصلاح کے لیے تیار) موجود ہو گئی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک جماعت مہیا ہو گئی جسے اس کام کے کرنے کی تربیت مل چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی روایات نسلوں تک چلتی اور صدیوں تک کارفرما رہتی ہیں۔

مشکلات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک خلیفہ کو ایک مرتبہ چالیس ”مولوی نما“ بد معاشوں نے یہ ”فتویٰ“ دیا کہ خلیفہ قانون سے بالا ہے۔ (کیا انگلستان کا بدنام مقولہ King can do no wrong بادشاہ سے قصور سرزد ہو ہی نہیں سکتا، یہ بھی کہیں اسی کی نقالی تو نہیں تھی؟) ایک اور مشکل یہ تھی کہ فقہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہے۔ اور قانون کے ماخوذوں میں قانون کے علاوہ لغت، صرف نحو، تاریخ وغیرہ ہی نہیں حیوانیات، نباتیات، بلکہ کیمیا و طبیعیات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ قبلہ معلوم کرنا جغرافیہ طبعی پر موقوف ہے۔ نماز اور افطار و سحری کے اوقات علم ہیئت وغیرہ کے دقیق مسائل پر مبنی ہیں۔ رمضان کے لیے رویت ہلال کو اہمیت ہے۔ اور بادل وغیرہ کے باعث ایک جگہ چاند نظر نہ آئے تو کتنے فاصلے کی رویت اطراف پر موثر ہوگی وغیرہ مسائل کی طرف اشارے سے اندازہ ہوگا کہ نماز روزہ جیسے خالص عباداتی مسائل میں بھی علوم طبعیہ سے کس طرح قدم قدم پر مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاروبار، تجارت،

معاهدات، آب پاشی، صرافہ، بنک کاری وغیرہ کے سلسلے میں قانون سازی میں کتنے علوم کے ماہروں کی نہ ضرورت ہوگی! امام ابوحنیفہ ہر علم و فن کے ماہروں کو ہم بزم کرنے اور اسلامی قانون یعنی فقہ کو ان سب کے تعاون سے مرتب و مدون کرنے کی کوشش میں عمر بھر لگے رہے اور بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے۔

کتاب میں قسم قسم کے معلومات یک جا ہو گئے ہیں۔ کسے یقین آئے گا کہ امام ابوحنیفہ (فوت ۱۵۰ھ) زمین کے کروی اور گول ہونے کے قائل تھے؟ صفحہ (۲۳۲) پر جو قصہ لکھا ہے اس سے اس کے سوا کیا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے۔ خلیفہ منصور کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ سے کسی نے پوچھا کہ ”دنیا کے ٹھیک بیچ میں کون سی جگہ ہے؟“۔ امام نے فرمایا کہ ”وہی جگہ جہاں تو بیٹھا ہے۔“ زمین کے ٹھیک کروی شکل ہوئے بغیر نہ تو یہ جواب صحیح ہو سکتا ہے اور نہ سائل اس پر چپ اور قائل ہو سکتا ہے۔ (قطبین چمکنے سے یہاں بحث نہیں)۔

”جرتج شاید جارج کے لفظ ہی کی کوئی صورت ہے“ اس کا تعلق گریگوری سے سمجھا جاتا ہے۔

امام ابو یوسف سب سے پہلے قاضی القضاات تھے بطور واقعہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ اسی طرح کا کام اولاً امام ابوحنیفہ کو پیش کیا گیا تھا جسے انہوں نے قبول نہیں فرمایا اس کے ماننے سے بھی انکار نہیں۔ لیکن اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ اس عہدے کا تصور امام ابوحنیفہ کی (جو ایرانی النسل تھے) تجویز سے ہوا یا خود خلفاء عباسیہ کو اپنے ماحول کے ایرانی اثرات و روایات سے، قبل اسلام کے عہدہ موبذ ان کے باعث، اس کی تجویز سوچھی، بہر صورت قاضی القضاات کا تصور (جو وزیر عدالت اور میر عدل دونوں کے اجتماع کی حیثیت ہے) ایرانی تھا یا نہیں، مولانا کی طویل بحث کے باوجود حل نہ ہو سکا۔ موبذ موبذ ان آیا خالص مذہبی افسر تھا یا خالص عدالتی یا دونوں کا جامع، جب تک اس کا مواد سامنے نہ آئے خالص عدالتی قاضی القضاات کے تصور کا ماخذ معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں پورے استناد کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن قدیم تر تمدنوں مثلاً یہودیوں وغیرہ کے ہاں مذہبی اور عباداتی اعلیٰ افسر ہی اعلیٰ ترین افسر عدالت و مراعات بھی ہوتا تھا۔ موبذ موبذ ان

بھی ایسا ہی رہا ہو، قرین قیاس ہے۔ جاحظ نے موبذ موبذ ان کا ترجمہ اگر قاضی القضاۃ کیا تھا، تو اس مذہبی افسر کے عدالتی شعبہ فرائض کے ذکر کے سلسلے ہی میں ہوگا۔ ایران میں خالص عدالتی موبذ موبذ ان کا پتا نہیں چلتا کہ قاضی القضاۃ کو اس کی تتبع قرار دیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خلافت راشدہ و خلافت بنی امیہ میں ایسی کوئی چیز مسلمانوں میں نہ تھی۔ اور یہ امر معنی خیز ہے کہ اس طرح کا عہدہ بغداد اور قرطبہ میں ایک ہی وقت میں قائم ہوا۔ گویا وہ ایک سماجی ضرورت تھی اور مسلمانوں کی عمرانی ضرورتوں نے اس کا قیام بجھایا تھا۔ اور بس۔

کتاب کے بعض اور دلچسپ معلومات میں سے یہ ہے کہ ابو مسلم خراسانی کے زمانے میں بھی چینی کے برتن پائے جاتے تھے۔

وزراء کو نماز باجماعت نہ پڑھنے کی بنا پر عدالت میں مردود الشہادت قرار دیا جاتا تھا۔

ایک بڑی دلچسپ بات یہ کہ امام محمد شیبانی کو تدوین فقہ میں جو مدگار ملے ان میں ان کی اپنی بعض رومی لونڈیاں بھی تھیں اس سے مراد یونانی ہوں گی۔ کیونکہ تاریخ اسلام میں رومی سے مراد عموماً بیزنطینی ہوتے ہیں یعنی قسطنطنیہ کی سلطنت والے۔ اور ان میں یونانی سب سے ممتاز تھے۔ کیا یہ لونڈیاں صرف صاف نویس تھیں یا اس سے زیادہ کچھ اور بھی؟

بنی تغلب کے متعلق ایک معاہدے کا بعض مورخ ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ وعدہ کیا کہ خود تو عیسائی رہیں گے لیکن اپنے بچوں کو پتہ نہ دیں گے یعنی عیسائی نہ بنائیں گے۔ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدہ کی تدوین کے سلسلے میں پتا چلا کہ یہ اصل میں ”لا تقرّبوا الصلاۃ کا سا واقعہ ہے۔ مکمل معاہدے سے (طبری خراج ابی یوسف سے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نو مسلم تغلبیوں کی اولاد کے متعلق پادریوں کے اختیار سماعت اور عمل دخل کو روکنا مقصود تھا۔ ورنہ عیسائیوں کو یہ حکم دینا کہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں لا اکرہ فی الدین کے قرآنی احکام کے مغائر ہو جائے گا۔

ہارون الرشید کے زمانے میں خاندانی ناموں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اور مامون

الرشید اور امین الرشید کا کوئی تاریخی وجود نہیں۔ عبد اللہ المامون اور محمد الامین صحیح نام ہیں۔ امین و مامون زیادہ سے زیادہ لقب ہو سکتے ہیں۔ ان میں الرشید کے لفظ کا اضافہ ٹھیک نہیں۔

طبع اول میں کتاب اچھی چھپی ہے لیکن مؤلف کو بروقت پڑھنے کا غالباً موقع نہیں ملا۔ ص..... سطر نمبر ۱ میں کارہ کا لفظ ہے یعنی کراہت کرنے والا۔ پروف خواں نے اسے نہ سمجھا اور ”ناکارہ“ بنا کر اپنے ناکافی علم کا ثبوت درج کتاب کر دیا۔

ص..... سطر..... میں آزمائشوں کی بھٹیوں سے ”کھرا“ ہو کر تو کوئی نکل سکتا ہے ”کھڑا“ ہو کر نہیں جیسا کہ چھپا ہے۔ کم یا زیادہ اہم ایسی کچھ اور بھی طباعتی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ یہ قائل معافی سمجھی جاسکتی ہیں لیکن کاش ناشر کتاب میں ایک اشاریہ لگوا دیں جس کا شاید اب بھی وقت ہے موجودہ فہرست مضامین تک محض ناکافی ہے۔ طبع ثانی میں تو اس کی تیاری آسان ہے۔

تمننا و دعا:

مولانا کی اور تالیفوں کا کتاب میں مرثدہ ہے مثلاً تدوین فقہ کی تاریخ وغیرہ۔ دعا ہے کہ مولانا کا سایہ علم کے سر پر تا دیر صحت و عافیت کے ساتھ باقی رہے۔ کہ ان زیر تالیف کتابوں سے دنیا محروم نہ رہ جائے۔ براعظم ہند میں اسلامیات کے احیاء میں مولانا نے جو حصہ لیا ہے وہ کفر و جہالت کے منطقہ حارہ میں ٹھنڈی ہواؤں کے مصداق ہے۔ جزاہ اللہ عنا احسن الجزاء۔

(امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی۔ سید مناظر احسن گیلانی)

(نفیس اکیڈمی کراچی۔ ۱۹۵۷ء)

کتاب النبات دینوری

کچھ عرصہ ہوا ۱۔ معارف میں اس موضوع پر چند باتیں عرض کی گئی تھیں اور مدینہ منورہ کے ایک مخطوطے کا ذکر کیا گیا تھا جو دینوری کی کتاب النبات کے تین بابوں پر مشتمل ہے۔ آج ایک مزید ٹکڑے کی دستیابی کی خوشخبری دینی ہے۔

بمبئی کے مرحوم دولسانی رسلہ العروۃ کے شمارہ دوم میں ترمذی صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا ہے معلوم نہیں اُن کے معلومات کا ماخذ کیا تھا لیکن وہ زائد چیز نہیں بلکہ مدینہ منورہ کے مذکورہ صدر مخطوطے ہی سے متعلق ہے۔ میں نے ۱۳۶۶ھ کے آغاز میں اس کی نقل لی تھی، ترمذی صاحب اور اُن کے ممدوح کو نہ معلوم اس کا پتا کب چلا۔ البتہ ترمذی صاحب کی یہ اطلاع اُردو دان طبع کے لیے شائع کرنی ہے کہ مصر کے ممتاز عالم نباتات ڈاکٹر احمد عیسیٰ بک نے دینوری کے اقتباسات کو مختلف کتب لغت وغیرہ سے اکٹھا کیے ہیں اور ان کو شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ شائع ہو گئے تو انہی کو اولیت حاصل ہوگی باقی اکٹھا کرنے کی حد تک اس سے پہلے بھی متعدد اصحاب نے یہ کوشش کی۔ اس مقالہ کے پہلے نمبر میں زلبر برگ کا ذکر ہے جس نے اب سے کوئی چالیس اکتالیس برس پہلے کوشش کی تھی۔ راقم الحروف نے بھی کئی سو صفحات میں ایسا ہی مواد جمع کیا ہے لیکن ناتمام ہونے کے باعث اشاعت کی جانب توجہ نہیں کی جاسکی اس کے لیے ہزاروں مطبوعہ اوراق کی دیدہ ریزی سے چھان بین کرنے کے علاوہ مخطوطات سے بھی مواد لینا ہے جن میں سے بعض نہایت نادر ہیں مثلاً ابن سجون کی جامع الادویۃ المفردۃ یا ابن سیدۃ کی المحکم وغیرہ۔

مجھے آکسفورڈ میں چند ماہ ہوئے اپنے ایک سابق جرمن استاذ کی زبانی معلوم ہوا

۱۔ دسمبر ۱۹۴۹ء

کہ استانبول میں ایک کامل نسخے کا پتا چلا ہے۔ اس کے متعلق جرمن انجمن مستشرقین شاخ استانبول کے ناظم ڈاکٹر ہلموت سے معلومات حاصل ہو سکتے تھے لیکن وہ اب استانبول چھوڑ کر وطن کی خدمت کے جذبہ سے فرانکفورت کنار مائین کی جامعہ میں شعبہ مشرقیات کے صدر بن کر چلے گئے ہیں انہیں وہیں خط لکھا کچھ عرصہ کے بعد جواب ملا کہ افواہ صحیح ہے لیکن مخطوطہ کامل نہیں بلکہ اصل کا ایک ٹکڑا ہے اور اس پر سویڈن کے ایک مستشرق کام کر رہے ہیں۔

پھر آخر الذکر کو خط لکھا۔ آج کی صحبت میں ماخذ اطلاعات ان ہی کا خط ہے۔ ڈاکٹر برنارٹ لیوین جامعہ اپالا کے کتب خانہ میں کسی عہدے پر مامور ہیں اور آج کل ابن المصنف کے کلام کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ وہ ۷ فروری ۱۹۵۰ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

”یہ واقعی ایک حیرت انگیز اتفاق ہے کہ اس قیمتی کتاب (کتاب النبات الدینوری) کے مختلف ٹکڑے تقریباً ایک ہی وقت میں دستیاب ہوئے اور اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچے ہیں جن میں ایک آپ ہیں اور ایک اس دور دراز سویڈن میں۔“

ڈاکٹر لیوین نے ازراہ عنایت اپنے نسخے کے چند اوراق کا فوٹو بھی خط میں منسلک کیا ہے۔ اب تجویز یہ ہے کہ نئے ٹکڑے پر دونوں کام کریں اور دونوں ٹکڑے ایک ساتھ شائع ہوں۔ اگر کوئی خلاف توقع حادثہ نہ بھی پیش آئے، تو بھی اس کام میں کچھ عرصہ لگے گا، اس لیے اہل علم کی آگاہی کے لیے فی الحال چند معلومات عرض کیے جاتے ہیں۔

نیا مخطوطہ ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے جس میں (۲۳۴) ورق یا (۴۶۸) صفحات ہیں خط نہایت نفیس اعراب لگا اور جلی ہے، جن چند صفحات کا فوٹو آیا ہے اس میں کہیں تاریخ نہیں ہے لیکن اندازاً سات آٹھ سو برس پہلے کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ ٹکڑا کتاب کے جزء خامس پر مشتمل ہے ابتدائی پندرہ ورق غائب بیان کیے جاتے ہیں ورق ۱۶ سے جو متن شروع ہوتا ہے وہ ڈاکٹر لیوین کے الفاظ میں یوں ہے:

ورق ۱۶ تا ۲۶ ب	ومن انحاء صنعة القسی	(کمان سازی کی قسمیں)
ورق ۲۷ تا ۳۵ ب	من صفات النبل	(تیروں کی صفتیں)
ورق ۳۶ تا ۳۸ ب	مما فی القدح	(تیروں کی لکڑی کا حصہ)
ورق ۳۸ تا ۵۳ ب	مما یحمل علی القدح	(تیروں میں لکڑی کے حصہ پر چڑھائی جانے والی چیز۔)

ورق ۵۳ تا ۷۱	من اسماء السہام	(تیروں کے لیے عربی مترادفات)

اس کے بعد مخطوطے میں ایک اچھپا ہے۔ ڈاکٹر لیون کے الفاظ میں :
 ”ورق ۷۱ تا ۲۳۲ میں نباتی نام حروف تہجی پر مرتب ہیں اور
 اراک سے رُتک یہی ترتیب ہے۔ اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
 کتاب النبات دو بڑے حصوں پر مشتمل رہی ہے۔ پہلے حصہ میں
 مستقل مقالے تھے جو ایک خاص نظام کے تحت مرتب کیے گئے
 تھے اور دوسرے حصہ میں ایک قاموس تھی۔“

اس تفصیل سے متعدد اہم مسائل حل ہوتے ہیں اگرچہ اپالا کا نسخہ بھی اپنی جگہ
 کامل نہیں ہے لیکن خوش قسمتی سے یہ وہ ٹکڑا ہے جہاں کتاب کی ایک اہم خصوصیت یعنی
 اس کی تقسیم نمایاں ہے۔ اسی طرح اب یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ابن سکون، الغافقی اور ابن
 البیطار کی جڑی بوٹیوں میں حروف تہجی کی ترتیب اُن کی جدت نہ تھی بلکہ دینوری ہی کی
 نقالی اور خوشہ چینی تھی۔ میں اپنے مقالے کی پہلی قسط میں عرض کر چکا ہوں کہ ابن سکون
 اور ابن البیطار وغیرہ نباتات پر اپنے پیشروؤں کے بیانات جمع تو کرتے ہیں لیکن آغاز
 عموماً دینوری کے بیان سے کرتے ہیں اور ابن البیطار کے ہاں بعض وقت یہ فقرہ ملتا ہے :
 قال الغافقی قال ابو حنیفہ الدینوری اس کی توجیہ اب یہ کرنی پڑتی ہے کہ ابن
 بیطار نے دینوری کے اس بیان کو جو حروف تہجی کی ترتیب پر نہیں بلکہ مستقل مقالات کی
 صورت میں ہے اور جس کی تلاش آسان نہیں ہے کبھی اپنی یادداشت کی مدد سے اور کبھی

عافقی کے آسان ذریعہ سے کتاب المفردات میں نقل کیا ہو گا۔ کتاب النبات کا نو دستیاب شدہ ٹکڑا اگر پوری طرح سامنے آجائے خاص کر اس کا حصہ دوم اور اس کا ابن البیطار وغیرہ سے مقابلہ کیا جائے تو اس پہلو پر زیادہ بہتر رائے قائم کی جاسکے گی۔

میں نے مقالہ گذشتہ میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ کتاب النبات للذینوری کے کون کون سے اقتباسات خاص ابن سیدہ کی کس کس جلد میں ہیں۔ ڈاکٹر لیون کے بیان کی روشنی میں مختص کی ورق گردانی سے معلوم ہوا کہ متعلقہ ابواب اس کی چھٹی جلد میں ہیں چنانچہ ص ۳۹ پر بعینہ ہمارے عنوان کا باب ومن انحاء صنعة القسی ہے دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب تو مخطوطہ اسپالا کے الفاظ میں نہیں ہے لیکن باب السہام متعدد فصلوں کے ساتھ موجود ہے۔ ہمارا پانچواں باب من اسماء السہام ممکن ہے وہی ہو جس کو ابن سیدہ نے ص ۵۱ پر اسماء ضروب السہام وصفا تھا کے عنوان سے لکھا ہے۔ ہمارے سامنے مخطوطہ اسپالا کے پہلے باب کا پہلا ورق ہے ابن سیدہ کے ص ۳۹ سے اس کا مقابلہ کرنے پر نظر آیا کہ مخطوطہ مدینہ منورہ کی طرح اس حصہ میں بھی ابن سیدہ نے بہت ہی کم حصہ نقل کیا ہے اور ذینوری کے بے شمار بیانات حذف کر دیے ہیں جو اس لیے ناگزیر تھا کہ ابن سیدہ کا موضوع و مقصد جدا تھا۔

بہر حال اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ مخطوطے اور نئے مخطوطے کا کوئی حصہ مشترک نہیں ہے اور دونوں مل کر کتاب کے معتد بہ حصہ پر مشتمل ہو جاتے ہیں بعض پرانے مولفوں نے کتاب النبات للذینوری کے ذکر میں لکھا ہے کہ وہ ”ست مجلدات کبار“ میں تھی۔ ڈاکٹر لیون کے بیان کے مطابق ان کا مخطوطہ الجزء الخامس پر مشتمل ہے اگرچہ جزء اور مجلد ایک ہی چیز نہیں ہیں لیکن موجودہ دونوں مخطوطے مل کر ڈیڑھ جلد نہیں تو ڈیڑھ جزء ضرور بن جاتے ہیں۔ گو یہ معلوم نہیں کہ اصل میں کتنے جزء تھے پانچ تھے یا کم یا زیادہ۔

(معارف اعظم گڑھ۔ جون ۱۹۵۰ء)

القاضی الرشید

مؤلف کتاب الذخائر والتحف

تین سال کا عرصہ ہوا، معارف میں عنوانِ بالا پر متعدد اہل علم نے دادِ تحقیق دی تھی، اسکے بعد سے میرے پاس کچھ نیا مواد جمع ہوا ہے۔ معارف کے علم پر در صفات سے توقع ہے کہ یہ معلومات بھی اہل نظر تک پہنچائی جائیں گی تاکہ جو لوگ اس سے استنباط کر سکتے ہیں وہ اسے جان لیں۔

البتہ ان ناظرین کے لیے جو پہلی دفعہ اس بحث سے دوچار ہوں گے دو چار تمہیدی باتیں عرض کی جائیں تو تکرار بے محل غالباً نہ ہوگی۔ قصہ یہ ہے کہ ترکی کے شہر ایفون قرہ حصار کے کتب خانے میں ایک نایاب مخطوط ”کتاب الذخائر والتحف“ ہے۔ کتاب میں اس کے مولف کا ذکر نہیں۔ ناچیز نے اسے طباعت کے لیے مرتب کیا، اور کویت کی حکومت نے ۱۹۵۹ء میں اسے شائع کیا۔ اس سے بہت پہلے ۱۹۵۳ء میں اس کا ایک اقتباس برتا ”ملکہ روما کا خط المکتفی باللہ خلیفہ بغداد کے نام“ کے عنوان سے کراچی کے انگریزی رسالے ”جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی“ میں شائع کرتے ہوئے میں نے اس مجہول الحال کتاب کو الاوحدی کی طرف منسوب کیا تھا کیونکہ کتاب میں اس کا کچھ مبہم سا ذکر ہے۔ (اس مضمون کے اطالوی اور فرانسیسی ترجمے بھی چھپے اور اس پر علمی حلقوں میں کافی بحثیں بھی ہوئیں، پھر جب ۱۹۵۹ء میں کتاب کے چھپنے کی نوبت آئی تو میں نے اسے بعض حوالوں کی بنا پر القاضی الرشید بن الزبیر کی طرف

منسوب کرنے کی جسارت کی اور لکھا کہ یہ فاطمی دور کا ایک مؤلف ہے جو ۴۶۳ھ تک زندہ تھا، معارف میں ایک اہل علم نے اس پر تنقید کی اور ضمناً اسے ۵۶۳ھ میں فوت ہونے والے ایک مؤلف کی طرف منسوب کیا۔

میں اس مضمون میں نہ افراد کی بحث میں پڑونگا نہ انفرادی آرا کی تدقیق کی نا خوشگوار خامہ فرسائی میں، صرف تالیف اور مولف کا ایک عام اور ممکنہ حد تک جامع تبصرہ مقصود ہے۔

کتاب کے مندرجات:

کتاب کا پورا نام ہے ”کتاب الذخائر والنف واما کان بالقصر من ذالک“۔ اس کے دیباچے میں مولف نے بیان کیا ہے کہ اس میں قیمتی تحفوں اور ہدیوں کا، شادیوں، دعوتوں، ختنہ کی رسموں اور بچوں کے ختم قرآن کی تقریبوں کے مصارف کا، یادگار زمانہ دنوں کا، عجائب و غرائب کے ذخیروں کا، دولتمندوں کی وفات کے بعد ان کے یہاں سے برآمد ہونے والے خزانوں کا، غنیمت اور فتوحات میں حاصل ہونے والی قیمتی چیزوں کا اور (فاطمی) امام المستنصر باللہ کے محل سے ۴۶۰ھ اور ۴۶۱ھ کے ہنگاموں کے موقع پر لٹے ہوئے نوادرات کا ذکر ہے۔

گر یہی ہوتا تو بھی بڑا دلچسپ مواد تھا، لیکن کتاب اس سے بھی کہیں زیادہ پُر از معلومات ہے، اس میں نہ صرف ترکستان، ایران وغیرہ اسلامی ممالک کے غیر معروف لیکن اہم واقعات کا ذکر ہے، بلکہ چین اور یورپ کے اہم واقعات کا بھی ذکر ہے، یورپ کے (۲۶) واقعات اس کتاب میں ہیں، جن میں گیارہویں صدی عیسوی کے یورپ کی معاشی، صنعتی اور سماجی تاریخ کے متعدد ایسے پہلوؤں کا بیان ہے جن سے خود یورپ کی تاریخیں خالی ہیں، اور یہ خلا اس کتاب سے پُر ہوتا ہے، بلاط الشہداء کے عبدالرحمن الغافقی کے بورڈ و فتح کرنے کا بھی اس میں ذکر ہے، فرانس، اٹلی، صقلیہ اور اسپین کے بھی ایسے حالات ہیں جو کسی اور ماخذ میں نہیں ملتے، اور یہ سب سرکاری دستاویزوں پر مبنی ہے۔

مؤلف کا نام:

کتاب کے مولف کا کہیں ذکر نہیں، سرورق پر ایک جدید الحظ حوالے میں، بہ ظاہر کتب خانہ ایفون قرۃ حصار کے فہرست نگار نے اسے شیخ شہاب الدین احمد بن عبد اللہ بن حسن الاوحدی المقرئ الشافعی کی طرف منسوب کیا ہے، وہیں ایک پرانے سے خط میں ہے کہ یہ مولیٰ ابراہیم بن محمد بن آید میر العلای المعروف بابن دقماق کا نقل کردہ نسخہ ہے، (اوحدی کی وفات ۸۱۱ھ میں اور ابن دقماق کی ۸۰۹ھ میں ہوئی)۔

مگر یہ پیچیدگی کتاب کے آخر کی ایک تحریر سے شروع ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ ”کتاب الہدایا والتحف کا جو حصہ دستیاب ہوا، یہ اس کا انتخاب ہے“ سرورق پر ذخائر و تحف نام تھا، اس تحریر میں اس کو ہدایا و تحف کر دیا گیا ہے۔

اس خاتمہ کلام کے بعد ایک ضمیمہ ہے، اس میں تحریر ہے کہ کتاب الہدایا والتحف کے دستیاب شدہ حصے پر یہ اضافہ ہمارے صاحب (یعنی رفیق) امیر کبیر شہاب الدین احمد بن عبد اللہ ابن الحسن الاوحدی المقرئ الشافعی کے انتخاب کردہ معلومات کے ذریعے سے کیا گیا ہے۔ دو صفحوں کے بعد ”اتہنی“ پر اس کو ختم کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کوئی حوالہ یا تفصیل نہیں ہے، اگر یہ ضمیمہ اوحدی کا ہے تو پھر اصل کتاب کس کی ہے؟

چونکہ کتاب میں فاطمی خلفاء کے زمانے کے بھی حالات ہیں، اس لیے میں نے مقریزی کی خطط مصر کی طرف رجوع کیا، کیونکہ ”الضوء اللامع“ میں سخاوی نے اوحدی کے حالات میں لکھا ہے کہ اوحدی نے خطط مصر پر بڑی محنت سے ایک کتاب لکھی تھی، اور صرف ایک حصے کا مبیضہ کیا تھا کہ اس کی وفات ہو گئی، اور مقریزی نے اسی کو اپنی طرف منسوب کر لیا، اوحدی فوجی وردی میں رہتے تھے اور بہ حالت افلاس ۱۹ جمادی الاولیٰ ۸۱۱ھ میں وفات پائی، مقریزی نے اپنی کتاب العقود میں سوانح عمریوں کے ذیل میں ان کا کارآمد ذکر کیا ہے (مقریزی کی درر العقود الفریدہ فی تراجم الاعیان المفیدہ اب ناپید ہے، اس کا صرف ایک ٹکڑا مشرقی جرمنی کے شہر گوتا میں ہے، اگرچہ میں نے اسے دیکھا نہیں لیکن میرے علم میں وہ اوحدی سے متعلقہ حصے سے خالی ہے)۔

بہر حال نخط مقریزی (طبع بولاق) میں تلاش سے ہماری پیش نظر کتاب کے کوئی دس بارہ اقتباس ملے (دیکھو جلد اول صفحات ۴۰۸، ۴۱۳، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۹۲) یہ عبارتیں ”کتاب الذخائر“ کے حوالے سے نقل کی گئی ہیں (جو ہماری کتاب کا بھی نام ہے) لیکن مولف کے نام کا کہیں حوالہ نہیں ہے (ص ۴۲۴) پر ایک اور اقتباس ہماری کتاب کا ہے، لیکن مقریزی نے اس میں ماخذ کا بھی ذکر نہیں کیا ہے، البتہ اس قصہ کا مکملہ (جو ہماری کتاب میں نہیں ہے) القاضی المہذب کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

مقریزی پر روسی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، انگریزی وغیرہ میں کافی چیزیں لکھی گئی ہیں اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مقریزی کے ماخذ معلومات کا پتا چلایا جائے، اس سلسلہ میں لندن کے رسالہ ”JRAS“ ۱۹۰۲ء صفحہ (۱۰۳ تا ۱۲۳) میں ایک مضمون ہے [نخط مقریزی میں مذکورہ مولفوں اور تالیفوں کا ذکر]۔ اس میں مضمون نگار گیسٹ (GUEST) نے لکھا ہے ”الذخائر والتحف کے مولف کا نام معلوم نہیں، ممکن ہے کہ یہ مجلی بن جمیع کی ذخائر ہو“۔ اگر مضمون نگار صاحب ذرا تحقیق کر لیتے تو کشف القنون ہی سے معلوم ہو جاتا کہ مجلی بن جمیع کی کتاب الذخائر فقہ شافعی کی کتاب ہے، اس کو تاریخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اوپر میں نے ملکہ برتا کے جس قصے کا ذکر کیا ہے، اس کا مختصر ذکر ابن ندیم نے بھی کیا ہے اور اس کی اساس پر روسی مولف بارتولد نے چیکو سلواکیا کے ایک رسالے میں ایک مضمون لکھا ہے۔ میں نے اسے پڑھا، لیکن اس میں ظاہر ہے کہ مقریزی کے ماخذ پر بحث نہیں ہے، پھر ایک اور روسی مولف انوسٹرانسیف (INOSTRANCEV) نے روما کے رسالہ ”BZO“ ۱۹۱۱ء میں فرانسیسی زبان میں ایک مضمون اسی ملکہ برتا پر لکھا ہے، اور العزلی کی مطالع البدور میں بھی اس قصے کے وجود کا ذکر ہے، جب میں نے اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا تو اس میں بھی ہماری کتاب کے ایک دو نہیں بیس تیس مقاموں پر اقتباس نظر آئے اور آٹھ مقاموں پر تو ان کے ماخذ کا ذکر بھی ملا (دیکھو مطالع البدور، جلد اول صفحہ ۵۸، ۶۱، ۱۳۸، ۲۳۳، نیز جلد دوم ص ۴۰، ۶۵، ۱۶۲، ۱۸۹)۔ ان میں سے سب سے پہلے اقتباس میں ہے: ”دسواں باب مسند، نیکی اور فرش“ القاضی الرشید ابو

الحسین احمد بن القاضی الرشید بن الزبیر نے اپنی کتاب العجائب والطرف والہدایا والتحف میں بیان کیا ہے کہ.....“ دوسرے حوالوں میں بھی مولف یا عنوان کتاب کا مختصر ذکر ہے۔

اسی کی اساس پر میں نے کتاب الذخائر والتحف کو شائع کرتے وقت اسے القاضی الرشید ابن الزبیر کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کی اور چونکہ کتاب میں مولف نے ۴۴۳ھ تا ۴۶۳ھ تک چشم دید حالات لکھے ہیں، اس لیے میں نے قیاس کیا کہ مؤلف کی وفات ۴۶۳ھ کے بعد ہونی چاہیے، وہ حوالے یہ ہیں:

(۱) بادشاہ میخائیل نے اس سفیر کے ہاتھوں ۴۴۳ھ میں!..... بہت قیمتی تحفے بھیجے جن کا میں نے خود تئیس میں مشاہدہ کیا، ”شاہد“ (دیکھو کتاب الذخائر ص ۸۵) [مشاہدہ یقیناً سوا سوسال بعد نہیں ہو سکتا، سفیر کی آمد کے لگ بھگ زمانے ہی میں ہونا چاہیے]۔

(۲) خطیر الملک نے مجھے اطلاع دی (اخبری)..... جبکہ وہ شام سے ذیقعدہ ۴۶۲ھ میں تئیس آیا) کہ اندلس کے حکمران اقبال الدولہ علی بن مجاہد نے المستنصر باللہ (فاطمی) کو ایک تحفہ بھیجا..... (کتاب الذخائر ص ۹۶)، یہ اطلاع ۴۶۲ھ کی ہے اور اقبال الدولہ اور مستنصر باللہ کا زمانہ بھی یہی ہے، ۴۶۳ھ میں یہ لوگ زندہ نہ تھے۔

(۳) امیر ناصر الدولہ ابوعلی الحسن بن حمدان نے ۴۶۳ھ میں بیزنطینی حکمران رومانوس دیوجینیس کو ایک تحفہ بھیجا..... (دیکھو کتاب الذخائر ص ۱۰۵) اور ابو الفضل ابراہیم بن علی الکفر تابی نے مجھ سے بیان کیا (حدیثی)، جبکہ وہ ۴۶۳ھ میں قسطنطنیہ سے دو میاٹ آیا تھا کہ اس نے رومانوس دیوجینیس کو دیکھا

۱۔ اس حوالے میں کوئی سہو ہے کیونکہ پانچواں میخائیل ۱۰۴۲ھ میں مر چکا تھا اور چھٹا میخائیل ۱۰۵۶ھ سے قبل تخت نشین نہیں ہوا، زیر بحث ۴۴۳ھ (مطابق ۱۰۵۲ء تا ۱۰۵۳ء) میں نواں قسطنطین بیزنطینی حکمران تھا اس لیے یہاں یا تو بادشاہ کے نام میں مولف سے غلطی ہوئی ہے، یا تاریخ میں۔

کہ..... (کتاب الذخائر ص ۲۶۳) اس حکمران کا یہی زمانہ ہے اس کے سو سال بعد کا نہیں۔

(۴) ایک شخص نے جو جھنڈوں اور بیرقوں سے خوب واقف ہے، مجھے بتایا (علمی) کہ جھنڈوں کے سرکاری ذخیرے میں..... سپہ سالار جوہر کی آمد مصر اور ۳۵۸ھ میں (فاطمی) قصر شاہی کی تعمیر کے بعد سے اب تک (الی ہذا الوقت)، جبکہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے..... (کتاب الذخائر ص ۳۷۵)۔ ۳۵۸ھ کے بعد سے ”زائد از صد سال“ کے معنی ۳۵۸ھ سے کچھ ہی بعد مثلاً ۴۶۳ھ ہو سکتا ہے، ۵۶۳ھ نہیں۔

ان اقتباسوں سے واضح ہوتا ہے کہ بیان کنندہ راوی یعنی مولف کتاب ۴۴۳ھ اور ۴۶۳ھ کے درمیان دربار فاطمی کے صیغہ استقبال سفراء میں مامور تھا۔ ایک اور اندرونی شہادت کتاب کے ص ۸۷ میں ہے، جہاں ایک بے حقیقت اور تقریباً گننام حکمران کا بڑے ظفہ خیز القاب کے ساتھ اس طرح ذکر کیا گیا ہے: ”الملك المعظم شاهنشاه سلطان دين الله وملك عباد الله وعضد خليفة الله أبو كاليجار بن سلطان الدولة بن بهاء الدولة بن عضد الدولة بن ركن الدولة بن بويه.....“

مولف کا مذہب:

یہ ابو کالیجار تاریخ ابن اثیر، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام وغیرہ کے مطابق بغداد میں امیر الامراء رہا ہے (اور غالباً اسی لیے ہمارے مولف کو، جو اس کی پیشی میں ملازم ہوگا سرکاری محافظ خانے میں ملکہ برتا وغیرہ کے اصل خطوط کے دیکھنے کا موقع ملا ہوگا) ابو کالیجار اور طغرل بیگ سلجوقی میں لڑائیاں رہیں، ابو کالیجار نے اصفہان اور کرمان فتح کر لیا، لیکن ایک وبا میں اسکے بارہ ہزار گھوڑے ہلاک ہو گئے، اس لیے اس نے طغرل بیگ سے صلح کر لی، اور طغرل نے ابو کالیجار کی بیٹی سے، اور ابو کالیجار کے بیٹے نے طغرل کی بیٹی سے نکاح کر کے آپس میں رشتہ بھی کر لیا، ۴۴۰ھ میں کرمان کے مقام

جناب میں ابو کالیجار کا انتقال ہو گیا۔

ابو کالیجار کی وفات کے بعد طفعل کا کوئی حریف نہ رہا اور اس کا اثر سارے ایران، عراق وغیرہ میں پھیل گیا، ان حالات میں ابو کالیجار کے کارندوں، خاص کر شیعہ کارندوں کا سنی سلجوقیوں کے ہاں ترقی یا رسوخ کا کیا امکان ہے، ابو کالیجار شیعہ تھا، اس لیے القاضی الرشید کو بھی اصولاً شیعہ ہونا چاہیے، اور تاریخی مواد بھی یہی ثابت کرتا ہے، (جیسا کہ ابھی بیان ہوگا) اس لیے اگر القاضی الرشید نے سلجوقی علاقے کو خیر باد کہہ کر مصر یعنی فاطمی شیعوں کے ہاں قسمت آزمائی کی کوشش کی تو حیرت کی بات نہ ہونی چاہیے۔

”اعیان الشیعہ“ ایک مشہور کتاب ہے، اس کی جلد نہم صفحہ ۸۲ تا ۹۷ میں سوانح نمبر (۱۳۸۶) پر القاضی الرشید کے حالات تفصیل سے ہیں، اس میں لکھا ہے کہ ”نستہ السحر نامی کتاب کے بیان کے مطابق القاضی الرشید ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے شیعیت قبول کی، اور وہ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔“

محمد علی تبریزی نے اپنی ریحانۃ الادب (جلد پنجم صفحہ ۳۵۵ تا ۳۵۶، نمبر ۷۳۰) میں لکھا ہے: ”یہ ظاہر ہے کہ وہ شیعہ تھا اور شیخ محمد محسن طہرانی کی ”الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ“ اور کتاب اعیان الشیعہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔“

ایک دوسری لیکن عالمانہ بحث میں جامعہ ڈھاکہ کے پروفیسر مفیض اللہ کبیر نے کلکتے کے انگریزی رسالے ”انڈو ایرینیکا“ میں ۱۹۵۸ء سے بومی خانوادے پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا، اس کی ۱۹۵۹ء کی جلد میں صفحہ (۲۷) پر ایک اہم بیان ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

”امیر الامراء بننے سے پہلے ابو کالیجار اسماعیلی فرقے کی دعوت سے متاثر ہو گیا تھا۔ یہ دعوت شیراز میں ایک اسماعیلی داعی دے رہا تھا جو اسماعیلیوں کے ہاں المؤید فی الدین الشیرازی کے نام سے مشہور ہے۔ جب ابو کالیجار بصرہ کی بغاوت فرو کر کے تقریباً

۴۳ھ میں شیراز لونا تو المؤید نے اس سے خط و کتابت شروع کی اور اسے اسماعیلیت قبول کرنے کی دعوت دی، اور یہ بھی بتایا کہ ابو کا لیجار کے سارے آباء و اجداد اسماعیلی ہی تھے، (جو ظاہر ہے کہ لغویات ہے) دیکھو سیرۃ المؤید صفحہ ۱۳-۱۴۔ رفتہ رفتہ ابو کا لیجار بھی اس دعوت سے متاثر ہو گیا، جو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی دیلمی فوج میں بھی پھیلائی جا رہی تھی، (دیکھو فارس نامہ ص ۱۱۹) لیکن جلد ہی مختلف وجوہ سے ابو کا لیجار کو اس داعی سے قطع تعلق کر لینا پڑا کیونکہ نہ صرف اس کے چند درباریوں نے جس میں شیراز کا قاضی القضاۃ بھی شامل تھا، اسے یقین دلایا کہ یہ داعی اس کی فوج کو بغداد پر اکسارہا ہے، بلکہ خلیفہ القائم کو بھی جب داعی المؤید کی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اس نے ابو کا لیجار سے خواہش کی کہ اس داعی سے تعلقات منقطع کر لے، (سیرۃ المؤید صفحہ ۶۳-۶۴) اسی اثنا میں جلال الدولہ کا انتقال ہو گیا اور ابو کا لیجار نے کوشش کی کہ جلال الدولہ کی جگہ خود اسے امیر الامرا بنایا جائے اور یہ ممکن نہ تھا کہ عباسی خلفاء کے حریف کے فرستادہ داعی سے تعلقات منقطع کیے بغیر اس کی خواہش پوری ہو سکے (دیکھو سیرۃ المؤید ص ۷۳-۷۴) اس لیے ابو کا لیجار نے حکم دیا کہ اس داعی کو دریائے فرات کے پار ملک بدر کر دیا جائے اور داعی سے کہا کہ اگر وہ عباسی خلفاء کی سرزمین میں آیا تو اس کو موت کی سزا دی جائے گی۔ (المؤید نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس ملک بدری کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ ”ابو کا لیجار نے مجھے ایک خط لکھا کہ مصر میں امام (فاطمی حکمران) کے ہاں واپس چلا جاؤں، اور کسی دوسرے مناسب وقت پر دوبارہ آؤں (دیکھو سیرۃ المؤید ص ۷۳-۷۴) اسی کتاب میں (ص ۷۶ تا ۷۸) پر ایک اور

خدا ہے جو ابو کالیجار نے داعی کو اس کے مصر جاتے وقت بھیجا تھا،
اگر المؤید کے بیان پر اعتماد کیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ ابو کالیجار
دل سے اس داعی ہی کی طرف میلان رکھتا تھا، اگرچہ سیاسی وجوہ
سے اس نے اسے رخصت ہونے کی خواہش کی تھی۔“

مؤلف کا عصر:

اوپر جن شیعہ سوانح عمریوں کا ذکر ہوا، ان میں اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں
میں بھی القاضی الرشید کے حالات ملتے ہیں اور یہ سب اس کی وفات ۵۶۲ھ یا
۵۶۳ھ میں، یعنی کتاب کی تالیف کے ایک سو سال بعد بیان کرتے ہیں، مثلاً:

یا قوت، معجم الادبا (یا ارشاد الاریب) جلد چہارم ص ۵۱ تا ۶۷

ابن خلکان، وفيات الاعیان، نمبر ۶۴

ابن العماد، شذرات الذهب، جلد چہارم صفحہ ۱۹۷، ایضاً خرید:

ج ۱ ص ۲۰۰ تا ۲۰۲

سیوطی، بغیہ، صفحہ ۱۴۶، ایضاً حسن المحاضرہ جلد دوم ص ۱۲۳

خوانساری، روضات الجنات صفحہ ۷۷ تا ۷۸

یافعی، مراۃ الجنان جلد سوم ص ۳۶۷ تا ۳۶۹

جعفر الاذیفی، الطالع السعید، نمبر ۵۲

الاسنوی، طبقات الشافعیہ، ورق ۶۳/ الف

الذہبی، سیر النبلاء ج ۱۲ صفحہ ۲۶۲

ابن سرہ الجعدی، طبقات فقہاء البیسن صفحہ ۱۳۰ (مخطوطہ) زمانہ تالیف ۵۸۶ھ

ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، حالات ۵۶۳ھ

یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں مصر میں چھپی ہے۔ اڈیٹر نے حاشیے میں لکھا ہے کہ القاضی الرشید کے
حالات باخترہ جلد دوم صفحہ ۳-۶ میں السلوک، ورق ۱۲۳ میں، اور الداعی اور یس کی عیون
الاخبار جلد ہفتم ص ۲۰۳ میں بھی ہیں، دیکھو کتاب مذکور ص ۱۶۷

ابن تفری بردی: النجوم الزاہرہ، بر موقع

ان میں سے متعدد حوالے میرے مکرم دوست بیروت کے پروفیسر صبحی الصالح نے مہیا کیے، اور جو کتابیں مجھے پارلیس میں نہ ملیں ان کی ضروری عبارتوں کی نقلیں بھی بھیجیں، جزاء اللہ خیراً، مذکورہ حوالوں میں القاضی الرشید کے اشعار بھی ہیں، لیکن ان کو ہماری اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے ان کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں، بعض حوالے مولانا عبدالعزیز میمن نے بھی ازراہ عنایت بھیجے، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

میں ان میں سے صرف پہلے دو اقتباسوں کو یہاں ورج کروں گا۔

(الف) یاقوت نے لکھا ہے: ”احمد بن علی بن ابراہیم بن الزبیر الغسانی الاسوانی المصری جس کا لقب الرشید، اور کنیت ابوالحسن ہے، اس کا صعد مصر کے ایک بڑے اور بہت مالدار گھرانے سے تعلق تھا، اسے اسکندریہ کی بندرگاہ اور دواوین سلطانیہ (سرکاری مرکزی دفتر) کا ناظم بنایا گیا، پھر اس کو ظالمانہ طور پر محرم ۵۶۲ھ میں قتل کیا گیا، اس کی تصانیف مصر سے باہر بھی مشہور ہیں۔ ان میں کتب ذیل بھی شامل ہیں:

- ۱۔ منیۃ الالعی وبلعة المدعی جس میں کئی علوم کا ذکر ہے۔
- ۲۔ کتاب المقامات
- ۳۔ کتاب جنان الجنان وروضة الاذهان چار جلدوں میں
- مصری شعر کا تذکرہ
- ۴۔ کتاب الهدایا والطرف
- ۵۔ کتاب شفاء الغلة فی سمت القبلة
- ۶۔ رسائل جو تقریباً پچاس ورق میں ہیں
- ۷۔ دیوان تقریباً سو ورق میں۔

۱۔ لفظ مصر عربوں کی ایجاد نہیں ہے یہ بڑا پرانا لفظ ہے، چنانچہ توریت میں قبیلہ مصرامیم کا نام آیا ہے، ہندوؤں میں جو خاندان مسر اور مصرجی کہلاتے ہیں، ان کا بھی اس سے رشتہ جوڑا جاتا ہے۔

وہ صعید مصر میں اسوان میں پیدا ہوا۔ پھر ترک وطن کر کے مصر (قاہرہ) میں آباد ہو گیا۔ اور وہاں کے حکمرانوں سے توسل پیدا کیا، اور وزرا کی مدح میں قصیدے لکھے جنہوں نے ایسی ترکیاں عطا کیں، چنانچہ اسے ”رسالت“ (یعنی فاطمی دعوت) کے لیے یمن بھیجا گیا، جہاں بعد میں اس کو قاضی اور گورنر بھی بنایا گیا ”قاضی قضاۃ الیمن اور داعی دعاۃ الزمن“ کے لقب سے ملقب کیا گیا، رسوخ و اقتدار حاصل ہونے کے بعد اس کو خلیفہ بننے کی ہوس پیدا ہوئی، اور اس کوشش میں اس کو کامیابی ہوئی، لوگوں نے اس کو قبول کر لیا اور اس نے اپنے نام کے سکے ڈھالے جن کی ایک جانب ”الامام الامجد ابو الحسین احمد“ اور دوسری طرف ”قل ہواللہ احد اللہ الصمد“ درج تھا لیکن بعد میں اسے گرفتار کر کے قوس بھیج دیا گیا..... اس کے قتل کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اسد الدین شیرکوہ کی طرف مائل ہو گیا تھا چنانچہ جب وہ اس ملک میں آیا تو القاضی الرشید نے اس سے خط و کتابت کی..... اس اقتباس میں اس کی تالیف نمبر ۴ کی طرف خاص کر اشارہ کرنا ہے۔

(ب) ابن خلکان نے اس گتھی کو سلجھانے کی کلید مہیا کی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ”القاضی الرشید ابو الحسین احمد بن القاضی الرشید، ابو الحسن علی بن القاضی الرشید، ابو الحسین ابراہیم بن محمد بن حسین بن الزبیر الغسانی الاسوانی، یہ اچھا عالم اور فرزانہ شخص تھا، بڑے عہدہ پر فائز تھا، اس نے کتاب الجنان و ریاض الاذہان تالیف کی جو مشاہیر علماء کی سوانح عمریوں پر مشتمل ہے۔ اس کی نظموں کا ایک دیوان بھی ہے، اس کے بھائی القاضی المہذب کا بھی ایک دیوان ہے، العماد نے السیل والذیل میں لکھا ہے کہ شاور نے اس کا شیرکوہ کی طرف میلان دیکھا تو ۵۶۳ھ میں اس کو ظالمانہ طور سے قتل کر دیا، اس کا رنگ کالا اور سینہ چوڑا تھا، معصروں میں ہندسہ، ریاضی، علم الادیان، ادب اور شاعری میں اس کا کوئی حریف نہ تھا۔

لہذا ان تحریروں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس خاندان میں تین نسل تک مسلسل القاضی الرشید کا لقب جاری رہا، قاضی رشید اول کا پوتا باختلاف روایت ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ یا ۵۶۳ھ میں فوت ہوا۔ ایسی حالت میں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہماری کتاب کا مولف پوتا نہیں بلکہ دادا رہا ہو؟ مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے فروری ۱۹۶۱ء کے

معارف میں جو تحقیق فرمائی ہے، اس سے اس خاندان کے متعلق کافی حالات معلوم ہوتے ہیں۔ وہ الافوی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

(الف) ”نمبر ۵۲ احمد بن علی بن ابراہیم بن علی بن الزبیر ابوالحسن القرشی الاسدی الاسوانی المعروف بہ الرشید۔“

(ب) ”نمبر ۲۹ علی بن احمد بن علی الاسوانی، الرشید کا باپ، العماد الاصبہانی نے اسکا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ قاہرہ میں ۵۶۳ھ [۵۳۳ھ؟] میں فوت ہوا۔“

(ج) ”نمبر ۲۳ ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن الزبیر الاسوانی القاضی، جو قوس اور اس کے نواحی کا ۴۷۲ھ میں قاضی تھا، یہ الرشید اور المہذب کا دادا ہے، جن دونوں کا باپ الزبیر تھا۔ النضر نے اس کا مرثیہ لکھا، اس کا کچھ اقتباس ہم آگے ابن النضر کے حالات کے سلسلے میں دیں گے۔“

شیعہ سنی میلانات اور ابن الوقت لوگوں کے طرز عمل پر اس کتاب کے ذیل کے بیانات سے کچھ روشنی پڑے گی:

”نمبر ۲۵ عبد القادر بن مہذب بن جعفر الافوی جو میرا چچا زاد بھائی ہے..... اسمعیلی فرقے سے تعلقات رکھتا ہے اور النعمان بن محمد کی کتاب دعائم الاسلام کے مطالعے میں لگا ہوا ہے۔“ ”نمبر ۱۹ ابراہیم بن محمد بن احمد بن نصر الخطاب بہ فخر الدولہ جو الزبیر کے بیٹوں الرشید اور المہذب کا بھانجا تھا، یہ ادیب، شاعر اور انشاء پرداز تھا۔ سب سے پہلے اسی کو صلاح الدین ایوبی نے کاتب مقرر کیا۔ اس کے بعد صلاح الدین کے بھائی الملک العادل کا کاتب بنا، اس نے اپنے ماموں الرشید کے بعض اشعار کی روایت کی ہے۔“

اس بیان سے گمان ہوتا ہے کہ اس خاندان میں شیعہ سنی دونوں میلانات کے لوگ بیک وقت پائے جاتے تھے کیونکہ سلطان صلاح الدین کا کاتب سنی ہونا چاہیے،

ہمارا مولف ادنوی سنی ہے اور اس کا پچازاد بھائی اسماعیلی شیعہ، (ادنوی کی وفات ۴۲۸ھ میں ہوئی)۔

خلاصہ :

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ القاضی الرشید جو اولاً بوہبی حکمران ابو کالیجار کی پیشی میں تھا، ابو کالیجار کی وفات ۴۲۰ھ کے بعد جب بوہبیوں کا سقوط ہوا تو وہ مصر چلا آیا، یہاں فاطمیوں نے اس کی قدردانی کی اور اس کو صید مصر میں ایک جاگیر عطا کی، ۴۲۲ھ تا ۴۶۳ھ وہ دفتر خارجہ میں رہا، پھر ۴۷۲ھ میں قوس کا قاضی مقرر ہوا، اس کے بیٹے اور پوتے ہی نہیں پڑپوتے تک کے حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں کہ وہ سب مصر میں سرکاری ملازم اور خاصے ممتاز رہے۔ اس کا مفصل نسب اسی ادنوی نے یہ بیان کیا ہے ”نمبر ۵ ابراہیم بن احمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن فلیہ بن سعید بن ابراہیم بن حسین القرشی الاسدی ابو اسحاق بن ابو الحسین بن ابو اسحق الاسوانی الکاتب۔ یہ الرشید بن الزبیر کا بیٹا تھا۔۔۔۔۔ میں نے اس کی تاریخ ولادت پوچھی تو ۵۶۱ھ معلوم ہوئی یہ سرکاری دفاتر میں کارگزار تھا۔“

میں ان بیانات سے فی الحال اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ:

- (۱) کتاب الذخائر والتحف اپنی موجودہ شکل میں الاوحدی کی تالیف ہے جس نے القاضی الرشید کے مسودے کا جو حصہ بھی دستیاب ہوا اس کو صاف کر کے شائع کیا، اور مقریزی نے اپنی کتاب خط میں اسی سے استفادہ کیا۔
- (۲) لیکن اوحدی کا کام صرف مبیضہ کرنا تھا یا تلخیص و انتخاب، اصل کتاب کا نام الہدایا والطرف تھا، اور اوحدی کے اڈیشن کا نام الذخائر والتحف ہوا۔
- (۳) کتاب کا نام چونکہ بہت لمبا تھا اس لیے بعد کے لوگوں نے اس کا طرح طرح کے ناموں میں اختصار کیا۔
- (۴) چونکہ القاضی الرشید بن القاضی الرشید بن القاضی الرشید تین آدمیوں کا نام ہے،

اس لیے یاقوت کو سہو ہوا اور اس نے دادا کی کتاب کو اس کے مشہور پڑپوتے کی طرف منسوب کر دیا، یہ بھی ممکن ہے دادا کی تالیف کو پوتے نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہو، اور بے خیالی میں ان عبارتوں کی اصلاح نہ کی ہو جہاں دادا نے سال اور تاریخ بیان کر کے ضمیر متکلم کے ساتھ کوئی روایت بیان کی ہے (بالکل اسی طرح جس طرح خلیفہ مامون نے بیت المقدس کے قیۃ الصخرہ میں عبدالملک بن مروان کا نام کتبے میں سے نکال کر اپنا نام تو داخل کر دیا، لیکن سنہ تعمیر بدلنے کا خیال نہیں کیا، اس لیے اب یہ چوری پکڑ لی گئی۔)

(۵) دادا القاضی الرشید اگر پانچویں صدی کے آغاز مثلاً ۴۱۷ھ میں پیدا ہوا ہو تو ۴۷۴ھ تک اس کا برسر کار رہنا اور قوس میں قاضی کے فرائض انجام دینا اور ۴۴۴ھ سے ۴۶۳ھ تک وزارت خارجہ میں رہنا بالکل ممکن ہے۔

ممکن ہے آئندہ اہل علم کی کوشش سے مزید حالات معلوم ہو سکیں کہ فوق کل ذی علم علیم!

(معارف اعظم گڑھ - مئی ۱۹۶۴ء)

تاریخ

علمِ تاریخ میں مسلمانوں کا حصہ

تاریخ بہت پرانا علم ہے۔ متمدن، غیر متمدن، ہر قوم میں، ہر زمانے میں اس کے آثار ملتے ہیں۔ تحریری کتابیں نہ بھی ہوں، تو زبان زد قاصد کی صورت میں پرانے بڑے لوگوں کے کارنامے نثر یا نظم میں ضرور ملتے ہیں۔ اس کی ابتدائی غرض کچھ تو اپنے مشاہیر کی بڑائی اور کچھ دل بہلائی، وقت گزاری کا سامان رہی، اور شاذ و نادر عبرت پذیری یا ہمت افزائی بھی۔ اس کے لیے نہ تو زمانے کے تعین کو کوئی اہمیت ہے، نہ مختلف ہیروؤں میں ترتیب کی خاص ضرورت۔ زیادہ تر لڑائی اور دلیری پر زور دیا جاتا ہے، پھر دولت اور تو نگری پر۔ جن و عشق کی چاشنی بھی بہت قدیم سے ملتی ہے۔

جب تمدن ترقی کرتا ہے، حکمرانی کا علاقہ پھیلتا ہے۔ امن اور فراغ بالی کی مدت کافی لمبی ہو جائے، تو ہیروؤں کی تعداد کا بڑھنا بھی ناگزیر ہے۔ خود پرستی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے کہ حکومت کے ملازموں میں ایک مؤرخ بھی ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ دربار میں حاضر رہتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ اپنے حکمران آقا کے کارناموں کو مدون کرتا رہے، اور تذکرے میں اس کی تعریف و توصیف بھی کرے۔

اسلام کا آغاز ۶۱۰ء جیسے متاخر زمانے میں ہوا۔ انسانیت نے ہزاروں سال میں بتدریج جو علمی اور ذہنی ترقی کی تھی، اس نے اس سے استفادہ کیا اور اس پر کچھ نئی چیزوں کا اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ یہاں انہی کا مختصر ذکر مطلوب ہے۔

تاریخ:

تاریخ کا لفظ ہمارے ہاں عربی زبان سے آیا ہے۔ اس کا مادہ ”ارخ“ اور ”ورخ“ دونوں بیان ہوئے ہیں۔ علم اشتقاق کے بعض قدیم مؤلفوں نے لکھا ہے کہ ”ارخ“ کے معنی حمیری (یعنی یمن کی پرانی عربی) زبان میں ”چاند“ کے ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ عبرانی میں بھی اس کے یہی معنی ہیں۔ ہیٹن بھی اس کی تائید کرتا ہے اور لکھتا ہے (۱) کہ ”سامی زبانوں میں ورخ کے معنی چاند کے ہیں۔“ اس طرح عربی فعل تاریخ (نیز تورخ) کے معنی ہوں گے: چاند بنانا، یعنی نئے چاند کی مدد سے مہینا شمار کرنا، یا وقت کا حساب کرنا۔ ابن عساکر کی یہ روایت بھی اہم (۲) ہے کہ ”ایک یمنی مسلمان نے حضرت عمر سے کہا: میں نے یمن میں ایک چیز دیکھی، جسے وہاں کے لوگ تاریخ کا نام دیتے ہیں اور یوں لکھتے ہیں کہ فلاں سال کے فلاں مہینے ہیں۔“

کہتے ہیں کہ وقت شماری کے لیے سات دن کا ایک ہفتہ اور بارہ مہینے کا ایک سال سب سے پہلے بابل والوں نے شروع کیا، دوسرے لوگوں نے یہ انہی سے سیکھا اور جاری رکھا۔ سورج کا ہر روز ٹکنا اور ڈوبنا، اور چاند کا مہینے بھر تک بڑھ اور گھٹ کر پھر پرانی حالت میں آ جانا، ایسے مناظر فطرت تھے جن کا ہر شہری روزمرہ مشاہدہ کرتا تھا اور ان کے جاننے کے لیے سادہ لوح سے سادہ لوح انسان کو بھی کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن بارہ چاندوں کے قمری سال کی موسموں سے مطابقت نہیں ہوتی۔ اسی لیے جب انسان نے زراعت کا پیشہ سیکھا، شمسی (سورج کے) سال کی بھی اہمیت پیدا ہو گئی اگرچہ اس کا طریقہ مختلف ملکوں میں مختلف رہا۔

A.F. Beeston, Epigraphic South Arabian Calendars and Dating (۱)

(London 1956) P-3

(۲) تاریخ دمشق (نثرہ مجلد)، ۱: ۳۷۱، سخاوی، الاعلان بالتوخیج: ۱۳۲

پرانے عرب میں شمسی سال:

اسلام سے پہلے عربوں میں اس کے دو طریقے رائج تھے، اور سال شماری دو مختلف طرح سے ہوتی تھی: ایک میں انواء کا (یعنی بارش کے ستاروں کا جن کو دکھنی اردو میں کارتی کہتے ہیں) لحاظ ہوتا تھا۔ ایسے اٹھائیس ستارے ہیں جن سے ہر ایک تقریباً تیرہ تیرہ دن کے وقفے سے نکلتا ہے (۳)۔ برسات، سردی، گرمی، بہار، خزاں مختلف موسموں کا ان سے پوری صحت کے ساتھ تعین ہوتا ہے۔

دوسرے طریقے میں محرم، صفر وغیرہ بارہ مہینے تھے۔ غروب آفتاب کے فوراً بعد نئے چاند کے افق مغرب میں نظر آنے سے نیا مہینا شروع ہوتا ہے۔ یہ نیا چاند جو افق پر تقریباً ۱۰ سے ۲۵ درجے کے زاویہ پر نکلتا ہے کبھی ۲۹ دن کے بعد اور کبھی ۳۰ دن کے بعد نظر آتا ہے۔ بعض اوقات پے در پے دو اور کبھی تین تین مہینے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی مسلسل دو یا مسلسل تین تیس مہینے بھی؛ ورنہ عام طور پر ایک اٹھیس دوسرا تیس ہوتا ہے بحیثیت مجموعی ۳۵۴ دن چند گھنٹوں، منٹوں، سکندوں میں ایک قمری سال پورا ہوتا ہے۔ شمسی سال کو ۳۶۵ دن اور چند گھنٹے، منٹ، اور سکند لگتے ہیں۔ اس طرح قمری سال، شمسی سال سے تقریباً گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ اسی لیے جاہلیہ میں ہر تیسرے سال ایک تیرھویں قمری مہینے (یعنی ۳۰ یا ۳۱ دن) کا اضافہ کر دیتے تھے۔ لیکن تین سال میں ۳۳ دن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے چند سال تک ہر تیسرے برس جنتری میں ایک مہینے کا اضافہ کرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ دو ہی سال بعد ایک مہینے کا اضافہ کر لیتے ہیں، جس کے بعد مکرر چند سال تک تین تین برس کے بعد تیرہ مہینوں والا سال بنایا جاتا۔ اسے قرآن میں نسی کا نام دیا گیا ہے۔

(۳) اسے اقوام متحدہ کی حالیہ تجویز سے مشابہت ہے کہ اٹھائیس دن کے ہر سال تیرہ مہینے ہوں (۱۳×۲۸=۳۶۴ دن) اور نو روز ایک گمنام ہوتا کہ مہینوں کی تاریخیں ہمیشہ معینہ دنوں میں آئیں۔ اگر اس پر عمل ہوا، تو اصلی جمعہ کا دن کبھی سنچر، کبھی اتوار، کبھی پیر وغیرہ پڑے گا۔

وقت شماری کے اسلامی احکام:

وقت شماری کا قرآن مجید میں کئی بار ذکر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کس حد تک اس علم سے واقف تھے۔ چنانچہ:

(۱) ”[اصحاب کہف] اپنے غار میں تین سو برس مقیم رہے اور نو (برس) کا اضافہ کیا“ (۲۵:۱۸) یعنی تین سو خالص قمری سالوں میں کبیسہ گری کے لیے نو سال کا اضافہ کر کے تین سو شمسی سالوں سے تطابق پیدا کیا گیا۔ گویا ۳۰۹ شمسی سالوں کے برابر ہوئے۔

(۲) ”یشک، مہینوں کی تعداد خدا کے ہاں، خدا کی تحریر میں، اس دن جب اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، بارہ مہینے تھے۔ ان میں سے چار حرام ہیں (ان میں لڑائی بھڑائی بند کرنی چاہیے)..... نسی (کبیسہ گری) کفر میں زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔ اس سے کافر ہی بھٹکتے ہیں: اس (مہینے) کو وہ ایک سال طال قرار دیتے اور ایک سال حرام، تاکہ خدا کی طرف سے حرام قرار دیے ہوئے (مہینوں) کی تعداد تو ٹھیک بیٹھ جائے لیکن وہ چیز طال ہو جائے، جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ ان لوگوں کو ان کے بُرے کام بھی بھلے لگتے ہیں۔“

(۳۷:۹-۳۷)

(۳) ”وہ (خدا) ہی ہے جس نے سورج کو روشنی اور چاند کو نور بنایا اور اس (چاند) کی منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب جان سکو۔“ (۵:۱۰)

(۴) ”اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔ ہم رات کی نشانی کو ناپید کرتے ہیں اور دن کی نشانی کو نظر آنے والی بناتے ہیں، تاکہ تم اپنے پروردگار کا فضل حاصل کر سکو، اور سالوں کی تعداد اور حساب جان سکو۔ اور ہم نے ہر چیز میں تفصیلیں پیدا کی ہیں۔“ (۱۴:۱۷)

(۵) ”اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف بہ رہا ہے۔ یہ طاقتور اور جاننے والے (خدا) کی مقرر کردہ بات ہے۔ اور ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کی ہیں تاکہ (ہر مہینے

کے آغاز پر) وہ کھجور کے پرانے پھڑے کی طرح (کماندار شکل میں) مکرر عود کر آئے۔ نہ سورج کو یہ سزاوار ہے کہ چاند کو جالے، اور نہ رات کو سزاوار ہے کہ دن سے آگے نکل جائے۔ (چاند اور سورج میں سے) ہر ایک الگ الگ (محور) میں تیرتا رہتا ہے۔“ (۳۶:۳۸-۴۰)

(۶) ”(اے رسول) وہ آپ سے نئے چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ وہ لوگوں کے لیے وقت شماری اور حج (کا زمانہ معلوم کرنے) کے لیے ہیں۔“ (۱۸۹:۲)

وقت کے مفہوم سے بحث:

تاریخ کی کتابوں کے شروع میں وقت کے مفہوم سے بحث کرنا مسلمان مؤرخوں کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً طبری (ف ۹۲۳ء) جیسے پرانے مؤرخ نے اپنی ”تاریخ الامم والانبیاء والملوک“ میں یہی کہا ہے۔ مسعودی (ف ۹۵۶ء) نے بھی اس سے دلچسپی لی اور ساری دنیا میں جو سنہ مروّج ہیں ان کی تفصیل بتائی ہے۔

سنہ کا رواج مسلمانوں میں:

کائیانی (Caetani) نے اپنی کتاب ”واقعات اسلام (Annali del l'Islam) (۲۳۹:۱) میں سنہ ہجری کے آغاز کا قصہ بیان کرتے ہوئے یہ حیرت انگیز واقعہ یاد دلایا ہے کہ عیسائیوں میں سنہ عیسوی کا رواج پہلے پہل نوں صدی عیسوی میں شارلمان کے زمانے میں ہوا۔ آماری (Amar) نے صقلیہ کی تاریخ لکھتے ہوئے وہاں کے ایک گرجے کا کتبہ درج کیا ہے جس میں مہینے کا نام تو فرنگی دیا ہے، لیکن تاریخ صرف ہجری سنہ میں دی گئی ہے، گویا صقلیہ میں کوئی معروف فرنگی سنہ نہیں پایا جاتا تھا، جس پر سب متفق ہوں اور یہ کہ ہجری سنہ سے سب واقف تھے۔

مسلمانوں میں سنہ ہجری کا رواج طبری (۴)، بیہقی (۵)، سخاوی (۶) وغیرہ کے

(۴) تاریخ طبری حالات ۱۱ھ (یورپی ایڈیشن، سلسلہ اول) ص ۱۲۵۰

(۵) دلائل النبوة (مخطوطات استانبول)

(۶) الاعلان بالتوبخ لمن ذم التاريخ (بغداد ۱۳۸۲ھ)، ص ۱۳۸-۱۳۹

مطابق عہد نبوی ہی سے اور ہجرت کے پہلے سال ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ البتہ اس کے اصول سے متعلق شروع میں کچھ اختلاف تھا، بعض لوگ ربیع الاول کو سال کا پہلا مہینہ قرار دیتے تھے، (۷) کہ رسول اکرم کی ہجرت اسی مہینے میں ہوئی؛ بعض لوگ محرم کو پہلا مہینہ شمار کرتے تھے کہ قدیم سے عرب میں ایسا ہی رواج تھا (۸) بیہقی نے کچھ اور فرق بھی ذکر کیے ہیں (۹)۔ اسی لیے قواعد اور سرکاری استعمال کے احکام خلیفہ حضرت عمرؓ نے ۱۷ھ میں دیے (۱۰)۔ غرض کہاں ۱۷ھ اور کہاں نویں صدی عیسوی! یہیں تفاوت راہ از کجاست تاکجا۔

طبری نے ۱۷ھ میں ہجری سنہ کے رواج کے لیے سرکاری مجلس مشاورت کے جو حالات بیان کیے ہیں (۱۱) وہ بھی سبق آموز ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشورہ نہ صرف کافی عرصے تک ہوتا رہا بلکہ یہ بھی کہ اس میں یہودیوں، ایرانیوں، (؟ پارسیوں) وغیرہ سے بھی رائے لی گئی تھی۔ بہر حال طبری کے مطابق خلیفہ کی مشورت طلبی پر بعض لوگوں نے کہا کہ رومی (یعنی بیزنطینی) سنہ اختیار کیا جائے جو ذوالقرنین سے

(۷) طبری و سخاوی: حوالہ ہائے بالا

(۸) سخاوی: ۱۲۳۔ ابن عساکر تاریخ دمشق (نشرہ مجدد) ۱: ۳۷۱۔ تاریخ طبری: ۱۲۵۲۔

(سخاوی: ۱۲۶) نے مسند الفردوس حدیث ۳۵۵ کے حوالے سے اس کی تائید میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے۔

(۹) دلائل النبوة (حوالہ بالا کے) مطابق کچھ لوگ سنہ کا آغاز اس محرم سے کرتے تھے جس میں بیعت عقبہ ہوئی اور ہجرت کرنا طے ہوا (یعنی ۱۷ھ قبل ہجرت) اس کے بخلاف کچھ لوگ اس محرم سے گنتے تھے جس میں خود رسول اکرم نے ہجرت فرمائی (اور یہی اب رائج ہے) اور کچھ اس محرم سے جو رسول اللہ کے مدینہ آنے کے بعد پہلی دفعہ آیا (یعنی ۲ھ) اس طرح کسی واقعے کے زمانے میں تین سال کا نادانستہ فرق ہو جاتا تھا۔ غزوہ بنی المصطلق جو شعبان ۴ھ، شعبان ۵ھ اور شعبان ۶ھ میں تین مستند ترین مؤرخوں کے ہاں تین طرح سے بیان ہوا ہے، تو اس کی وجہ یہی تھی۔

(۱۰) طبری (ص ۱۲۵۳) نے ۱۷ یا ۱۸ لکھا ہے۔ ابن عساکر (تاریخ دمشق، ۱: ۳۹۰) کے مطابق حضرت عمرؓ نے ۱۶ھ میں حج کیا اور سرکاری جنتری کے احکام دیے؛ اس لیے حج کے ایک ماہ بعد ۱۷ھ سے نفاذ ہوا ہوگا۔

(۱۱) تاریخ طبری، ص ۱۲۵۰ تا ۱۲۵۵

شروع ہوتا ہے (۱۲)۔ اسے اس بنا پر رد کیا گیا کہ ”فہذ ایطول“ (یہ طوالت پیدا کرتا ہے) (۱۳) بعض لوگوں نے کہا کہ فارسی (ایرانی) سنہ اختیار کیا جائے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے ہاں کوئی مستقل سنہ ہے ہی نہیں، ہر نئے حکمران کے سنہ جلوس سے وقت شمار ہوتا ہے (۱۴)۔ پس اس کے اختیار کرنے میں غرض فوت ہو جاتی تھی۔ کسی اور نے کہا کہ بعثت نبوی کے آغاز سے حساب کیا جائے۔ مگر اس وقت تک اسلام پھیلا نہ تھا اور یہ سارے ہی مسلمانوں کو ان کے کفر و جہالت کا زمانہ یاد دلانے کا باعث تھا (۱۵)۔

(۱۲) اگر اس سے مراد سکندر اعظم ہے تو سنہ سکندری، سکندر کی وفات یعنی ۱۲ نومبر ۳۲۳ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن سخاوی (صفحہ ۱۴۳) کی روایت میں بعض نو مسلم یہودی جو جلسہ میں حاضر تھے، کہنے لگے ”ہمارے پاس وقت کے حساب کا ایک سنہ ہے جسے ہم سکندر سے شروع کرتے ہیں“ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے سلوٹی Seleucide سنہ مراد ہونا چاہیے جو گیارہویں صدی عیسوی تک یہودیوں میں شام میں رائج تھا اور یکم اکتوبر ۳۱۲ قبل مسیح سے شروع ہوتا تھا، جیسا کہ Der Grosse Brockhgus نامی جرمن انسائیکلو پیڈیا میں لفظ Ara کے تحت لکھا ہے

(۱۳) اس کا مطلب واضح نہیں۔ ۷۷۱ھ میں ۸۵۱ سلوٹی پڑتا ہے۔

(۱۴) سخاوی (ص ۱۴۳) نے لکھا ہے کہ یہ توضیح ہرمزان نے کی ہے۔ یہ ایک ایرانی سردار تھا جو جنگ میں گرفتار ہو کر مدینہ آیا تھا۔ ممکن ہے کہ مسلمان بھی ہو گیا ہو۔ اس نے کہا کہ ایرانی وقت شماری کے حساب کو ”ماہ روز“ کہتے ہیں۔ راوی کا گمان ہے کہ لفظ ماہ روز کو معرب کر کے مؤرخ بنایا گیا اور پھر اس کا مصدر ”تاریخ“ بنا۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ ہم ادھر دیکھ چکے ہیں کہ ”تاریخ“ یعنی عربی لفظ ہے۔

(۱۵) ابن عساکر نے (تاریخ دمشق، جلد اول، ص ۳۴ نیز ۳۵ میں) دو ضعیف سی روایتیں نقل کی ہیں کہ ولادت نبوی سے آغاز کرنے کی بھی تجویز ہوئی تھی۔ لیکن اس پر بھی وہی اعتراض ہوتا ہے، جو بعثت نبوی کے متعلق ہوا۔ پھر یہ بھی واقع ہے کہ اس تاریخ سے شروع ہونے والا سنہ کے میں رائج بھی تھا۔ یاد رہے کہ کے میں حبشی حملے کی تاریخ سے ایک سنہ شروع ہوا تھا اور حملہ آوروں کے ہاتھی کی وجہ سے اسے سنۃ الفیل یا ہاتھی کا سال کہتے تھے۔ اسی سال آنحضرت بھی پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ انہی حملے اور اہل مکہ کی بھگدڑ سے اس کا شمار ہوتا زبان زد اور عوام کا ذہن نشین امر تھا اس لیے اب اسی کو آنحضرت کی ولادت پر منتقل کرنا بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

کسی نے کہا کہ آنحضرت کی وفات سے سنہ شروع کیا جائے۔ لیکن یہ ایک انتہائی درد انگیز اور افسوسناک واقعہ تھا۔ آخر میں ہجرت کو نقطہ آغاز قرار دینے کا مشورہ ملا (جو کہتے ہیں کہ حضرت علی نے دیا تھا)۔ اسے سب نے قبول کر لیا کیونکہ یہ ”دارالشرب سے دارالسلام میں آنے، اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کی تاریخ ہے۔“

آنحضرت کی اپنی ہجرت تو ربیع الاول میں ہوئی تھی لیکن کچھ تو اس لیے کہ محرم کا سال کا پہلا مہینا ہونا معروف تھا اور اس میں تبدیلی کی ضرورت نہ تھی، اور کچھ اس لیے کہ آنحضرت سے پہلے دوسرے مکی مسلمانوں نے محرم کے مہینے ہی سے مدینے کی ہجرت شروع کر دی تھی، محرم کو سنہ ہجری کا آغاز تسلیم کر لیا گیا۔ مغربی مستشرقین نے زمانہ حال میں ہجری اور عیسوی تاریخوں میں جو فرق ہے، اس کی بنا پر حساب کرنے کے لیے یکم محرم ۱ھ کے مطابق عیسوی تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض ۱۵ جولائی اور بعض ۱۶ جولائی ۶۲۲ء تعین کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان ہیئت دان خود اس کا حساب کر کے صحیح تاریخ متعین کریں۔

یہ نیا اسلامی سنہ جو ہجرت کی طرف منسوب ہو کر سنہ ہجری کہلاتا ہے خالص قمری سنہ ہے جس میں شمسی سال اور موسموں کے ہمیشہ معین مہینے میں آنے کے لیے کمیہ گری نہیں کی جاتی۔

آسان نہ ہوتا۔ شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مکی حادثے کو اسلامی سنہ کے لیے قبول نہ کرنے میں مدنی انصار کی دلداری بھی مقصود تھی۔ مدینے والوں کا کوئی اپنا سنہ موجود نہ تھا۔ اس لیے ایسا سنہ اختیار کرنا بہتر تھا جو مکے اور مدینے دونوں جگہ کے مسلمانوں کے لیے دلکشی رکھتا ہو ہجرت سے شمار میں یہ بات بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ شاید یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سنہ ہجری کے آغاز پر عیسائی دنیا میں روم میں الگ سنہ تھا، یونان میں الگ، شام میں الگ اور یہ سارے ہی سنین سیاسی واقعات سے متعلق اور کسی نہ کسی بادشاہ سے شروع ہوتے تھے؛ ان کو حضرت عیسیٰ یا عیسوی دین کے کسی واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شارلمان کے زمانے (نویں صدی عیسوی) میں حضرت عیسیٰ کی ولادت سے عیسوی سنہ کا آغاز کرنا ممکن ہے اسلامی تمدن سے ربط کے باعث ذہن میں آیا ہو، مگر اب آٹھ سو برس پہلے کے واقعات کا تعین آسان نہیں تھا۔ چنانچہ جدید مغربی تحقیقات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ۴ یا ۶ قبل مسیح میں پیدا ہوئے تھے۔

قمری اور شمسی سال:

قرآن (۹: ۳۷) کے احکام کے تحت رسول اکرم نے اپنے آخری حج کے موقع پر (جو اسی لیے حجة الوداع کہلاتا ہے) یعنی اپنی وفات سے تین مہینے پہلے مکہ کے مضافات میں بمقام عرفات، جبل الرحمة پر سے جو تاریخی خطبہ دیا (اور جس میں انسان کے بنیادی حقوق و فرائض کا ذکر ہے)، اس میں نسی یعنی کیسہ گری کو منسوخ فرمایا اور خالص قمری سال رائج کرنے کا حکم دیا تھا۔ فرمایا (۱۶):

ایہا الناس انما النسبی زیادة فی الکفر یُضَلُّ به الذین کفروا یُحَلِّوْهُ عَامًا وِیَحِرُّ مَوْنَهٗ عَامًا لِّیَواطِؤْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ، فِیَحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وِیَحِرُّوْا مَا اَحَلَّ۔ وَ اِنَّ الزَّمَانَ قَدْ اسْتَدَا رَکْهَیْمَةُ یَوْمٍ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ۔

لوگو! کیسہ گری (لوند کا مہینا بڑھانا) کفر میں زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔ اس طرح کافروں کو بھٹکایا جاتا ہے۔ (کیونکہ) وہ اس (مہینے) کو ایک سال (جنگ کے لیے) حلال قرار دیتے ہیں اور ایک اور سال اسے حرام قرار دیتے ہیں تاکہ (مہینوں کی) جس تعداد کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کی (ظاہری) پابندی کرتے ہوئے اس

(۱۶) اس کا پورا متن ابن ہشام، طبری وغیرہ بکثرت مؤرخوں اور محدثوں نے دیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے میری کتاب ”الوفاق السیاسیہ“ دستاویز نمبر ۲۸۷/الف) معدرجہ بالا اقتباس کے سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں رہیں۔ عرب میں اسلام سے پہلے ہر سال چار مہینے محترم قرار دیے گئے تھے، جن میں خوزریزی حرام بھی جاتی تھی۔ ان میں سے تین مسلسل تھے، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم۔ پھر جب قمری اور شمسی سال میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے کیسہ گری شروع کی گئی، تو ان تین مہینوں میں وقفہ ڈالا جانے لگا اور پہلے دو مہینوں کے بعد ایک غیر محترم لوند کا مہینا بڑھایا جاتا، جس کے بعد پھر محرم کا مہینا آتا۔ اس لوند کے مہینے میں جنگ اور لوٹ مار جائز بھی جاتی تھی۔ یہ ہے کفر میں زیادتی۔ لوند کا مہینا بیچ میں آ جانے سے عموماً تیسرے برس قمری سال کے اور لوند والے سال کے مہینوں میں ایک ایک مہینے کا فرق پڑتا اور یہ فرق بڑھتا جاتا، اور پہلے محرم، صفر میں آتا ہے، پھر ربیع الاول میں، پھر ربیع الآخر میں، وغیرہ اور کوئی پینتیس سال میں رفتہ رفتہ پھر دونوں قسم کے سالوں کے مہینے یکساں ہو جاتے۔ حجۃ الوداع کے سال ایسا ہی ہوا تھا۔۔ اور خطبے میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ ”تخلیقِ عالم کے زمانے کی صورت حال مکرر عود کر آئی ہے۔“

(مہینے) کو حلال بنائیں جسے اللہ نے حرام قرار دیا اور اسے حرام بنائیں جسے اس نے حلال قرار دیا ہے۔ اب زمانہ گردش کر کے اسی شکل پر واپس آ گیا ہے جیسا کہ (اسے) اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے دن بنایا تھا۔ مہینوں کی تعداد اللہ کے ہاں، اللہ کی نوشت میں، آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے دن، بارہ مہینے قرار دی گئی۔ ان میں سے چار حرام ہیں۔ تین تو پے در پے ہیں اور ایک منفرد، یعنی ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم نیز مضر قبیلہ والوں کا رجب کا مہینا جو جمادی (الآخر) اور شعبان کے بیچ میں ہوتا ہے۔ کیا میں نے (پیام) پہنچا دیا؟ اے اللہ، تو گواہ رہ۔

وإن عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ثَلَاثَةٌ مِتْوَالِيَاتٌ وَوَاحِدٌ فَرْدٌ: ذُو الْقَعْدَةِ وَذُو الْحِجَّةِ وَمُحَرَّمٌ، وَرَجَبٌ، مُضَرُّ الَّذِي بَيْنَ جُمَادَى وَشُعْبَانَ۔ أَلَا هَلْ بَلَغْتُ؟ اللَّهُمَّ فَاشْهَد۔

اس اصلاح سے بے شمار نفسیاتی، سیاسی اور سماجی فائدے حاصل ہوئے۔ مثلاً:

(۱) مسلمانوں کا اپنا ایک ممتاز سال پیدا ہو گیا جس میں کسی اور کی تقلید کی ضرورت نہ تھی اور اس کا حساب اور شمار اتنا آسان تھا کہ عامی سے عامی شخص بھی اسے سمجھ سکتا تھا۔

(۲) قمری سال چونکہ شمسی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے اس لیے بتیس شمسی سال میں تینتیس قمری سال ہو جاتے ہیں۔ اس طرح (۳۲) سال میں حکومت (۳۳) مرتبہ ٹیکس وصول کر کے رعایا ہی کے فائدے کے لیے خرچ کرنے کی گنجائش پاتی ہے۔ زراعتی لگان کو کٹائی کے زمانے سے، اور دیگر محاصل کو کسی مہینے سے متعلق کرنے کے ذریعے سے کسانوں کی دشواری کو عہد نبوی ہی میں حل کر دیا گیا تھا۔

(۳) رمضان کے روزے اگر ہمیشہ ایک ہی موسم میں آئیں تو بعض ملکوں میں افراد کو ہمیشہ زحمت اور بعض ملکوں میں ہمیشہ آسانی رہتی ہے (مثلاً خط استواء پر سردی کا موسم خوشگوار ہوتا ہے تو قطبی علاقوں میں سخت مشقت کا) روزے کے ذریعے

سے فوجی اغراض کے لیے بھوک پیاس کو برداشت کرنے کی عادت ڈالنا اگر وقتاً فوقتاً موسموں کی تبدیلی کے ساتھ ہو (جیسا کہ قمری سال میں ہوتا ہے) تو زیادہ مفید ہے اور اس سے کسی ملک کے لوگوں کو شکایت بھی نہیں ہوگی۔ یہی بات حج پر بھی صادق آتی ہے۔

(۴) تاریخ بتاتی ہے کہ شمسی سال کا حساب آسان نہیں ہے؟ چنانچہ اس کی غلطیوں کو بار بار درست کرنا پڑا۔ مثلاً اسکندری (سلوٹی) سنہ کے اصول کو جو ۳۱۲ ق م میں شروع ہوا تھا، جولیس سیزر نے ۴۶ ق م میں بدلا اور اعتدال صیفی (Equinox) کو پرانی جگہ سے ہٹا کر ۲۵ مارچ کو مقرر کر دیا۔ اس میں بھی غلطی تھی اور پادریوں کے اجتماع یقیہ (ازنیق) میں ۳۲۵ء ایک نیا اصول حساب شماری کا مقرر کر کے اعتدال صیفی ۱۲ مارچ کو مقرر ہوا۔ لیکن اس میں بھی غلطی تھی، اس لیے پوپ تیرھویں گریگوری نے ۱۵۸۲ء میں حکم دیا کہ اکتوبر کی چوتھی کے بعد کا دن پانچ نہیں بلکہ پندرہ اکتوبر خیال کیا جائے (تاکہ دس دن کی غلطی دور کی جا سکے)۔ لطیفہ یہ ہے کہ عرصے تک یورپی لوگ خیال کرتے رہے کہ پوپ نے ان کی عمروں میں سے دس دن چرا لیے ہیں۔ موجودہ مروجہ یعنی گریگوری حساب بھی خامیوں کا حامل ہے، زمین کی گردش ست نہ بھی پڑی (اور روشنی ہیئت دان بیان کر رہے ہیں کہ وہ روز بروز ست پڑتی جا رہی ہے اور سیکنڈوں کا فرق پیدا ہو گیا ہے) تو بھی کچھ عرصے بعد لازماً مزید ایک دن حساب سے حذف کرنا پڑے گا۔

یہ ساری دردسری ہجری حساب کے قمری سال میں بالکل نہیں پائی جاتی۔ قمری سنہ میں پیچیدگی ہے تو یہ کہ چاند کی رویت مشرقی اور مغربی ملکوں میں، نیز شمالی اور جنوبی ملکوں میں بعض وقت ایک ایک دن کے فرق سے ہوتی ہے۔ اس کا اثر عملاً اس پر ہوتا ہے کہ عید کی تعطیل کس دن دی جائے۔ مثلاً یہ ممکن ہے کہ مغربی پاکستان میں چاند ہو اور مشرقی پاکستان ۱ میں نہ ہو۔ اسی طرح کسی واقعے، ولادت، وفات وغیرہ پہ ۱ موجودہ بلکہ دیش (مرتب)۔

تاریخ کے ساتھ دن کا بھی ذکر ہو تو بین الممالک شمار میں بھی فرق ہو سکتا ہے۔
علم تاریخ و واقعات نویسی:

مسلمانوں کے سارے علوم و فنون کی طرح ان کا علم تاریخ بھی قرآن مجید کا رہن منت ہے۔ قرآن میں بکثرت تاریخی اشخاص اور واقعات کا ذکر ہے۔ اس کے اشاروں اور تلمیحوں کی تفصیل و تفسیر نے ایک نیا علم پیدا کر دیا۔ قرآن مجید کے یہ حوالے تخلیق کائنات، اولین انسان (آدم) کی پیدائش، مختلف ملکوں اور قوموں میں بھیجے ہوئے پیغمبروں، مختلف مقاموں کے اچھے یا بُرے بادشاہوں، اور دیگر سبق آموز واقعات و حوادث سے متعلق ہیں۔ قرآنی حوالوں سے لے کر قصص انبیاء کی جو مستقل کتابیں لکھی گئیں، وہ عالمگیر تاریخ کی اولین کتابیں کہی جا سکتی ہیں۔

مجوسی، یہودی، صابی اور عیسائی مشہور قومیں ہیں؛ قرآن میں ان کا بار بار ذکر آیا ہے، اور ان کے نبیوں کا بھی ذکر ہے۔ شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کے صدر مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے بدھ مت کا ذکر بھی قرآن مجید میں پایا ہے۔ ان کا استدلال یوں ہے کہ آغاز اسلام کے وقت دنیا کے جتنے بڑے دین تھے، ان کا قرآن میں ذکر ہونا چاہیے۔ اسی لیے آتش پرست پارسی، ستارہ پرست صابی، بت پرست مشرک اور خدا پرست یہودی اور عیسائی لوگوں کا صراحت سے بار بار ذکر آیا ہے۔ اس زمانے میں بدھ مت بھی ایک بڑا مذہب تھا، پس اس کا ذکر بھی قرآن میں ہونا چاہیے۔ اس تمہید کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن میں ذوالکفل پیغمبر کا ذکر دو بار آیا ہے (سورہ ۲۱، آیت ۸۵ اور سورہ ۳۸ آیت ۲۸ میں) لیکن نام کے سوا کوئی تفصیل نہیں۔ قرآن ہی نہیں حدیث اور عام اسلامی تاریخوں میں بھی ان پیغمبر کے کوئی حالات نہیں ملتے۔ ذوالکفل، ذوالقرنین، ذوالنون نام نہیں لقب ہیں۔ (ذوالنون یعنی مچھلی والا سے مراد حضرت یونس ہیں) ذوالکفل کے معنی ہیں کفل والا۔ مولانا مرحوم کا گمان ہے کہ یہ ”کفل“ اصل میں کپل وستو کا معرب ہے جو گوتم بدھ کا وطن ہے۔ کفل کے معنی عربی

میں روزگار اور پرورش کے بھی ہیں (کفالت کا لفظ اسی سے نکلا ہے) اور فرانسیسی مستشرق فلیوزا Filiozal نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ گوتم بدھ کے والد کا نام سندھ دن تھا (یعنی پاک روزگار)۔ اس لفظ سے بھی ذوالکفل کو تعلق ہو سکتا ہے۔ مولانا مناظر احسن مرحوم نے ایک دوسرا حوالہ بدھ مت سے متعلق قرآن کی سورت (۹۵) میں بھی پایا ہے۔ اس سورت کا عنوان ہے ”تین“ (یعنی انجیر)، اور اس کی ابتدائی آیتیں یوں شروع ہوتی ہیں: قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی، اور سینا پہاڑ کی، اور اس محفوظ شہر کی.....“ سارے مفسر متفق ہیں کہ اس میں چار پیغمبروں کا ذکر ہے: اس محفوظ شہر سے مراد مکہ معظمہ اور حضرت محمدؐ ہیں، سینا پہاڑ نہر سویز کے جنوب مشرق میں معروف ہے اور یہیں حضرت موسیٰؑ کو خدا کی تجلی اور توریت کی وحی ہوئی تھی، جبل زیتون بیت المقدس میں ہے اور اس سے اشارہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف ہے۔ اب رہ گیا لفظ انجیر: اس کے بارے میں کوئی تشفی بخش جواب مفسروں کو نہیں ملا اور ان میں اختلاف رائے ہے۔ بعض لوگ اس سے حضرت ابراہیمؑ مراد لیتے ہیں؛ لیکن حضرت ابراہیمؑ کی سوانح عمری میں انجیر کو کوئی خاص اہمیت نہیں رہی ہے۔ مولانا مناظر احسن مرحوم یاد دلاتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے برخلاف گوتم بدھ کی زندگی میں انجیر کو خاص دخل ہے، اور انہیں عرفان جنگلی انجیر ہی کے درخت کے نیچے حاصل ہوا تھا۔ اسی اصل درخت کی شاخ کو سیلون میں لیجا کر بویا گیا تھا، اور آج تک وہاں یہ پرانا درخت بدھ مت والوں کے ہاں انتہائی احترام سے دیکھا جاتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مدرس اردو ڈاکٹر ثریا سلطانہ بیگم نے گار سین دُتاسی کے حالات پر ڈاکٹریٹ کا جو مقالہ فرانسیسی میں لکھا ہے، اس میں انہوں نے یاد دلایا ہے کہ امام احمد بن حنبل کی مشہور کتاب المسند (۲۰۶:۶) میں اس کی صراحت ہے کہ بعثت سے قبل پیغمبر اسلام علیہ السلام نے ایک مرتبہ مسقط و عمان کے علاقے کا بھی طویل (تجارتی) سفر فرمایا تھا۔ نیز یہ کہ دائرۃ المعارف (حیدر آباد دکن) کی شائع کردہ کتاب المحرم مولفہ، ابن حبیب (ص ۲۶۵) میں اس کا ذکر ہے کہ علاقہ مسقط و عمان میں ہر سال ایک بہت بڑا میلہ دبا، میں لگتا تھا جس میں سندھ اور ہند اور چین، اور مشرق اور مغرب

کے تاجر بھی آیا کرتے تھے۔ تعجب کا مقام نہیں: اگر حضرت محمدؐ نے وہاں چینی تاجروں کو بھی دیکھا ہو۔ جن کی ہنرمندی کی تعریف آپؐ نے اپنے اس مشہور قول میں فرمائی ہے:

اطلبوا العلم ولو بالصّین

علم سیکھو، چاہے اس کے لیے چین (جیسے دور دراز ملک) ہی کو جانا پڑے۔

اس زمانے میں چین میں بدھ مت کا رواج ہو چلا تھا۔ ان حالات میں مولانا

مناظر احسن مرحوم کا استنباط کافی وقع ہو جاتا ہے۔

عالمگیریت:

قدیم زمانے میں ہر مورخ عام طور پر اپنی قوم اور اپنے ملک کے حالات پر اکتفا کرتا تھا۔ ارسطوؒ نے ذرا بھی شرمائے بغیر لکھا ہے کہ غیر یونانی قومیں پیدا ہی اس لیے ہوئی ہیں کہ یونانیوں کے غلام رہیں۔ توریت میں حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب کتاب میں حکم ہے کہ غیر یہودی لوگ اگر لڑے بھڑے بغیر اطاعت کر لیں تو انہیں بطور غلام و خدمتگار زندہ رہنے دیا جائیگا، ورنہ ان کے مرد قتل کر دیے جائیں گے اور عورت بچے غلام بنا لیے جائیں گے (۱۷)۔ اور حضرت اشموئیلؑ کی طرف منسوب کتاب میں ہے کہ مقابلہ یا مدافعت کرنے والے دشمن کے مرد، عورت، دودھ پیتے بچے، اونٹ، گدھے، ہر جاندار چیز کو قتل اور نابود کر دینا چاہیے (۱۸)۔ توریت میں خدا کا لقب بھی عام طور پر ”بنی اسرائیل کا رب“ دیا جاتا ہے۔ جاپانیوں کے پرانے تصور میں تو ان کے ملک کے جزیروں کے سوا دنیا میں کسی اور علاقے کا وجود بھی نہیں۔ جاہلیت کے زمانے میں ایام العرب کے نام سے جو قبائلی کہانیاں پائی جاتی تھیں، وہ بھی عربی علاقوں کی مقامی تاریخیں تھیں۔ غرض عالمگیریت کہیں بھی نہیں ملتی۔

قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت ہے: ”الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ (تعریف اس خدا کے لیے جو سارے عالموں کا آقا ہے)، اس عالم کا بھی جس سے ہم واقف ہیں، اور ان دوسرے عالموں کا بھی جن سے ہمیں واقفیت نہیں ہے۔ اسی طرح

(۱۷) توریت، کتاب شنیہ باب (۲۰) جلد (۱۵: ۱۰)

(۱۸) توریت، کتاب اشموئیل اول، باب (۱۵) جلد (۳)

پیغمبر اسلام ایک مخصوص گھرانے کے لوگوں کے لیے، ایک مخصوص ملک یا مخصوص وقت کے لیے نہیں، بلکہ سارے انسانوں کے لیے (كَافَّةً لِلنَّاسِ) اور ابدی و آخری تعلیم کے ساتھ (خَاتَمُ النَّبِيِّينَ) ہیں۔ ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی تعلیم کے ماننے والوں کا نقطہ نظر بھی عالمگیر ہی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں کئی بار لکھا ہے کہ خدا نے ہر زمانے اور ہر ملک میں ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجے ہیں۔ اور یہ کہ بعض کا ذکر قرآن میں ہے، تو بعض کا نہیں (۱۹) لیکن تھے سب خدا کے بھیجے ہوئے۔ اور خدا کا پیغام رساں کی حیثیت سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اسی لیے مسلمانوں کے ہاں مؤرخ کا فریضہ بھی عالمگیر تاریخ لکھنا، اور اس بڑے چوکھٹے میں اسلام کو بھی جڑنا قرار پایا۔ ہمارے زمانے میں پروفیسر ہاشمی (لندن) کے وسائل زیادہ ہیں۔ لیکن اب سے تیرہ سو برس پہلے مؤرخ ابن اسحاق (ف ۱۵۱ھ) کی اہمیت گھٹ نہیں جاتی، جس نے خلیفہ منصور کے حکم سے ولی عہد مہدی کے لیے ایک ضخیم کتاب ”الابتداء والمبعث“ لکھی جس میں تخلیق عالم سے لے کر خلیفہ منصور کے زمانے تک کے تاریخی حالات تھے۔ اس کے بعد طبری اور مسعودی نے اپنے اپنے وسائل سے دنیا کی ساری مشہور قوموں کے حالات لکھے۔ البیرونی کا نام بھی کتاب الہند اور الآثار الباقیہ وغیرہ کے باعث ممتاز ہے۔ سب سے اہم شاید رشید الدین خان کی جامع التواریخ ہے جس میں پیغمبروں کے حالات بھی ہیں، بادشاہوں کے بھی، خلفاء اسلام کے بھی، پوپوں کے بھی، ہند، چین، منگولیا، روم، قسطنطنیہ، غرض بکثرت علاقوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور وہاں کے حکمرانوں کی تصویریں بھی دی ہیں۔ اس کے حصہ چین کا میں نے ایک مرتبہ اپنے ایک جرمن استاد کے لیے ترجمہ کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اولاً چین سے وہاں کی دو مستند تاریخیں منگائی گئیں اور چند چینی مؤرخ بھی مہمان بلائے گئے اور درباری مترجموں کی مدد سے ان کتابوں کا ترجمہ کروا کر جامع التواریخ کا یہ حصہ مرتب کیا گیا۔ اس کتاب کا حصہ ہند اب ہالینڈ کے پروفیسر کارل یان (K. John) نے شائع کر دیا ہے۔

(۱۹) مثلاً قرآن، ۱۶۳:۴، نیز ۸۰:۴ وغیرہ

شاہی دلچسپی اور سرپرستی:

عہد صحابہ ہی میں نہ صرف مسلمان مؤرخ پیدا ہو گئے تھے۔ (مثلاً حضرت علی کے بھائی عقیل بن ابی طالب جو مسجد نبوی میں مغازی کا درس دیا کرتے تھے، یا زیاد بن ابیہ جو کتاب الثالب کے مؤلف ہیں)۔۔۔ بلکہ خود حکمران بھی اس علم میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ چنانچہ خلیفہ معاویہؓ نے یمن کے مشہور فاضل عبید بن شریہ سے قدیم عرب کے حالات پر کتابیں لکھوائیں۔ دیگر ماہروں سے بھی کام لیا جس کا سبق آموز تذکرہ مسعودی نے مروج الذهب میں یوں کیا ہے:

كان من أخلاق معاوية أنه كان يأذن في اليوم والليلة خمس مرأت- كان اذا صلى الفجر جلس للقاص حتى يفرغ من قصصه ثم يدخل فيوتى بمصلى فيقرأ جزءاً- ثم يدخل إلى منزله فيأمره ينهى- ثم يصلى أربع ركعات ثم يخرج إلى مجلسه فيأذن الخاصة الخاصة فيحد ثم ويحد ثونه- ويدخل عليه وزراؤه فيكلمونه فيما يريدون من يومهم إلى العشي- ثم يؤتى بالغداء الاصغر- ثم يخرج فيقول: يا غلام أخرج الكرسي- فيوضع فيسند ظهره إلى المقصورة ويجلس على كرسي ويقوم الأحداث -

معاویہ کی عادت تھی کہ (ملاقاتیوں کو) دن اور رات میں پانچ مرتبہ اجازت دیتے تھے۔ چنانچہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد بیٹھتے تا آنکہ واعظ اپنے وعظ سے فارغ ہوتا۔ پھر اندر جاتے اور ان کا قرآن لایا جاتا اس کا ایک جزء پڑھتے۔ پھر اپنے رہنے کے کمرے میں جاتے اور احکام دیتے یا ممانعتیں کرتے پھر چار رکعت (نفل) نماز پڑھتے پھر نکل کر اپنے بیٹھنے کے کمرے میں آتے جہاں خاص الخاص لوگوں کو آنے کی اجازت دی جاتی۔ ان سے بات چیت ہوتی اور وزراء (مددگار) بھی آتے اور دن بھر کی ضرورتوں پر گفتگو کرتے۔ پھر چھوٹا ناشتا لایا جاتا..... پھر دیر تک گفتگو ہوتی رہتی۔ پھر جب چاہتے اپنے رہنے کے کمرے میں چلے جاتے۔ اس کے بعد جب نکلتے تو (نوکر سے) کہتے: لڑکے کرسی لا۔ وہ رکھی جاتی اور وہ (مسجد میں) مقصورے کی طرف پیٹھ کر کے کرسی پر بیٹھتے اور مقدمے پیش ہوتے۔

غریب آدمی ہو کہ خانہ بدوش بدوی، بچہ ہو کہ عورت یا کوئی اور بے یار و مددگار، ہر کوئی آسکتا۔ کوئی کہتا مجھ پر ظلم ہوا ہے، تو فرماتے اس کی مدد کرو۔ کوئی کہتا مجھ پر تعدی ہوئی ہے، تو فرماتے اس کے ساتھ (مدد کے لیے پولیس) بھیجو۔ کوئی کہتا میرے ساتھ یوں ہوا ہے، تو فرماتے اس کے معاملے کو دیکھو۔ پھر جب کوئی (شکایتی) باقی نہ رہتا تو اندر جاتے اور تخت پر بیٹھتے۔ اور فرماتے: قدر و منزلت رکھنے والے لوگوں کو آنے کی اجازت دو، لیکن وہ مجھے سلاموں کا جواب دینے میں مشغول نہ کریں پھر جب سب ٹھیک بیٹھ جاتے تو فرماتے: تم شریف اسی لیے کہلاتے ہو کہ اوروں کے برخلاف تمہیں یہاں بیٹھنے کا شرف حاصل ہے اس لیے جو لوگ ہم تک پہنچ نہیں سکتے ان کی حاجتیں ہم تک پہنچاؤ۔ اس پر کوئی اٹھ کر مثلاً کہتا پھر ناشتا لایا جاتا اور کاتب (سکرٹری) حاضر رہتا وہ دو تین لقمے کھاتے اور اس اثنا میں کاتب مراسلے پڑھتا رہتا، اور وہ مناسب احکام صادر فرماتے بعض اوقات اس ناشتے پر چالیس یا اس کے لگ بھگ اہل حاجت موجود رہتے۔ پھر ناشتا اٹھا لیا جاتا۔ اور لوگوں سے کہا جاتا کہ جا سکتے ہو۔ وہ چلے جاتے۔ پھر وہ اپنے رہنے کے کمرے میں جاتے جس کے بعد کسی کو ملنے کی جرأت نہ ہوتی۔ پھر جب ظہر کی اذان

فیقوم الیہ الضعیف والأعرابی والصی والمرأة ومن لا أحد له فيقول: ظلمت۔ فيقول: أعزوه ويقول: عدی علی فيقول: ابعثوا معه ويقول: صنع بی فيقول، انظروا فی أمره حتی اذالم یبق أحد دخل فجلس علی السریر۔ ثم يقول: أئذنوا للناس علی قدر منازلهم؛ ولا یشغلنی أحد عن رد السلام..... فأذاستوا جلوسا قال: یا هؤلاء انما سمیتم أشرفا لانکم شرفتم من دونکم بهذا المجلس؛ ارفعوا الینا حوائج من لا یصل الینا۔ فیقوم الرجل فيقول..... ثم یؤتی بالغداء ویحضر الکاتب فیأکل لقمתיں أو ثلاثاً والکاتب یقرأ کتابه فیأمر فیہ بأمره وربما قدم علیہ من أصحاب الحوائج أربعون أو نحوهم علی قدر الغداء۔ ثم یرفع الغداء ویقال للناس، اجیزوا۔ فیتصرفون۔ فیدخل منزله فلا یطعم فیہ طامع حتی

ینادی بالظہر۔ فیخرج فیصلی۔
 ثم یدخل فیصلی اربع
 رکعات، ثم یجلس فیاء ذن
 لخاصة الخاصة [للاکل]
 ویدخل الیہ وزراؤه فیؤامر ونہ
 فیما احتجوا الیہ بقیة یومہم۔
 ویجلس الی العصر۔ ثم یخرج
 فیصلی العصر وینادی
 بالمغرب فیخرج فیصلیہا ثم
 یصلی بعدہا اربع رکعات ثم
 یدخل منزله فلا یطعم فیہ طامع
 حتی وینادی بالعشاء الآخرة
 فیخرج فیصلی ثم یؤذن
 للخاصة، وخاصة الخاصة،
 والوزراء والحاشیة۔ فیؤامرہ
 الوزراء فیما أرادوا صدراً من
 لیلتہم ویستمرّ الی ثلث اللیل
 فی اخبار العرب وایامہا،
 والعجم وملوکہا وسیاستہا
 لرعیتہا، وسائر ملوک الامم و
 حروبہا ومکائدہا، وسیاستہا
 لرعیتہا وغیر ذلک الامم
 السالفة ثم تأتئہ الطرف الغربیة
 من عند نسانہ من الحلوی

ہوتی، تو نکلے اور نماز پڑھتے۔ پھر اندر جا کر چار
 رکعت (سنت) پڑھتے پھر خاص الخاص لوگوں
 کے ساتھ بیٹھ کر (کھانا کھاتے..... اور وزیر
 (مددگار) آتے اور دن کے باقی حصے کے لیے
 ضروری چیزوں سے متعلق مشورے ہوتے اور عصر
 کے وقت تک بیٹھے رہتے۔ پھر باہر نکلتے اور عصر کی
 نماز پڑھتے۔ پھر جب مغرب کی اذان ہوتی تو
 باہر نکلتے اور مغرب کی نماز پڑھتے جس کے بعد
 چار رکعت (سنت) بھی پڑھتے پھر اپنے رہنے
 کے کمرے میں جاتے جس کے بعد کسی کو ملنے کی
 جرأت نہ ہوتی۔ پھر جب عشاء کی اذان ہوتی تو
 نکلتے اور عشاء کی نماز پڑھتے۔ پھر خاص، اور خاص
 الخاص لوگوں اور وزیروں اور حاشیے کے (مقرب)
 لوگوں کو آنے کی اجازت دی جاتی۔ اور وزیروں
 سے رات کے ابتدائی حصے کے لیے مشورت ہوتی
 رہتی پھر ایک تہائی رات گئے تک قدیم عرب کے
 حالات اور مشہور جنگوں، عجم (ایران) کے حالات
 پر اور وہاں کے بادشاہوں کا اپنی رعایا سے برتاؤ،
 دیگر ممالک کے بادشاہوں اور ان کی جنگوں اور
 ان کے (دشمنوں کے ساتھ) مکاریاں اور اپنی
 رعایا کے ساتھ برتاؤ وغیرہ کو (سننے) جو زمانہ
 سابق کی قوموں سے متعلق ہے۔ پھر زمانے سے
 نادر چیزیں آتیں مثلاً مٹھائی اور دیگر لطیف
 کھانے۔ پھر اندر جا کر ایک تہائی رات سوتے۔

وغیرہا من الماکل اللطیفۃ ثم یدخل فینام ثلث الدلیل۔ ثم یقوم فیقعد فیحضر الدفاتر فیہا سیرالملوک وأخبارہا والحروب والمکائد فیقراء ذلک علیہ غلمان لہ مرتبون وقد وکلوا بحفظہا وقراءتہا فتمربسمعہ کل لیلۃ جمل من الأخبار والسیر والآثار وأنواع السیاسات ثم یدخرج فیصلی الصبح ثم یعود فیفعل ماو صفنا فی کل یوم۔

پھر اٹھ بیٹھتے اور وہ کتابیں لائی جاتیں جن میں بادشاہوں کا برتاؤ اور حالات اور جنگوں اور (دشمن سے) مکر کا ذکر ہوتا۔ ان کو وہ ملازم پڑھتے جو خاص اس کام کے لیے مامور تھے۔ اور ان کا کام یہی تھا کہ ان (کتابوں) کی رکھوالی کریں اور ان کو پڑھ کر سنائیں۔ اس طرح ہر رات (بادشاہوں کے) برتاؤ اور حالات اور سیاست کے کچھ نہ کچھ حالات سماعت سے گزرتے۔ پھر باہر نکلتے اور صبح (فجر) کی نماز پڑھتے۔ پھر دوبارہ سارا دن اسی طرح کام کرتے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اس اقتباس کے آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ملکوں کے تاریخی حالات پر (عربی میں ترجمہ یا تالیف کے ذریعے سے) کتابیں شاہی استعمال کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔ یہ پیغمبر اسلام کی وفات سے بمشکل تیس سال بعد کے واقعات ہیں۔ اس طرح کی شاہی دلچسپیاں بعد کے زمانے میں بھی برقرار رہیں۔

واقعات کی صحت:

قدیم زمانے میں تاریخ کا مقصد اپنی قوم کے مشہور کارناموں کو تعریف و توصیف سے بیان کرنا ہوتا تھا، اور مؤرخ اکثر درباری مقرب اور حکومت کے ملازم ہوتے تھے، اس لیے مبالغہ آرائی جائز ہی نہیں لازم سمجھی جاتی تھی اور تاریخ اور افسانے میں فرق مشکل ہو جاتا تھا۔

واقعات کی صحت کا لحاظ قدیم زمانے میں صرف محکمہ عدالت سے مخصوص تھا اور چشم دید گواہوں کی شہادت کی مدد سے کسی واقعے کو صحیح یا غیر صحیح قرار دینا حاکم عدالت کی ذمہ داری تھی۔ اور اس کا تعلق دو آدمیوں کے جھگڑے سے ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف

تاریخ میں یک طرفہ بیان اور مؤرخ کے ادعا کے سوا اور کوئی ثبوت، کوئی حوالہ شاذ ہی ہوتا تھا۔ کئی سو سال کا عرصہ ہوا، ایٹ انڈیا کمپنی نے مشہور جرمن مستشرق آلویس اشپرنگر کو نکلنے بلایا اور اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے ابن حجر کی کتاب ”الاصابة في أحوال الصحابة“ کو ایڈٹ کیا، جو عہد نبوی کی تاریخ کے چشم دید راویوں کے حالات پر مشتمل ہے، اشپرنگر کو رشک تھا کہ قانون شہادت و ثبوت کا اطلاق تاریخ پر مسلمانوں سے پہلے کسی قوم نے نہ کیا۔ مسلمان مؤلفوں کی لکھی ہوئی تاریخیں ”مستند“ واقعات کا مجموعہ ہوتی ہیں، یعنی پہلے سند بیان ہوتی ہے کہ چشم دید اور برسر موقع حاضر گواہ سے لے کر مؤلف تک واقعے کی نقل نسل بہ نسل کن لوگوں نے کی، پھر چند لفظی یا چند سطری واقعہ بیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسری سند شروع ہوتی ہے، تاکہ کوئی مزید واقعہ بیان ہو۔ اور ساری کتاب اس طرح سیکڑوں بلکہ ہزاروں اسانید کے ساتھ بیان شدہ واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ زمانہ حال کی بہترین تاریخ وہ سمجھی جاتی ہے جس میں ہر واقعہ کا حوالہ دیا جائے، لیکن ہر واقعے کے لیے حوالے کے حوالے جو مؤلف سے لے کر چشم دید شاہد تک بیان ہوں اتنا استیعاب، اتنے مکمل حوالے مسلمانوں کے سوا کسی قوم کے لٹریچر میں نہیں ملتے۔ مسلمانوں کے ہاں وہ تاریخ کم قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے، جس کا مؤلف صرف کتابیات پر اکتفا کرے اور چند راویوں کا نام لے کر پھر یہ کہہ دے کہ ”میں نے ان سب کے بیانات سے بحذف مکررات یہ مربوط تفصیل مرتب کی ہے۔“ اور بعض کے بیانات میں کچھ تفصیل ہے تو دوسروں کے ہاں کچھ اور تفصیل؛ اور یہ نہ بتائے کہ کوئی تفصیل کس ماخذ کی ہے۔

تاریخ کی شاخیں:

سفر ناموں کے ذریعے سے مسلمانوں کے ہاں بین الممالک تاریخ کی روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ جہانگردوں میں ابن جبیر (ف ۶۱۳ھ/ ۱۲۱۷ء) اور ابن بطوطہ (ف ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء) کا نام لینا کافی ہے اگرچہ اس سے کئی صدی پہلے کی کتابیں مثلاً ”اخبار الہند والصین“ بھی موجود ہے۔

شہروں کی تاریخیں بھی کثرت سے لکھی جانے لگیں: بغداد، بصرہ، دمشق، مکہ، مدینہ، سمرقند، نیشاپور وغیرہ۔ ان میں شہر کی عام تاریخ کے علاوہ مشہور شہریوں کے حالات بھی ہوتے ہیں ملک وار اور خانوادہ وار تاریخیں تو ناگزیر ہی تھیں۔

پیشوں کے لحاظ سے بھی سوانح عمریاں لکھی گئیں: قاری، مفسر، محدث، فقیہ، قاضی، مورخ، طبیب، فلسفی وغیرہ چونکہ ہر دور میں کثرت سے گزرے ہیں، اس لیے یہ شخص ناگزیر تھا کہ سارے ہم پیشہ مشاہیر کے حالات یکجا لکھے جائیں۔ پھر متاخر مؤلف ان کے تکمیل بھی لکھتے رہے۔

بلا امتیاز، ہر شعبہ حیات کے مشاہیر کے حالات کے مجموعے بھی کثرت سے تیار ہوئے۔ کبھی زمانے کے لحاظ سے کبھی حروف تہجی کے لحاظ سے۔ اول الذکر کبھی سنہ وار رہے اور کبھی صدی وار، سنہ وار میں حروف تہجی کا لحاظ ممکن نہیں؛ صدی وار میں حروف تہجی کی ترتیب ہی عام طور پر ملحوظ رہی ہے۔

چونکہ قانون شہادت کا تاریخ پر بھی اطلاق کیا جانے لگا تھا، اس لیے شروع ہی سے اس کی ضرورت رہی ہے کہ ایسی کتب رجال لکھی جائیں جن میں ہر شخص کے حالات اور اس کی ثقاہت کے ساتھ ساتھ یہ تفصیل بھی ہو کہ اس کے استاد کون کون تھے۔ اور شاگرد کون کون۔ اس سے راویوں کے سلسلوں کی صحت کی جانچ میں آسانی ہوتی ہے۔

نسب نامے بھی اسلام، خاص کر عرب کی تاریخ کی خصوصیت رہے ہیں اور ان سے متعلق بھی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ پیغمبر اسلام نے حکم دیا تھا کہ ہر شخص اپنا نسب نامہ، دو، چار، دس، بیس جتنی پشت تک بھی ممکن ہو، زبانی یاد رکھے۔ خلیفہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ساری رعایا کے لیے بطور روزگار سالانہ وظیفہ مقرر ہوئے تھے۔ اس دیوان میں رجسٹر تیار ہوئے تھے، ہر بچے کا پیدائش کے ساتھ ہی مختصر روزینہ مقرر ہو جاتا، جو عمر کے ساتھ بڑھتا جاتا۔ اس طرح ان رجسٹروں کی ہر وقت نظر ثانی ہوتی رہتی تھی۔ امام محمد شیبانی کے مطابق تو اس کا چھوٹے پیمانے پر آغاز عہد نبوی ہی میں ہو گیا تھا اور فوجی خدمت کے لیے تیار رضا کاروں کے مستقل روزینے مقرر ہو گئے تھے (۲۰) ہجرت

(۲۰) شرح السیر الکبیر للسرحدی، باب (۱۰۵) فقرہ (۱۹۷۸)

کے بعد شہری مملکتِ مدینہ کا جو دستور وضع ہوا، (۲۱) اس کے مطابق سارے مسلمانوں میں قبیلہ داراساس پر نیبے کا انتظام بوجھل ذمہ داریوں کے لیے ہو گیا تھا۔ ان حالات میں نسب ناموں کی تیاری ناگزیر تھی۔ کتب انساب سے لوگوں کی رشتہ داریاں اور نسلی اور نکاحی رشتے وغیرہ معلوم ہوتے ہیں، جن سے بارہا تاریخی واقعات کے اسباب و بواعث کا پتا چلتا ہے۔

فلسفہ تاریخ اور عمرانیات پر صاعد الاندلسی کی ”طبقات الامم“ سے ایک نئے علم کی داغ بیل پڑی، جس کی تکمیل مقدمہ ابن خلدون سے ہوئی، اور اب یہ مستقل علم بن گیا۔ علم تاریخ کو اس منزل تک پہنچانے کا فریضہ مسلمانوں نے سرانجام دیا۔ اس کے بعد مشعل علم مغرب نے تھامی۔ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت۔ لیکن اگلوں اور پچھلوں کی خدمات سے مقابلہ کر کے مسلمانوں کی اس خدمت کا درجہ متعین کرنا، یہ ناظر اورباحث کا کام ہے۔

(ارمغان مالک مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
مجلس ارمغان مالک۔ نئی دہلی ۱۹۷۱ء)

(۲۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: عہد نبوی کا نظام حکمرانی (از ڈاکٹر محمد حیدر اللہ)

فتح مکہ (۸-ھ) کی چودہ سو سالہ یادگار

مضمون کے پس منظر کے طور پر پہلے اس کے ساتھ منسلک
ڈاکٹر صاحب کا گرامی نامہ ملاحظہ ہو۔

”معارف“

۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ

مخدوم و محترم! زاد مجدکم و عم فیہکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
آج فجر کی نماز کے بعد تسبیح کے معمولات میں مشغول تھا کہ
یکا یک کچھ بات یاد آئی۔ قلم برداشتہ لکھ کر روانہ کر رہا ہوں۔ کیا
عجب کہ وہ ۱۴۰۸ھ ہی کے آخری شمارہ میں، مضمون نہیں تو خط ہی
کے طور پر شائع ہو جائے، فرض ادا ہو، قضا کی نوبت نہ آئے۔
واللہ علیٰ مایشاء قدیر۔ حفظکم اللہ و عافاکم۔

الفقیر الی اللہ محمد حمید اللہ

کراچی کے موثر ہفتہ وار انگریزی اخبار ”مسلم ورلڈ“ مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۸۳ء
میں عرض کیا تھا کہ سنہ ہجری کی پہلی دہ سا لگی ختم نبوت سے عبارت ہے اور اس کا لمحہ لمحہ

تاریخ بشری کے لیے حرف آخر اور اسوۂ حسنہ ہے اور یہ بھی گزارش کی تھی کہ ۵ھ کے معرکہ خندق، ۶ھ کے صلح نامہ حدیبیہ، ۷ھ کے غزوہ خندق، ۸ھ کی فتح مکہ اور ۹ھ کے عام الوفود کے واقعات پر چودہ سو (۱۴۰۰) سال گزر رہے ہیں، پھر ۱۰ھ کے حجۃ الوداع اور اکمال دین کا زمانہ آئے گا۔ فرمان الہی ہے کہ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ، کیا ہم تحدیثِ نعمت نہیں کریں گے؟

باری تعالیٰ کی حکمت ہے کہ مجھے فتح مکہ کی یادگار منانے کی یاد بھی دیر سے آرہی ہے، ختم رسالت پر اولین حکم ”اقْرَأْ“ کا ہوا اور سمجھایا بھی گیا: ”عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ“ - ”أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ“ دوسری وحی تھی، الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ تقریباً آخری آیت ہے، اور ”إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ“ الآیۃ آخری سورہ سمجھی جاتی ہے، دیر بھی ہوئی ہے تو مالا یدرک کلمہ لایترک جملہ۔

فتح مکہ کا پس منظر دیکھیں:

حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ ”كنت كنزا مخفيا.....“ اسی کی تصریح و تاکید قرآن نے بھی کی ”مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ خود فرشتوں کے لیے البیت المعمور کی عبادت گاہ مقرر ہوئی اور حَافِئِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ اِس کا طریقہ تھا، غالباً حضرت آدم علیہ السلام بھی جنت میں ویسا ہی کرتے رہے ہوں گے، ان کے ”ظَلُّوْا جَهَنَّمَ“ ہونے کے باوجود لغزش پر توبہ کی، نہ صرف توبہ قبول ہوئی بلکہ ”أَمَانَةٌ“ کے حامل بنے اور موجد ملائک بنائے گئے اور سزا کے طور پر نہیں بلکہ سرفرازی کے طور پر خلیفۃ اللہ فی الارض نامزد ہوئے، خدمت کا جائزہ لینے کے لیے بیوی کے ساتھ زمین کا سفر کیا تو کہتے ہیں کہ بیوی راستہ میں کھو گئیں، زمین پر پہنچ کر تلاش جاری رکھی، تو بالآخر وہ بمقام عرفات مل گئیں۔

زمین پر آسانی زندگی جاری رکھنے کی خواہش ہوئی تو رب العالمین نے انجینئر فرشتے بھیجے، جنہوں نے مکہ معظمہ میں کعبہ کا بیت اللہ تعمیر کیا، جو نبی آدم علیہ السلام کے لیے اولین عبادت گاہ بنا، قطع کلام کریں کہ حکمت باری ہوئی کہ وہ انسان کی نظروں سے

غائب رہے، چونکہ مکان سے مکین بھی فوراً ذہن میں آتا ہے، اس لیے بیت اللہ سے ساکن بیت ذہن میں آتا ہے اور زیادہ باادب طور پر جس میں ساکن بیت کی صورت شکل معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ مورخ روایت کرتے ہیں کہ یہ ”الکعبة البیت الحرام“ عرش کے نیچے کے البیت المعمور کے عین تحت ہے، اس قدر کہ اگر وہاں سے ایک پتھر پھینکا جائے تو وہ کعبہ کی چھت پر گرے، اس میں رمزیہ ہے کہ کعبہ کے بیت اللہ کے پاس جو گویا عرش کی کھڑکی ہے دعاء کریں تو وہ راست عرش تک پہنچ جاتی ہے، کوئی درمیانی واسطوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

غالباً آدم علیہ السلام وحواء کعبہ کے پاس اسی طرح عبادت کرنے لگے ہوں گے جس طرح آسمان پر بیت المعمور کا طواف ہوا کرتا ہے اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی۔

جب طوفان نوح آیا تھا تو روایت ہے کہ اللہ نے کعبہ کو اس کی حرمت کے باعث آسمان پر اٹھا لیا، بہر حال زمین اس سے محروم ہو گئی، بائبل (کتاب پیدائش ۸/۲۰) کی روایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ جب طوفان تھا اور حضرت نوح اور ان کے ہمراہی کشتی سے نکل کر خشک زمین پر آئے تو انہوں نے فوراً ایک عبادت گاہ تعمیر کی، یہ ایک قربان گاہ سے عبارت ہے جہاں چیزیں قربان کی جاتی تھیں۔

اس پر چند ہی نسلیں گزریں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا زمانہ آیا، وہ اچھے لیکن بت پرست گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اللہ نے فضل کیا تو ایک رات یکا یک رب کی تلاش کی سوچھی۔ کوکب (زہرہ) ستارے کو دیکھا تو خیال کیا کہ وہی ان کا رب ہے، تھوڑی ہی دیر میں وہ ڈوب گیا تو اس گمان کو رد کیا، پھر چاند کو رب سمجھا، جب وہ بھی غروب ہو گیا اور سورج نکلا تو اسے رب خیال کیا اور آخر اس کو بھی ترک کرنا پڑا اور وحی نے خدائے واحد رب العالمین کے وجود کی تلقین کی۔ اس سے نہ صرف اطمینان خاطر ہوا بلکہ اس کی زور و شور سے تبلیغ بھی شروع کی، پہلے باپ نے ان کو گھر سے نکالا، پھر بت شکنی کے ”جرم“ پر بادشاہ نے زندہ آگ میں جھونکنے کی سزا دی۔

خدا کی حکمتوں کے کیا کہنے، اس نے انسانوں کو سمجھایا کہ کس طرح ٹھنڈی چیزوں کو مثلاً کھولتا گرم پانی بنائے اور کس طرح گرم چیزوں کو ٹھنڈا کر کے مثلاً برف بنائے،

معلوم ہوتا ہے کہ اہل حران (بابل) نے نادانستہ ایسی لکڑیاں اور ایسی چیزیں آگ بنانے کے لیے جمع کیں جن سے ٹھنڈا شعلہ پیدا ہوا (جواب ہر جگہ انسان بنانے لگا ہے) اور ”يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَيَّ اِنْزَاهِنِيْم“ کا معجزہ مشاہدے میں آیا۔ حضرت ابراہیم بیوی اور بھتیجے حضرت لوط کے ساتھ وطن کو چھوڑ اور بلاد النہرین کو عبور کر کے (عبرانی بن کر) کنعان پہنچے، وہاں بابل کے مطابق اُن دنوں قحط تھا تو آگے بڑھ کر مصر پہنچے، وہاں بیوی حضرت سارہ کے حسن سے بدکار فرعون کے ہاتھوں پتائیں پیش آئیں، لیکن وہ بھی حکمت الہی کا ایک جز تھا، فرعون نے توبہ کر کے اپنی بیٹی حضرت ہاجر کو بطور تحفہ حضرت سارہ کی خدمت گار کے طور پر پیش کیا، مصر سے واپسی پر فلسطین میں مورہ نامی مقام پر عبادت الہی کے لیے ایک قربان گاہ تعمیر کی (کتاب پیدائش ۷-۱۲/۸) پھر آگے بڑھ کر بیت ایل نامی مقام پر ایک نئی عبادت گاہ بنائی، (ایضاً ۱۳/۳) پھر مرے میں بھی یہی کیا، (ایضاً ۱۳/۱۸) کچھ عرصہ بعد تبلیغ دین کو توسیع دینے کے لیے اپنے نوزاد بیٹے اسماعیل اور ان کی ماں ہاجر کو مکہ میں بسایا اور اس بے آب و گیاہ مقام پر صفا و مروہ کی سعی پر اللہ نے زمزم کا چشمہ پیدا کیا، پھر امتحان خلّت کے آخری حصہ میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم ملا۔ (کتاب پیدائش ۲۲/۸) کا یہ جزء صحیح ہو گا کہ حضرت ابراہیم نے بیٹے کو ذبح کرنے کے مقام پر بھی ایک عبادت گاہ کی تعمیر کی کہ احکام الہی کی وہاں تعمیل ہو (یہ منیٰ میں ہوا، ان امتحانوں کے بعد انہیں کعبہ آدم کے مقام کی تلاش اور وہاں نئی عبادت گاہ بیت اللہ کی تعمیر کا حکم ہوا اور اس کے لیے حج کا طریقہ نافذ ہوا جس میں عرفات آدم و حوا بھی شامل ہو گئے، حضرت ہاجر کی سعی صفا و مروہ بھی ذبحِ فرزند کی جگہ جانور کی قربانی اور منیٰ بھی اور طواف کعبہ بھی شامل ہوئے۔

جب خاتم النبیین کا زمانہ آیا تو آپؐ نے بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح کعبہ کی اپنے دست مبارک سے نئی تعمیر کی، حجر اسود اپنے ہاتھ سے نصب فرمایا، اپنے جد کی طرح جلاوطن ہو کر مدینہ بھی گئے اور وہاں دس سال تک خدا کے آخری دین کی تبلیغ کی جو روح اور بدن، دنیا و آخرت سب کی بھلائوں کا جامع تھا، اس کے لیے جو جد و جہد کی وہ مورخ کو ششدر کر دیتی ہے۔ مدینہ میں کوئی مملکت نہیں پائی جاتی تھی۔ اس شہر کے ایک چھوٹے سے حصہ میں

ایک شہری مملکت تائیس کی، اس کا ایک تحریری دستور مدون اور نافذ کیا، چند مربع میل رقبہ کی یہ بستی دس سال بعد ایک مملکت کا دارالسلطنت بنی جو تیس لاکھ مربع کلومیٹر کے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ ہجرت کے وقت کے مٹھی بھر مسلمان حجۃ الوداع کے وقت ایک لاکھ چالیس ہزار حاجی عرفات بھیجتے ہیں (سارے مسلمان غالباً اس وقت پانچ لاکھ سے کم نہ تھے) ہتھیاروں سے کشمکش کو دیکھو تو بدر میں تین سو بارہ کا ساڑھے نو سو سے مقابلہ ہوا، اُحد میں سات سو کا تین ہزار سے، خندق میں چودہ سو کا بارہ ہزار سے، خیبر میں پندرہ سو کا بیس ہزار سے اور فتح اللہ ان کمزوروں کو دیتا ہے۔

خیبر ۷ھ کے بعد ۸ھ میں فتح مکہ ہوئی، اس کو یاد دلا کر اسے ختم کرتا ہوں، ۶ھ میں مشرکین مکہ سے دس سال کے لیے صلح ہوئی، انہوں نے بد عہدی کی اور مسلمان اہل خزاعہ کو نماز پڑھتے وقت قتل کیا، اس سے انتقام لینے کا حکم دیا کہ مدینہ سے کوئی شخص بلا اجازت باہر نہ جائے۔ حلیف قبائل کے سرداروں کو بلا کر کہا کہ ایک بڑی مہم کے لیے اپنے رضا کاروں کے ساتھ تیار رہو، ہم تمہارے علاقہ سے گزرتے وقت تم کو لے لیں گے، پھر مکہ پر حملہ کرنے کے لیے جو مدینہ کے جنوب میں ہے، مدینہ کے شمال، پھر مشرق، مغرب وغیرہ آڑے ترچھے سفر کرتے ہیں اور ایک بڑے صحابی کا بیان ہے کہ کسی کو خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہے ہیں تا آنکہ ہم مکہ کے دامن میں اپنا پڑاؤ ڈالتے ہیں، دشمن سردار ابوسفیان گرفتار کر لیا جاتا ہے، مکہ پر خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر قبضہ ہو جاتا ہے، پھر آپ مشرکین اہل مکہ کو جمع کر کے پوچھتے ہیں کہ مجھ سے کس برتاؤ کی توقع کرتے ہو؟ پھر قتل عام، غلام بنانے، مال لوٹنے کی جگہ فرماتے ہیں: لا تنزیب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ طرفۃ العین میں ان کی کایا پلٹ ہو گئی اور راتوں رات سارا مکہ پورے اخلاص کے ساتھ مسلمان ہو جاتا ہے۔ اسی واقعہ پر اب ۱۲۰۸ھ میں پورے چودہ سو سال گزر رہے ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۸۸ء)

وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں پر بھیجا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

قانون

سیر یا قانون بین الممالک ۱

دو خود مختار سیاسی وحدتوں کے تعلقات جن قواعد کے تحت جاری رہتے ہیں، ان کو مسلمان فقہاء نے (عربی میں) ”سیر“ کا نام دیا تھا (جو ”سیرۃ“ کی جمع اور جس کے معنی طرز عمل اور برتاؤ کے ہیں)۔ قدیم زمانے میں اسے ”قانون بین القبائل“ کا نام دے سکتے تھے۔ پھر شہری مملکتوں کے زمانے میں اسے بین البلدیات کہہ سکتے تھے۔ ایک زمانے میں جب ”قوم“ کا مفہوم سیاسی تھانسی نہیں، بین الاقوام کی اصطلاح کا اس پر اطلاق ہو سکتا تھا۔ اب اسے بین الممالک یا بین الدول کے سوا کوئی اور نام نہیں دے سکتے۔

اس پس منظر سے معلوم ہو گا کہ سیر کا وجود انسانی سماج میں زمانہ ماقبل تاریخ سے ہو چکا ہونا چاہیے۔ لیکن تاریخی نقطہ نظر سے ان ”قواعد“ کے نہیں بلکہ ان ”قواعد کے علم“ کے موجد پہلی اور دوسری صدی ہجری کے مسلمان فقہاء ہیں۔ دو وجوہ سے یہی استنباط کرنا پڑتا ہے۔

(۱) مسلمان ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے علم سیر کے قواعد کا اطلاق عالمگیر کر دیا اور دنیا کی کسی بھی قوم یا مملکت کو اس سے مستثنیٰ نہ رکھا۔ قدیم ترین قوموں میں سے آریائی برہمنوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ان کو ان کے ہم مذہب، ہم زبان اور ہم تمدن مگر ایک دوسرے سے خود مختار برہمنی مملکتوں میں تو باہمی جنگ و امن کے تعلقات معینہ قواعد کے

۱۔ یہ مقالہ بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے لیے پیرس سے آیا تھا (مدیر)

تحت رہیں گے۔ لیکن باقی دنیا کو جسے ملیچھ کا نام دیا گیا تھا، اچھوت قرار دے کر منوسمرتی وغیرہ کے تحت جانوروں سے بھی بدتر درجے تک پہنچا دیا گیا تھا ان بے چارے مفتوحوں کا سایہ بھی کسی برہمنی مذہب والے پر پڑ جائے تو اسے نہانے کی ضرورت ہو۔ ان سے برتاؤ میں صرف صوابدید کی ہر آن بدل سکنے والی چیز پر عمل تھا۔ (۲) بنی اسرائیل کو توریت نے یہ تعلیم دی کہ جس اجنبی شہر کے سامنے وہ پہنچیں اور وہ خوشی سے اطاعت کرے تو وہاں والوں کو جان کی تو امان رہے گی لیکن وہ بنی اسرائیل کے غلام اور خدمت گار بنیں گے اور اگر مقابلے کے بعد وہ مغلوب ہو تو وہاں والوں میں سے مقاتلوں کو قتل، عورتوں، بچوں کو غلام اور مال و متاع کو غنیمت بنایا جائے گا۔ اس ”رعایت“ سے بھی عمالقہ قبائل (جو فلسطین کے عربی النسل باشندے تھے) مستثنیٰ تھے۔ ان میں سے کسی ذی روح کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ عورت مرد ہی نہیں دودھ پیتا بچہ بھی بلکہ اونٹ بکری، بیل اور گدھا تک قتل کر دیا جائے۔ (دیکھو توریت میں کتاب ثثنیہ نیز اشموئیل پیغمبر کی کتاب اول)۔ (۳) یونانی تصور ارسطو طالیس وغیرہ کے مطابق یہ تھا۔ جزیرہ نمائے یونان میں بسنے والی ہم مذہب، ہم زبان اور ہم تمدن یونانی شہری مملکتوں میں تو باہمی جنگ امن میں معینہ قواعد کا اطلاق ہوگا۔ باقی دنیا کے لیے جسے برابر (یعنی برابریت پسند) کا نام دیا گیا تھا، کوئی حق نہیں پایا جاتا تھا ”فطرت نے انہیں یونانیوں کا غلام بننے کے لیے پیدا کیا ہے“ اور ان کے متعلق یونانی اپنی صوابدید پر جو چاہے عمل کر سکتا ہے۔ (۴) رومی دور میں نسلی تنگ نظری سے تو نجات ملی لیکن دنیا کو تین حصوں میں بانٹا گیا۔ رومی سلطنت اور دوست اور حلیف ممالک اور باقی دنیا۔ حلیفوں کے ساتھ حالت امن میں تو معین قواعد کے مطابق سلوک ہوتا لیکن باقی اجنبی ممالک نیز سابق حلیف ملک سے جنگ کی صورت میں سوائے صوابدید کے کوئی معین قواعد نہ تھے۔ (۵) یورپ اور امریکہ میں ۱۸۵۶ء تک قانون ”مین ایکسین“ پر عمل تھا اور کسی غیر عیسائی کے لیے کوئی ”حق“ نہیں تسلیم کیا جاتا تھا۔ پوپ جو تھے نکولاس کے مطابق تو کسی غیر عیسائی کو دیے ہوئے قول کی پابندی مذہبی نقطہ نظر سے کسی عیسائی پر واجب نہیں بلکہ عہد شکنی ہی بہتر ہے۔ ۱۸۵۶ء میں پیرس کانگریس میں جب ترکی سے ایک معاہدہ کرنا پڑا

تو مجبوراً یہ قرار دیا گیا کہ مغربی قانون بین الملک کے اصول و احکام کا اطلاق ترکی پر بھی مساوات کے اصول پر ہوگا۔ اس تاریخ کے بعد رفتہ رفتہ جاپان وغیرہ غیر عیسائی ممالک صریح معاہدوں کے ذریعے متمدن کے زمرے میں داخل کیے جاتے رہے۔ حالیہ جنگ عظیم تک یہ اصول رہا کہ ”متمدن“ ممالک میں آپس کے برتاؤ میں تو قواعد معین ہوں گے لیکن غیر متمدن سے، جس سے مراد عملاً یہ تھا کہ جو استعمار پرست مغربی حملہ آوروں کے خلاف اپنی مدافعت کے قابل نہ ہو، سوائے صوابدید کے کسی اور اصول پر عمل کی ضرورت نہیں۔ اب مجلس اقوام متحدہ میں اصول یہ ہے کہ جس جدید امیدوار کو اقوام متحدہ کے موجود الوقت ارکان اپنی اکثریت سے قبول کریں اور اس کی مجلس تحفظ کا کوئی مستقل رکن اس کے خلاف نہ ہو تو اسے اقوام متحدہ کا رکن بنایا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں۔ بہر حال مغرب میں اب تک کسی ملک کو اس کے اپنے حق کی بنا پر ”متمدن“ تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ یہ فریق ثانی کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس کے برخلاف چودہ سو برس ہوئے اسلام نے اپنے آغاز ہی سے یہ اصول قرار دیا کہ ساری غیر مسلم یعنی اجنبی دنیا کے ساتھ برتاؤ کے قواعد معین ہیں۔ صوابدید یا اصول شکنی کی کسی صورت میں اجازت نہیں۔

(۲) مسلمانوں سے قبل مختلف قوموں میں اجنبیوں سے جنگ و امن کے برتاؤ کا ذکر تو ملتا ہے لیکن یہ برتاؤ علم سیاست کا جزو تھا اور نصیحت الملوک یا شہزادوں کی درسی کتابوں میں ان سے بحث ہوتی تھی۔ قانون کی کتابوں میں نہیں۔ بین الملک تعلقات کے قواعد کا ذکر میرے علم میں اسلام سے پہلے مستقل علم کے طور پر کبھی نہیں ہوا۔ مسلمانوں نے یا تو اس پر خصوصی کتابیں لکھیں یا ان کو قانون (فقہ) کی کتابوں میں ایک باب کے طور پر درج کیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ قواعد اسلامی قانون کا جزو تھے۔ مسلمان حاکم کی صوابدید کا مسئلہ نہیں۔ غرض مسلمانوں نے اسے قانون بھی بنایا۔ بین الملک و عالمگیر اور ایک مستقل علم بھی۔

آغاز:

یہ کہنا تو دشوار ہے کہ سب سے پہلے کس مسلمان فقیہ نے علم سیر سے بحث کی۔ صحابہ کرام کو چھوڑ بھی دیں تو علقمہ خنی، ابراہیم خنی، حماد، ابن سیرین وغیرہ کی کتابیں اس

نہیں ملتیں۔ زید بن علی زین العابدین کی وفات ۱۲۰ھ میں ہوئی (۱۲۲ھ بھی بیان کی جاتی ہے) ان کی کتاب ”المجموع فی الفقہ“ البتہ مل گئی اور چھپ گئی ہے۔ اس میں کتاب السیر کے عنوان سے ایک خاصا طویل باب ہے اور مسلمانوں کی خانہ جنگیوں ہی سے نہیں بلکہ اجنبی غیر مسلم ممالک سے جنگ اور صلح کے قواعد سے بحث کرتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ انہی کے ہم عصر تھے، معتقد اور شاگرد بھی کہے جاسکتے ہیں۔ بنی امیہ کے آخری حکمرانوں کی سنگری سے عاجز ہو کر انہوں نے دامے درمے خنہ قلمی انقلاب کی مدد کی۔ چنانچہ زید بن علی کی مسلح کوشش کے وقت انہوں نے بڑی رقم کا چندہ بھی دیا تھا۔ معلوم نہیں ٹھیک کس تاریخ کو بہر حال بروایت ابن حجر انہوں نے ایک مستقل ”کتاب السیر“ لکھی، جس میں علاوہ اور قواعد جنگ و امن کے، اس نکتے سے بحث تھی کہ ”لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق“ (حدیث: خالق کی نافرمانی کے لیے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔) یعنی بغاوت شرعی نقطہ نظر سے کب جائز ہے؟ اس خطیر علمی رائے زنی یا فتویٰ پر بڑا ہنگامہ مچا۔ ایک طرف تو امام ابو حنیفہ کو عراق چھوڑ کر حرم حجاز میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ دوسرے ان کی کتاب کی کئی لوگوں نے تردید لکھی۔ امام اوزاعی کی کتاب اس بارے میں سب سے مشہور ہے۔ امام مالک کی ”کتاب السیر“ بھی ایسی ہی ہونی چاہیے۔ کیونکہ لکھا ہے کہ بعض وقت عشاء کی نماز کے بعد سے فجر کی نماز تک دونوں اماموں میں مسجد نبوی میں علمی مباحثہ ہوتا رہا۔ امام مالک کی کتاب اب لاپتا ہے لیکن امام اوزاعی کی کتاب کے نہ صرف اقتباسات ملتے ہیں بلکہ اس کا جواب جو امام ابو یوسف نے ”الرد علی سیر الاوزاعی“ کے نام سے لکھا تھا، وہ موجود ہے اور چھپ بھی چکا ہے۔ ان سب کے بعد امام شافعیؒ کا زمانہ آیا اور عباسی دور میں انہوں نے اپنی کتاب الامام میں اس مباحثے پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ اولاً ابو حنیفہ کی رائے نقل کرتے ہیں پھر اس پر اوزاعی کی تنقید پھر ابو یوسف کا جواب اور آخر میں اپنی ذاتی رائے دیتے ہیں۔ اور مسئلہ بہ مسئلہ سارے اقتباسات یا اختلافی مباحث اس طرح درج کرتے ہیں۔

اس دور کے بعد ہمیں سیر پر دو طرح کا مواد ملتا ہے۔ ایک تو مستقل کتابیں مثلاً

امام محمد کی ”کتاب السیر الصغیر“ اور ”کتاب السیر الکبیر“ - مذکورہ بالا ائمہ کے علاوہ زفر، ابراہیم الفزاری، واقدی وغیرہ بھی اس موضوع پر کتابیں لکھتے ہیں اور اب فزاری کی کتاب کے ٹکڑے اور واقدی کے اقتباسات ملتے ہیں۔

دوسرے فقہ کی عام کتابوں میں کتاب السیر کے عنوان سے ہمیشہ ایک مستقل باب قانون بین الممالک کے متعلق نظر آتا ہے: سنی کتابوں میں بھی شیعہ اور خارجی کتابوں میں بھی۔ اور جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا اس صورت حال کو بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان بین الممالک تعلقات کے قواعد کو اپنے قانون ملک کا جزو سمجھتے ہیں، محض صوابدید کی چیز نہیں جو حکمران اور سپہ سالار اپنی مرضی سے بدل سکیں۔ اور جب کوئی چیز قانون ملک کا جزو ہوتی ہے تو اس کی خلاف ورزی پر عدالت اور قاضی کے ہاں فریاد کی جاسکتی اور داد چاہی جاسکتی ہے، چاہے مظلوم دشمن اجنبی ہی کیوں نہ ہو قانون بین الممالک کا اتنا بلند تصور مغرب میں آج تک نہیں آسکا ہے۔

اسلامی قانون بین الممالک کی ایک واقعاتی اہمیت یہ ہے کہ مسلمان چونکہ بحر الکاہل (Pacific) سے بحر الظلمات (Atlantic) تک صدیوں حکمران رہے اور تین براعظموں پر اپنے بے شمار غیر مسلم ہمسایوں سے برتاؤ میں انہی قواعد پر عمل کرتے رہے، اس لیے قوانین کا باہمی تاثر ناگزیر تھا۔ اسلامی قانون چونکہ زیادہ ترقی یافتہ اور انسانیت پرور تھا اس لیے اس کی تاثیر بھی زیادہ رہی۔ میں نے اپنی حقیر انگریزی تالیف (MUSLIM CONDUCT OF STATE) میں ایک مفصل باب میں اس سے بحث کی ہے کہ جدید مغربی قانون بین الممالک کس حد تک اسلامی قانون اور مسلمانوں کے طرز عمل سے ماخوذ اور متاثر ہے۔ یہاں اس اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔

مندرجات:

قانون بین الممالک کی اب دو بڑی قسمیں ہو گئی ہیں: عمومی اور خصوصی۔ عمومی میں ان قواعد سے بحث ہوتی ہے جن کے تحت ایک حکومت کے تعلقات دوسری حکومت اور اس کی رعایا سے جنگ اور امن میں جاری رہتے ہیں۔ خصوصی میں اجنبی رعایا کے

تعلقات مسلمان رعایا کے ساتھ بتائے جاتے ہیں۔ اس آخر الذکر کو عباسی دور کے فقہاء نے تہارج کا نام دیا تھا۔ اسے آج کل تصادم قوانین (CONFLICT OF LAWS) کا نام بھی دیا جاتا ہے کیونکہ اس کے مباحث میں اہم تر یہ ہوتا ہے کہ فریقین مقدمہ کے اپنے اپنے قانون میں احکام مختلف ہوں تو فیصلہ کس کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ اسلامی قانون میں نکاح ایک معاہدہ ہے اور (طلاق کے ذریعے سے) قابل تنسیخ مگر عیسائی مذہب کے لحاظ سے نکاح ایک مقدس فعل (SACRAMENT) اور ناقابل تنسیخ چیز ہے لہذا ایک عیسائی کنبے کے مرد کے مسلمان ہو جانے کی صورت میں اگر نو مسلم شوہر طلاق دے تو اس کے مقدمے کا فیصلہ کس فریق کے قانون کے مطابق کیا جائے؟ بہر حال تفصیلات میں گئے بغیر عرض کرتا ہے کہ قدیم اسلامی کتب سیر میں عمومی اور خصوصی دونوں قسم کے قانون ہائے بین الممالک کا ایک جاذب ذکر ہوتا رہا ہے۔

اساس:

انہوں سے کسی ملک میں قانون ملک کے مطابق برتاؤ ہوتا ہے۔ صرف پرائوں کے لیے سیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کسے اپنا اور کسے پر اپنا قرار دیں، اس بارے میں ہر تمدن کا اصول الگ رہا ہے۔ اوپر تمہید میں اس کی تاریخ اور ارتقا بیان ہوا۔ آج کل مغرب میں زیادہ تر جغرافیائی یعنی سیاسی قومیت کا رفرما ہے نسل زبان اور مذہب کو قانوناً کم ہی اہمیت ہے۔ جمہوریہ جنوبی افریقہ میں نسلی یا رنگی قومیت ہے کالی رعایا درجہ دوم کے شہری قرار دیے گئے ہیں۔ جمہوریہ اسرائیل میں نسلی قومیت برابری ہے۔ عیسائی اہل ملک درجہ دوم کی اور مسلمان اہل ملک درجہ سوم کی رعیت ہیں اور یہودی چاہے دنیا کے کسی ملک میں رہتے ہوں، خود بخود اسرائیل کی رعیت بھی سمجھے جاتے ہیں گویا ان اجنبی یہودیوں کو مرکب یا دھری قومیت حاصل ہوتی ہے۔ روس میں صرف اشتراکی درجہ اول کی رعیت ہیں اور ذمہ داری کے عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں (پارلیمنٹ کی رکنیت ہو کہ وزارت کسی غیر اشتراکی رعیت کو نہیں دی جا سکتی)۔ غیر اشتراکی باشندگان ملک خاص کر مسلمانوں کو اپنے مذہبی قانون پر عمل کی اجازت نہیں۔

اس کے برخلاف مسلمان فقہاء نے اپنے دورِ عروج میں مطمح نظر (آئندہ لوجی) کو سیاسی و ملی ربط کا اصول قرار دیا۔ یعنی سارے مسلمان ایک قوم ہیں اور سارے غیر مسلم ایک دوسری قوم، لیکن مسلمان اپنے قانون پر اور غیر مسلم اپنے قانون پر عمل کریں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سیر (قانون بین الممالک) کی کتابوں میں مسلمانوں نے ”اپنوں“ سے بحث صرف بغاوت اور خانہ جنگی کی صورت میں کی اور ”پراپنوں“ میں نہ صرف اجنبی غیر مسلم سلطنتوں اور ان کی رعایا سے بحث کی بلکہ خود اسلامی مملکت کی غیر مسلم رعایا (ذمیوں) سے بھی۔

اس میں غیر مسلموں کا فائدہ ہی فائدہ ہے کیونکہ قرآن مجید کے صریح احکام کے تحت ہر مذہبی گروہ کو قانونی، دینی اور سماجی امور کی حد تک خود مختار رہنے کا حق ہے۔ دو عیسائیوں میں دیوانی یا فوجداری جھگڑا ہو تو ”ولیحکم اهل الانجیل بما انزل اللہ فیہ“ (المائدہ: ۴۶) کے تحت ان کا مقدمہ اسلامی مملکت کی عیسائی عدالت میں عیسائی جج کے سامنے اور عیسائی قانون کے مطابق چلتا ہے۔ اسلامی قانون کا ان پر اطلاق نہیں ہوتا۔ یہی حال ہر مذہبی گروہ یہودی اور پارسی وغیرہ کا ہے۔ عیسائیوں میں فرقہ پرستی اور ان میں کثیر باہمی اختلاف کی بنا پر خلافت راشدہ میں یہ حل نکالا گیا کہ خصوصی فرقہ دار عدالتوں کی جگہ ہر فرقے کے پادریوں اور کلیساؤں کو عدالتی اختیار بھی دے دیے جائیں۔ (اگر فریقین مقدمہ مختلف مذہبوں یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے ہوں تو فریقین ہی یہ طے کرتے ہیں کہ کس ثالث سے رجوع کریں۔ عموماً مسلمان کا انتخاب ہوتا رہا ہوگا۔)

اسلام تبلیغی مذہب تو ہے لیکن دین قبول کرنے میں جبر و اکراہ کو قرآن نے ممنوع قرار دیا ہے۔ غیر مسلموں کے لیے ذمی (یعنی زیر حفاظت اور ذمہ داری سے مستفید شخص) کا نام بے معنی نہیں۔ انہیں اپنے دین اور اپنے تمدن سے استفادے کی آزادی رہتی ہے۔ مسائل قانون شخصی، نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے ہوں، یا سماجی و معاہداتی، ان پر اسلامی قانون عائد نہیں کیا جاتا۔ سیر میں چونکہ اجنبیوں سے بحث ہوتی ہے، اس لیے ذمیوں کو ناگزیر اس کا موضوع قرار دیا گیا اور یہ صراحت کی گئی کہ بیرون

سے سیاحت وغیرہ کے لیے آنے والے اجنبی بھی اپنے ہم مذہب ذمیوں میں داخل شمار کیے جائیں گے۔ مزید برآں ادنیٰ ملازمت سے لے کر وزارت سفید تک سارے ہی عہدے غیر مسلموں کے لیے کھلے ہوئے ہیں جیسا کہ ماوردی، ابویعلیٰ الفراء وغیرہ نے صراحت کی ہے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن امیہ ضمری کو سفیر بنا کر حبشہ بھیجا تھا۔ ”اور وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔“

اس فراخ دلی اور رواداری کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی مملکتوں میں غیر مسلم رعایا کی بغاوتیں (ترکی میں مغربی تصور قومیت آنے سے قبل تک) تقریباً ناپید رہیں۔ خلافت راشدہ کی برق آسا فتوحات نے ۲۶ھ میں اسلامی فوجوں کو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے تین براعظموں پر پہنچا دیا تو اس وقت مسلمان اقلیت ہی میں نہیں، آبادی میں اقل قلیل تھے۔ اس کے دس سال بعد حضرت عثمانؓ کی شہادت کے سلسلے میں خانہ جنگی شروع ہوئی اور سالہا سال جاری رہی لیکن اس اثنا میں نہ سابق بیزنطینی (رومی) رعایا نے بغاوت کر کے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی اور نہ سابق ایرانی یا کسی اور رعایا نے۔ بلکہ بہ اتفاق مؤرخین یہ ذمی مسلمانوں کی ماتحتی کو اپنے سابق ہم مذہبوں کی حکومت پر ترجیح دیتے رہے یہی حال علی العموم اموی اور عباسی دور کا رہا۔ اس کا راز یہی معلوم ہوتا ہے کہ ذمیوں کو کامل داخلی خود مختاری حاصل رہی: عبادت و ضمیر کی بھی اور ثقافت اور عدل گستری کی بھی۔

شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مغربی تصور قومیت میں بنی نوع آدم کا تشمت ہی روز افزوں ہوتا ہے۔ اسلامی تصور قومیت میں تشمت و متفرق اجزاء کے روز افزوں تو حد کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

ماخذ احکام:

سیر چونکہ فقہ کا ایک باب اور ایک جزو ہے، اس لیے اسلامی قواعد سیر کے ماخذ اولاً وہی ہوں گے، جو فقہ کے ہیں۔ یعنی قرآن و سنت نیز اجتماعی یا انفرادی آراء فقہاء۔ لیکن عہد نبویؐ ہی سے اس سلسلے میں بین الممالک معاہدات کو ایک جائز اور واجب

التعمیل ماخذ تسلیم کر لیا گیا (مثلاً صلح نامہ حدیبیہ) ایسا ماخذ صرف فریقین معاہدہ میں کارفرما رہتا ہے اور صرف اس وقت تک جبکہ معاہدہ نافذ رہے دیگر ممالک و اوقات کے لیے وہ ایک نظیر کا کام دیتا ہے۔

ایک اور ماخذ متقابل اثر (RECIPROCITY) ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا حکم سرحدی جنگی کے افسروں کے نام کہ غیر ممالک کے تاجروں کو کچھ درآمد کریں تو ان سے اسی شرح پر جنگی وصول کی جائے جس شرح پر ان تاجروں کے وطن میں مسلمان تاجروں سے وصول کی جاتی ہے۔ امام محمدؒ نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی اجنبی ملک میں مسلمان تاجروں یا عورتوں پر جنگی معاف ہو تو مماثل برتاؤ وہاں کے تاجروں سے اسلامی سرزمین میں کیا جائے گا۔ اسی طرح استیمان (ویزا) کے قواعد بھی مساوات اور تقابل کی اساس پر مبنی رہے۔

مزید تفصیلوں میں مجھے بغیر عرض کرنا یہ ہے کہ اس طرح اسلامی سیر ایک منجمد اور غیر ترقی پذیر نظام بن جانے کی جگہ نشوونما پانے اور ہر زمانے کی ضرورتوں کا ساتھ دینے کے قابل رہتا ہے اور فقہاء خذما صفادع ماکدر پر عمل کر سکتے ہیں۔

مؤیدہ یا قوت نافذہ (SANCTIONS)

حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعرمیؓ کے نام ہدایت نامے میں کیا خوب کہا ہے کہ ”لا ینفع تکلم بحق لا نفاذہ“ (اس حق سے فائدہ ہی کیا جو نافذ نہ کیا جا سکے)۔ دیگر قوانین کی طرح سیر سے بھی حقوق اور واجبات دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی یعنی غیر مسلم مملکت کے نظام سے یہاں بحث نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں خاص کر سیر کا نفاذ کن تہدیدات کے تحت ہوتا ہے۔

قانون کے نفاذ کے لیے حکومت کی مادی قوت مکرہ پہلی چیز ہے۔ پولیس، فوج اور دیگر مادی وسائل اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ جب کوئی متضرر اسلامی عدالت سے رجوع ہوتا ہے تو وہ فریقین کو حاضر ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ سماعت کے بعد فیصلہ کرتی اور اپنے حدود اختیار (اسلامی مملکت) کے اندر اس کا نفاذ کرتی ہے۔ چاہے یہ فیصلہ

مسلمان کے حق میں ہوا ہو یا غیر مسلم دشمن کے۔ نفاذ پر آمادہ یا مجبور کرنے والی دوسری چیز خدا اور عذابِ آخرت کا خوف ہے۔

صرف ایک مادی وسیلے کے مقابلے میں یہ مادی اور روحانی دو گونہ مؤیدہ، ظاہر ہے کہ زیادہ مؤثر ہے۔ اب زمانہ حال میں اخبارات کے باعث دنیا میں فضیحت رائے عامہ کی طرف سے تضحیح اور مماثل امور کو بھی روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی عدالت انصاف ابھی طفولیت میں ہے۔ عدالت حقوق انسانی بے بس بھی ہے اور نا اہلوں کے ہاتھ میں بھی ہے۔ مجلس اقوام متحدہ کو اس کے دستور نے معطل بنا رکھا ہے۔ لیکن ان ننھی مٹی چیزوں میں چاہے مسلمان ملکیتیں شریک ہوں، ان کی ایجاد کا سہرا ان کے سر نہیں۔

قانون بین الممالک کے احکام تین حصوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں: حالتِ امن، حالتِ جنگ اور حالتِ غیر جانب داری۔ یہاں چند اشاروں پر اکتفا کے سوا چارہ نہیں۔

خود مختاری اور اقتدارِ اعلیٰ (INDEPENDENCE AND SOVEREIGNTY)

غیر محدود آزادی کا دنیا میں وجود نہیں۔ کچھ قدرتی پابندیاں ہیں: بچہ کتنا ہی چلائے، ماں چاند کو توڑ کر اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی۔ کچھ پابندیاں غیروں کے مماثل حق سے پیدا ہوتی ہیں: میرے لیے بے شک یہ ممکن ہے کہ جسے چاہوں قتل کروں، جس کا مال چاہوں چھینوں۔ لیکن اتنا ہی امکان ہر دوسرے شخص کو بھی میرے خلاف پایا جاتا ہے۔ مجبوراً یہ پابندی گوارا کرنی پڑتی ہے کہ نہ میں کسی شخص کو قتل کر سکوں اور نہ کوئی دوسرا مجھے۔ ان اصول کا اطلاق افراد ہی کی طرح مملکتوں پر بھی ہوتا ہے۔

مذکورہ قدرتی اور باہمی مفاد کی پابندیوں کے سوا معاہداتی پابندیاں بھی حکومتیں قبول کرتی ہیں کبھی خوشی سے اور کبھی مجبوراً۔ ان سارے امور کا اطلاق بلا تفریق مذہب و ملت ساری انسانی حکومتوں پر ہوتا ہے۔

اصولاً دنیا میں صرف ایک اسلامی مملکت ہونی چاہیے۔ جب سب کا کعبہ اور

قرآن ایک ہے تو خلیفہ یا امام بھی ایک ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا امکان نظر آتا ہے کہ ایک سے زائد اسلامی مملکتیں وقت واحد میں پائی جائیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں ذکر ہے کہ جب نجاشی کی وفات کی اطلاع آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ یعنی وہ مسلمان تھا لیکن وہ اپنے ملک میں عملاً خود مختار بھی تھا۔ چاہے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا دینی ہی نہیں دنیوی پیشوا بھی مانتا ہو لیکن حبشہ کے نظم و نسق کے لیے مدینے سے احکام بھیجے جانے کا پتا نہیں چلتا۔

نیم خود مختار مملکتیں بھی عہد نبویؐ میں نظر آتی ہیں۔ عمان (جنوب مشرقی عرب) میں جلندی کے دو بیٹوں جیفر اور عبد کی مشترکہ حکمرانی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خط لکھا کہ اگر مسلمان ہوئے تو انہیں ان کی بادشاہت پر برقرار رکھا جائے گا، ورنہ ان کے علاقے پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ دونوں مسلمان ہو گئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاں حضرت عمرو بن العاص کو بھیجا۔ (جنہیں ایک طرح مقیم سیاسی نمائندہ یا ریزیڈنٹ کہا جاسکتا ہے) اور مورخ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کی وصولی اور اسلامی مقدمات کا فیصلہ حضرت عمرو بن العاص سے متعلق تھے۔ باقی سارے امور میں جیفر و عبد خود مختار تھے۔

ایک سے زائد خود مختار مملکتیں خانہ جنگی کے ذریعے مسلمانوں میں بطور امر واقعہ پہلی صدی ہجری ہی میں وجود میں آ گئیں۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور حضرت معاویہ کے زمانے کے عام الجماعۃ (اتحاد کے سال) کے مابین سال ہا سال تک عملاً دو اسلامی مملکتیں رہیں۔ اس کے بعد اموی دور میں حضرت عبداللہ بن الزبیر کی حجازی حکومت بھی قابل ذکر ہے۔ بعد ازاں عباسیوں کی آمد پر اندلس مستقلاً الگ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ خود مختار اسلامی مملکتیں روز افزوں ہوتی چلی گئیں۔ مجبوری کا کیا علاج؟ عباسی دور کے مختار فقہاء نے بالآخر فتویٰ ہی دے دیا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

اتحاد اسلامی کا جذبہ عوام و خواص میں اب بھی برقرار ہے، لیکن ایک فردی خلافت اب ذرا دیر طلب نظر آتی ہے۔ البتہ ایسی مجلس خلافت کے ارکان اسلامی مملکتوں کے صدر ہوں نسبتاً آسان حل ہے اور اس میں سب کا فائدہ ہی نظر آتا ہے،

نقصان کسی کا نہیں۔

اختیار سماعت (JURISDICTION)

اس سلسلے میں ذمیوں کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ نیز اس کا بھی کہ اجنبی مسافروں پر مسلمانوں کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ ان کے ہم مذہب ذمیوں کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ اسلامی تصور انصاف کے تحت ادنیٰ و اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں حتیٰ کہ صدر مملکت بھی معمولی عدالت کے ماتحت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ خلفاء راشدین کے دور سے لے کر ہمارے زمانے تک کے مسلمان حکمران کو ضرورت پر خود اس کی اپنی مملکت میں قاضی کے سامنے جواب دہی کے لیے آنا ایک معمولی واقعہ رہا ہے۔ غیر ملکی مہمان حکمران یا سفیر کی عزت تو کی جاتی ہے لیکن ان کا قانون سے بالا ہونا اسلامی نظام عدل گستری میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ (اگرچہ وہ آج مغربی قانون بین الممالک کے مسلمات میں شامل سمجھا جاتا ہے۔)

سفارت:

ماقبل تاریخ زمانے سے انسانی سماج میں پیام رساں پائے جاتے ہیں، لیکن مستقل سفیروں کا آغاز بہ ظاہر مسلمانوں ہی کے ہاں سب سے پہلے ہوا اور یورپ میں اس کے کوئی دو سو سال بعد۔ جیسا کہ امیر علی نے (HIST. OF SARACENS) میں لکھا ہے۔ خلیفہ بغداد کے مستقل نمائندے ”خود مختار“ صوبوں کے موروثی والیوں کے دربار میں اور ان والیوں کے کارندے بغداد میں رہا کرتے تھے۔

سفارت کے ذریعے معاہدے بھی ہوا کرتے ہیں۔ اس بارے میں عیسائی اور اسلامی تصور میں بنیادی فرق ہے۔ پوپوں نے خاص کر پوپ جو تھے نکولاس نے فتویٰ دے رکھا ہے کہ غیر مذہب والوں سے جو وعدہ یا اقرار کیا گیا ہو، اس کی پابندی عیسائی پر واجب نہیں۔ اسلام (قرآن) نے اس کے برعکس وعدے کی پابندی اور معاہدے کی تعمیل کو ہر کسی کے ساتھ لازمی اور واجبی چیز قرار دیا اور عہد شکنی پر گناہ اور عذاب آخرت سے بھی ڈرایا ہے۔ ایک مشہور حدیث میں تو یہاں تک حکم ہے کہ ”وفاء بغدر خیر

من عذر بغدر“ (دوسرے کی غداری کے باوجود عہد کا وفا کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ غداری کا جواب غداری سے دیا جائے)۔

جنگ:

قانونِ جنگ ایک طویل داستان ہے۔ بعض پرانے مسلمان مؤلفوں نے اسے دو اقرار دیا ہے اور سماج کی بیماریوں کا آخری علاج۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تعدی اور حد سے تجاوز عمل میں نہ آئے اور قتل و خوریزی ناگزیر حد تک روا ہے۔ عہد نبوی میں دفاعی اور پیش بندی کی صرف دو طرح کی جنگوں کا پتا چلتا ہے اور دشمن کو بھی اسلام قبول کرنے پر سارے گزشتہ جرائم سے معاف کر دیا جاتا ہے لیکن چند ذیلی تفصیلیں بے محل نہ ہوں گی۔

اعلانِ جنگ ضروری ہے۔ ممکن ہو تو ہر لڑائی کے آغاز پر دعوتِ اسلام دی جائے جنگ کا اثر سابقہ واجبات پر نہیں پڑتا۔ مثلاً حالتِ امن میں کوئی اجنبی ہمارے ملک میں آئے اور اس کے اثناء قیام میں اس کے ملک سے جنگ چھڑ جائے تو اس کی چاہے نگرانی کی جائے لیکن نہ اس کو قتل و قید کیا جاسکتا ہے اور نہ اپنے وطن واپسی سے روکا جاسکتا ہے۔ ایسی واپسی کے وقت وہ اپنی ساری دولت اور جائیداد بھی ساتھ لے جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث (السيف محاء للذنوب الا الدين) کے مطابق اجنبی کے واجب الادا قرضے اسے جنگ چھڑنے کے باوجود منسوخ نہیں ہوتے۔ مالِ غنیمت انفرادی سپاہی کا حق نہیں ہوتا بلکہ ساری غنیمت یکجا کی جاتی ہے اور ساری فوج کو اس میں حصہ دلایا جاتا ہے۔ (سپہ سالار اور سپاہی کے حصے برابر ہوتے ہیں) حتیٰ کہ ان سپاہیوں کو بھی جو لشکر میں تو تھے لیکن لوٹ یا لڑائی میں شریک نہ ہوئے۔ ایک صحیح حدیث قابلِ ذکر ہے۔ کسی صحابی نے پوچھا کہ بعض لوگ اپنی بہادری کے دکھاوے کے لیے جنگ کرتے ہیں۔ بعض قومی عصبيت کے تحت وغیرہ۔ ان میں کون خدا کی راہ میں جنگ کرتا سمجھا جائے گا؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ”صرف وہ جس کی غرض یہ ہو کہ خدا کا بول بالا ہو۔“ (من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا)۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگر کوئی نبی خود جنگ کی نگرانی نہ کرے بلکہ دنیا دار اور بے دین بادشاہوں پر چھوڑ دے تو جنگ میں انسانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے سپہ سالاری بھی فرمائی اور ایسا نمونہ بھی چھوڑا جو مسلمان بادشاہوں کے لیے واجب العمل ہے اور ساتھ ہی انسانیت پرور بھی۔

غیر جانب داری:

آج کل عربی مؤلف اسے حیا د کہنے لگے ہیں۔ قبل اسلام کی عربی میں نیز قرآن وحدیث میں اس کے لیے اعتزال کی اصطلاح برتی گئی ہے۔ غیر جانب داری جب چاہے ختم کر کے جنگ میں شرکت تو کی جاسکتی ہے لیکن کوئی جنگ سابقہ معاہدے کی منسوخی کے اعلان اور فریق ثانی کو اطلاع دیے بغیر شروع نہیں کی جاسکتی اور جب تک غیر جانبدار رہیں، غیر جانب داری کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں تو ”معاہدہ کیے ہوئے“ ملک میں مسلمانوں پر ظلم ہو تو بھی غیر جانب داری کے زمانے میں غیر جانبدار رہنے کا عجیب و غریب حکم ملتا ہے۔

(ماہنامہ فکر و نظر - راولپنڈی - مئی ۱۹۶۸ء)

علمِ قانون میں مسلمانوں کا حصہ

تمہید:

اگر ”قانون“ کے معنی طرزِ عمل کے طریقے کے ہیں تو قانون تقریباً اتنا ہی قدیم ہوگا جتنی خود انسانیت۔ انسان ایک طرف اپنے ذاتی تجربوں کو یاد رکھتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور دوسری طرف ”تاریخ“ کی مدد سے پرانے لوگوں کے تجربوں کا خود تجربہ کرتا اور مفید نظر آنے والے پرانے تجربوں کو اپناتا لیتا ہے۔ یہ چیز اور شعبوں کی طرح قانون میں بھی ہونی چاہئے۔

قانون اپنی اولین اور ابتدائی حالت میں ”عادت“ کی شکل میں رہا ہوگا، یعنی خود ساختہ قاعدہ، کسی بزرگ (باپ، استاد، قبیلے کے سردار، مجلس شوریٰ وغیرہ) کے احکام۔ ان میں جبر، تہدید اور خلاف ورزی پر سزا کے عناصر بعد میں آئے ہوں گے۔

اسلام بعثتِ نبوی پر (دسمبر ۶۰۹ء سے) شروع ہوا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیس سالہ تبلیغی زندگی (۱۳ق ھ تا ۱۱ھ/مطابق ۶۰۹ء تا ۶۳۲ء) اساسی تشریح کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد سے اب تک چودہ سو سال سے ذیلی تشریح یا توسیع کا زمانہ ہے جو جاری ہے۔ مسلمان فقہاء میں اختلافات بھی پیدا ہوئے ہیں اور مرجع جانے اور ختم ہو جانے کی جگہ، اسلامی قانون کی نشأتِ ثانیہ ہی ہوتی نظر آ رہی ہے کیونکہ تقابلی مطالعہ بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی قانونی میراث اوروں سے بہتر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہے۔

قانون دنیا کے ہر ملک میں ہر زمانے میں ملتا ہے۔ دیگر حیوانات کا طرزِ عمل زمان و مکان کے فرق سے نہیں بدلتا، لیکن انسانی فطرت کے باعث انسانوں کے طرزِ عمل میں یکسانی کی جگہ بہ کثرت اختلاف پایا جاتا ہے۔ دو ملکوں میں ایک ہی ملک میں، دو قوموں میں ایک ہی قوم میں، دو زمانوں میں بھی نہیں معاصرین میں بھی یک رائی کی جگہ انفرادیت اور باہم اختلاف رائے سے دوچار ہوتے ہیں، اور کہہ سکتے ہیں کہ انسان ”اپنے ہم جنسوں سے اختلاف رکھنے والے جانور“ کا نام ہے۔ بلکہ خود ایک انسان کی اپنی رائے بھی وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے۔

ان حالات میں ہمارے موضوع پر کچھ بیان کرنا آسان نہیں۔ لیکن اس تنوع میں کچھ نہ کچھ توحید بھی ملتا ہے اور اسی پر آج کچھ گفتگو کی جاسکتی ہے۔

قانون کا مفہوم مختلف قوموں میں:

اگر آج کل معاصر مغربی قوموں میں قانون اور اخلاق میں فرق کیا جاتا ہے تو ہمارے اسلاف نے بھی کم و بیش یہی مفہوم ”تقویٰ“ اور ”تقویٰ“ کے نام سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس امتیاز کے اسباب کچھ تو داخلی اور اساسی ہیں اور کچھ تاریخی اور عارضی۔ مختلف انسانوں کی افتاء و طبع کے فرق کو بھی اس میں دخل ہے۔ اسی لیے درجہٴ تعبدیت IMPERATIVENESS اور لزوم میں فرق ہوتا ہے۔

غالباً قدیم زمانے میں ساری ہی دیندار قوموں میں قانون کو ایک الہامی چیز مانا جاتا تھا۔ نبی یا پیغمبر اس کو امت تک پہنچاتا اور پھر عبادت گاہ میں فریضہ انجام دینے والے مذہبی افسر اس کی تعبیر و تشریح کے مجاز سمجھے جاتے، بلکہ نفاذ بھی انہی سے متعلق ہوتا۔

یہودیوں میں شروع میں ایسا ہی تھا، لیکن اشموئیل (سامویل) پیغمبر کے زمانے میں پیغمبر کی موجودگی ہی میں ساول کو جنگی ضرورتوں سے طالوت (بادشاہ) بنایا گیا، اور اس طرح دین و دولت یعنی روحانی مسائل اور دنیوی بادشاہت میں فرق ہو گیا۔ (دیکھو عہد قدیم، کتاب سامویل اول، باب ۸ مابعد)۔

حضرت عیسیٰ جس وقت فلسطین میں پیدا ہوئے تو وہاں بت پرست رومیوں کا قبضہ تھا۔ یہودی وہاں نہ صرف محکوم تھے بلکہ معتبوب بھی۔ غالباً اسی لیے حضرت عیسیٰ نے جب اپنے دین کی تبلیغ شروع فرمائی تو ایک طرف (انجیل لوقا ۲۵/۴۰ کے مطابق) یہ فرمایا کہ ”خدا کی چیز خدا کو، اور قیصر کی چیز قیصر کو دو“ (جو دین و دنیا کی تفریق ہی کے معنی رکھتا نظر آتا ہے)، اور ساتھ ہی اپنے فرستادہ مبلغوں (حواریوں) کو (انجیل متی ۶/۱۰، ۲۳/۱۵) تاکید بھی فرمائی کہ ”میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں“ اور یہ کہ ”وہ غیر یہودی لوگوں میں تبلیغ کے لیے نہ جائیں۔“ نیز یہ کہ (انجیل متی ۵/۱۸ تا ۱۹) ”میں تو ریت کو منسوخ کرنے کے لیے نہیں آیا ہوں، اس کا ایک شوشہ تک نہیں بدلا جاسکتا۔“ اگرچہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر جانے کے چھ ہی سال بعد سینٹ پال وغیرہ چند لوگوں نے اس صریح حکم کو منسوخ قرار دیا، (عہد جدید، احکام حواریین، ۲۸-۲۹)، لیکن اسے تین سو سال لگے کہ کوئی بادشاہ اس عیسائی دین کو قبول کرے۔ جب روما کا بادشاہ قسطنطین عیسائیت کو قبول کرتا ہے تو اسی شہر میں عیسائیوں کا دینی پیشوا پوپ بھی رہتا تھا۔ نہ پوپ نے اب دینی پیشوائی بادشاہ کے سپرد کرنی چاہی، اور نہ بادشاہ اپنی بادشاہت پوپ کو نذر کرنے پر آمادہ ہوا۔ خانہ جنگی تو نہ ہوئی، تقسیم عمل سے کام بن گیا، اور وہی اب تک چلا آ رہا ہے۔

ایران میں زردشت کا، چین میں کنفوشیوس کا، ہندوستان میں ویدوں، پرانوں کے لانے والے اہل دین کا مذہب ان کے جیتے جی ایک حد تک قبول بھی ہوا اور ان لوگوں کو مشیر بنایا بھی گیا تو خود ان کو بادشاہ اور حکمران بننے کا موقع نہ ملا۔ ہندوستان میں گوتم بدھ نے تو ولی عہدی پر لات مار کر زہد اور ترک دنیا کو ترجیح دی۔ اس کے برخلاف رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف خدائی احکام امت تک پہنچائے اور قرآن مجید کو کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا انتظام کیا، بلکہ ایک مملکت بھی قائم فرمائی اور خود ہی اسے چلا کر نمونہ بھی چھوڑا (اور متاخر یہودی پیغمبروں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی طرح) آپ نبی بھی رہے اور ساتھ ہی بادشاہ بھی کہ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ آپ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین اور ان کے جانشینوں میں کبھی

دین اور دنیا کے لیے خانہ جنگی اور جھگڑے کا سوال پیدا نہ ہوا، اور سارا اسلام، چاہے دین ہو یا دنیا، ایک ہی افسر کے سپرد ہوتا رہا۔ عقائد، عبادات اخلاق تصوفی طریقت، معاملات، عقوبات، وراثت، ساری چیزوں کا ماخذ بھی ایک تھا (یعنی قرآن و حدیث) اور نگرانی و نفاذ بھی ایک ہی شخص (خلیفہ) سے متعلق تھے۔ (اس فہرست میں طریقت کو دیکھ کر آدمی چونکا نہ ہو۔ صوفی سلسلوں میں حضرت ابو بکر اور حضرت علی کے ناموں سے کون واقف نہیں؟ اور یہ خلیفہ بھی رہے ہیں)۔

احکام میں درجہ بندی:

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ ہوا، احکام میں درجہ بندی کی ضرورت ہے۔ خیر و شر میں فرق، اور معروف و منکر میں امتیاز ناگزیر تھا، ایک کو کرنے کے لیے اور دوسرے کو اجتناب کے لیے اس سے بچگانہ تقسیم ہوئی:

پہلا قابل امر ذکر یہ ہے کہ خیر و شر سابق میں فلسفیانہ مفہوم اور نظری چیز تھے تو قرآن نے ان کو قانونی اور عملی چیز بنا دیا، اور ان کو ”معروف“ و ”منکر“ کے معنی خیز نام بھی دیے۔ ”معروف“ کہتے ہیں اس چیز کو جسے ہر شخص جانتا اور اس کا اچھا ہونا مانتا، اور عقلاً بھی سمجھتا ہے کہ ویسا ہی کرنا چاہیے، اور منکر یا غیر معروف چیز وہ ہوتی ہے جسے کوئی نہیں کرتا، اور نہ کرنے دیتا ہے۔ گویا خیر و شر خدا کی ”من مانی“ تقدیر ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ انسانی عقلیت کے مطابق اور موزوں و مناسب بھی ہیں۔

مسلمان فقہانے دیکھا کہ سارے اسلامی احکام کو اس معیار معروف و منکر پر جانچیں تو وہ پانچ قسموں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔ خیر محض تو صرف اللہ کی ذات پاک ہے، اور شر محض کا دنیا میں کوئی وجود نہیں (خود شیطان بھی شر محض نہیں، کیونکہ انسان کے آزمانے کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے)۔ خیر اور شر ایک اضافی چیز ہیں، یعنی ان میں زیادتی اور کمی کا امکان ہے۔ اس لیے اگر کسی قانون قاعدے میں خیر ہی خیر نظر آتا ہو تو وہ واجب العمل ہوگا۔ اور اگر شر ہی شر نظر آتا ہو تو وہ حرام اور ممنوع ہوگا۔ اگر اس میں خیر غالب نظر آئے تو وہ مستحب اور پسندیدہ سمجھا جائے گا، چاہے لازم نہ قرار دیا جا

سکتا ہو۔ اور اگر شر غالب نظر آئے چاہے اس میں کچھ خیر بھی ہو تو اسے مکروہ اور ناپسندیدہ سمجھا جائے گا۔ لیکن کسی چیز میں نہ خیر نظر آئے نہ شر، یا خیر اور شر برابر کے ہوں تو اسے مباح قرار دیا جائے گا کہ جو شخص چاہے کرے یا نہ کرے، یا کبھی کرے اور کبھی نہ کرے۔ احکام اور قواعد کو خیر و شر کی اساس پر واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام کی منجگانہ تقسیم۔ یہ ہے وہ جدت جو مسلمانوں نے قانون کے متعلق کی، اور جو ان سے پہلے کسی کے ذہن میں نہ آئی تھی۔ یہ اساسی تقسیم ہے، جس طرح قطب نما میں شمال، جنوب، مشرق، مغرب کے چار جہت۔ پھر جس طرح ذیلی جہتیں نکل سکتی ہیں، اور شمال مشرق، وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح واجب اور مباح، نیز حرام اور مباح کے درمیان بہت سے درجے پیدا ہو سکتے ہیں، مثلاً سنت، سنت مکوہہ وغیرہ ایک طرف، اور مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی وغیرہ دوسری طرف۔ صرف ظاہری تعمیل اور ظاہری و باطنی کامل تعمیل کے فرق سے ”فقوی“ اور ”فقوی“ کا لطیف و نفیس فرق بھی پیدا ہوا کہ انسانی حاکم صرف ظاہر کو دیکھ سکتا ہے، باطن کو بھی دیکھنا اللہ کا اختصاص ہے۔

ظاہر و باطن کے اس فرق کو نیت سے بھی تعلق ہے۔ اور شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ حدیث شریف ”انما الاعمال بالنیات“ (سارے کام نیتوں پر مبنی ہوتے ہیں) بھی ایک اہم قانونی جدت تھی۔ اور نظاموں میں اس کا کم پتا چلتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ۱۸۵۶ء کے جوڈیکچر ایکٹ کے نافذ کیے جانے تک انگلستان جیسے متمدن ملک میں جہاز، درخت، دیوار، جانور وغیرہ بھی ذمہ دار شخص سمجھے جاتے تھے، اور اگر ان میں سے کسی کے باعث حادثے میں انسانی جان تلف ہوتی تو ان غیر ذوی العقول چیزوں کو بھی سزا دی جاتی۔ مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرمادی ہے کہ ”العجماء جبّار“، غیر ذوی العقول اشیاء پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

انسانی معاشرے میں ابتداء جبر کا امکان نہ تھا، اور مظلوم کو اپنی ذاتی قوت اور اپنے ذاتی وسائل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سلطنتوں اور حکومتوں کا زمانہ آیا تو حاکم کی قوت اور ظالم محکوم کے اضافی ضعف کا لحاظ رکھتے ہوئے ظالم سے انصاف کرایا جاتا۔ اور ملک کی پولیس اور فوج حاکم عدالت کی مدد کرتیں لیکن اس نظام میں، جواب تک ہر

جگہ جاری ہے، خاص کر دو کوتاہیاں ہیں: ایک تو ظالم کا اتنا قوی ہونا کہ کسی نہ کسی وجہ سے عدالت اپنے فیصلے کی تعمیل نہ کرا سکے، مثلاً نظم و نسق کے بڑے افسروں یا حکمران کے قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔ دوسری کوتاہی یہ ہے کہ اگر جرم کو اتنے مخفی طور پر کیا جائے کہ عدالت کو اس کا پتا ہی نہ چل سکے۔ اسلام نے پولیس و فوج کا نظام بھی برقرار رکھا اور اس میں ایک مزید اور بہت مؤثر چیز کا بھی اضافہ کیا۔ اور یہ حشر و نشر اور حساب آخرت کا تصور ہے۔ ایک طرف ہر انسان کو، خاص کر ہر مسلمان کو یہ یاد دلایا گیا ہے کہ دنیا میں سزا سے بچ بھی جاؤ تو آخرت کی ابدی زندگی میں عالم الغیب و الشہادت اور عادل و قوی خدا سے کہاں بھاگ سکو گے؟ اور دوسری طرف حکام عدالت کو بھی ان کا فریضہ انصاف یاد دلایا گیا اور کہا گیا کہ اگر وہ ظلم کریں تو آخرت میں ان کو بھی سزا ملے گی۔ اس دہرے مادی و روحانی ذریعہ زجر تہدید SANCTION قائم کی گئی تاکہ ظلم کی بیخ کنی ہو۔ اور یہ دہری تہدید یقیناً واحد مادی تہدید کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہے۔

قانون میں دین و دنیا کا اجتماع:

نبوت اور بادشاہت کے اجتماع کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان خلیفہ دینی اور دنیوی دونوں معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا۔ خلفاء راشدین کے زمانے میں عبادات اور معاملات ہی نہیں، سلوک و طریقت بھی خلیفے سے متعلق تھے، پھر طریقت کو اس سے الگ کیا گیا تو بھی عبادات اور معاملات ایک ہی شخص سے متعلق رہے۔ طریقت کو الگ کرنے کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ حضرت ابوبکر کے زمانے ہی سے انصار کی یہ تجویز رد کر دی گئی کہ ”منا امیر ومنکم امیر“ اے، یعنی وقت واحد میں ایک سے زائد خلیفہ ہوں (سیاسی معاملات کے لیے)؛ مگر روحانی دنیا میں یہ دشواری نہیں محسوس کی گئی اور وقت واحد میں ایک سے زائد افراد رسول اللہ کے خلیفے ہو سکتے تھے اور ہوئے۔ مثلاً نقشبندیوں کے ہاں حضرت ابوبکر، اور قادریوں، چشتیوں کے ہاں حضرت علی سے سلسلہ ملتا ہے اور یہ دونوں راست رسول اللہ کے خلیفہ ہیں، یہ نہیں کہ ایک کے بعد دوسرا جانشین ہوا ہو جیسا کہ

۱۔ ترجمہ: ایک خلیفہ ہم میں سے ہوا اور ایک خلیفہ تم میں سے۔ (مرتب)

سیاسی خلافت میں نظر آتا ہے۔ دیگر قوموں میں مادی اور روحانی امور کو ایک دوسرے سے الگ کیا گیا (یعنی سلطنت اور کلیسا)، تو مسلمانوں نے ظاہری اور باطنی امور کے لیے الگ الگ افسر بنائے۔ سیاسی خلیفہ ظاہری امور کے لیے جن میں نماز، روزہ، حج بھی شامل ہیں اور معاملات و سیاست بھی۔ اور باطنی امور کا خلیفہ اخلاق کی تربیت اور انسان اور خدا کے انفرادی تعلقات کو استوار تر بنانے میں مدد دیتا ہے۔ دونوں بھی رسول اللہ کے خلیفہ ہیں اور خلیفہ بلا فصل۔ فرق یہ ہے کہ سیاسی خلیفہ بلا فصل صرف ایک فرد ہو سکا، روحانی خلفاء بلا فصل بہ کثرت ہوئے، رسول کی وفات کے فوراً بعد بھی، اور تا اس دم ایک زمانے میں ایک ملک ہی نہیں، ایک شہر، ایک گلی بلکہ ایک مکان کے اندر بھی کئی مرشد یعنی روحانی خلیفے ہو سکتے ہیں۔

سیاسی خلیفہ کو دینی اور دنیوی دونوں معاملات کی نگرانی کا فریضہ دیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی قانون (فقہ) کی کتابوں میں بھی دونوں مسائل سے بحث ناگزیر ہو گئی۔ اور ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ فقہ کی کتابوں کے ابتدائی باب طہارت، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر مشتمل ہوتے ہیں، جو عبادات کہلاتے ہیں۔ پھر معاملات، تجارت و زراعت وغیرہ آتے ہیں۔ پھر عقوبات یعنی جرائم کا ذکر آتا ہے۔ آخر میں مابعد الموت نافذ ہونے والے امور یعنی وصیت اور وراثت سے بحث ہوتی ہے۔ اس ترتیب میں وہ امر نمایاں کیے جانے کے قابل ہیں۔ اول تو یہ کہ زکوٰۃ یعنی ٹیکسوں کو (چاہے نقد اندونختے پر ہوں یا زراعت، تجارت، معدنیات وغیرہ پر)، عبادات میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر انسان حکومت کے جبر کے بغیر بھی نماز روزے کی پابندی کرتا ہے تو وہ زکوٰۃ بھی اسی عقیدت اور روحانی طلب کے باعث ادا کرتا ہے اور چھپانے، دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ دوسرا نکتہ یہ قابل ذکر ہے کہ عبادات سیاست اور معاملات ایک ہی حاکم کے ہاتھ میں ہونے سے وہ دونوں سے برابر کی دلچسپی لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک کی خاطر دوسرا کام نظر انداز کر دے جیسا کہ مثلاً اشتراکی حکومتوں میں عبادت گاہوں اور دینی تعلیم کے اداروں وغیرہ کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے۔ مسلمان حکمران ہی مسجد میں امام ہوتا ہے، اور قصر حکومت میں بھی امام یعنی حکمران وہی

ہوتا ہے۔ یہ خیال نہ کیا جائے کہ فقہ کی کتابوں میں سیاست کے قواعد سے بحث نہیں ہوتی۔ جرائم میں چوری اور رہزنی کے بعد بیرونی حملہ آوروں سے جنگ نہیں قانون بین الملک سے بحث ہوتی ہے۔ نماز کے امام کے ذکر میں امام شافعی کی کتاب الاثم میں سلطنت کے امام یعنی قانون دستوری کی بحث ملے گی۔

اصول فقہ یعنی علم قانون:

ہر قوم اور ہر تمدن اپنا قانون بناتا ہے اور اس قانون کی کچھ خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ پرانی قوموں نے قانون پر تو توجہ کی اور قوانین کے مجموعے بھی تیار کیے لیکن علم قانون کی ضرورت انہیں کبھی محسوس نہ ہوئی یعنی ایک ایسا علم جو قانون سے مجرد معنوں میں بحث کرے کہ قانون کسے کہتے ہیں، قانون کی تعمیل اور اطاعت کیوں کرنی چاہیے، قانون کے ماخذ کیا ہیں، قانون کون بنا سکتا ہے، کون بدل اور منسوخ کر سکتا ہے، قانون کی تعبیر اور توضیح کس طرح کی جائے، دو قانونی احکام میں اختلاف یا تضاد نظر آئے تو اس کے حل کا کیا طریقہ ہوگا، وغیرہ وغیرہ، غرض ایک ایسا علم جو کسی معین ملک یا قوم کے قانون سے متعلق نہیں ہوتا مگر جس کی روشنی میں دنیا کے کسی بھی ملک یا قوم کے قانون کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اس خلاء کو سب سے پہلے مسلمانوں نے پُر کیا، اور اسے اصول فقہ یعنی قانون کی جڑوں کے معنی خیز نام سے موسوم کیا۔ قرآن مجید (سورہ ۱۴، آیت ۲۴ تا ۲۶) میں اچھے اور بُرے احکام یعنی قانون کا بڑے لطیف انداز میں ذکر ہے اور کہا گیا ہے کہ ”اچھا فرمان اچھے درخت کی طرح ہے کہ اس کی جڑ خوب ثابت رہتی ہے اور اس کی شاخیں (فرع) آسمان تک پھیل جاتی ہیں.....“ اس تلمیح سے اخذ کر کے مسلمان فقہانے قانون کی دو قسمیں کیں، ایک اصل (یا: جڑ) اور دوسرے شاخیں (یا: فرع)۔ فروغ قانون تو وہ ہیں جن کے مماثل ہر قوم میں ملتے ہیں، یعنی قاعدے اور احکام کہ کس وقت اور کس حالت میں کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ لیکن اصول قانون میں مجرد علم قانون سے بحث ہوتی ہے اور اس کے ابواب یا بحثوں کا انطباق دنیا کے کسی بھی قانون پر کیا جاسکتا

ہے۔ فرنگیوں میں جُورس پُر وڈنس حالیہ چیز ہے، مسلمانوں میں یہ کم از کم پہلی صدی ہجری کے اواخر سے ملتا ہے۔ اس پر سب سے قدیم معروف کتاب امام ابو حنیفہ کی ہے جنہوں نے کتاب الرائی تالیف کی تھی۔ پھر ان کے دونوں شاگردوں ابو یوسف اور محمد شیبانی کی طرف بھی ”اصول الفقہ“ نامی کتابیں منسوب ہیں۔ موجودہ دستیاب ہونے والی کتابوں میں سب سے قدیم امام شافعی کی ہے جس کا نام الرسالہ ہے اور جو اس علم سے تفصیل کے ساتھ بحث کرتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی قانون کے سلسلے میں سب سے اہم جدت ہے۔ میں بھی اس سے ابتداءً تاواقف تھا۔ لندن یونیورسٹی کی سوسالہ سالگرہ ہوئی تو مشہور فرانسیسی مستشرق اوسٹرووگ کو خاص طور پر بلایا گیا اور اس کے وہاں دیے ہوئے تین لیکچر ”انگورا ریفارم“ کے نام سے شائع ہوئے۔ ان میں سے ایک کا عنوان ہے ”قانون کی جڑیں“ (رولس آؤلا) اور اس میں وہ سر دھتا ہے اتنی اہم اور بدیہی چیز کیسے قدیم رومیوں یونانیوں کے ذہن میں نہ آئی اور کیسے وہ مسلمانوں سے مختص ہو کر رہ گئی۔

سیر یعنی قانون بین الممالک:

سنی، شیعہ، فاطمی، اباضی (خارجی) کسی بھی مسلمان فرقے کی فقہ کی کتاب ہو، اس میں ایک باب ”کتاب السیر“ کے نام سے ضرور ہوتا ہے جس میں اجنبی ملکوں سے جنگ اور امن کے زمانے کے تعلقات کا ذکر ہوتا ہے۔ اسی کو مغرب میں انٹرنیشنل لایعنی قانون بین الممالک کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے موجد بھی مسلمان ہیں۔ مگر کچھ تشریح کی ضرورت ہے:

اجنبی ممالک سے جنگ اور امن کے زمانے کے تعلقات اتنے ہی قدیم ہیں جتنا انسانی معاشرے میں بوقت واحد دو یا زیادہ خود مختار مملکتوں کا وجود۔ اس معنی میں یہ قانون اتنا ہی قدیم ہے جتنا تاریخی انسان۔ کیونکہ ہزاروں سال (قبل اسلام) سے مملکتوں کی باہمی جنگ کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن جنگ اور امن کے زمانے کے ان تعلقات کے لیے جو قاعدے بنے اور ملتے ہیں ان میں وہ قاعدے عام نہیں ہیں بلکہ معین اجنبیوں سے مختص قرار دیے گئے ہیں۔ مثلاً بائبل (توریت) میں یہودی قانون ملتا ہے

اور اس میں صراحت ہے کہ جنگ کے زمانے میں فلاں فلاں احکام پر عمل کیا جائے لیکن ان کا اطلاق عمالقہ پر نہ ہوگا؛ عمالقہ کو نیست و نابود کر دو، نہ صرف مرد بلکہ عورت، بچے، شیرخوار اطفال، حتیٰ کہ ان کے اونٹ اور گدھوں تک کو قتل کر دو۔ (دیکھو کتاب متثنیٰ اور کتاب سامویل اول) قدیم یونانی قانون بین الممالک کو دیکھو تو وہاں نظر آتا ہے جنگ کے نرم یا گرم جو قاعدے ہیں ان کا اطلاق یونانی النسل اور یونانی المذہب ریاستوں سے مخصوص ہیں، غیر یونانیوں سے برتاؤ میں کسی قاعدے قانون کی پابندی ضروری نہیں، جو چاہو کر سکتے ہو۔ رومی دور میں بھی زیادہ اصلاح نہ ہوئی اور صرف یہ کہا گیا کہ جن ملکوں کے ساتھ رومیوں کی حلفی یا اور طرح کے تعلقات رہے ہیں ان کے ساتھ برتاؤ میں فلاں فلاں قاعدے ملحوظ رہیں، اجنبیوں سے تعلقات میں کسی قاعدے کی پابندی نہیں۔ سنہ ۱۸۵۶ء تک یورپ کا قانون بین الممالک صرف بین النصرانیت قانون تھا، اور صرف عیسائی ملکوں کے آپس کے برتاؤ سے مخصوص تھا۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں پہلی دفعہ صراحت سے معاہدہ کرنا ہوا کہ ان قواعد کا اطلاق مسلمان ترکی سے بھی ہوگا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کی مجلس اقوام، اور دوسری جنگ کے بعد کی موجودہ اقوام متحدہ بھی ہر کسی کے لیے کھلی ہوئی نہیں ہیں، اور ہر نئے امیدوار کو دو موجودہ رکنوں کی سفارش کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ نیا امیدوار مہذب ہے اور اسے اقوام متحدہ کا رکن بنایا جائے۔ پھر غلبہ آراء سے اس کی رکنیت قبول کی جاتی ہے۔

اسلام وہ پہلا قانون ہے۔۔ اور تاحال واحد۔۔ جو کہتا ہے کہ سارے غیر مسلم ممالک سے معینہ قاعدوں کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، اور یہ قاعدے جو جنگ اور امن دونوں زمانوں سے متعلق ہیں، معین اور معلوم ہیں۔ مسلمانوں کا بنایا اور برتا ہوا قانون بین الممالک قانون بھی ہے اور بین الممالک بھی، قدیم لوگوں کے ہاں نہ وہ قانون رہا ہے اور نہ بین الممالک۔ بلکہ محدود حلقہ انسانیت سے مخصوص۔

یہ اسلامی قانون بین الممالک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے شروع ہوا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مملکت بھی قائم فرمائی اور دشمنوں سے جنگ بھی کی، اور حالت جنگ و صلح کے طرز عمل کا جو نمونہ چھوڑا اسی کی اساس پر

مسلمان فقہا نے اسلامی قانون بین الممالک مدون کیا۔ اس کا قدیم ترین تحریری ذکر زیدی مذہب کے بانی امام زید بن علی کی کتاب ”المجموع فی الفقہ“ میں کتاب السیر میں ملتا ہے۔ امام ابو حنیفہ ان کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے متعلق ابن حجر عسقلانی نے امام شافعی کی سوانح عمری ”توالی التامیس“ میں لکھا ہے کہ سیر پر سب سے پہلے مستقل کتاب ابو حنیفہ نے لکھی۔ اس کے مندرجات پر امام اوزاعی نے اعتراض کیا تو ابو حنیفہ کے شاگرد ابو یوسف نے رد لکھا۔ پھر امام شافعی نے اس ساری بحث کو سامنے رکھ کر اپنی کتاب الام میں ایک باب لکھا جس کا نام ہے سیر الاوزاعی۔ اس میں وہ ابو حنیفہ، اوزاعی اور ابو یوسف کی دلیلیں بیان کرنے کے بعد اپنی ذاتی رائے درج کرتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ کے متعدد شاگردوں نے سیر یعنی قانون بین الممالک پر مستقل اور ضخیم کتابیں لکھیں۔ امام محمد کی کتاب السیر الکبیر ہم تک پہنچی اور بہت مفصل ہے۔ یونیسکو نے اس کا فرانسیسی ترجمہ کرایا ہے کہ اس علم کی یہ دنیا کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ لبنان نے اسے شائع کرنے کی ہامی بھری، مگر وہ بیچارہ اب قانون کی کیا خدمت کرے، خانہ جنگیوں میں اپنی ذاتی حفاظت ہی کر لے تو بہت ہے۔

تحریری دستور مملکت:

سلطنتیں دنیا میں بہت قدیم زمانے سے ملتی ہیں، لیکن حکمران کسی قاعدے قانون کے پابند نہ رہے ہیں، ان کی مرضی ہی ان کا قانون رہا ہے۔ حکمران کے برتاؤ کو معین قواعد کا پابند بنانا اور ان قواعد کو لکھ کر شائع کرنا حالیہ چیز سمجھی جاتی ہے۔

قدیم تاریخ پر نظر ڈالیں تو نظر آتا ہے کہ یونانیوں کے ہاں چھوٹی چھوٹی بہت سی شہری مملکتیں تھیں۔ ان میں سے شہر اٹینا (آتھنس) کے متعلق بعض معلومات ارسطو نے لکھے ہیں مگر یہ دستور نہیں، بلکہ دستوری حالات کی تاریخ ہے۔ (ارسطو نے جو سکندر اعظم کا وزیر تھا، دنیا کی بہت سی مملکتوں کے دستوری قواعد فراہم کیے اور رسالوں کی صورت میں شائع کیے تھے) شہری مملکت اٹینا کے دستور میں ایک بار کچھ اصلاحیں مناسب سمجھی گئیں تو سولن کو تجویز پیش کرنے پر مامور کیا گیا اور اس نے ترمیمیں تحریری طور پر

پیش کیں۔ لیکن وہ صرف ترمیمیں تھیں، پورا دستور نہ تھا۔ اور کسی بادشاہ یا حکمران کی طرف سے نافذ کردہ چیز بھی نہ تھی۔ اس کے بعد ایک اور تحریری ”دستور“ کا پتا ملتا ہے جو طنز کے سوا کچھ نہیں۔ حضرت موسیٰ کے بہت بعد، اور حضرت داؤد سے کچھ پہلے ایک نبی تھے حضرت اشموئیل (سامویل)۔ یہ بوڑھے ہو گئے تو یہودیوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنی موجودگی ہی میں ایک شخص کو بادشاہ نامزد کریں۔ خدا کے حکم سے انہوں نے قوم کو اس سے روکا اور کہا کہ بادشاہ جو کوئی بنے گا تو وہ تم پر ظلم کرے گا۔ تمہارے لڑکوں لڑکیوں کو لوٹڈی غلام بنائے گا، تمہارا مال زبردستی چھینے گا وغیرہ (دیکھو کتاب سامویل اول، باب ۸، جملے ۹ تا ۱۸)۔ مگر انہوں نے نہ مانا اور اصرار کرتے رہے۔ اس پر حضرت اشموئیل (سامویل) نے ہاؤل نامی شخص کو طالوت یعنی بادشاہ نامزد کیا ”اور تب سامویل نے قوم کو بادشاہت کے حقوق سے واقف کرایا، اور انہوں نے ان کو ایک کتاب کی صورت میں لکھا اور اسے خدا کے حضور میں پیش کیا اور پھر سارے لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو واپس بھجوا دیا“ (سامویل اول، باب ۱۰، جملہ ۲۵)۔

ارسطو کا ہم عصر، ہندوستان میں کارٹیلیا تھا، جو ارسطو ہی کی طرح اپنے ملک میں وزیر تھا۔ اس کی لکھی ہوئی کتاب ارتھاشاسترا موجود ہے اور اس کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہ نصیحتہ الملوک قسم کی کتاب ہے، بادشاہ اس سے استفادہ کر سکتا تھا، شہزادے اس کو پڑھ سکتے تھے، لیکن وہ کوئی دستوری قانون نہ تھا کہ اس پر عمل ضروری ہو، اور نہ کسی بادشاہ کا فرمان کہ اسے کم از کم بادشاہ کا دستوری وعدہ ہی سمجھا جائے۔

تاریخ میں جو قدیم ترین تحریری دستور ملتا ہے وہ نبی اُمّی پیغمبر اسلام کا مدون اور نافذ کیا ہوا دستوری قانون ہے۔ جب حضور ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں ایک سیاسی خلا تھا۔ کوئی مملکت پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ وہاں صرف قبیلے رہتے تھے جن میں سو، سو سو سال سے مسلسل باہمی جنگ ہی جاری تھی۔ مدینہ آتے ہی حضور نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے نمائندوں کو بلایا اور تجویز پیش کی کہ ایک شہری مملکت قائم کر لو، اور باہم اتحاد کرو تو سب ہی کا فائدہ ہے۔ اسے مسلمانوں، بت پرست عربوں اور یہودیوں نے قبول کیا تو باون دفعات کی ایک دستاویز مرتب ہوئی جس میں حکمران اور رعایا دونوں

کے حقوق اور فرائض امن اور جنگ دونوں حالتوں کے متعلق تفصیل سے بیان ہوئے اور علاوہ اور چیزوں کے سماجی بنیے (معاقل) کا بھی مفصل ذکر ہوا۔ یہ دستاویز، جو تحریری تھی، تاریخ نے محفوظ رکھی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا یہ تحریری دستور مملکت ہے جو سنہ ہجری میں مرتب اور نافذ ہوا۔ (اس موضوع پر دیکھو میری انگریزی کتاب مطبوعہ لاہور ”دی فرسٹ رٹن کانسٹی ٹیوشن ان دی ورلڈ“)

جدید قانون سازی:

ایک بنیادی اور مسلمہ قاعدہ ہے کہ کسی موجودہ قانون قاعدے کو وہی شخص بدل سکتا ہے جس نے وہ پرانا قاعدہ بنایا ہو، یا اس سے بھی بڑے درجے کا کوئی شخص مثلاً کسی وزیر کا بنایا ہوا قاعدہ خود وزیر ہی منسوخ کر سکتا ہے، یا وزیر کا بھی افسر یعنی بادشاہ، یہ نہیں ہو سکتا کہ وزیر کا کوئی ماتحت وزیر کے حکم کو منسوخ کر سکے۔ ان حالات میں بادشاہ کے حکم کو خود بادشاہ ہی بدل سکے گا، یا کوئی نبی اور یہ کہتے ہوئے کہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے جو بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہے۔ پرانے نبی کے لائے ہوئے حکم کو ایک بعد میں آنے والے نبی کے ذریعے سے بدلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی نبی یہ کہہ دے کہ میں آخری نبی ہوں، میرے بعد قیامت تک کوئی اور نبی آنے نہیں سکتا، تو پھر اسی آخری نبی کے احکام کے بدلنے کا کوئی امکان علمی نقطہ نظر سے رہ نہیں سکتا۔

اس مسئلے کے کئی پہلو قابل غور ہیں: قانون اگر روز بدل سکے اور قانون ساز کوئی مستبد بے اصول بادشاہ ہو تو رعایا کو سکون خاطر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی قانون کبھی بدل نہ سکے تو حالات کے بدلنے سے اگر اس قاعدے کے بدلنے کی ضرورت محسوس ہو تو گتھی کا کوئی حل مل نہ سکے گا۔ یہ آخر الذکر احتمال ایک مفروضہ ہے اور بس کیونکہ اگر پرانا قانون بعد میں بھی ٹھیک معلوم ہو تو اس کے بدلنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ ریاضی کے قاعدوں کی طرح کہ قدیم زمانے میں دو اور دو چار ہوتے تھے تو اب بھی چار ہی ہوتے ہیں، پانچ نہیں۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ اسلامی قانون کا جو حصہ اللہ اور رسول کے احکام (قرآن اور حدیث) پر مبنی ہو تو اس میں ثبات اور استحکام کا

فائدہ تو ہوگا، لیکن تعطل کی خامی اس میں اس وقت نہیں پیدا ہوگی جب جدید زمانے میں بھی عقل اسے مفید اور معقول سمجھے۔ اور تجربہ بتا رہا ہے کہ قرآن و حدیث کے احکام اب چودہ سو سال بعد بھی معقول ہی تسلیم کیے جا رہے ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ سارا اسلامی قانون قرآن و حدیث پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ بہت سے اجزا انسانوں، فقیہوں کے استنباط کردہ ہیں۔ اور ایک فقیہ کا حکم دوسرا فقیہ قبول بھی کر سکتا اور اپنی نئی رائے بھی دے سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے اختلاف آراء کی صورت میں معقول تر رائے کو سب قبول کریں گے، اور دوسری رائے رد کی جا سکے گی۔ مثلاً کون نہیں جانتا کہ بے شمار معاملات میں امام ابو حنیفہ کی رائے کو ترک کر کے ان کے شاگردوں (صاحبین وغیرہ) کی رائے کو خود حنفی مذہب میں قابل عمل سمجھا جاتا ہے۔

غور کریں تو نظر آئے گا کہ اسلامی قانون میں اولاً وہ سارے قاعدے داخل تھے جو ملک (مکہ، مدینہ، عرب) میں رائج تھے اور رسول اللہ نے ان کو منسوخ نہ قرار دیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ کچھ پرانے رواج قرآن یا حدیث نے بدلے، اور کچھ نئے احکام دیے۔ قبل اسلام کے غیر منسوخ شدہ قواعد کا ایک جز حدیث میں بھی ”تقریر“ کے نام سے شامل ہو گیا، یعنی وہ عرف و عادت، وہ رسم و رواج جسے رسول اللہ نے برقرار رکھا۔ عہد نبوی کے اواخر میں ایک مزید اور بہت اہم چیز بڑھی، اور یہ اجتہاد ہے۔ ہوا یہ کہ حضرت معاذ بن جبل گورنر بنا کر در دراز یمن کو بھیجے گئے۔ رخصت کے وقت رسول اللہ نے ان سے پوچھا: احکام کس طرح دیا کرو گے؟ کہا: کتاب اللہ کے مطابق۔ پوچھا: اگر اس میں حکم نہ ملے تو؟ کہا: رسول اللہ کی سنت کے مطابق۔ پوچھا: اگر اس میں بھی نہ ملے تو؟ کہا: پھر تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کروں گا۔ اس پر رسول اتنا خوش ہوئے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی: تعریف ہو اس اللہ کو جس نے اپنے نبی کے فرستادے کو اس چیز کی توفیق دی جو اس کے نبی کو پسند ہے۔

غرض عہد نبوی میں غیر منسوخ شدہ قدیم رسم و رواج، قرآن، حدیث اور (قرآن و حدیث کے سکوت میں) اجتہاد اسلامی قانون کے ماخذ تھے۔ ان کے علاوہ معاہدات کے ذریعے سے، نیز مماثلت RECIPROCITY کے طور پر بھی نئے قاعدے قبول

ہونے لگے تھے اور غیر ملکوں کے معقول قاعدے بھی قبول کیے جانے لگے تھے، خود بخود نہیں، بلکہ انفرادی بیرونی قاعدے اگر وہ ہمیں معقول معلوم ہوں۔ اجماع ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

اجتہاد کی اجازت تو رسول اللہ نے دی، لیکن ایک سے زائد لوگوں کے اجتہاد سے اختلاف کی صورت ابھی پیدا نہیں ہو سکی تھی، کیونکہ رسول اللہ کی زندگی میں اگر دو صحابیوں کی رائے میں اختلاف ہوتا -- اور بارہا ایسا ہوا بھی -- تو فریقین اسے رسول اللہ سے رجوع کرتے اور رسول کا حکم اس کا فیصلہ کر دیتا۔ لیکن رسول اللہ کی وفات کے بعد اختلافات پیدا بھی ہوئے اور بڑھتے ہی گئے۔ دیگر قوموں میں قانون سازی کا حق یا تو اہل دین کو ہوتا یا حکمران کو۔ اسلام میں یہ ممکن نہ تھا۔ خلفاء نے شاذ و نادر کچھ احکام دیے، اور وہ بھی فقہاء کے مشورے کے بعد، لیکن قانون سازی کا حق مسلمانوں میں غیر سرکاری اہل علم سے مختص ہو کر رہ گیا۔

عدل گستری کو حکمران سے آزاد رہنا چاہیے۔ اسے بہتوں نے مانا، اور اب مغرب میں بھی اس پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن قانون سازی کو بھی حکومت سے آزاد رہنا چاہیے، یہ اب بھی مغرب کے ذہن میں نہیں آیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر نئے انتخاب کے بعد نمائندوں کی اکثریت ہر پرانے قانون کو بدل سکتی اور بدلتی ہے۔ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ روایت یہ ہے کہ اجتہاد و استنباط سے اسلامی قانون کے کسی خلا کو پُر کرنا، یہ حکومت کا نہیں، اہل علم اور فقہاء کا کام ہے۔ ایسے نجی اہل علم چونکہ سب آپس میں مساوی ہوتے ہیں، اس لیے ہر شخص اپنی رائے دیتا اور دوسروں کو حق ہوتا ہے کہ کسی اور کی رائے کو قبول کرے یا رد کرے۔ کبھی کبھی سب ہم عصر کسی استنباط کو قبول کرتے رہے اور اسے اجماع کا نام دیا جانے لگا۔ مگر وہ اب تک کوئی ادارہ نہ بنا یعنی یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ آیا واقعی کسی قاعدے پر سارے لوگوں کو اتفاق ہے۔

اس عرض کا منشا یہ کہنا ہے کہ اسلام میں جس حد تک ذیلی قانون سازی ہو سکتی ہے، یعنی قرآن و حدیث کے سکوت کے وقت پیدا شدہ مسائل کا قاعدہ مقرر کرنا، یہ کام حکومتوں نے نہیں، نجی فقہاء نے کیا۔ گویا اسلام میں عدل گستری ہی نہیں، قانون سازی

بھی حکومت سے آزاد رہی ہے۔ اور یہ اس بات کی ذمہ دار رہی ہے کہ قانون کی تیز ترقی ہو۔ ہجرت پر ایک صدی بھی نہیں گزری تھی کہ نجی فقہاء نے اسلامی قانون کے مجموعے مدون کر کے شائع کر دیے، اور حکومتوں کو بھی اس پر اعتراض نہ رہا۔ چونکہ یہ نجی رائے تھیں، اس لیے کسی کے لیے واجب التعمیل نہ تھیں، ہو سکتا تھا کہ کوئی حاکم عدالت کسی کتاب کی کوئی بات قبول کر کے نافذ کرے، کوئی دوسرا کوئی دوسری چیز، ان سے جو دشواریاں پیدا ہوئیں ان کو کس طرح حل کیا گیا، وہ موجودہ بحث سے غیر متعلق ہے ان گتھیوں کو حل کیا گیا، اور آئندہ بھی ہر وقت حل کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ایک ذیلی چیز کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ بالا اختلافات آراء نے مسلمانوں میں ایک نئے علم کو پیدا کیا اور اس کا نام ہے علم الاختلاف۔ چنانچہ ایسی کتابیں لکھی جانے لگیں فلاں فلاں مسئلے میں کیا اختلاف ہے اور ہر فقیہ اپنی تائید میں کیا دلیلیں پیش کرتا ہے۔ اور پھر ایک مسئلے پر بنیادی اختلاف ہو تو اس کے نتیجے کے طور پر کیا کیا فرعی اختلاف خود بخود پیدا ہوتے ہیں، چاہے ابتدائی اختلاف کرنے والوں کے ذہن میں وہ نتائج آئے ہوں یا نہیں۔

خلاصہ :

علم قانون کی مسلمانوں نے بھی خدمت کی ہے۔ ان کی بعض جدتوں کو اوروں نے جلد یا بدیر قبول بھی کر لیا۔ بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو تاحال قبول نہیں ہوئی ہیں۔ چند چیزوں کا ہم نے یہاں ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے اور بھی چیزیں ہوں۔ تعاون اور اشتراکِ عمل سے ان کا پتا چلے گا اور اس سے سب فائدہ اٹھائیں گے۔

مسلمان علماء کی بین الاقوامی کانفرنس (۷ تا ۱۰ مارچ ۱۹۸۱ء) مقالات کانفرنس (جلد ہفتم۔ حصہ اول)۔

تاریخِ قانون میں مسلمانوں کا حصہ

تمہید:

قانون سے مراد انسان کے حقوق و فرائض کا علم ہے۔ یہ چیزیں کبھی عملدرآمد اور رسم و رواج سے وجود میں آتی ہیں، کبھی حکومت کے فیصلے سے، تو کبھی استنباط اور قیاس کے باعث۔ اس معنی میں قانون اتنا ہی قدیم ہے، جتنا انسانی سماج۔ بنی نوع انسان میں افراد کا فرق، گروہوں کے فرق میں؛ اور گروہوں کا فرق، ان کے قانونوں کے فرق میں منعکس ہوتا ہے۔

ہر انسانی گروہ ماحول یا تاریخی اسباب سے کسی نہ کسی چیز پر زیادہ زور دیتا ہے، اور اسی بنا پر اس خاص مسئلے میں زیادہ ممتاز نتائج حاصل کرتا ہے۔ قانون کی ضرورت ہر انسانی گروہ کو رہی ہے، چین ہو کہ ہندوستان، عراق ہو کہ ایران، مصر ہو کہ یونان، امریکا ہو کہ افریقا، کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا ہے۔ اور ہر گروہ نے قانون میں ترقی کی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے حصے یا کارنامے سے بحث کی جائیگی، تاکہ ہر دوسرا گروہ اپنے ہاں کے قانون کی تاریخ سے اس کا مقابلہ کر سکے۔

قانونیات یا اصولِ قانون:

قانون یعنی مجموعہ احکام ہر ملک میں ملتا ہے، تحریری ہو کہ غیر تحریری۔ لیکن قدیم

زمانے میں علم قانون کا پتا نہیں چلتا۔ قانون میں احکام کی تفصیل ہوتی ہے کہ فلاں کام کیا جائے، فلاں کام نہ کیا جائے وغیرہ۔ علم قانون میں اس سے بحث ہوتی ہے کہ قانون کی سماج کو ضرورت کیوں ہے، احکام کس طرح بنائے اور بدلے جاتے ہیں، تعبیر و اطلاق کس طرح ہو، استنباط کے کیا قاعدے ہیں وغیرہ۔ اول الذکر ہر ملک میں علاحدہ ہوتا ہے، آخر الذکر کا اطلاق دنیا کے ہر ملک اور ہر گروہ کے قانون پر کیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر کو درخت کی شاخیں اور ڈالیاں کہیں تو آخر الذکر کو اس درخت کی جڑ کہا جاسکتا ہے (جیسا کہ قرآنی آیت ”اصلها ثابت و فرعها فی السماء“ میں بھی کہا گیا ہے) اول الذکر کو اب قانون اور آخر الذکر کو اصول قانون کہتے ہیں۔

میرے علم میں اصول قانون پر دنیا میں سب سے پہلی کتاب مسلمانوں نے لکھی۔ چونکہ وہ قانون کو ”فقہ“ کہتے ہیں، اس لیے اس دوسرے علم کو وہ ”اصول فقہ“ سے موسوم کرتے ہیں۔ اس بارے میں قدیم ترین کتابیں امام ابو حنیفہ (ف ۱۵۰ء) اور ان کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی کی طرف منسوب ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اب دستیاب نہیں ہوتی کہ اس کی تحلیل کی جاسکے۔ آج کل موجود سب سے قدیم کتاب امام محمد شیبانی کے شاگرد امام شافعی کی ہے۔ اس کا نام ہے ”الرسالہ“۔ اس کا انگریزی ترجمہ ایک عراقی عیسائی مجید خدوری نے امریکا میں شائع بھی کیا ہے۔ اس میں فلسفہ قانون، ماخذ ہائے قانون، تعبیر، استنباط و اطلاق قانون اور مماثل چیزوں سے بحث اور ان کا اسلامی قانون پر اطلاق کیا گیا ہے۔ اس کے بعد سے اس موضوع پر مسلمانوں نے سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں اور دینی مدارس میں آج تک یہ موضوع نصاب کا جزو ہے۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ قانون تو نہیں، قانونیات کا آغاز مسلمانوں سے ہوا۔

فلسفہ قانون:

بھلائی اور بُرائی (خیر و شر) پر انسان قدیم سے غور کرتا آیا ہے اور اس سے فلسفہ میں بحث ہوتی ہے۔ لیکن قانون کو جبر و استبداد کی جگہ عقل اور نظریہ خیر و شر پر مبنی کرنا بھی

مسلمانوں ہی سے مخصوص نظر آتا ہے۔ اس کا آغاز کس مؤلف سے ہوا، یہ تو معلوم نہیں۔ امام غزالی کے ایک اشارے سے گمان ہوتا ہے کہ اس کا ذکر معتزلہ فرقے کے فقہاء سے ہوا۔ بہر حال مسلمانوں نے کہا ہے کہ جو بھلائی ہے، وہ ضرور کرنی چاہیے (فرض)؛ اور جو بُرائی ہو، اس سے بچنا ضروری ہے (حرام)۔ مخلوط چیزوں میں سے جس میں بھلائی زیادہ ہو، اس کی سفارش کی جائیگی (مستحب)، اور جس میں بُرائی زیادہ ہو، اس سے حوصلہ شکنی کی جائیگی (مکروہ)۔ جس میں بھلائی اور بُرائی دونوں برابر ہوں، یا جس میں نہ بھلائی نظر آئے نہ بُرائی، اس کو ہر شخص کی مرضی اور اختیار پر چھوڑ دیا جائیگا (مباح)۔ یہ منجگانہ تقسیم قانون کے سارے احکام پر حاوی ہے۔ قانون دیوانی ہو یا فوجداری، معاہدات ہوں یا وراثت، حتیٰ کہ عبادات بھی اسی میں آسانی سے داخل ہو جاتے ہیں۔ قطب نما کی ذیلی سمتوں ”شمال، شمال مشرق“ وغیرہ کی طرح ان قانونی بنیادی قسموں کی بھی ذیلی قسمیں کی جاتی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان فقہاء نے اسے قرآنی اصطلاحات معروف و منکر سے اخذ کیا ہے۔ معروف سے مراد اچھی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن اس لفظ کے لغوی معنی ہیں: ”جیسے ہر شخص جانتا اور مانتا ہو“، یعنی جس کی بھلائی اور خوبی سے ہر کوئی واقف ہو، اور کسی کو اس سے انکار نہ ہو۔ اسی طرح منکر سے مراد بُری چیزیں ہوتی ہیں، مگر اس اصطلاح کے لفظی معنی ہیں: ”جس سے کوئی واقف نہ ہو“، گویا جس کے رائج اور اچھے سمجھے جانے سے ہر کوئی انکار کرتا ہو۔ غرض اسلامی قانون اپنے ہر حکم اور ہر ممانعت کے متعلق یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ خیر و شر کی مسلمہ فلسفیانہ اساس پر پوری اُترے اور اس کی محض جبر کی بنا پر تعمیل نہ کی جائے۔

تعمیل کے وسائل اور تہدیدات:

آج کل کہا اور پڑھا یہ جاتا ہے کہ قانون کی تعمیل اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ ملک کے مقتدر اعلیٰ (بادشاہ یا پارلیمنٹ) کا حکم ہے؛ اور اگر اس کی تعمیل نہ کریں، تو وہ ہمیں پولیس، فوج اور عدالت کی مدد سے مجبور کریگا کہ اس کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے۔

لیکن اس بیان میں کئی خامیاں ہیں۔ پہلے یہ کہ قانون کا بعض لوگوں پر اطلاق نہیں ہو سکتا مثلاً قانون انگلستان یہ کہتا آیا ہے کہ بادشاہ کوئی غلط، ناحق کام کر ہی نہیں سکتا۔ وہ، اور دیگر مغربی قوانین بھی، غیر ملکی سفیروں وغیرہ کو مقامی عدالت کے اختیار سماعت سے باہر مانتے ہیں۔ دوسری خامی یہ ہے کہ چونکہ اساس جبر ہے، اس لیے ہر شخص کو اس کے خلاف ضد ہوتی ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے فرائض کو چھپائے اور قانون کی زد میں نہ آئے۔ دوسرے الفاظ میں، اگر حکومت کسی شخص کے واجبات سے واقف نہ ہو، تو اُس شخص کو کوئی ترغیب نہیں ہوتی کہ وہ از خود حکومت کو ان سے واقف کرائے اور اپنا فریضہ انجام دے۔

اسلام نے قانون کی تعمیل دو گونہ اساس پر مبنی رکھی ہے: اولاً، یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ قانون خدا کا حکم ہے اور خدا عالم الغیب ہے، جس سے کوئی چیز چھپائی نہیں جاسکتی؛ وہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہمیں دوبارہ زندہ کر کے ہمارے دنیوی اعمال کا رتی رتی حساب لیگا اور جزا و سزا دیگا۔ دوسرے، سارے دنیوی وسائل (پولیس، فوج، عدالت وغیرہ) بھی مہیا رکھے۔ مزید برآں حکم بھلی چیزوں ہی کا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ سچا مسلمان کسی جبر کے نہ ہونے کے باوجود نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہے؛ اسی طرح حکومت کے ناواقف یا کسی اور وجہ سے کمزور ہونے کے باوجود ٹیکس دیتا اور دیگر فرائض کا انجام دینا ضروری سمجھتا ہے۔

قانون جنگ و صلح:

اسے آج کل قانون بین الممالک کہتے ہیں (بعض لوگ بین الاقوام بھی کہتے ہیں)۔ قدیم زمانے میں یہ نہ تو واقعی بین الممالک اور عالمگیر تھا اور نہ قانون ہی۔ یہ کاملاً حکمران اور سپہ سالار کی مرضی پر ہوتا تھا کہ دشمن اور اجنبی سے کیا برتاؤ کیا جائے۔ یہ کوئی متعین قاعدہ نہیں تھا، بلکہ ہر وقت بدلا جاسکتا تھا بعض وقت اس کے لیے کوئی قاعدے ہوتے بھی، تو ان کا اطلاق ہم نسل، ہم مذہب اور ہم زبان دشمنوں ہی تک محدود رہتا، دوسروں سے نہیں۔ اسی لیے اس موضوع کے قواعد، اگر بیان بھی ہوتے، تو کسی قانون

کی کتاب میں نہیں، بلکہ سیاسیات کی کتاب، شہزادوں کی تعلیم و تربیت کی کتاب میں بیان ہوتے۔

قانون بین الممالک کو ”قانون“ اور ”بین الممالک“ دونوں قرار دینا، اور اس کو عام قانون ملک کا ایک جزو قرار دینا۔۔۔ اس کا آغاز بھی مسلمانوں میں ملتا ہے۔ امام حسینؑ کے پوتے زید بن علی کی وفات ۳۸ھ میں بتائی جاتی ہے۔ ان کی تالیف ”المجموع فی الفقہ“ اب چھپ گئی ہے؛ اور یہ مسلمانوں کی قانونی کتابوں میں سے سب سے قدیم ہے، جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس میں جہاں معاملات، وراثت وغیرہ کے ابواب ہیں، وہیں ایک باب ”سیر“ کے عنوان سے بھی ہے۔ اس میں ساری غیر مسلم دنیا (نیز باغی مسلمانوں) سے جنگ اور صلح کے احکام دیے ہیں۔ اس کے بعد سے اب تک فقہ کی جو لاتعداد کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ہر ایک میں یہ باب ملتا ہے۔ گویا، بین الممالک تعلقات کے احکام قانون کا جزو بن گئے؛ اب وہ انفرادی صوابدید اور من مانی کرنے کی چیز نہیں رہے۔

اس موضوع کی اہمیت کے باعث مسلمانوں نے اسے ایک مستقل علم بھی بنا دیا۔ ابن حجر العسقلانی نے امام شافعی کی جو سوانح عمری لکھی ہے، اس میں بتایا ہے کہ سیر پر مستقل کتاب سب سے پہلے ابو حنیفہ نے لکھی (جو مذکورۃ الصدر زید بن علی کے شاگرد کہے جاتے ہیں)۔

اس کے نظریات کی ایک معاصر فقیہ امام اوزاعی نے تنقید کی۔ ابو حنیفہ نے خود اس کا جواب دینا مناسب نہ خیال کیا، مگر ان کے ایک شاگرد ابو یوسف نے الرد علی سیر الاوزاعی کے نام سے ایک کتاب لکھی (جواب چھپ گئی ہے)۔ پھر امام شافعی نے اس ساری بحث کی تنقیح کی۔ انہوں نے اپنی کتاب الام میں ”سیر الاوزاعی“ کے نام سے ایک باب شامل کیا، جس میں سارے فریقوں کے دلائل نقل کر کے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی تحقیق اور ذاتی رائے لکھی ہے۔

ان لوگوں کے معاصر امام مالک، امام محمد شیبانی، امام زفر، نیز مشہور مؤرخ اور بغداد کے قاضی و اقدی نے بھی اس موضوع پر ”کتاب السیر“ کے عنوان سے مستقل

کتابیں لکھیں۔ بعد کی صدیوں میں سرخسی (ف۔ ۱۰۹۰ء) نے امام محمد شیبانی کی شرح کر کے ”شرح السیر الکبیر“ لکھی، جو دائرۃ المعارف، حیدرآباد (دکن) نے عرصہ ہوا، چار ضخیم جلدوں میں چھاپی تھی (یونیسکو نے اس کی اہمیت محسوس کر کے مجھ سے اس کا فرانسیسی ترجمہ کرایا ہے، جو چھپنے کے لیے بیروت بھیجا جا چکا ہے۔)

تحریری قانون دستور:

دستور یعنی حکومت کرنے کا طریقہ اتنا ہی قدیم ہے، جتنا خود مملکت کا دنیا میں وجود۔ لیکن اگر دستور سے ہم حکومت کا صرف وہ طریقہ مراد لیں، جو تحریری اور مدونہ بھی ہو اور ملک کے حکمران کی طرف سے نافذ کیا ہوا بھی ہو، تو یہ اسلام سے قبل مجھے کہیں نہیں ملا۔

چین کے کنفیوشس کی کتاب ”شوکنگ“ ہندوستانی کوٹلیہ کی ”ارتھ شاستر“ اور یونانی ارسطو کے ”دستور آتھنس“ کو دستور مملکت کہا جاسکتا ہے، لیکن یہ دزیوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، کسی حکمران کی طرف سے نافذ کردہ آئین نہیں۔ مزید برآں ارسطو کی کتاب میں شہری مملکت آتھنس کے دستور کی تاریخ اور ارتقا بھی بتایا گیا ہے۔ گویا یہ ایک درسی اور تاریخی کتاب ہے، قانونی دستاویز نہیں۔ ارسطو سے پہلے سولن کا کارنامہ بھی اس ذیل میں نہیں آتا کیونکہ نہ صرف یہ کہ سولن ملک کا واحد حکمران نہیں تھا، بلکہ یہ بھی کہ اس نے اپنے وطن کے دستور میں صرف چند ترمیمیں کیں، سارا دستور مدون اور نافذ نہیں کیا۔

زمانہ حال میں انگریزوں کا ماگنا کارنا جن حالات میں بھی مرتب ہوا ہو، وہ بہر حال ۱۲۱۵ء میں وجود میں آیا۔ فرانسیسی اور امریکی دستور تو اور بھی بعد کے ہیں۔ ان حالات میں پیغمبر اسلام کا دستور مملکت مدینہ جو ۶۲۲ء کے غالباً ماہ جون میں مدون اور نافذ ہوا، دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت کہا جاسکتا ہے۔

ہوایہ کہ جب آنحضرتؐ نے بت پرستی ترک کرنے اور اچھے اخلاق و عادات پر عمل کرنے کی اسلامی دعوت دی، تو ان کے ہموطنوں نے مخالفت کی، اور روزافزوں

اذیت دینی شروع کی۔ آخر مجبور ہو کر آپ کو ترک وطن کرنا پڑا۔ آپ مدینہ چلے آئے، جہاں حکومت کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ شہر عبارت تھا، چند قبیلوں سے جو آئے دن خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتے تھے چونکہ یہاں کے سربراہ آردہ قبیلوں کے سردار مسلمان ہو گئے تھے، اس لیے اس ”اجنبی غیر جانبدار“ شخص (یعنی منشیہ اسلام) کی سرکردگی میں بہ آسانی امن قائم ہو گیا۔ رسول اکرم نے ۵۲ دفعات پر مشتمل ایک دستاویز مرتب فرمائی، جس میں مدینے کو ایک شہری مملکت اور خود مختار سلطنت قرار دیا گیا؛ حکمران اور رعایا کے باہمی حقوق و فرائض بتائے؛ عدل گستری، قانون سازی، جنگ و صلح وغیرہ کے اصول درج کیے؛ مسلمانوں اور غیر مسلم رعایا کے تعلقات کی تفصیل دی؛ مختلف اہم مالی ذمہ داری پیدا کرنے والے حادثات کے لیے بیسے (انشورنس) کا نظام قائم کیا؛ اور دیگر انتظامی تفصیلات کے علاوہ صراحت سے یہ بھی کہا گیا کہ مسلمان ہوں کہ غیر مسلم، ساری رعایا اپنے جھگڑوں میں آنحضرت کا حکم بجالائیں۔

اس دستور کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے اور دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے علاوہ اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے (دیکھیے میری کتاب ”عہد نبوی میں نظام حکمرانی“ میں باب ”دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور“۔)

موازنہ حکومت (بجٹ):

مختلف مذہبوں اور تمدنوں کی اساسی کتابوں میں جہاں حکمرانی کے قواعد کا ذکر ملتا ہے، وہیں حکومت کی آمدنی اور ٹیکسوں وغیرہ کی تفصیل بھی کچھ نہ کچھ ملتی ہے! لیکن میرے علم میں اس سرکاری آمدنی کے خرچ کے قواعد اسلام سے قبل کہیں نہیں ملتے؛ گویا ان کو حکمران کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

۱۔ مسلمانوں میں ہارون رشید بلکہ اسے بھی کچھ قبل کے مفصل موازنے اب تک تاریخ میں محفوظ ہیں کہ کس مدے، کس مقام سے، کتنی رقم وصول ہوتی تھی۔ غیر مفصل موازنے یعنی مجموعی آمدنی کا ذکر عہد بنی امیہ کے گویا آغاز سے ملتا ہے۔ صوبہ عراق کی آمدنی تو حضرت عمر کے زمانے سے معلوم ہے، اور ہر دور میں جو کمی زیادتی اس میں ہوتی رہی، اس کا بھی پتا چلتا ہے۔

قرآن وہ واحد دینی کتاب ہے، جس میں موازنہ خرچ کے تفصیلی احکام دیے گئے ہیں، اور حکم دیا گیا ہے کہ سرکاری آمدنی کن چیزوں پر خرچ کی جائے (دیکھیے سورہ ۶۰:۹):

جز ایں نیست کہ مسلمانوں سے وصول ہونے والے محاصل فقراء اور مساکین کے لیے ہیں، نیز ان لوگوں کے لیے جو (ان محصولوں کے وصول اور خرچ کرنے کا) کام کریں؛ اور ان کے لیے جن کے دل موہ لینا مقصود ہو؛ اور گردنوں (کو بھونے سے چھڑانے) کے لیے؛ اور کچلنے والی مالی ذمہ داریوں میں دے ہوئے لوگوں کے لیے؛ اور اللہ کی راہ میں؛ اور فرزند راہ (مسافر) کے لیے۔ یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا فریضہ ہے اور اللہ خوب جانتا اور حکمت والا ہے۔

اس میں ابتدائی لفظ بہت اہم ہیں ”جز ایں نیست“: اس کے سوا کچھ اور نہ کیا جائے۔ اس آیت میں آٹھ جامع مذاات گنائی گئی ہیں، جو حکومت اور رعایا کی یہی خواہ حکومت کے سارے اخراجات پر حاوی ہیں۔ اس آیت میں صرف مسلمان رعایا سے وصول ہونے والے محصولوں کا ذکر ہے، غیر مسلم رعایا کے ٹیکس کے خرچ کرنے کے احکام دوسری آیتوں میں ہیں۔ موجودہ آیت کے سلسلے میں امام ابو یوسف کی ’کتاب الخراج‘ میں حضرت عمر کا یہ قول درج ہے کہ فقراء سے مسلمان محتاج مراد ہیں اور مساکین سے غیر مسلم مساکین۔ تیسرا زمہ ”عالمین“ کے لیے ہے؛ اس میں سارا کشوری اور لشکری لقم و نسق شریک ہو جاتا ہے، گویا ملازمین سرکاری۔ چوتھی مد مولفۃ القلوب کے لیے ہے۔ اس کی تشریح ابو یعلیٰ القراء نے اپنی ”الاحکام السلطانیہ“ میں یوں کی ہے:

اس میں چار قسم کے لوگ شامل ہیں: پہلے وہ، جو مسلمانوں کی مدد کریں؛ دوسرے وہ، جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز رہیں، تیسرے وہ، جو اسلام قبول کرنا چاہیں، چوتھے وہ، جن

کی وجہ سے ان کے عزیز اور رشتے دار مسلمان ہو سکیں۔ ان میں سے ہر کسی پر یہ مدخر کی جاسکتی ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

گویا یہ آج کل کی اصطلاح میں ”سیکریٹ فنڈ“ ہے۔ پانچویں زمرے میں، فقہاء اور مفسر، دو اخراجات شامل کرتے ہیں: ایک تو ملک میں پائے جانے والے غلاموں کو آزاد کرانا، (ان کے آقاؤں کو معاوضہ دے کر)؛ اور دوسرے ملکی رعایا، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اگر وہ دشمن کے ہاتھ جنگ وغیرہ میں قید ہو گئی ہو، تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ دینا، چھتا زمرہ قرض اور مالی ذمہ داری سے دبے ہوئے لوگوں کا ہے۔ یہ فقراء و مساکین نہیں، جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، بلکہ وہ لوگ ہیں جن کی ضرورت عارضی ہوتی ہے، مثلاً زلزلے یا طغیانی کے مصیبت زدہ، خون بہا ادا کرنے کے مستوجب وغیرہ۔ ایسے لوگوں کی بلا معاوضہ مالی اعانت بھی کی جاسکتی ہے، انہیں بلا سود قرض بھی دیا جاسکتا ہے، جیسا کہ حضرت عمر کے زمانہ خلافت میں اکثر ہوتا رہا۔ ساتویں مد ”فی سبیل اللہ“ کی ہے، جس میں فقہاء اور مفسر کے نزدیک سب سے پہلے ملک کا دفاع اور فوج آتے ہیں۔ اس کے بعد مسجدیں، مدرسے اور سارے خیراتی کام ہیں۔ آٹھویں اور آخری مد ”فرزیدِ راہ“ کی بتائی گئی ہے۔ مسافروں کی مہمان نوازی صرف یہی نہیں کہ انہیں مفت کھانا کھلا دیا جائے، سفر کے لیے سڑکوں، پلوں کی تعمیر، جان و مال کی حفاظت کے لیے پولیس کا انتظام، حفظانِ صحت کے لیے دواسازوں اور دوا فروشوں کی نگرانی اور شفا خانوں کا قیام، ان کے رہنے کے لیے ہوٹلوں، سرایوں کا نظام وغیرہ۔ غرض وہ سارے انتظامات آجاتے ہیں، جن سے ”فرزیدِ راہ“ کو جانی اور مالی حفاظت اور آرام مل سکتا ہے۔

متفرقات:

مجھے تو کسی قدیم قانونی نظام میں ”نیت“ کا ذکر بھی نہیں ملا۔ یہ آنحضرت کے قول ”انما الاعمال بالنیات“ (اعمال نیتوں ہی پر مبنی ہیں) کے باعث اسلامی قانون،

خاص کر فوجداری اور تعزیرات میں اہمیت کی حامل ہے۔ نابالغ بچے، مجنون، سہو اور غلط فہمی میں مبتلا شخص وغیرہ، اسی بنا پر مستوجب سزا قرار نہیں پاتے۔

تقابلی قانون بھی مجھے اولاً مسلمانوں کے ہاں ملتا ہے۔ ”اختلاف الفقہاء“ نامی کتابوں میں نہ صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں مسئلے میں کس کی کیا رائے ہے، بلکہ یہ بھی کہ ہر ایک فریق کی دلیل کیا ہے پھر کسی بنیادی اختلاف کے نتائج اور تفرعات کا ذکر ہوتا ہے۔ مسلمان فقہانے اپنی قانونی کتابوں میں احکام کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، عبادات، معاملات، عقوبات، اور وراثت۔ اس طرح یہ دینی اور دنیوی، روحانی اور مادی، ساری زندگی کے احکام پر حاوی ہو جاتے ہیں بلکہ وراثت میں تو مرنے کے بعد اثر انداز ہونے والے احکام (وصیت، تقسیم ترکہ وغیرہ) سے بھی بحث ہوتی ہے۔

آخر میں تدوین قانون کی تیز گامی کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ زید بن علی (ف ۳۸۷ء) کی کتاب قدیم ترین موجودہ کتاب ہے اور مذکورہ تقسیم پر مشتمل ہے اور امام محمد شیبانی (ف ۸۰۵ء) نے جو شارلمان کے ہمعصر ہیں ”کتاب المبسوط“ لکھی، جس کا نامکمل مخطوطہ، جو استانبول میں ہے، چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ گویا رسول اکرم کی وفات کے سو سال کے اندر ایک اُن پڑھ قوم تمدن کی اس سطح پر پہنچ گئی کہ دنیا کی تاریخ قانون میں اہم اضافوں کے قابل ہو جائے۔

(نذر عابد۔ مرتبہ مالک رام)

مجلس نذر عابد۔ نئی دہلی ۱۹۷۷ء)

رُومی قانون اور اسلامی قانون کے تعلقات پر چند ملاحظات

حق بات کو ماننا چاہیے۔ خواہ وہ تلخ ہو، مسلمان فقہاء نے اسلامی قانون کی جو تدوین کی، آیا اس میں انہوں نے فلسفے، طب وغیرہ کی طرح، بیرونی مدد لی یا نہیں؟ اگر لی ہے تو چشم ماروشن اور اگر نہ لی تو چشم ماروشن، اس میں نہ تو شرمانے کی ضرورت ہے اور نہ مغرور ہونے کی بلکہ تلاش و تحقیق کی ضرورت ہے۔ اسی جذبہ کے تحت اس موضوع کا میں مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ ”وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ“۔

بعض ”بے رنگ“ اہل قلم کو ضد ہے کہ رنگدار قوموں میں ایچ نہیں ہو سکتی اور اُن کی ہر عمدہ چیز یونان یا روما کی نقل اور بگڑی ہوئی نقل ہوتی ہے، فقہ کی حد تک اہل قلم کی کمی نہیں اور اُن کی متفقہ یقین دہانی پر ”طائفان دزدان بر سر قلہ کوہ نشستہ بودند“ کا قصہ صادق آتا ہے اور بکرا لے جانے والوں میں بعض بھولے بھی ہوتے ہیں، میں نے ایسی بہت سی چیزیں پڑھیں لیکن ان میں بے بنیاد مفروضات اور بے دلیل دعووں کے سوا کم کوئی چیز ملی۔

ایک مقالہ فقہ اسلامی کی تدوین و ارتقاء میں بیرونی موثرات پڑھا تھا۔ ایک اور مقالہ انجمن علمی اساتذہ جامعہ عثمانیہ کو سنایا گیا تھا۔ رسالہ اسلامک کلچر حیدر آباد ۱۹۳۹ء (ص ۱۲۵ تا ۱۲۶) میں بھی بعض چیزیں شائع کیں۔ امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی (مجموعہ مقالات حیدر آباد اکاڈمی ۱۳۶۱ھ) کا باب بھی اسی پر مشتمل ہے۔ سب سے مفصل بحث میں نے کُل ہند موثر مستشرقین ہند کے اجلاس حیدر آباد ۱۹۳۱ء میں کی۔ مجھے علم نہیں یہ مقالہ اس کی روداد میں چھپایا نہیں لیکن اسے حیدر آباد اکاڈمی کے مجموعہ

مقالات (۱۹۳۳ء) میں انگریزی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ (انفلونس آف رومن لائون مسلم لا)

ہندی موثر مستشرقین (۱۹۳۱ء) کے ایک سال بعد اطالوی زبان میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے اس کا نام ”تحریرات کارنوناں یسوا انجہانی، جلد چہارم، مشرق قوانین“ ہے مجھے اس کا علم ابھی چند ماہ ہوئے ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ یہ مقالہ ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا لیکن چھپ نہ سکا اور ۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ مارگیولٹ، شناخت وغیرہ کے مضامین کے مقابلہ میں یہ ایک دیانت دارانہ علمی تحقیق ہے اور اس قابل ہے کہ ہمارے اہل علم اس سے واقف ہوں۔

ایک اور مضمون جامعہ الجزائر کے پروفیسر بوسکے نے ۱۹۴۷ء میں فرانسیسی میں لکھا تھا جو رویو لٹریٹیرین (جولائی تا ستمبر ۱۹۴۷ء مطبوعہ الجزائر) میں چھپا تھا۔ یہ ایک طرح سے نال یسو کے مضمون کا تکملہ ہے اور رطب ویابس پر مشتمل ہونے کے باوجود کافی معلومات کا حامل ہے۔

اولا نال یسو کا مضمون اطالوی سے ترجمہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ناظرین کو پسند آیا اور طلب جاری رہی تو فرانسیسی مضمون (مولفہ بوسکے) کا ترجمہ بھی گزرا نا جائے گا۔

میں یہاں صرف ایسے خیالات پیش کروں گا جو اصلاً تاریخی نوعیت کے ہیں۔ اور یہ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ممتاز ماہران قانون کے اس کثیر مجمع میں مجھے کچھ کہنے کی گنجائش ہو سکے۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو وہ پہلا شخص جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلامی قانون مادی حد تک رومی قانون سے ماخوذ ہے، ۱۸۶۵ء میں دوے نی کوکات تیسکی (Domenicogathesche) تھا (دیکھو اس کی اطالوی تالیف In annual di diritto pubblico privato otto mano) یعنی عثمانی قانون عمومی و خصوصی کی متداول کتاب مطبوعہ سکندریہ ۱۸۶۵ء۔ یہ شخص سکندریہ کی عدالت مرافعہ مخلوط میں وکالت کرتا تھا اور انجمن المعہد المصری کا رکن تھا۔ اسے نہ عربی آتی تھی اور نہ ترکی لیکن اسے سلطنت عثمانیہ (ترکی) اور مصر سے

تعلق رکھنے والے مسائل قانون و ضابطہ سے بڑی دلچسپی تھی اور اس موضوع پر قابل قدر کتابیں (مغربی زبانوں میں ۱) ناپید نہ تھیں۔

وہ اپنے قیاس کا آغاز بعض مفروضات سے کرتا ہے جو اس حیثیت سے بہت کچھ قابل بحث ہوتے ہیں کہ تاریخی وجوہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یا نہیں اور یہ کہ دونوں قوانین (جسٹی نین کے قانون روم اور اسلامی قانون) میں متعدد مشابہتیں پائی جاتی ہیں، یا نہیں۔ اس کا گمان تھا کہ رومی احکام و قواعد کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جعلی حدیثوں کی شکل میں مسلمانوں نے اپنے ہاں آسانی داخل کر لیا ہو گا۔

اس وقت سے اس نظریہ کی طرح طرح سے تائید کی جاتی رہی ہے۔ کبھی تو پورے اذعان کے ساتھ اور کبھی محض قیاس کی بناء پر یہ مویدین یا تو غیر مستشرق قانون دان ہیں، جن میں سے بعض براہ راست یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ مسلمانوں کا قانون اساساً رومی قانون ہے۔ جس میں بہ مشکل کوئی ترمیم کی گئی ہے جیسا کہ ہنری ہیوز نے ۱۸۸۱ء میں کہا تھا یا وہ طلبہ مسائل اسلامی ہیں۔ جو قانون میں بہت کم دخل رکھتے ہیں۔

لیکن حقیقت میں کسی نے بھی اس موضوع کی ساری پیچیدگیوں پر غور نہیں کیا جو اسلامیاتی ماخوذیت کے طرفدار ہیں۔ وہ یا تو عام ادعا پر اکتفا کرتے ہیں جو تخمینہ اندازوں کا ثمرہ ہوتا ہے، نہ کسی گہرے مطالعے کا، یا بہت ہی مخصوص نکات تلاش کرتے ہیں۔ یا معین اسلامی قواعد اور متعین رومی قواعد کی مماثلتوں کو جمع کرتے ہیں جو بعض وقت زیر بحث مسئلہ پر اثر انداز تو ہوتی ہیں لیکن اس سے اس کا اثبات نہیں ہوتا اور یہ مماثلتیں بے شبہہ زیر بحث مسئلے پر قیمتی مواد مہیا کرتی ہیں لیکن اس کو حل کرنے سے بہت دور ہیں۔

ان کے مقابلہ میں چند جدید مسلمان ایرانی بہائی مؤلف، ابو الفضل الجارقدانی کی ایک تالیف کی بناء پر جو ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی اور جس کا عربی متن عبد الجلیل سعد

۱۔ یہ تین لفظ میں نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ غالباً یہی مراد ہے (مترجم)

کی ”مقدمۃ القوانين“ میں ہے، یہ ادعا کرتے ہیں کہ جس چیز کو اہل یورپ رومی قانون کہتے ہیں وہ اصل میں اسلامی قانون سے ماخوذ ہے۔

اس لیے میں چاہتا ہوں کہ قانون روما کے (جس سے اس کا وسیع ترین مفہوم مراد ہے) قانون اسلام پر عمیق اثر پڑنے کے متعلق مجھے جو شکوک و شبہات ہیں، ان کے سب وجوہ یکجا بیان کر دوں اور چند ایسے نکات بتاؤں جن کو ان دونوں قانونوں کے باہمی تعلقات پر رائے ظاہر کرنے والوں نے یا تو محض بے وجہ فرض کر لیا یا نہایت ناکافی بنیاد پر انہیں قابل لحاظ قرار دے لیا۔

(۱) ایک اور غلط بحث اس مسئلہ میں اس بناء پر پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ بتانا بھول جاتے ہیں کہ قانون اسلامی کا کیا مفہوم ذہن میں ہے۔ ”قانون اسلامی“ کی یہ اصطلاح اہل یورپ کے ہاں مختلف معنی اختیار کر لیتی ہے۔ اکثریت کے ہاں یورپی زبانوں اور نظاموں میں اس کے ہم معنی اصطلاح کی غیر موجودگی کی وجہ سے جس چیز کو مسلمان ”فقہ“ سے موسوم کرتے ہیں، اس کا مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مذہبی قانون (شریعت) کا وہ حصہ ہے جو مومن کے خدا کے ساتھ، اپنے آپ کے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ پائے جانے والے تعلقات ظاہری کے احکام بیان کرتا ہے۔ قانون کا جو مفہوم اہل مغرب کے ہاں ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہ تعریف ایک جہت سے ضرورت سے زیادہ وسیع ہے اور ایک جہت سے ضرورت سے زیادہ تنگ ہے چنانچہ عبادات جن میں بعض ایسے احکام بھی مندرج ملتے ہیں جو ہمیں قانون عمومی سے متعلق معلوم ہوتے ہیں مثلاً نظام خراج کے بعض اجزاء اور قواعد معدنیات وغیرہ قانون خاندان و اشخاص و وراثت، قانون جائیداد (بشمول اوقاف) قانون معدلت (آداب القاضی) و عقوبات، قانون جنگ (سیر) اور بعض ایسے مسائل جو اہل مغرب کو مذہبی رسم و رواج سے زیادہ متعلق نظر آتے ہیں مثلاً یمین و نذر معمولی مسالخ قربانی کا ذبیحہ جائز و ناجائز اکل و شرب، صید البر والبحر، لباس جن کا ذکر فقہ میں ہوتا ہے اس کے برخلاف مقدس مصاور (قرآن و حدیث) کے مہیا کردہ عناصر میں صراحت نہ ہونے کے باعث قانون عمومی کے اہم حصے اور خود قانون خصوصی (پرائیویٹ لا) کے متعدد اجزاء فقہ سے خارج سمجھے

گئے ہیں مثلاً نظریہ سلطنت و سلطان قانون انتظامی کے بہت سے اجزاء جن کو سیاست شرعیہ کہا جاتا ہے یعنی معاملہ عمومی میں صوابدید کا اس طرح استعمال کہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔

بعض اہل یورپ قانون اسلامی کے ایک ایسے معنی بتاتے ہیں جو فقہ سے کافی مختلف ہیں۔ چنانچہ وہ فقہ سے اپنے من مانے ایسے اجزاء الگ کر لیتے ہیں جو مغربی تصورات کے مطابق واقعی قانون ہیں اور ان میں وہ کچھ تو ایسے امور کا خاص کر قانون عمومی کے مسائل کا اضافہ کر لیتے ہیں جو مسلمانوں کی نظر میں سیاست شرعیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ ایسے مسائل کا جو فقہ میں بڑھائے گئے ہیں اور متاخر زمانہ میں گوارا کر لیے گئے ہیں مثلاً طویل المدت اجارات اراضی کے معاہدے جن کو بہت متاخر زمانہ میں بحر متوسط کے اسلامی ممالک میں اوقاف اور جاگیروں کی کثرت و ترقی کے باعث جائز تسلیم کر لیا گیا ہے۔

اس طرح بعض وقت خاص کر نوآبادیاتی ماحول میں قانون اسلامی کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ اس قانون کا نام ہے جو کسی خاص علاقے کے مسلمانوں میں مستعمل ہو یعنی وہ اجزائے فقہ جن پر عمل متروک نہ ہو گیا ہو بشمول اس خالص رواجی قانون کے جس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا تین تعریفوں میں سے کسی ایک کو بھی ترجیح دی جائے تو قانون روما کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ کس قدر مختلف طور پر پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ صدر تعلقات کے متعلق جو لوگ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں ان میں سے اکثر کے متعلق یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا وہ صرف کلیات موضوعہ کی حد تک یعنی بطور علم قانون کے قانون اسلام کو قانون روما کا تابع قرار دیتے ہیں (جیسا کہ حقیقت میں بعض کا خیال ہے) یا صرف کتابوں میں مواد کی ترتیب و تبویب کی حد تک۔

(۲) مزید بحث سے پہلے یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ عربی قانون یا عربی قانونوں کی حالت اسلام سے پہلے کیا تھی۔ اس بارے میں بنیادی تحقیقات اب تک عمل میں نہیں

لائی گئی ہے اور ایسی تحقیقات کی ضرورت کو وہ لوگ بالکل نظر انداز کرتے رہے ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر خاندان (ازواج اور اس کے تعلقات) وراثت، تعزیرات اور طریقہ عدل گستری کے قانون کو چھوڑ دیا جائے تو عربوں کا قانون ایک ایسی خلا سے مشابہ تھا جسے رفتہ رفتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے زمانوں میں غیر عربی اقوام نے جو اسلامی حکومت کے ماتحت اور مسلمان بنائی گئی تھیں اجنبی قوانین سے پر کر دیا۔

لیکن قبل از اسلام ترقی یافتہ عربی قوانین کا پایا جانا ہر شک و شبہ سے پاک ہے۔ ہم صرف جنوب مغربی عرب ہی سے بحث نہیں کرتے جو نہایت پرانے شہر روم کی بنیاد رکھے جانے سے بھی پہلے قدیم تمدن کا مرکز تھا اور جس میں مملکتی عضویتیں (یا ادارے) شاہی قسم کے دستور کے ساتھ مستحکم طور پر موجود تھے اور جہاں اس کا رواج عام تھا کہ معاہدوں کو پتھریا تانے پر کندہ کر کے شائع کرتے تھے اور جہاں ایک با اقتدار تحریری قانون بھی پایا جاتا تھا چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ایک سبائی کتبہ شائع کیا گیا ہے جس میں سبا اور ذوزید ان کے بادشاہ شمر بیہر عرش (تقریباً ۲۸۰ء) نے جانوروں اور غلاموں کی جنایات کے سلسلہ میں قانون تعذیب (قید و جلا وطنی؟) کے حدود و احکام مقرر کیے ہیں۔ اس جنوب مغرب ہی سے نہیں بلکہ ہم ۶۰۰ء کے لگ بھگ کے زمانے کی حجاز کی حضری و شہر نشین آبادیوں سے بھی بحث کرتے ہیں۔ جن کی مدد کو اسلام نکل کھڑا ہوا تھا۔ یہ ممکن نہیں کہ اس سے صدیوں پہلے ان لوگوں میں قانون جائیداد نے قابلی ذکر ترقی نہ کر لی ہو۔ اس بات کی طرف اشارہ کافی ہے کہ قریش مکہ بین الممالک نوعیت کا عظیم الشان کاروانی و تجارتی کاروبار کرتے تھے اور خانہ کعبہ کے حج کے سلسلہ میں میرہ (غلہ رسانی) و خفارہ (بدرقہ) کی عظیم خدمات انجام دی جاتی تھیں، بڑے زرعی اور آب رسانی کے کام انجام دیے گئے تھے اور مدینہ تبوک، تہما، الیمامہ وغیرہ کے نخلستانوں میں مختلف قسم کے زراعتی معاہدے ہوا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کم سے کم اسلامی قانون جائیداد کے ایک بڑے حصے کے جراثیم اس آبادی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کافی پہلے وجود میں آچکے تھے۔

بیشک یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ فلسطین و شام سے تماس کے باعث رومی اثرات

عرب میں آگئے ہوں لیکن اگر ایسا ہوا ہوگا تو یہ اثرات اسلامی قانون پر قبل اسلام کے عربی قانون کے توسط سے پڑے ہوں گے نہ کہ اسلامی زمانے میں جب کہ عربوں نے اپنے جزیرہ نما کے باہر بڑی فتوحات حاصل کیں اور یہ مفروضہ بھی محض گمان ہی گمان ہے جس کی اب تک واقعات و حقائق سے کوئی تائید نہیں ہوتی اور اگر ایسی کوئی چیز ثابت بھی ہو جائے تو اس سے دوسری قسم کی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ میں یہاں صرف ایک چیز کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ پانچویں صدی عیسوی کے نصف اول کی مشہور شہادت تھیوڈورینو کا بیان ہے کہ رومی سلطنت کے اقصائے حدود میں ایسی آبادیاں ہیں جو روما کی ماتحت تو ہیں مگر ان پر رومی قانون نافذ نہیں ہوتا، تھیوڈورینو اس کی وضاحت میں لکھتا ہے کہ

”علاوہ اور اقوام کے طاقتور اسماعیلی قبائل
To pom polaphyla toy

Ismaeel اس میں شامل ہیں۔“

اب صرف یہ دریافت طلب رہتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ان علاقوں میں جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اسلام پیدا ہوا اور پھلا پھولا زمانہ قبل اسلام کے قانون جائیداد کو جزء ہی سمجھا جاسکے؟ اس سوال کا جواب تقریباً نفی میں ہوگا۔ اگر ہم صرف اس مواد پر اکتفا کریں جو پرانی عربی شاعری اور زمانہ قبل اسلام اور پہلی صدی ہجری کی اولیات مہیا کرتی ہیں اور ان معلومات کو نظر انداز کر دیں جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں، جدید ”اسلامیاتوں“ کو شاعری و قصص کے ان ماخذوں پر بڑا غرہ ہے۔ یہ اعتماد دینیات، سیاسیات، اخلاق وغیرہ کے متعلق تو درست ہوگا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ خاص قانون کے معاملہ میں صورت حال مختلف ہے۔ مذکورہ صدر شعبوں کے برخلاف قانونی احکام پر مشتمل حدیثوں کی تعداد ہزاروں پر مشتمل نہیں بلکہ مختصر ہے اور ان میں وہ صورت حال بھی نہیں ہے جو اسنوٹ مورخ دینے Snan ck Hurgronje نے دوسرے معاملات میں مشاہدہ کی ہے کہ کسی معینہ مسئلہ میں اگر ایک حدیث ایک بات کا حکم دیتی ہے تو دوسری حدیث اس کے بالکل خلاف ہے اور ایک تیسری حدیث الفاظ کے ایسے لطیف فرق سے جو بہ مشکل محسوس ہوتا ہے دونوں کے بین بین حکم دیتی اور

دونوں اضداد میں تطابق پیدا کر دیتی ہے۔ قانون میں مختلف مذاہب فقہ اختلافی مسائل میں بیشتر مختلف حدیثوں کی بنیاد پر اختلاف نہیں کرتے بلکہ عموماً ایک ہی حدیث کی مختلف تعبیروں کی اساس پر اختلاف ہوتا ہے مثلاً خیام مجلس کو شافعی، حنبلی اور اثنا عشری جائز قرار دیتے ہیں اور مالکی اور حنفی ناجائز اور یہ اختلاف ایک ہی حدیث کی مختلف تعبیروں کے باعث ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ایسے اختلافات میں مسلمانوں کی ابتدائی نسلوں نے ان صورتوں میں حدیثیں وضع نہیں کیں بلکہ جبکہ عدم یقین اور ارادہ میں اختلاف ہو۔ مثلاً وقف کے سلسلے میں۔ جس میں بے شمار اختلافات ہیں یا نہیں اور دوسرے اہمیت رکھنے والے مسائل کے سلسلے میں۔ ایسے معاملات میں مسلمان فقہاء اپنی رائے کی تائید میں جو حدیثیں بیان کرتے ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس قسم کے مشاہدات کی بنا پر مجھے امید ہے کہ حدیثوں کو کام میں لا کر قبل اسلام کے عربی قانون کو بحال کیا جاسکتا ہے۔

(۳) اس امر کی تائید کہ اسلام سے پہلے ایک ایسا عربی قانون موجود تھا جو قابل ذکر ترقی کر چکا تھا، اس واقعہ سے بھی (جس کا بظاہر کسی نے اب تک لحاظ نہیں کیا ہے) ہوتی ہے کہ اسلامی قانون کا ایک بڑا حصہ بشمول قانون جائداد پہلی صدی ہجری ہی میں مدون ہو چکا تھا اگر اتنی جلد تشکیل کو نہ مانیں تو پھر میرے خیال میں اس دوسرے واقعے کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکے گی کہ مسئلہ متعہ کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مختلف غیر راخ العقیدہ فرقوں (شیعہ، خوارج) اور راخ العقیدہ (سنی) فرقوں کے مذاہب فقہ میں اس سے زیادہ فرق نہیں ہے جتنا خود سنیوں کے چاروں مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو اس کی بنا پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلامی قانون عمومی طور پر ان فرقوں کے پیدا ہونے سے قبل تشکیل پا چکا تھا جو بڑے معتقداتی اختلافات کے باعث رونما ہوئے اور یہ کہ مدینے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کی نسلوں میں فقہاء (سبعہ) کے پائے جانے کی جو روایت بیان کی جاتی ہے وہ اس سے زیادہ اعتماد کی مستحق ہے جتنا اب تک اس پر کیا

۱۔ یہ اصطلاح مولف کی ہے مترجم کی نہیں۔

جاتا ہے اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ چونکہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں شیعوں کو سیاسی اقتدار حاصل نہ تھا اور اس طرح انہوں نے اپنا نظام قانون اس امکان کے بغیر تعمیر کیا کہ اس کا عملی اطلاق ہو اس لیے ان کو اس کی تحریک ہوئی ہوگی کہ اس سے زیادہ آزادی کے ساتھ عمل کریں جتنا راسخ العقیدہ سنی جو حقایق حیات کے لحاظ کرنے پر مجبور تھے۔

(۴) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً ہی بعد عربوں نے اپنے ہولناک حملوں سے نہ صرف بیزنطینی (روی) سلطنت کے کئی بڑے ایشیائی اور افریقی صوبے چھین لیے بلکہ ایک دوسری بڑی سلطنت ایران کو بھی شکست دے کر اس پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ اس لیے نظریے کی حد تک یہ خیال کرنا منطقی ہوگا کہ اسلامی فقہ پر ساسانی قانون کا اثر بھی پڑا ہوگا اور ایرانی نظم و نسق نے فوراً ہی اسلامی نظم و نسق کو بعض اصطلاحیں مہیا کیں مثلاً ”دیوان“ یا خلیفہ ثانی حضرت عمر ۱۳ تا ۲۳ھ / ۶۳۲ء تا ۶۴۴ء نے فتح کے بعد ہی بابل اور عراق کے علاقہ کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ اسلامی قانون کے مطابق مفتوحہ ممالک میں اراضی کے مالکداروں سے برتاؤ کرنے کا ایک نمونہ بن گیا۔ اس نظام مالکداری نے ایران سے چند اصطلاحیں بھی لے لیں، مثلاً بیع المراءبہ کا ایک دوسرا نام (دہ یازدہ، دہ دوازدہ) گویا اس میں خط نہیں بلکہ رتج ہوتا یا لفظ سفجہ (ہنڈی) جس کا کوئی عربی مترادف نہیں یا پانی کے قواعد جو ایسے ممالک میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں جہاں زندگی صرف آب پاشی پر منحصر ہو اور یہ اچھی طرح ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اسلام سے قبل ہی ساسانی سلطنت نے علاقہ بابل کی پوری سرحد پر بدویوں کے حملوں کو روکنے کے لیے ایک عاجز مملکت کھڑی کر دی تھی اور آخر میں یہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ خاص علاقہ مابین النہرین اور بابل ہی میں جہاں ساسانی پائے تخت تھا، سنیوں کے دو بڑے مذاہب حنفی و حنبلی کے بانیوں نے زندگی گزاری اور تدریس کا کام انجام دیا نیز ایک اور سنی مذہب شافعی کے بانی کی زندگی کا پہلا حصہ بھی وہیں گزرا۔ اسی طرح مختلف فرقوں کے مختلف شعبوں کے نظام ہائے قانون بنانے والے بھی وہیں رہے۔ ان اسباب کی بنا پر نظریہ کی حد

تک اسلامی قانون پر ایرانی ساسانی قانون کے اثرات کا بھی امکان ہے۔ اگرچہ اب تک اس قانون کے متعلق ہمیں عملاً کچھ بھی معلوم نہیں ہے اسی لیے زیر بحث مسئلے کے متعلق کوئی قیاس آرائی نہیں کی جاسکتی۔

قبل اسلام کے عربی قانون ہی کی طرح ساسانی قانون میں رومی یا یونانی اثرات کے سراپت کر جانے اور پھر اس کی راہ سے اسلامی نظام تک پہنچنے کا خیال کوئی لغوبات نہیں ہوگی لیکن پھر بھی یہ گمان ہی گمان ہوگا جس کا پیش کرنا تو آسان ہے لیکن ثابت کرنا مشکل۔

(۵) جسٹی نین (پوسنی نین) کے زمانہ کے قانون روما کے قواعد اور اسلامی قوانین میں بہ کثرت مشابہتیں ہیں اور بعض صورتوں میں اثر انداز بھی لیکن یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر بیرونی مشابہت کی تائید اندرونی عناصر اور تاریخی دستاویزوں سے نہ ہو تو یہ مشابہت کتنی ہی مغالطہ انگیز کیوں نہ ہو، اس کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے کہ ایک قانون دوسرے کا تابع اور اس سے ماخوذ ہے۔ جو لوگ اسلامی قانون کے بڑے حصے کے رومی قانون سے ماخوذ ہونے کا ثبوت دینے کی غرض سے مماثلتوں کو اکٹھا کرتے ہیں، وہ اس مسئلہ کے تین بنیادی نکتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں:

(الف) مثلاً وہ ان اختلافات کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اسلامی مذاہب فقہ میں خود چار رائج العقیدہ سنی مذاہب میں بھی پائے جاتے ہیں اس لحاظ سے جن مسائل میں اسلامی قانون اور رومی قانون میں مشابہت بتائی جاتی ہے وہ کسی ایک مذہب کے چند احکام میں ہوتی ہے اور دوسرے مذاہب فقہ میں وہ احکام نہیں پائے جاتے۔ اس نکتہ کو فراموش کر دینے کی وجہ سے غیر عربی دانوں مثلاً دارستی (Daresle) کولر (Kohler) کی تحقیقات میں بعض ایسے عناصر کو اسلامی قانون کی خصوصیت قرار دے دیا گیا ہے، جو اس کے صرف کسی ایک مذہب فقہ کی خصوصیت ہیں۔

(ب) دوسرے وہ ان مماثلتوں کا شکار کرنے میں اس کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان اختلافات کو بھی نمایاں کریں جو فقہ اور رومی قانون کے احکام میں

پائے جاتے ہیں حالانکہ یہ اختلافات کمسوبہ حال کو پہنچنے میں کسوٹی کا سا کام دے سکتے ہیں۔

(ج) تیسرے وہ اس عمیق فرق کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جو مغرب کے ام الادوار (کلاسیکل زمانہ) اور اسلامی دنیا میں ”قانون“ اور اس کے ماخذوں کے تصور کے متعلق پایا جاتا ہے۔ ایسی صورتیں بہت ہیں کہ وہ خیالات اور ادارات جو اس ہیلینی (یونانی) میں گہری جڑ پکڑ گئے تھے، عربوں کی فتح کے بعد عربی اسلامی تمدن کی اساس بن گئے پھر بھی وہ اسلامی قانون (فقہ) یا غیر فقہ) میں سرایت نہ کر سکے مثلاً یہ سب جانتے ہیں کہ ہیلینی (یونانی) ماحول میں بیع و شراء کو ایک معاہدہ مالی سمجھا جاتا ہے حالانکہ تمام اسلامی مذاہب فقہ کا اجماع ہے کہ وہ ایک معاہدہ تراخی (آپس کی رضامندی کا معاملہ) ہے مسلمانوں کا یہ رجحان اس بناء پر نہیں ہے کہ وہ اس بارے میں رومی تصورات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نہ اس بناء پر ہے کہ وہ معاملہ مالی اور معاملہ تراخی میں امتیاز پیدا کرتے رہے ہیں بلکہ اس کی بنیاد وہ قرآنی آیت (سورہ نمبر ۴، آیت نمبر ۲۹) ہے جس میں ”تجارة عن تراض“ وارد ہوا ہے یعنی تجارت آپس کی رضامندی سے ہونی چاہیے۔

اسی طرح جب عربوں نے بہت مختصر مدت میں بیزنطینی سلطنت کے انتہائی زرخیز صوبوں پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے وہاں مال گرو کرنے (hypathec) کا بڑا رواج پایا۔ اگرچہ یہ چیز خود یہودیوں کے قانون مٹا میں اپوٹیتی کے نام سے آگئی تھی مگر معاشی زندگی میں اُس کی اہمیت کے باوجود یہ ادارہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا کہ اسلامی قانون میں سرایت کر سکے اور اب ہمارے زمانہ میں یورپی قانون سازی کے ذریعہ سے (مسلمانوں میں) داخل کیا گیا ہے۔

ہیلینی دنیا میں طویل المدت اجارۃ اراضی بہت رائج تھا۔ مگر اس کو مسلمانوں کے قانون میں اپنی حقیقی جگہ حاصل کرنے کے لیے کئی طویل صدیاں لگیں۔ پھر بھی تمام مذاہب فقہ نے اس کو جائز قرار نہیں دیا اور اس جواز کا باعث اوقاف اور جاگیروں

(۱) اقطاع کی کثرت تھی۔

(۶) اکثروں نے اسلامی قانون کو رومی قانون کا تابع قرار دیا ہے اور کچھ لوگ تو یہاں تک گمان کرتے ہیں کہ قانون روما کی کتابوں کا عربی میں اور کتاب پانڈیکٹ (Pandects) کا فارسی ترجمہ ہو چکا ہوگا جن کا مسلمان فقہاء نے مطالعہ کر کے اُن سے اپنے قواعد اور اپنے نظامہ قانون اخذ کیے ہوں گے حالانکہ ایسا دعویٰ کرنا آج بھی ممکن نہیں ہے اور اس قسم کے دعووں کی تاریخی لغویت قطعی ثابت ہے اور یہی امران جدید ترین (۱۹۳۲ء تک کے) منفی نتائج سے بھی واضح ہوتا ہے۔ جو مختلف مشرقی (عبرانی، سریانی، قبطی، عربی، حبشی) ادبیات میں تحقیقات کرنے سے ظاہر ہوئے ہیں اور یہ تحقیقات خاص اس غرض کے لیے عمل میں لائی گئی تھی تاکہ شہنشاہی (رومی) قوانین کو نئے روپ میں پائے جانے کے متعلق بیفانتے (Benfante) کے مفروضے کی تائید کے لیے مواد فراہم کیا جاسکے۔

تاریخی لغویت سے قطع نظر بھی یہ بات عجیب ہے کہ ان خیالات کے مویدین نے یہ نہیں سوچا کہ معین مسائل کو خاص خاص ابواب میں داخل کرنے کے لیے شدید مشابہتوں کا پایا جانا ضروری اور لازمی ہے خواہ وہ کسی متمدن قوم کا قانون کیوں نہ ہو۔ اس بنا پر میں اپنے کو شخصی خصوصی قانون کی چند مثالوں تک محدود رکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر عرب فقہاء نے کسی رومی متداول کتاب کو نمونہ بنایا ہوتا تو وہ نابالغوں اور غلاموں یا ملکیت اراضی کے مسائل کو ایسے مختلف ابواب میں ہرگز نہ منتشر کرتے جہاں اُن کے پانے کا کوئی یورپی قانون دان کبھی گمان ہی نہیں کر سکتا اور مسائل ربا کو بیع و شراء سے متعلق نہ کیا جاتا۔ اسلامی فقہ میں اس کی نہایت واضح علامتیں موجود ہیں کہ اس کے ایک بڑے حصہ کی تدوین مستقل طور پر عمل میں لائی گئی اور یہ تدوین میری رائے میں محض قانونی نظریات سے کہیں زیادہ ان تاریخی حالات کے باعث ہوئی جن میں مسلمانوں کے قانونی و سماجی ادارات نے ترقی کی۔

(۷) اسلامی قانون پر رومی قانون کے اثر کے نظریے کی تائید میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک دلیل اس کی تدوین میں سرعت بھی ہے کہ دوسری صدی

ہجری کے آغاز ہی میں مسلمانوں میں فقہی مسائل کا مطالعہ اور اس پر تالیفیں شروع ہو کر عظیم ترقی حاصل کر چکی تھیں اور اس غیر معمولی واقعہ کی توجیہ وہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ اس کے لیے رومی قانون کو نمونہ فرض کیا جائے جو رومی قانون کی ادبیات نے مہیا کیا تھا۔

لیکن اس دلیل آرائی کے وقت اس کو بھلا دیا جاتا ہے کہ اس غیر معمولی اور قبل از وقت وسعت و بارآوری کا باعث یہ نہ تھا کہ مسلمانوں کو قانون سے (اس کے مغربی معنوں میں) کوئی عشق تھا۔ اس زمانے میں مشرقی عیسائیت کے پیدا کردہ مصائب کے نتیجے میں قانونی میلان سارے مشرق قریبہ میں کلیہً مفقود تھا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں میں اس کثیر قانونی پیداوار کا سبب اصل میں وہ تصور تھا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تبعین قانون کے متعلق رکھتے تھے کیونکہ قانون (فقہ) کو علم دین کا جزو لاینفک قرار دیا گیا تھا اور وہ محض دنیوی مادی علم نہیں تھا اور فقہ کی اتنی تیز ترقی اصل میں علوم دینی کی (جن کا آغاز قرآن کی تفسیر اور حدیث کی تدوین و تشریح سے ہوا) تیز ترقی ہی کا ایک پہلو ہے۔

(۸) جو لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی قانون رومی قانون کا تابع ہے یا کم از کم اس پر اس کا عمیق عمل ہوا ہے ان کا یہ فریضہ تھا کہ کم سے کم وہ وضاحت کے ساتھ یہ بیان کرتے کہ یہ تابعیت یا عظیم اثر کس طور پر وقوع پذیر ہوا۔

بعض اہل قانون نے یہ مفروضہ پیش کیا ہے کہ رومی قانون کی کتابوں کے عربی ترجمے ہوئے ہوں گے مگر واقعات و حقائق اس مفروضے کی پوری تردید کرتے ہیں یا کم از کم یہ کہ اسکندریہ و بیروت کے مشہور مدارس قانون کی جو اگرچہ عربی فتوحات سے ایک صدی پہلے ہی بند ہو چکے تھے روایت جاری رہی ہوں گی۔ اس کے مقابلے میں علوم اسلامیہ کے یورپی ماہرین اور ان عیسائیوں اور یہودیوں کا نظریہ جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا تاریخی حقیقت سے کم دور تھا کیونکہ انہوں نے ان محاکم عدالت کا خیال کیا جو اسلامی فتح کے وقت پائے جاتے تھے لیکن اس گروہ کو اپنے اس مفروضہ سے قبل چند سنجیدہ اور شدید تاریخی گتھیوں کو حل کرنے کی ضرورت تھی یعنی جس وقت عربوں نے فلسطین و شام پر تسلط قائم کیا اس وقت وہاں کے نظامہ عدالت کی واقعی حالت کیا

تھی؟ کیا وہ برسرکار تھے؟ اور بہت سے مقاموں پر وہ اہل کلیسا کے سپرد نہیں ہو چکے تھے؟ اور ہم کو معلوم ہے کہ مشرق میں یہ لوگ قانونی مسائل سے کتنی کم واقفیت رکھتے تھے اور کیا عربی تاریخوں سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ عربی حملہ شروع ہوتے ہی تقریباً تمام بیزنطینی کشوری اور عدالتی مجسٹریٹ جو قانون کے واحد حقیقی واقف کار تھے ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس کا پتا اس واقعہ سے چلتا ہے کہ شہروں کی اطاعت اسقفون کے توسط سے ہوتی رہی کشوری افسروں کے توسط سے نہیں جو فرار ہو چکے تھے؟ زیر بحث مسئلے میں ان سوالات کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن ابھی ایک اور نکتہ ہے جس پر مختصر طور سے توجہ منعطف کرانے کی ضرورت ہے۔

وہ یہ کہ اسلامی قانون کی رومی قانون سے ماخوذیت اور ان دونوں کے باہمی تعلقات پر جتنی بحثیں ہوئی ہیں ان میں ضمناً یہ چیز پیشگی فرض کر لی جاتی رہی ہے کہ پرانا نظام عدل گسٹری عربی فتوحات کے بعد بھی ایک سو برس تک باقاعدہ طور پر جاری و ساری رہا تھا اور نئے مالک اپنی غیر مسلم رعایا کے متعلق اس سے استفادہ کرتے رہے تھے، جو واقعہ کے مطابق نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے مفتوحہ قوموں کے نظام میں مداخلت نہیں کی اور یہ قرار دیا کہ جس کا جو مذہب ہو گا اس کا وہی قانون۔ اس طرح اگر وہ یہ غیر صحیح مفروضہ مان لیں کہ اسقفون اور ربیوں کی عدالتیں باقاعدہ کارگزار تھیں (باقاعدہ اس معنی میں کہ اسقف رومی قانون کی صحیح تعبیر و تفسیر کرتے رہے) تو بھی عرب اس سے علمی استفادہ نہیں کر سکتے تھے اور ان کا مفاد مشترکہ معاشی کاروبار سے بھی وابستہ نہ تھا جس کی بناء پر قانون جائداد کے سلسلے میں فاتح اپنے مفتوحوں سے کچھ سیکھتے کیونکہ مفتوحات کے بعد عرصہ دراز تک عربوں نے صرف حاکمانہ فرائض سے کام رکھا یعنی وہ صرف افسر اور سپاہی رہے کسان، تاجر اور زمیندار (زرعی زمینوں کے مالک) نہیں بنے۔ یہ صحیح ہے کہ سرکاری زمینیں فوجیوں کو بطور جاگیر عطا ہوتی رہیں لیکن جاگیر کا عرب مالک صرف اس پر قاعدت کرتا تھا کہ عیسائی گماشتے اسے لگان ادا کرتے رہیں اور جو زرعی معاہدے عمل میں آئے اور ان کی بناء پر جو جھگڑے پیدا ہوتے تھے۔ ان میں فریقین عیسائی ہوتے

تھے اور پہلی صدی ہجری میں جب اسلامی قانون شکل گیر ہوا تھا اسلامی عدالتیں ایسے مقدموں کی سماعت نہیں کرتی تھیں اور اگر اتفاقاً اُن سے رجوع کیا بھی جاتا تو وہ مقدموں کا فیصلہ اپنے قوانین کی اساس پر کرتی تھیں عیسائیوں کے قانون کی بنیاد پر نہیں اس کے علاوہ جو زمانہ زیر بحث مسئلہ کے لیے اہمیت رکھتا ہے اس میں نو مسلموں کا کوئی قابل ذکر اثر ہی نہیں تھا اور وہ صرف موالی کی حیثیت رکھتے تھے اور عربوں سے کم مرتبہ خیال کیے جاتے تھے اور اُن کو قضا کے عہدوں پر مامور نہیں کیا جاتا تھا۔

ان تاریخی حالات میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ عام ملکی نظم و نسق کے ایک جزء کو چھوڑ کر رومی قانون کا اثر اسلامی قانون کے بننے میں قابل ذکر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

(معارف، اعظم گڑھ۔ جنوری ۱۹۵۳ء)

خطِ عرب

www.KitaboSunnat.com

عربوں کی جہاز رانی پر استدراک

(مقدمہ)

کم کتابیں ہوتی ہیں جو مختصین (ماہرین فن) اور عوام دونوں کو یکساں پسند آئیں۔ ان خوش نصیب کتابوں میں سے ایک مولینا سید سلیمان ندوی کی تازہ تالیف ”عربوں کی جہاز رانی“ ہے۔ مضمون اتنا اچھوتا پھر بھی مواد اتنا زیادہ اس کی کم توقع تھی خاص کر طبع اول کے وقت اس کی عام پسندی کا شاید اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بعض روز ناموں نے بہ اقساط پوری کتاب اپنے صفحوں میں نقل کر دی۔ میں بھی ان شائقین میں سے ہونے کی عزت رکھتا ہوں جو اس کتاب سے واقف تھے اور ان کا تقاضا تھا کہ یہ جلد چھپ کر منظر عام پر آجائے۔ کئی سال کے انتظار کے بعد جب اس کا اشتہار نظر سے گزرا تو میں نے فوراً یہ کتاب منگالی اور باوجود سخت اور ضروری مصروفیتوں اور فرائض منصبی کے، اسے ختم کر کے ہی چھوڑی، پڑھتے وقت حاشیوں پر جا بجا اپنی یادداشت کے لیے کچھ معلومات لکھے۔ اب انہی باتوں کو یہاں کسی قدر پھیلا کر بیان کروں گا۔

یہ کوئی تنقید نہیں ہے تنقید اسی وقت ہوتی ہے جب دلچسپ اور کارآمد ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ناقد بھی اس کتاب کے موضوع کا ماہر ہو اور قریب قریب تالیف کے برابر ہی تنقید پر محنت صرف کرے۔ یہ تو چند بے ربط معلومات ہیں جو مہینے بھر

سے بستر پر پڑے ہوئے ایک بیمار کے کمزور دماغ اور کمزور تر حافظے نے اپنے حالیہ سفر تعلیمی کی بیاض کی مدد سے اکٹھا کیے ہیں۔ اس جلدی کی وجہ یہ ہے کہ آج کل جبری آرام ملا ہوا ہے، پھر ایسی فرصت کہاں۔ اب ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ کی ابتداء ہے۔ عید کے بعد شاید نئی مصروفیتیں ہوں۔ یہ مضمون اگر کوئی بحران نہیں تو ایک عای کا بیان ہی اس سے زیادہ نہیں۔ (کذا)

اس تحریر کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ ابھی ابھی سالہ حال کے مقابلے میں کامیاب ہونے پر دو عربی النسل مسلمان، حیدر آبادی میرے بھی رشتہ دار، نوجوان، حکومت برطانوی ہند کے ڈفرن جہاز پر قائم کردہ مدرسے میں بحری تعلیم کے لیے بطور کیڈٹ داخل کیے گئے ہیں۔ یہ خبر سن کر ریاست حیدر آباد کے کھوئے ہوئے ساحل کی تاریخ بجلی بن کر دماغ میں کوند گئی اور ٹھنڈی آہ نکال کر گرم آنسو ٹپکا گئی۔

ایک کمی:

سب سے پہلے ایک قدیم شکایت دہرائی پڑتی ہے جس کے جواب میں عموم البلوی کا فقیہانہ عذر بھی اب نامقبول ہے۔ وہ یہ کہ اتنی اچھی کتاب اور پھر بھی اشاریے (انڈکس) اور کتابیات بلیوگرانی سے محروم! ایک دفعہ میں نے سوربون (پاریس) میں اپنے ایک پروفیسر سے مزاحاً کہا تھا، کہ اشاریے اور کتابیات کی خواہش وہی ناظر کرتے ہیں جو ست اور کام چور ہوں۔ ان کا جواب میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ انہوں نے سادگی سے کہا، ہاں ست اور کام چور مؤلف ہی اس محنت اور افادہ عام سے باز رہتا ہے۔ سید صاحب کی محنت اور انتہاک سے میں واقف ہوں۔ سید صاحب اپنے شاگردوں سے یہ کام لے سکتے اور اپنا قیمتی وقت دوسرے کاموں کے لیے بچا سکتے ہیں۔ ہمارے اچھے مؤلفوں کی کتابوں کو دیکھ کر اکثر گرے کا قطعہ یاد آتا ہے:

Full many a gensofope restrayserene الی آخرہ

اسماء و اعلام اور مطالب کی ابجدی فہرست نہ صرف ناظرین کو بلکہ خود مؤلف کو ہمیشہ مدد دیتی اور کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ یہ حال حوالوں اور ماخذوں کی کتابوں کے

علیحدہ یکجا تذکرے کا ہے۔ مجھے معلوم نہیں سید صاحب نے سرہنگ زادہ کی حقائق الاخبار عن دول البحار سے استفادہ کیا ہے یا نہیں۔ کتاب میں کتابیات ہوتی تو فوراً تحقیق کر لی جاتی۔ سرسری ورق گردانی میں اس کا کہیں حوالہ نہیں دکھائی دیا، اس کتاب کی دو ضخیم اور ایک معمولی حجم کی جلدیں عرصہ ہوا مصر میں چھپی ہیں۔ پہلی جلد میں مسلمانوں کی بحریت ہی کا ذکر ہے۔

حدیث کا مواد:

عہد جاہلیت میں عربوں کی جہاز رانی کے معلومات لغت، قدیم اشعار اور قرآن مجید سے تو بیشک حاصل ہو سکتے ہیں۔ (عکبر ص ۴۱) لیکن اس سلسلے میں حدیث کے وسیع ادب کو ہاتھ لگائے بغیر چھوڑ دینا کم از کم طالب علمانہ احتیاط کے خلاف ہے۔ ممکن ہے ان خطبات کی تیاری کا ناقابل یقین کم وقت حدیث سے مواد حاصل کرنے کے محنت طلب کام میں مانع رہا ہو، سرخسی کی شرح السیر الکبیر للامام محمد میں متعدد دلچسپ واقعات ملتے ہیں۔ علی متقی کی کنز العمال اور تبویب الحدیث غیر مطبوعہ میں تو بحری سفر پر متعدد مستقل باب ملتے ہیں۔

لغت:

کشتی اور جہاز کے الفاظ (عکبر ص ۶-۷) صرف دس دیے گئے ہیں۔ بعد میں کچھ اور آئے ہیں لیکن یہ فہرست بہت ہی سرسری ہے۔ اول تو ان لغت کی کتابوں کی ورق گردانی ضروری ہے جن میں فن دار الفاظ یکجا کیے گئے ہیں پھر اس موضوع پر لکھے ہوئے جدید رسالے بھی دیکھنے ضروری ہیں۔

مثال کے طور پر وستن فیلڈ (Wistenfeld) کا رسالہ Die Namen der schippeimaral ischen جہازوں کے نام عربی میں اس میں کوئی سونا نام ہیں۔ میں یہاں ان کو بلا تنقید بہ ترتیب ابجدی دہرا دیتا ہوں۔ شاید یہ رسالہ آسانی سے ہر کسی کو دستیاب نہ ہو سکے۔

۱۔ عکبر مخفف ہے عربوں کی جہاز رانی کا۔

اسطول (جہازیں)	اعراری	بالوع	بحریہ	برعانی
اسطولا	بارجہ	باہرات	براکیتہ	برکتہ، لبرکتہ
برکوس لابرکوس	جفار، جفایتہ	ذبیۃ	سوقیۃ	ظطل
برمتہ	بھل	رکوة	شبارہ	عجوز
بریک	بھن	رمادہ	شباک	عدولی
بسطہ	جلبہ	رمث	شہوق	عرواس
بطاس	جنگ	زیربازیہ	فخزور	عشاری، عشری
بطان	حراقہ، حراک	زربز	فخوہ	غارب
بطسہ	حملۃ	زلاج	ٹملمی	غراب
بوس، بوس، بوسی	حمامہ	زالال	ٹلمندی	فلک، فلوک
بیرجہ	خلج	زوراء	ٹموط	فلوکتہ
نلتوی	غلیۃ	زورق	ٹشان	قادس
جاریۃ (ج جوار)	خن	سفینۃ	ٹشکولیۃ	قارب
جاسوس	خیطیۃ	سکان	ٹشینی	قُر قور، قُر قورہ
ججلیۃ	دغیض	سلور	صلغہ	قطعات
جدی	دقل	سماریہ	طہطاب	کارونیۃ
جراب	ذات الرفیف	سمبر	طریدہ	کلک
جرم	ذوبخ	سنبوق	طیار، طیرہ	کندوریات

الرمادہ (Armada)

الفلقتندی نے صبح الاشی میں ایک لفظ لکھتے بھی دیا ہے جس کی جمع کلک بتائی ہے اور اس سے ایک رسم الخطی لطیفہ بھی بیان کیا ہے جو باصلاح خفیف یوں ہوگا۔ مارآینا کلک (ام نے تیری کشتیوں جیسی کشتیاں نہیں دیکھیں) یعنی پانچ کاف ایک ہی لفظ میں یکجا جمع ہو گئے ہیں۔

لاطئة	مرکب	مصاب	ملقوطة	واجبات
ماشون	مرکوس	معر	ناغضة	دکیة
ماشوت	مبجیة	معدیة	نقیرة ۱	ہرہور
مثلثہ	مستعام	مطلع	بختوغ	
مرزاب	مسطحات	یکہ	واسطیہ	

اسی سلسلے میں ابن قمال کا بھی ایک اقتباس (بحوالہ مستفید) دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

الاسطول المنصور هولا من يجرى في ديوان
الجيش المصري وسند كرحاله في موضعه اسماء
مراكب طريدة شينى مسطح حراقة مركوس
شلندى، اعرارى ومنفعة المسلمين به اشهر من ان
تذكر واكثر من ان تحصر فاما الطريدة فانما برسم
حمل الخيل واكثر ماتحمل اربعين فرسا واما
الحمالة تحمل فيها الغلة واما الشلندى فانه
مركب ذى سقف تقاقل الغزاة على ظهره
وجدافون يجدفون تحة واما المسطح فهو فى معناه
فاما الشينى يسمى الغراب (نسخة العرات) ايضا
فانه يجدف بمائة واربعين مجداف وفيه المقاتلة
والجدافون والحراقة مختصرة وربما كانت مائة
(مئتان) وحوالى ذلك والعرارى (الاعزارى) من
توابعه يحمل فيه الازواد والمركوس لطيف نقل

۱۔ شاید اس سے ناقرہ یا قارہ کا لفظ تارپیڈو کے لیے برتا جا سکتا ہے شاید خرافات بھی (أَخْرَفَتْهَا
لِتَغْرِقَ أَهْلَهَا۔ ۷۱:۱۸)

الماء ليخفته يدخل على المواضع و يكون وسقه
(وسعه؟) دون مائة اردب -

اسطول منصور اور وہ مصری محکمہ فوج میں رائج ہے اور
اپنے موقع پر ہم اس کا حال لکھیں گے۔ اس بیڑے کے جہازوں
کا نام یہ ہے طریدہ اسینی مسطح، حراۃ، مرکوس، شلندی، اعراری۔
اس سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچتا ہے اس کے ذکر کرنے کی
ضرورت نہیں بلکہ عام طور پر مشہور ہے اور اس کا احاطہ نہیں کیا جا
سکتا۔ طریدہ گھوڑوں کے لادنے کے لیے مخصوص ہے اور زیادہ
سے زیادہ اس پر چالیس گھوڑے لادے جاتے ہیں، حملہ میں غلہ
لادا جاتا ہے شلندی ایک چھت والا جہاز ہے جس کی چھت کے اوپر
سے سپاہی لڑتے ہیں اور مطاح اس کے نیچے ہوتے ہیں مسطح بھی اسی
قسم کا ہوتا ہے شینی جس کو غراب بھی کہتے ہیں وہ ۱۴۰ ڈانڈ سے چلایا
جاتا ہے اور اس میں سپاہی اور مطاح ہوتے ہیں۔ حراۃ مختصر ہوتا ہے
اور بسا اوقات سویا اس کے قریب قریب ہوتا ہے اور عراری اس کے
پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اس میں رسد لادی جاتی ہے۔ مرکوس اپنے ہلکے
پن کے باعث پانی لے جانے کے لیے مناسب ہے اور اس میں
ایک سوار دب سے کچھ کم پانی سا سکتا ہے۔

زین الدین المعمری کی تحفة المجاہدین فی بعض اخبار الہر تکالین ل
نامی تاریخ میں بھی متعدد دیگر نام ہیں۔

۱۔ یہ عربی کتاب پرنگالی ترجمے کے ساتھ ۱۸۹۸ء میں لزبن (پرنگال) میں چھپی ہے رسالہ تاریخ
شائع کردہ جدید اڈیشن بلامبالغہ فی سطر پانچ چھ غلطیوں کا حامل ہے، پتھر کے چھاپے نے اور
بھی ماس کر دیا ہے۔ مزید برآں اس میں بعض اصلاص ناشناس ہیں مثلاً شہر کوئی (مقامی تلفظ
کچی) کو کوٹن (بربنائے Cochin) کر لیا گیا ہے۔

تمیم الداری:

لفظ داری کے معنی بھی (عکج ص ۱۰) ملاح کے بتائے گئے ہیں۔ کیا حضرت تمیم الداری کو بجائے قبیلہ بنی الدار کی جانب منسوب کرنے کے ان کے بحری سفروں کے باعث اس لقب سے ملقب ہونا قرار دیا جائے تو زیادہ صحیح نہ ہوگا؟ قصہ تمیم الداری پر مقریزی کا اشاعت طلب رسالہ الضوء الساری لمعرفة خبر تمیم الداری (مخطوطہ لائنڈن وپاریس) کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، اس کا ایک فقرہ یہ ہے:

”تمیم بن اوس الداری یکنی ابازقہ قدم مصروقیل
ان قدومه کان لغرو والبحر.....“

برشہ:

لفظ برشہ کا استعمال (عکج ص ۲۲) المعمری نے بھی ملیبار کی تاریخ میں کثرت سے کیا ہے شاید اس کو (Barge, Bark, Barchetta, Barque, Barquette) یورپی لہ السنہ کے کسی لفظ سے تعلق ہو۔ ممکن ہے پرتگالی تلفظ ہو، پرتگالی لغت اس وقت میرے سامنے نہیں ہے۔

زبان زد بحری محاورے:

الفاظ کی اس بحث کے سلسلے میں یہ امر بھی شاید قابل ذکر ہے کہ متعدد بحری محاورے عربوں کی زبان پر چڑھ گئے تھے۔ یہ سمندر سے روزمرہ کے تعلق کے بغیر ممکن

۱۔ یہ امر شاید دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ لفظ یورپ کی اصلیت کیا ہے۔ میرے ایک سامی لسانیات کے پروفیسر نے پاریس میں بیان کیا تھا کہ بائبل والے مشرقی ملکوں کو شمش آسیا کہتے ہیں اور مغربی ملکوں کو شمش اوروپا۔ عربی دان فوراً پہچان لیں گے کہ شمش وہی ہے جو عربی میں شمس (سورج) کی صورت میں برتا جاتا ہے۔ آسیا اٹھنے اور نکلنے کے معنی موا ساة (غم دور کرنا ہمدردی کرنا) سے غالباً تعلق رکھتا ہے۔ موسیٰ (پانی سے نکالا ہوا) بھی اس سے رشتہ رکھتا ہے۔ بابلی زبان میں (غ) نہیں تھا وہ اسے الف کی طرح پڑھتے تھے اس طرح معلوم ہوگا کہ اوروپا اور غروب غرب، مغرب میں کتنا گہرا تعلق ہے۔ انہی بابلی الفاظ سے یورپ اور ایشیا بنے اور پھیلے ہیں۔

نہیں۔ ان میں سے دو پر کچھ بیان بے محل نہ ہوگا۔

ایک تو خود قرآن مجید (۴/۲۸) میں بھی برتا گیا، تذهب ریحکم تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی یا تمہاری قوت جاتی رہے گی۔ اس محاورے کی اصلیت میرے خیال میں بادبانی جہاز رانوں کا محاورہ ہوگا کہ بادبان سے ہوا بدل گئی خواہ رخ کے تغیر سے خواہ بادبان کے پھٹ یا ٹوٹ جانے سے تو جہاز اور جہاز ران بے بس ہو جاتے ہیں۔

دوسرا ایک اور محاورہ ”ماہل بحر صوفہ“ کا ہے اور نہ صرف عبدالمطلب کی جانب منسوب ایک معاہدے میں ۱۔ برتا گیا ہے بلکہ ہجرت کے بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدے ۲۔ ہمسایہ عرب قبائل سے کیے ان میں بھی اس کا کئی بار استعمال ہوا ہے۔ ابن ہشام نے بھی اپنی سیرت میں اسے برتا ہے اس کا سرسری با محاورہ ترجمہ ہوگا کہ جب تک سمندر موجیں مارتا ہے یعنی ہمیشہ کے لیے لیکن خود صوف البحر بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔ اس پر کم کچھ سننے میں آتا ہے اس لیے اگر ابن ابیطار کی کتاب المفردات (جلد ۱ ص ۴۱ اب) اصطخری (ص ۴۲ س ۱۶ الخ ۳) اور دوزی (Duzy) کی عربی لغت (Supplement) سے اس صوف البحر یعنی سمندری اون کی تشریح معارف میں کسی وقت شائع کر دی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر موقع ملا تو کسی آئندہ فرصت میں اسے ناظرین معارف کے سامنے پیش کروں گا۔

قرآن اور سمندر:

قرآن مجید میں سمندر کا ذکر (عکبر ص ۳۰ تا ۲۸) ایک مستقل مقالے کا محتاج ہے۔ یادداشت کے لیے لینن گراڈ کے پروفیسر بارتولد کے مضمون کی طرف یہاں صرف اشارہ کروں گا جس کا جرمن ترجمہ جرمنی کے مشہور شرقیاتی رسالے Zdmg ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۳۷۷ تا ۳۳۷ میں ڈاکٹر ریتر نے بعنوان ذیل کیا ہے:

Der Koran und das Meer

- ۱۔ زینی دھلان (السیرۃ الحمدیۃ) جلد ۳ ص ۳۰۳ تا ۳۰۴۔
- ۲۔ ابن سعد جلد ۲ ص ۲۶ تا ۲۷ (معاہدات بنو عمرہ بنو غفار نعیم بن مسعود شحجی)
- ۳۔ یہ دونوں حوالے خود دوزی کی لغت میں تشریح کے ضمن میں مندرج ہیں۔

یعنی قرآن اور سمندر۔ اصل مضمون (Zapiski Kollegii P16.R0 vostokovendovi) میں ۱۹۲۵ء میں رومی میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں پروفیسر بار تولد آنجہانی نے علاوہ اور باتوں کے اس یورپی خیال کو پھر سے تازہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ضرور بحری سفر کیا ہوگا اس کے بغیر قرآن میں سمندر کے سفر وغیرہ کا اتنا مدققانہ اور کثیر ذکر نہ ہوتا۔ ۱۔

قصہ حضرت موسیٰ و کان وراء ہم ملک یا خذ کُلَّ سَفِينَةٍ غَصْباً (سورہ کہف) کی بھی کچھ تحقیق شامل کر دی جاتی تو بے محل اور غیر دلچسپ نہ ہوتی۔

مرزوقی:

مرزاتی (عکبر ص ۴۴) غالباً طباعت کی غلطی ہے اس سے مراد المرزوقی ہیں ان کی زیر تذکرہ کتاب الازمنہ والا ممکنہ میں قسم قسم کے معلومات کا ایک نہایت قابل قدر گنجینہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے نام میں وہ وسعت نہیں جو اس کے مواد میں ہے۔

عہد نبوی کے مزید معلومات:

عہد نبوی کے ان معلومات (عکبر ص ۴۸ تا ۵۰) سے پیاسوں کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں چند اور چیزوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے مثلاً:

- ۱۔ وہ احادیث جن میں بحری جنگوں کی پیشین گوئی ہے وغیرہ
- ۲۔ عہد نبوی کی ایک بحری جنگ (حوالہ: طبقات ابن سعد، جلد ۲،

ق ۱ ص ۱۸ تا ۱۹)

- ۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدے ایلہ (شمال مغربی عرب) اور بحرین (جنوب مشرقی عرب) کی بندرگاہوں کے باشندوں سے جن میں بحری جنگوں

- ۱۔ اس سلسلے میں شاید میرے ایک مضمون کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے جو انجمن ترقی اردو کے حالیہ شائع کردہ مجموعہ مضامین حبش اور اطالیہ کے صفحہ ۱۰۶ تا ۱۱۱ میں خاص اسی بحث پر ہے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حبش کا سفر فرمایا تھا۔ میرا پورا مضمون صفحہ ۱۰۰ سے ۱۱۷ تک ہی ہے گو بظاہر پورا باب صفحہ (۱۲۴) تک میری جانب منسوب نظر آتا ہے۔
- ۲۔ معارف: افسوس کہ یہ حوالہ درست نہیں۔

اور تجارت کے متعلق بھی دفعات ہیں۔ ۱۔

نجاشی کا بھیجا ہوا وفد:

نجاشی کے وفد (عکبر ص ۴۹) کے متعلق عام طور سے مشہور تو یہی ہے کہ جہاز کے ڈوبنے سے ہلاک ہو گیا، وفد کا سرگروہ نجاشی کا بیٹا بھی اسی زمرے میں شامل تھا لیکن سمہودی نے تاریخ مدینہ میں بیان کیا ہے کہ نجاشی کا بیٹا مدینہ آیا اور حضرت علی سے رشتہ موالات بھی پیدا کر لیا اور بعد میں اپنے باپ کے مرنے پر مدینہ ہی میں رہنا پسند کیا اور حبشہ جا کر تخت نشین ہونے سے انکار کر دیا۔ حبشی وفد کے آنے کا ذکر ابن عبدالباقی وغیرہ نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفور اخلاق سے ان لوگوں کی خدمت خود فرماتے تھے اور یہ گویا مہاجرین مکہ کی حبشہ میں پناہ دہی کا جواب تھا۔ ابن عبدالباقی کی الطراز المقتوش (حالات حبشہ پر) نیز فضائل حبشیان کی ایک مطبوعہ کتاب سواطع الانوار (ص ۸۲) پر آنحضرت کے نام آیا ہوا نجاشی اصحمہ کا جو خط درج ہے اس میں اس وفد اور اپنے بیٹے اریحما کے بھیجنے کا ذکر ہے۔ اگر خط صحیح ہے تو نامہ بریقیناً نجاشی کا بیٹا ہوگا مگر یہ خط متقدمین کے ہاں نہیں ملتا۔

حضرت عمرؓ:

کتاب الخراج میں امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنے قوم من اهل الحرب وراء البحر سے تجارتی معاہدہ کیا تھا کہ وہ ممالک محروسہ اسلامیہ میں آیا کریں۔

قسطنطنیہ پر حملے:

مسلمانوں کے ابتدائی بحری حملوں میں (عکبر ص ۵۸ تا ۶۲) استانبول پر حملوں کا ذکر نہیں نظر آیا حالانکہ حضرت معاویہ کے عہد کے حملے کی یاد دلانے والا وہاں

۱۔ معاہدہ الیہ جو محمّد بن روبہ سے ہوا، سیرت ابن ہشام ص ۹۰۲ طبقات ابن سعد (جلد ۱ ص ۳۷) ابو عبیدہ کی کتاب الاموال (نقرہ ۵۱۳) و نیز دیگر کتابوں میں ملے گا۔ بحرین کا معاہدہ جو قبیلہ عبدالقیس سے ہوا ابن سعد (جلد ۱ ص ۳۲ تا ۳۳) میں ہے۔

حضرت ابویوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار یادگار زمانہ ہے۔ عبدالملک بن مروان کے غالباً بیٹے مسلمہ کا حملہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس کے واقعات ایک قدیم ترکی تالیف (الاقوال المسلمہ فی غزوات المسلمہ) میں تفصیل سے ملتے ہیں جس کے منخطوط علاوہ استنبول کے کتب خانوں کے کیرج یونیورسٹی لائبریری میں بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ مقدسی کی جغرافیہ میں بھی قسطنطنیہ کے ذکر میں اس کا کچھ بیان ہے اور وہ لکھتا ہے کہ قسطنطنیہ اس وقت بصرے کے برابر یا اس سے بھی کچھ چھوٹا شہر ہے استانبول کے یورپی حصے میں غلطے کے پل کے قریب جو عرب جامعی ہے وہ بھی اسی زمانہ کی یادگار بیان کی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گو اس مسجد کی تعمیر جدید حال میں ہوئی ہے لیکن اس کی طرز بنا استانبول کی باقی تمام مسجدوں سے جدا ہے اور خالص عربی وضع کی ہے جس میں بیزنطینی اثر کو دخل نہیں۔ مسجد کے اندر ایک منظوم کتبہ بھی ہے اس کے چند اشعار نقل کرتا ہوں جن سے ضروری تاریخ اور معلومات حاصل ہوں گے۔

کیم التمش آلتی سنہ گچمش ایدی ہجر تدن

چون اولدی حضرت عبدالملک خلیفہ دین

مراد ایدی قسطنطنیہ یہ اوسفر

کہ قیلدی مسلمہ ناماری سر عسکر

بو وعظی گوٹش ایدن عرباندن اعلیٰ بیک آدم

تہد ایلد یلرتا بعین ایلہ اول دم

صحابہ دندہ نیچہ کیمسہ قیلدی بیلہ سفر

جناب حقہ تو کللہ اولد یلر رہبر

دیار رومہ کلوب اول بو شہری فتح ایتدی

اچندہ بولد یعنی مالی حیثہ بخش ایتدی

بوہتی مال غنیمتہ ایلوب معمور
 کہ نای اولدی عرب جامعی ایلہ مشہور
 یدی سنہ بوشرده اقامت ایلدیر
 بوبارگاہ خدادہ عبادت ایلدیر

وغیرہ وغیرہ کل چونتیس شعر ہیں جو میں نے نقل کر لیے تھے۔ اس کتبہ اور اس کے بیانات کی تحقیق شاید کسی اور صحبت میں کر سکوں جس میں مسجد کے فرش کی پیمائش اور نقشے وغیرہ کی اپنے پاس کے مواد کی مدد سے توضیح و تشریح بھی ہوگی۔ اوپر کے اشعار سے معلوم ہوگا کہ ۶۶ھ میں دعوت جہاد پر بلیک کہہ کر پچاس ہزار عربوں کی فوج جس میں چند صحابہ اور تابعین بھی شریک تھے یہاں آئی، مال غنیمت سے اس مسجد کو تعمیر کیا اور سات سال تک یہیں مقیم رہی۔

مصنوعی آبی راستے مسلمانوں کی ابتدائی بحری کارروائیوں میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آتا ہے جو تاریخ طبری (۲۰۳۸) میں ہے کہ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے سپاہیوں کو کشتیوں میں سوار کرا کے عراق کی بعض نہروں سے گزرنا چاہتے تھے۔ ایرانیوں نے ان کا پانی خالی کر دیا اور کشتیاں چل نہ سکیں پھر نہروں میں پانی آنے کے مقام کی مرمت کی گئی اور کشتیاں منزل مقصود کو روانہ ہوئیں۔

امام ابو یوسف کی کتاب الخراج میں آبی راہوں کی مرمت اور نگہداشت پر متعدد فصلیں ہیں ان کی جانب بھی اس سلسلے میں اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

عرب میں بندرگاہ:

عربی بندرگاہوں کا ذکر خاصی تفصیل سے (عکبر ص ۶۷ تا ۷۱) کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں عمان کے مشہور بندرگاہ دبا کے متعلق چند چیدہ معلومات بے محل نہ ہوں گے اسی طرح بحرین کے بندرگاہ مشقر اور یمن کے بندرگاہ عدن وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔.....ثم سوق دبا وهي احدى فرضتي افرض

العرب ياتيها تجار السند والهندو الصين واهل

المشرق والمغرب فيقوم سوقها آخر يوم من رجب وكان بيعهم فيها المساومة وكان الجلندی بن المتکبر يعشرهم فيها و فی سوق صحار و يفعل فی ذلك فعل الملوك بغيرها۔

پھر بازار دبا ہے اور وہ عرب کا ایک بندرگاہ ہے جس میں سند، ہند، چین کے تاجر اور مشرق اور مغرب کے لوگ آتے ہیں اور یہ بازار رجب کے آخر دن میں لگتا ہے اور ان کی بیچ اس بازار میں مسامہ ہوتی ہے اور جلندی بن متکبران سے اس میں اور بازار صحار میں عشر لیتا ہے اور اس معاملے میں وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو بادشاہ لوگ اور بازاروں میں اختیار کرتے ہیں۔

(کتاب البحر المحمد بن حبيب التوتی ۲۳۵ھ مخطوطہ برٹش میوزیم ورق ۱۰)

.....ثم یرتحلون بها الی دبا وکانت احد فرض العرب یجتمع بها تجار الهند والسند والصین واهل المشرق والمغرب..... فیشترون بها بیوع العرب الهجر.....“

(کتاب الازمه والامکنه للمرزوقی باب ۴۰)

پھر اس کو لے کر وہ دبا کو جاتے ہیں جو عرب کا ایک بندرگاہ تھا جہاں ہند، سند اور چین کے تاجر اور مشرق و مغرب کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہاں عرب اور ہجر کے اسباب کی طرح خریداری کرتے تھے۔

۲۔ ثم یرتحلون منها الی المشرق بهجر فتقوم سوقها اول يوم من جمادی الآخرة الی آخر الشهر فتوافی بها فارس یقطعون البحرات الیها بیاعاتهم.....“ (کتاب المحبر ورق ۹۳-۹۵)

پھر اس سے مشرق کا سفر کرتے تھے جو بحرین میں ہے یہ بازار جمادی الآخرہ کے پہلے دن سے مہینے کے آخر دن تک لگا رہتا تھا اور ایرانی لوگ اپنا سامان تجارت لے کر وہاں بحری سفر کر کے آتے تھے۔

۴، ۳..... ثم یسیرون بجمع من فیہا من تجار البر والبحر الی الشحر۔ شحر مہرہ۔ فیقوم سوقہم..... ثم یرتحلون منها الی عدن الا تجار البحر فانہ لا یرتحل منهم الا من بقی من بیعہ شئی ولم یبعہ فیوا، فی الناس بعدن من بقی معہ من تجار البحر شئی و من لم یکن شہدا لا سواق الی کانت قبلہا..... وکان طیب (الطیب!) الخلق..... ولم یکن احد یحسن صنعہ من غیر العرب حتی ان تجارا البحر لترجع بالطیب المعمول، تفخر بہ فی السند والہند وترتحل بہ تجار البر الی فارس والروم.....

(المرزوقی باب ۴۰)

پھر وہاں خشکی اور تری کے جو تاجر ہوتے تھے، ان کو لے کر شحر یعنی شمرہ تک جاتے ہیں اور وہاں ان کا بازار لگتا ہے پھر وہاں سے عدن کو جاتے ہیں البتہ بحری تاجروں میں صرف وہی لوگ وہاں سے عدن کا سفر کرتے ہیں جن کا سودا کچھ بکنے سے رہ گیا ہے اور اس نے اس کو نہیں بیچا ہے تو عدن میں لوگوں کے پاس وہی بحری تاجر آتا ہے جس کے ساتھ کچھ مال رہ گیا ہے اور وہ لوگ بھی عدن میں آتے ہیں جو اس سے پہلے کے بازاروں میں نہیں گئے تھے اور عطر خلیق کو اہل عرب کے سوا کوئی دوسرا عمدہ

نہیں بنا سکتا تھا یہاں تک کہ بحری تاجر اس مصنوعی خوشبو کو لے کر واپس ہوتے ہیں تو سند اور ہند میں اس پر فخر کرتے ہیں اور خشکی کے تاجر اس کو لے کر ایران اور روم میں جاتے ہیں۔

آبنائے عمان یا باب المندب؟

”اسی کے پاس عمان کی دریائی پہاڑیاں ہیں اور وہ جگہ ہے جس کو درود کہتے ہیں یہ دو پہاڑوں کے بیچ تنگ دریائی راستہ ہے (باب المندب؟) (عکبر ص ۷۶) یہاں غالباً سہو قلم سے بجائے ”آبنائے عمان“ کے آبنائے باب المندب لکھ دیا گیا ہے۔ باب المندب بحر قلزم کے دہانے پر ہے یہاں خلیج فارس کا ذکر ہے۔

چین:

ہم نے اوپر کی سطروں میں حدود ملک چین تک کے راستے بتائے ہیں (عکبر ص ۷۹) اس سلسلے میں وہ مشہور مقولہ بیان کیا جاسکتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا جاتا رہا ہے کہ اطلبوا العلم ولو کان بالصحین اگرچہ یہ حدیث ابن عبد البر نے علم پر اپنی مشہور کتاب میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے درج کی ہے۔ نبیؐ نے شعب الایمان میں، ابن عدی نے الکامل میں اور العقیلی نے المضعفاء میں لیکن ماہرین نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے، شاید اس قیاس کو زیادہ دور از کار نہیں قرار دیا جائے گا کہ یہ حدیث اس زمانے کی پیداوار ہے جب عربوں کے تجارتی تعلقات چین سے بہت مستحکم ہو گئے تھے اور وہاں کے بکپور (فغفور یا بغور۔ باگ کے معنی تاتاری اور جدید روسی زبان میں خدا کے ہیں۔ پور بیٹے کو کہتے ہیں۔ چینی اپنے بادشاہ کو آسمان کا بیٹا سے ملقب کرتے رہے ہیں) کے اسلام لانے کا امکان نظر آ رہا تھا اس وقت چینوں کی تالیف قلبی کی ضرورت تھی۔

تیسری صدی کا سفر نامہ یورپ:

”ابن فضلان نے بغداد سے روس و بلغاریہ تک اپنا سفر نامہ مرتب کیا تھا۔ جس کا مختصر خلاصہ یا قوت نے اپنی معجم (البلدان) میں شامل کیا ہے“ (عکبر ص ۱۱۵) اہل علم

میں سے ہر ایک کو یہ سن کر خوشی اور چند کو تازہ خبر معلوم ہوگی کہ مقتدر باللہ عباسی کے (جو تیسری صدی کے اواخر میں خلیفہ ہوا) سفیر ابن فضلان کا کھویا ہوا سفر نامہ مل گیا ہے اور ایران سے اس کے ایک مکمل نسخہ کی عکسی نقل (فوٹو) برلین کے سرکاری کتب خانے میں آچکی ہے اور اب اسے روسی اور دیگر زبانیں جاننے والے چند جرمن شرقیاتی اشاعت کے لیے تیار کر رہے ہیں اور غالباً ترجمہ بھی تفصیلی تعلیقات اور جدید ترین معلومات کے تقابلی مطالعے کے ساتھ شائع ہوگا۔

جاپان:

”اہل عرب..... جاپان کو جزائرِ واق واق کہتے ہیں“ (عکبر ص ۱۲۹) عرصہ ہوا عجائب الہند کے فرانسیسی ضمیمے میں پروفیسر دھوی نے یہ دلچسپ نظریہ پیش کیا تھا لیکن ابھی دو سال ہوئے پاریس کے رسالہ ژورنال آسیاتیک میں پروفیسر قران Terrand جس کا چند ماہ قبل انتقال ہو گیا ہے نے اس بارے میں نئے سرے تحقیقات کی ہے اور عربی کے علاوہ چینی اور دیگر ماخذوں سے کثیر مواد فراہم کیا ہے جس کا خلاصہ بھی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں (عنوان ”واق واق“ کے تحت) شائع ہوا ہے۔ اس تفصیلی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے مراد جاپان نہیں بلکہ بورنیو ہے۔

ابن جبیر:

عربی سیاحوں کے سلسلے میں ابن جبیر کا سفر نامہ حج بھی قابل ذکر ہے۔ یہ سلطان صلاح الدین کا معاصر ہے اور اس نے چین سے مصر وغیرہ تک جہاز پر سفر کیا تھا۔ ابن جبیر نے جس دقت نظر سے حالات سفر بیان کیے ہیں اور اثنائے راہ میں آتش فشان پہاڑوں، بندرگاہوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس سے بہت کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں خاص کر بحری سفر میں مسافر کے تجربے بہت دلچسپ ہیں۔

بحری نقشے:

سامان و آلات جہاز رانی کے سلسلے میں بحری نقشوں کا ذکر (عکبر ص ۱۳۷ تا ۱۴۱) کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک حالیہ تحقیق کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ کولمبس نے امریکہ کا

ایک نقشہ تیار کیا تھا جواب ناپید ہے۔ مشہور ترکی ماہر بحریات پیری رئیس اس کا تقریباً ہمعصر تھا۔ ترکی میں ان دنوں سلیمان اعظم جیسے اولوالعزموں کا دور تھا جو دنیا کو فتح کرنے کے منصوبے رکھتے تھے۔ ایسے زمانے میں سرکاری افسروں کے معلومات بھی عصری (اپ ٹو ڈیٹ) ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ پیری رئیس نے کولبس کا نقشہ امریکہ کسی طرح حاصل کیا اور اپنے نقشہ عالم میں شامل کر کے شائع کیا۔ یہ نقشہ کتب خانہ توپ قبو سرے (استانبول) میں ملا اور کوئی تین سال ہوئے کہ اس کو بون یونیورسٹی کے صدر کلیہ شرقیات اور جرمن مجلس شرقیات کے معتمد ڈاکٹر پاؤں کالے (P. Kahle) نے ایک طویل مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ایک ضخیم تر کتاب اسی موضوع پر انگریزی میں بھی پروفیسر کالے نے لکھی ہے جو امریکہ کی کسی یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہو گئی ہے، یا ہونے والی ہے۔

لائٹ ہاؤز:

لائٹ ہاؤز (عکبر ص ۱۴۱) کے سلسلے میں بھی پروفیسر کالے کی ایک کتاب کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس میں اسکندریہ کے مشہور منارے کے متعلق جملہ مل سکھنے والے عربی دیگر معلومات مع تصاویر شائع ہوئی ہیں۔

صور الکو اکب:

صور الکو اکب (عکبر ص ۱۴۴) پر ایک نہایت قدیم رسالہ کتاب الازمنہ لیوحنابن ماسویہ السطیب المعلم الفلکی ۱۹۲۲ء میں مصر میں شائع ہوا ہے ۲۔ اس میں سال کے

۱۔ اس کا سفیر چین گیا تھا تاکہ وہاں کی فوجی قوت وغیرہ کا اندازہ لگائے۔ سفر کی رپورٹ جو خطائی نامہ کے نام سے فارسی میں لکھی گئی تھی اور جس کا بعد میں ایک ناقص ترجمہ ترکی زبان میں بھی ہوا ہے چین کے متعلق معلومات کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس کا جرمن ترجمہ مجھ سے کرایا گیا تھا جواب چینی ماخذوں کے حواشی کے اضافے کے ساتھ مع اصل فارسی متن قریب میں شائع ہو گا یہ کام جرمن مجلس شرقیات کے معتمد اور اس کے رسالے کے ایڈیٹر ڈاکٹر کالے انجام دے رہے ہیں۔

بارہ مہینوں کی فلکی کیفیت تفصیل سے دی گئی ہے۔

قطب نما:

قطب نما پر جسے جہت نما یا سمت نما کہا شاید زیادہ موزوں ہو عربوں کے متعلق بہت دلچسپ مواد یکجا کیا گیا ہے (عکج ص ۱۳۷ تا ۱۶۲) مگر یہ چیز اس سے بہت زیادہ پرانی ہے۔ حال میں چند ماہ قبل حیدر آباد کے ضلع راجپور میں مسکی نای مقام پر اثری کھدائی کے سلسلے میں زمانہ ماقبل تاریخ کے عہد حجری کی جو چیزیں دریافت اور دستیاب ہوئی ہیں ان میں تین عدد جہت نما بھی صحیح و سالم حالت میں ملے ہیں۔ ان پر سولہ جہتوں کے نشان اور ذیلی جہتوں کی علامتیں صاف طور سے نمایاں ہیں۔ کسی دل جلے نے کہا ہے کہ اس جرخ کہن کے نیچے خود ہمارے اپنے سوائے کوئی چیز نئی نہیں۔

ایرانی ملک یمن میں:

ایرانیوں کی تجارتی اور دیگر ماوراء البحر نو آبادیوں کا ایک سرسری ذکر (عکج ص ۱۷۱ تا ۱۷۲) اشارہ کر دیا گیا ہے۔ پارسیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بعد بحری حملہ کر کے یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہر ز سپہ سالار و گورنر کے ساتھ آئے ہوئے یہ لوگ ابناء کہلاتے تھے۔ یہ لوگ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلمان ہو گئے اور کشوری لمہدوں پر سرفراز کیے گئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ردت کے موقع پر یمن کے عربوں میں یمنی قومیت کے جو جذبات پیدا ہوئے تھے، وہ آج چودہویں صدی ہجری میں ترکی، مصر، ایران و عراق وغیرہ کے حالات کو دیکھ کر اپنی حیرت انگیز قدامت دکھاتے ہیں:

”.....ولما سمع بذلك قيس ارسل الى ذى الكلاء واصحابه انّ الابناء نزاع في بلادكم وتقلأ فيكم وان تتركوهم لن يزالوا عليكم وقدارى من الراى ان اقتل روسهم و اخر جهم من بلادنا فتبرء وافلم يمالؤه ولم ينصر والابناء واعتزلوا۔ (تاریخ طبری ص ۱۹۹۰)

جب قیس نے اس کو سنا تو ذی الکلاع اور اس کے ساتھیوں کو پیغام دیا کہ ابناء تمہارے ملک میں اجنبی ہیں اور دوسری جگہ سے منتقل ہو کر آئے ہیں اگر تم لوگ ان کو چھوڑ دو گے تو تم پر مسلط رہیں گے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ان کے سرداروں کو قتل کر دو اور اپنے ملک سے ان کو نکال دو تو یہ لوگ الگ ہو گئے اور اس کی موافقت نہیں کی اور ابناء کی بھی مدد نہیں کی بلکہ غیر جانبدار رہے۔

ہندی امیر البحر:

جہاز رانوں کا ذکر کرتے ہوئے (عکبر ص ۱۷۱ تا ۱۸۳) عربوں کے ساتھ ترکوں وغیرہ تک کا ذکر کر دیا گیا ہے اور محروم ہے تو غریب ہندوستان ملیبار میں پر تگلی حملوں کے زمانے میں کالیکٹ پر سامری (Zamorin) لقب کے راجے حکمران تھے۔ ان کی بری فوج میں مسلمانوں کی کافی تعداد تھی لیکن ان کا بحریہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص اسلامی تھا زین الدین البحر کی تختہ الجاہدین فی بعض اخبار الہر تکالیین اور مسٹر پانکار کی حالیہ کتاب Malaban and The Portuguese میں اس بات کا کافی مواد ملتا ہے کہ کنج علی مکرار کا خاندان موروثی طور پر راجا سامری کا امیر البحر تھا چونکہ ملیباری مسلمان تاجر رہے ہیں اور مذہبیت کے باعث ہر سال ان کے بہت سے لوگ حج کو جایا کرتے تھے اسی لیے ان میں جہاز رانی بڑی ترقی کر گئی تھی۔ کنج علی مکرار کا خاندان اب بھی غالباً شہر نیپانی (ملیبار) میں آباد ہے۔ اگر اس خاندان کا کوئی رکن یا کوئی اور صاحب ہمت و معلومات اس امیر البحر خاندان کی تاریخ مرتب کرے تو نہ صرف دکن یا ہند بلکہ مسلمانوں کے لیے باعث نازش ہوگا کہ کس طرح مٹھی بھر آدمیوں اور کشتیوں کی کشتیوں سے ان مجاہدوں نے سمندروں اور مشرق کے مالک پرنگال کانسوں تک سمندر میں ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ ترکی ماخذوں سے:

اسی طرح ایک بعد کے زمانے میں بعض مسلمان ملیباری ریاستوں کے حکمرانوں

نے سلطان ترکی کو جہاز پر دو ہاتھی بھیجے (جن میں سے ایک راہ میں مر گیا) اور ایک قصیدہ عربی میں لکھا کر یورپی عیسائیوں کے مظالم کے خلاف مدد کی التجا کی تھی۔ ایک ترکی مورخ ان حالات کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ قصیدہ کی عربی میں بہت سی غلطیاں تھیں اور وزن وغیرہ بھی درست نہ تھا۔ سفارت چند روز انتظار کر کے ناکام واپس ہوئی۔

ہندوستان کے بہت سے واقعات ترکی تاریخوں اور سفر ناموں میں ملتے ہیں خاص کر مغلیہ عہد اور اس کے بعد کے زمانوں کے متعلق۔ ممکن ہے کہ کبھی ان سے ملک کو روشناس کرانے کی فرصت ملے۔

عربوں کی بحری تصانیف:

عربوں کی بحری تصنیفات (عکبر ص ۱۸۳) پر گو میں سرہنگ زادہ کی مذکورہ بالا کتاب کے سوا کسی اضافے کے قابل نہیں ہوں لیکن کس قدر افسوس ہوتا ہے کہ ابن ماجہ وغیرہ کی پارلیس سے شائع شدہ کتابوں کے فرانسیسی ویباچے سے اب تک فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا ہے۔ علی گڑھ کے ایک سابق پروفیسر صاحب نے ایک مرتبہ اس کے کسی باب (جو شاید انگریزی میں تھا) کا معارف میں ترجمہ شروع کیا تھا۔ ہندوستان میں بفضلِ خدا اب کافی تعداد فرانسیسی دانوں کی پیدا ہو گئی ہے خود جامعہ عثمانیہ میں کم از کم نصف درجن اساتذہ (جن میں دو پارلیس کے ڈاکٹر ہیں) سید صاحب کو مدد دے سکتے ہیں ایسی علمی چیزوں میں کوئی ایسی بات نہیں چھوڑ دینی چاہیے جو ذرا کاوش پر قابل عمل ہو جاتی۔

سند باد بحری الف لیلہ اور ہومر کی نظم:

نہ معلوم اہل علم میری اس رائے پر کیا کہیں گے کہ الف لیلہ سے بھی مواد حاصل کرنا چاہیے تھا علاوہ متعدد بحریت آمیز قصوں کے اس میں سند باد بحری کے سفر قابل ذکر ہیں۔ یہ افسانے یقیناً اسی زمانے کی پیداوار ہیں جب عربی جہاز رانی اوج عروج پر تھی۔ بحری سیاحوں اور ملاحوں کی کہانیاں غالباً تیسری صدی ہجری میں اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ ان سے سند باد کے سات بحری سفروں کے لیے کافی مواد فراہم ہو سکتا تھا۔

سند باد کے سلسلے میں ایک زیادہ اہم مسئلے پر کچھ کہنا ہے۔ جرمنی اور فرانس کے

اساتذہ سے بھی میری اس بارے میں گفتگو رہی ہے اور وہ میرے دلائل کو کافی وزن دار اور قابل غور قرار دیتے رہے ہیں۔ وہ یہ کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ مسلمان عربوں نے یونان سے علوم و فنون تو لیے لیکن ادب و شعر کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے منتقل نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ایک بڑا ثبوت یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہومر کی نظموں کا ترجمہ ابھی اسی صدی میں ہوا، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ لیکن سند باد کے قصوں کو پولیسیس کے واپسی وطن کے بحری اور مہمات بھرے سفر کے ساتھ ملا کر جو شخص پڑھتا ہے وہ ان کی یکسانی سے متاثر اور حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ناظرین سند باد کے تیسرے سفر کے اس قصے سے خالی الذہن نہ ہوں گے کہ سند باد مع اپنے ہمراہیوں کے ایک جزیرہ میں پہنچا ہے جہاں ایک آنکھ والا دیورہتا تھا۔ اس نے ان کو اپنے رہنے کے مقام پر بند کر دیا اور روزانہ دو ایک آدمیوں کو آگ پر بھون کر کھانے لگا۔ آخر سند باد نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک دن رات کو سوتے میں دھکی ہوئی سلاخ سے اس دیو کو اندھا کر دیا اور سب بھاگ نکلے۔ اس قصے کے ساتھ پولیسیس کا واقعہ جو ہومر نے لکھا ہے کسے یاد نہ آئے گا جو ایک آنکھ والے سانکلوپ پولی فیم کے ساتھ پیش آیا اور جو جزئی تفصیلات میں بھی بالکل اس سند بادی قصے سے مشابہ ہے بحری سفر، مصیبتیں اور انجام میں ہیرو کی کامیابی، یہ پولیسیس کی مہموں اور سند باد کے سفروں دونوں میں مشترک ہیں۔

اس سے سوائے اس کے کیا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہومر کی نظم پوری طرح یا کم از کم اس کے بہت سے قصے عربوں میں اتنے معروف اور زبان زد ہو گئے تھے کہ لوگ ان کو اب اجنبی نہیں خیال کرتے تھے۔ ابن ندیم (الفہرست ص ۳۰۵) کا بھی خیال ہے کہ سند باد اجنبی اور غالباً ہندی تالیف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ابھی عرض ہوا اسے ہندی کی جگہ یونانی سے ماخوذ قرار دینا صحیح تر معلوم ہوتا ہے۔

یہ چند ناچیز ملاحظات ہیں جو مولف فاضل کے غور کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ۔ مئی ۱۹۳۶ء۔ جون ۱۹۳۶ء)

آٹھویں صدی ہجری میں مصر و شام کی ڈاک کا انتظام

تمہید:

”الترغیف بالمصطلح الشریف“ فن انشاء کی ایک عربی انسائیکلو پیڈیا ہے جو ۴۲ھ میں یعنی اب سے زائد از (۶۰۰) سال قبل تالیف ہوئی۔ بروکلی مان کی تاریخ (ادب اللغة العربیہ) کی فہرست ۱ سے پتا چلتا ہے کہ اس کے متعدد نسخے کتب خانہ ایا صوفیا، قاہرہ، لائڈن وغیرہ میں موجود ہیں۔ اسکے مصنف کا نام ابو العباس احمد بن ابو المعالی یحییٰ بن فضل اللہ القرطبی العدوی العری الشافی ہے۔ اسکے مزید حالات زندگی و کارنامہ جات علمی کا مواد مذکورہ فہرست کے علاوہ فوات الوفيات میں بھی ملتا ہے۔ گویہ کتاب ۱۳۱۲ھ میں قاہرہ میں چھپ چکی ہے لیکن چونکہ اس قسم کے مواد سے اردو ادب خالی ہے اور یہ کتاب اس شخص کی تالیف ہے جو سرکاری میرنشی ابن میرنشی تھا جسکی بناء پر یہ مواد مستند قرار پاتا ہے، اس لیے اس کا مختصر تذکرہ اور ایک باب کا اقتباس غیر دلچسپ نہ ہوگا۔

کتاب کے سات باب ہیں۔ پہلے کا عنوان ”رتب الکتابات“ ہے۔ اس میں جہاں سلاطین عالم سے فرداً فرداً ہر ایک کے القاب، خط کی تمہید وغیرہ بیان ہوئے ہیں وہیں اس ملک کے اہم حالات کا بھی مجمل ذکر اسکی اہمیت اور دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔

خلیفہ وقت اور بیسویں دیگر سلاطین اسلام مثلاً ”محمد بن طغلق“ شہنشاہ ہند اور ”صاحب البلغار“ وغیرہ کے تذکروں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بادشاہوں اور حکمرانوں وغیرہ کا بھی بیان اس میں موجود ہے۔ دوسرے باب میں ”عادات العہود والتقالید والتفاویض و التواقیع والمراہیم والمناسخ“ یعنی مختلف قسموں اور درجوں کے معاہدے کرنے کے خاکے اور مسودے دیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں قسموں کے متعلق اور چوتھے میں ”الامانات والدفن ولھدن والمواصفات والمفاسحات“ کا ذکر ہے۔ پانچواں باب تاریخی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ہر ملک و ریاست کا جغرافیہ اور اس زمانے کے حدود وغیرہ بیان ہوئے ہیں۔ چھٹے باب میں چند فصلیں ”ڈاک اور کبوتروں کے اسٹیشنوں“ کے متعلق ہیں اور یہ مقالہ اسی پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس باب میں تجارتی اور مسافرتی بندرگاہوں وغیرہ کا بھی مختلف فصلوں میں ذکر ہے۔ ساتواں اور آخری باب ”ایسے امور کے متعلق ہے جن کی عموماً ضرورت پیش آیا کرتی ہے“ اس آخری باب کی سات فصلیں ہیں۔

اس موقع پر جیسا کہ اوپر بیان ہوا صرف یہ بتایا جائیگا کہ اس وقت ڈاک کا کتنا باقاعدہ اور منظم انتظام تھا۔ ضمناً اسلامی ڈاک کی تاریخ بھی آگئی ہے۔

ڈاک:

ڈاک کے متعلق قاعدہ ہے کہ ہر چار فرسخ پر اسٹیشن ہوں۔ ہر فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ ہر میل میں تین ہزار گز ہوتے ہیں۔ ہر گز میں چوبیس انگل اور ہر انگل کے چھ بو اور ہر بو کے چھ خچر کے بال ہوتے ہیں۔ اسی ناپ پر ڈاک کا عمل ہے۔ لیکن ڈاک کے موجودہ مرکروں میں اس کا لحاظ نہیں ہے کیونکہ بعض کی مسافت میں تفاوت پایا جاتا ہے جو کبھی تو پانی کی دوری کے سبب اور کبھی کسی گاؤں سے مانوس رہنے کے باعث واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض جگہ ایک کے بجائے دو برید (اسٹیشن) کرنے پڑتے ہیں۔

ڈاک کا انتظام اکاسرہ ایران و قیصرہ روم کے عہد میں بھی تھا لیکن مجھے

(مؤلف کتاب التعریف بالمصطلح الشریف کو) ان کی صورت اور پیمانے کا حال معلوم نہیں۔

اسلام میں سب سے پہلے معاویہ بن ابی سفیانؓ نے ”برید“ کا انتظام کیا۔ یہ اسوقت رائج کیا گیا جب ”امیر المومنین علیؓ“ کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے اور جانشین حضرت امام حسنؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں سلطنت و خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ آپ نے اپنی سلطنت کے ہر حصے سے جلد سے جلد خبریں حاصل کر نیکی غرض سے ایرانی دہقانوں اور رومی واقف کاروں کو جمع کر کے ان کو اپنے منشا و مقصد سے آگاہ کیا۔ انہوں نے حسب الحکم ”برید“ کی تنظیم کی اور اس سلسلے میں فخر سے کام لیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسکی اولیت کا سہرا خلیفہ عبدالملک بن مروان کے سر ہے جس نے عمرو بن سعید الاشدرق، عبداللہ بن زبیر، مصعب بن زبیر اور مختار بن ابی عبید کی ”بغوات و خروج“ کے خاتمے کے بعد اس کا انتظام کیا اور اس کے ذریعے سے قسطنطنیہ سے طلا کا رنگینے منگا کر دمشق کی جامع مسجد اور مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کی مسجدوں کی آرائش کی جسکی کچھ باقیات اب بھی (۱۴۶ھ میں) جامع دمشق کے صحن، قبوں اور اس کے آس پاس پائی جاتی ہیں۔ مکے میں باب بنی شیبہ اور دارالحجلہ کے پاس مہدی کے اضافہ کردہ حصے میں یہ طلا کاری دیکھی جاسکتی ہے جس کو تا حال مہدی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بیت المقدس میں صحرہ مبارک اور محراب القبلی کے پاس اسکے کچھ آثار باقی ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؓ برید کے ذریعے مزار نبویؐ پر درود و سلام بھیجا کرتے تھے۔ اس کے بعد عرصے تک ڈاک کا انتظام قائم رہا لیکن بنی امیہ کے خاتمہ اور بنی عباس کے برسر حکومت آنے کے عہد میں خراسان و عراق میں سلسلہ تعلقات منقطع ہو گیا۔

خاندان خلافت عباسیہ میں مہدی کے زمانے تک اس طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹے ہارون رشید کو جب ایک موقع پر سپہ سالار بنا کر بھیجا تو احوال و کوائف سے باخبر رہنے کے لیے اپنے اور لشکر گاہ کے درمیان برید کا انتظام کیا جو ہر وقت تازہ بہ تازہ نو بہ نو اخبار پہنچانے لگی۔ اس سفر جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی یہ

انتظام بھی برخواست ہو گیا۔ ہارون رشید جب خود تخت نشین ہوا تو ایک دن اسے یہ انتظام بھی یاد آیا اور اپنے وزیر اعظم یحییٰ بن خالد برکی کے مشورے سے سلطنت کے صوبہ جات سے باضابطہ خبریں حاصل کرنے کا بندوبست کیا اور وہی طریقہ اختیار کیا جو بنی اُمیہ کے دور میں رائج تھا۔ مختلف مرکزوں پر خراج جمع کیے گئے اور اسکے ذریعہ خلیفہ اور خبر رساں خط و کتابت کرنے لگے۔

یہ حالت مامون رشید کے زمانے تک رہی۔ بنی بویہ نے جو خلفاء عباسیہ کی کمزوری سے ان پر غالب آرہے تھے اس سلسلہ برید یا ڈاک کو منقطع کر دیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے حالات خلیفے سے مخفی رکھنا چاہتے تھے تاکہ اچانک بغداد پر حملہ کر کے خلیفہ سے من مانی باتیں منوالیں۔

سلجوقی بادشاہوں نے بھی یہی طریقہ جاری رکھا کیونکہ انکی خانہ جنگی اور باہمی نزاعات حسب منشا گھڑچڑھے اور خچر سوار ڈاک کے روانہ کرنے سے مانع تھے۔ جب زرنگی خاندان حکومت کرنے لگا تو برید کے لیے اعلیٰ نسل کی اونٹیاں منتخب کر کے مقرر کیں۔ بنی ابواب نے بھی اپنے زوال تک اس کو جاری رکھا۔

ان کے بعد ترکی خانوادے حکمران ہونے لگے تا آنکہ ملک اظہار بھیرس کے زمانے میں مصر و شام اور حلب سے فرات تک تمام ممالک ایک ہی حکم کے زیر نگیں ہو گئے۔ دمشق میں یہ خاص انتظام ہوا کہ وہاں ایک ایک نائب، وزیر، قاضی اور کاتب الانشاء متعین ہوئے اور میرے (مصنف کتاب کے) چچا ”الصاحب شرف الدین ابو محمد عبد الوہاب“ کاتب الانشاء مقرر ہوئے۔ جب وہ اپنے مستقر جانے سے قبل حضور میں باریاب ہوئے تو انہیں ہدایات دی گئیں ہمیشہ مرکز اعلیٰ کو تاتاریوں اور فرنگیوں کی تازہ کارستانوں اور دیگر حالات سے باخبر رکھیں اور کہا گیا ”اگر ممکن ہو تو ہر رات مجھے تازہ خبریں پہنچایا کرو“۔ پھر وہ زمانہ قدیم اور عہد خلفاء کی ڈاک کے عہد انتظام کا تذکرہ سنا تو بادشاہ نے انہیں بھی اسی طرح عمل کرنے کا حکم کیا۔

۱۔ مصنف کو یہ روایت مفصل و مطول طور پر جمال الدین الدواداری نے جو بریدی کے نام سے موسوم اور ابن سدید سے معروف ہے بیان کی تھی۔

یہ برید اب تک باقی ہے اور اتنی اہمیت و وسعت اختیار کر چکی ہے کہ اسکی موقوفی کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔

موجودہ مراکز برید

مصر:

مصر میں تین جہتوں سے ڈاک آتی ہے (۱) مرکز قلعہ جبل محروسہ سے قوص اور پھر اسوان جانے کے لیے پہلے جیزہ جاتی ہے وہاں سے زاویہ حسین، مٹیہ القائد (نوقائم شدہ مرکز)، ونا، لبیا، و ہروط، اقلوسنا ہو کو مٹیہ بن خصب پہنچتا ہے جو دریائے نیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں عمدہ چراگا ہیں ہیں۔ مدر سے، حمام اور بازار بھی کچھ کم نہیں۔ کہتے ہیں کہ امیر خصب نے اپنی حکومت مصر کے زمانے میں اسے اپنے بیٹے کے لیے بسایا اور اسی کے نام سے موسوم کیا اور جواب بھی مشہور ہے۔ ڈاک یہاں سے اشمونین جاتی ہے جو صعید کا ایک شہر ہے اور یہیں پائے تخت بھی ہے۔ پھر ذروہ و سربام جاتی ہے جو شریف حصن الدین بن تغلب کی طرف منسوب ہو کر ذروۃ الشریف بھی کہلاتا ہے۔ یہ شریفی مستقر تھا۔ یہاں ان کے قصر اور مکانات موجود ہیں۔ یہ بھی نیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں سے مقلوط، اسیلوط (یہ دونوں صعید میں ہیں طہ مراغہ (یا مراغ) بنش بوزہ (یا لبر بوزہ) جرجہ بلیہ اور ہو جاتی ہے۔ اس سے قریب کرم الحمر واقع ہے اور یہ دونوں صرف خاص سلطان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہیں مغربی میدانوں کا سرسبز علاقہ ختم ہو جاتا ہے اور ریتلے میدان خائق و ندر سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے ڈاک قوص جاتی ہے پھر اسوان، نوبہ اور سواکن تک بھی ”ہمن“ کے ذریعے جاتی ہے۔

(۲) اسکندریہ کے دو راستے ہیں پہلے قلعہ محروسہ سے براہ قلیوب، منوف، محلہ (مدینہ غربیہ) اور نحریریہ پہنچتی ہے۔ دوسرا راستہ مرکز قلعہ سے جیزہ، جزیرۃ الفظہ، دروان، طرانہ زاویہ مبارک (یا انباوک)، دهنور الحوش سے لوقین ہوتا ہوا، اسکندریہ پہنچتا ہے۔

(۳) دمیاط جانے کے لیے سعیدیہ سے جس کا ذکر نیچے آئیگا راستہ پھر پھونٹا ہے۔ چنانچہ قلعہ محروسہ سے سعیدیہ جا کر اشموم الرمان جاتے ہیں اور پھر دمیاط پہنچتے ہیں۔

فرات:

قلعہ الجبل المحرورہ سے ”مراکز اخذہ“ کے ذریعے فرات جانے کے لیے پہلے سریاقوس جاتے ہیں۔ اس کے قریب خانقاہ ناصریہ اور بازاریات بھی ہیں۔ یہاں سے بیر البیضا اور بلیس پہنچتے ہیں جو سلطانی گھوڑوں کا آخری مرکز ہے۔ سلطانی گھوڑوں کے لیے سائس اور چارہ وغیرہ سرکاری اہتمام سے ملتا ہے۔ اس کے بعد مقررہ برید عربی قبائل کے ہاتھ میں ہے۔ ان کو گھوڑوں کا کرایہ دیا جاتا ہے۔ ہر ماہ کی پہلی کو نوبت بہ نوبت یہ لوگ ہر مرکز پر اپنے گھوڑوں کے ساتھ آتے ہیں۔ ایک ماہ ایک لوگ اور دوسرے ماہ دوسرے لوگ آتے ہیں۔ اسکی نگرانی کے لیے ایک سرکاری عہدہ دار مقرر ہے جو اس نوبت کے گھوڑوں کو سرکاری نشان کا داغ لگاتا ہے۔

ان مرکزوں میں سب سے پہلا سعیدیہ ہے جہاں سے خطارہ، قبر الوالی (جو عمارات، چشموں اور باغوں کے باعث خوب آباد ہو رہا ہے)، صالحیہ، (جو مصری علاقے کا آخری معمور شہر ہے) بیرغزی قصیر (کریم الدین وکیل الخالص الناصری نے یہاں ایک مکان مسجد اور اذان گاہ تعمیر کی تھی مگر سوائے آخر الیمان کے سب منہدم ہو گئے ہیں۔ اس اذان گاہ سے روشنی گھر کا کام لیا جاتا ہے اسکے قریب ہی کا قولہ کا قدیم مرکز ہے جس کے متصل ایک پل کے نیچے سے طغیانی کے زمانے میں علاقہ رمل کا پانی بہ جاتا ہے) جب وہ، (یہاں عمارت و پانی معدوم ہیں صرف شہادت { داغ اندازی } کے لیے گھوڑے یہاں ٹھہرتے ہیں اور پانی ساتھ لاتے ہیں) غرابی، قطبا، صبیحہ نخل معن (اس کو مخفف کر کے کوئی ایک لفظ بولتے ہیں) مطیل، برادہ، وادہ، (یہاں ایک چھوٹا سا قریہ اور ملک الاشرف خلیل کی بنائی ہوئی مسجد ہے۔ فخر الدین کاتب المالک نے یہاں ایک رباط تعمیر کی تھی جو بعد میں فروخت ہو گئی) بیر القاضی، (وادہ اور اس میں فاصلہ بہت ہے) عریش (کریم الدین وکیل خاص نے یہاں ایک مضبوط و محفوظ مسافر گھر بنایا ہے اور پانی کا بھی انتظام کیا ہے۔ رات کو مسافر یہاں رہتے ہیں اور فرنگی ڈاکوؤں سے اطمینان رہتا ہے)، خروہ (یہاں بھی مسافر گھر ہے جو فخر الدین کاتب نے

تیار کر لیا تھا) ڈاک پہنچتی ہے۔ شہادت زدہ گھوڑے یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سے آگے جانے کے لیے سرکاری گھوڑے اور اصطل ہیں۔ چنانچہ یہاں سے زعقہ، رنج، سلقہ، (یہ بیزنطینی ڈاک کا بھی مرکز تھا) غزہ کی راہ سے ملائیس، بلد الخلیل، جنبا، صافیہ ہو کر کمرک جاتے ہیں۔

اگر دمشق جانا ہو تو غزہ (مذکورہ صدر) سے حمین، (جو مرکز برید گویا ڈاک خانہ یا پوسٹ آفس ہے) بیت دراس، (یہاں ناصر الدین خزندار تنگری نے ایک عمارت بنائی ہے۔ پہلے یاسور میں ٹھہرتے تھے مگر فاصلہ زیادہ ہونے سے اب اسے اسٹیشن بنایا گیا ہے) قشری (یہاں ایک وقف کائنواں ہے اور طاجار الدوادار الناصری کے جو اس مرکز کی تجدید کا مشیر تھا، آثار موجود ہیں اور لدولیت، دراس، یاسور میں مسافت زیادہ ہونے سے بہت مفید ثابت ہو رہا ہے) لدعجا (یہ راستے سے ہٹ کر ہے اگر یہاں سے بدلی جائے تو بہتر ہو) طیرہ (یہاں مکان ناصر الدین دوادار تنگری نے بنانا شروع کیا تھا جس کو اس کے بعد دوسروں نے مکمل کیا) فاقون، فر، حمین پہنچتے ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ نین اور طین ہو کر صفد بھی جاتا ہے۔ دمشق جانے کے لیے زرعی، بلیان، جامع (یہ ۴۱ھ میں بطور زاید مقرر ہوا)؟

زحر ابد جامع (امیر کاغل نے منفس سے قربت کے باعث اسے اسٹیشن بنایا پہلے ڈلی (یعنی راس الماء میں تھا) صنیم، غباغب، کسود، دمشق، اسٹیشن تھے۔
دمشق سے متعدد شاخیں پھوٹی ہیں چنانچہ قصیر - قطیفہ - قطل - قارا - برتج - العطش - فسلہ - یہاں سے طرابلس کو بھی راستہ جاتا ہے - شمیم - حمص - کاہ - طیم - جرابلس - معرہ - انقرا - آباد - قسرین - حلب - باب - شاجور - بیرہ - یہ ایک زبردست قلعہ ہے اور شروع سے اب تک مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔

قصیر - قطیفہ - قطنہ - (یہاں کوئی مرکز نہیں ہے صرف جوتے نعل، روٹی اور صدقہ ملتا ہے) - جلیجل - مصنع - قریمین - حیر - بیضا - تدمر - ارک - فخنہ - کواقل - قباقب - رجبہ - (مشرقی سرحد پر آخری اسٹیشن ہے)۔

دمشق سے برتج الفلوس - ارنیب - نصران - صفد تک

دُشَق سے خان میشلون - رُبدل - حسین - بیروت تک
 دُشَق سے خان میشلون - جزین - صیدا تک (صیدا سے بیروت جانے والوں
 کے لیے ایک مرکز ہو سکتا ہے)۔

دُشَق سے خان میشلون - کرک نوح - (صوبہ بقاع کا مستقر) بعلبک تک
 دُشَق سے زبدانی - بعلبک - قصبا - فسولہ - قصب - قدس - انمار - شعرا - عرقا
 طرابلس۔

دُشَق سے براہ جہم - حمص جاتے ہیں پھر سلمیہ - بقدید - سوریا
 دُشَق سے براہ جہم - عین یزال - صہلان - خابور - راس العین
 دُشَق سے مصیاف، حمص میں بھی راستہ اتصال ہے۔
 دُشَق سے براہ طفس - قیدیہ - برج ابیض - شبان - (اور دو مزید مرکزوں کے
 بعد) کرک۔

دُشَق سے صوبہ دلات کو براہ صفقہ - طفس - اذرعات جاتے ہیں۔
 حلب جانے کے لیے نمبر (۱) کے آخری مشہور اسٹیشن بیرہ ہو کر جاتے ہیں۔ اس
 سے آگے سموقہ - سندرا - بیت الفار - عینتاب - بہشتی ہیں یہاں سے قیساریہ وغیرہ بھی
 جاتے ہیں۔

عینتاب مذکورہ بالا سے قلعہ المسلمین ایک مرکز ہے اور یہیں فرات ہے۔ قلعہ
 المسلمین سے جسر الحجر اور کھفا پر یہ سلسلہ منتهی ہوتا ہے۔

حلب سے ارجاب - تیزین - لغرا - بغراض - (ارمیدیا کی سرحد پر ہے) مایاس
 ایاس جاتے ہیں۔

حلب سے جبول، بلس، جہم بھی ایک سلسلہ ہے اور یہ حلب کے مرکزوں کا
 خاکہ ہے۔

باقی دوسرے قلعے اور مستقر صوبہ جات انہی کی ذیلی شاخوں یا ایک سے
 دوسرے کی راہ میں واقع ہیں۔

طرابلس کے مرکز:

طرابلس سے مرقیہ، بلنیاس، لازقیہ (یہاں کی بندرگاہ بہترین اور درجہ اول کا شمار ہوتا ہے) صہیون (قلعہ اور سابق پائے تخت ہے اور تاریخی حیثیت سے بہت سے واقعات کا موقع رہا ہے) بلاطنس، قلیعہ، کہف، قدموس، خوابی، رصافہ، مصاف، صہیون سے برزید کو بھی ایک راستہ جاتا ہے۔

ممالک محروسہ سے متصل بریدی راستے:

حمصیرہ الاررد کے ہیں جو ہلاکو خاں کے جانشینوں کے قبضے میں ہیں۔ ان کے مرکزوں کو ”خیل الاولات“ اور ”خیل الیام“ کہتے ہیں۔ مگر یہاں کے گھوڑے وغیرہ نہ تو سلطانی ملک ہیں اور نہ کام کرنے پر مجبور۔ وہ صرف اپنی مرضی سے عربی قبائل اہل مصر کی طرح ڈاک لاتے لیجاتے ہیں۔

کبوتروں کی ڈاک

(سب سے پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کی ابتداء موصل سے ہوئی اور فاطمی خلفاء مصر اس سے کام لیتے رہے۔ اس کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کیا اور کبوتروں کے اترنے کے مقامات مقرر کیے۔

محی الدین بن عبدالظاہر نے ایک فاضلانہ کتاب ”تمایم الحمام“ کے نام سے اسی بارے میں لکھی ہے۔

موصل کی اس ”ایجاد“ پر سب سے پہلے نور الدین بن زنگی نے ۵۶۵ھ میں توجہ کی اور اس سے فائدہ اٹھایا)

مراکز:

اس کا جال تمام اسلامی ممالک میں بچھا ہوا ہے چنانچہ گواب مصر سے قوس، اسوان اور عنایتاب سے تعلق ٹوٹ گیا ہے لیکن پھر بھی قاہرہ سے اسکندریہ، قاہرہ سے

دمياط، قاہرہ سے سولیس، قاہرہ سے بیس (سرحد شام پر) صالحیہ، قطیہ، دلدادہ، غزہ، قدس شریف تک، غزہ سے نابلس، غزہ سے لد، قاقون، جنین، صفد تک، جنین سے بلیان اربد، طفش، صمنین، دمشق تک اور پھر ان میں سے ہر ایک سے متصل مشہور مقامات تک مثلاً بلیسان سے اذرعات اور طفش تک (والی الولات یعنی گورنر جنرل کو باخبر رکھنے کے لیے)۔

پھر دمشق، بعلبک، قارا، قریتین تک، قارا سے حمص، حماہ، مصرہ، معرہ، حلب، بیرہ، قلحہ المسلمین بہشتی تک اور آس پاس جہاں کہیں بھی ضرورت ہو انتظام ہے، پھر قریتین سے تدمر، خنہ، قبا، رجبہ تک اتصال ہے (البتہ واضح رہے کہ آجکل خنہ سے قبا کو کبوتر نہیں لیجاتے ہیں بلکہ تدمر کے چٹھی رساں ہی جو خنہ میں رکھے گئے ہیں قبا پر پہنچاتے ہیں)۔

یہ خلاصہ ہے اس کبوتری ڈاک کے مرکزوں کا جواب (۱۹۶۷ء) میں ممالک اسلامیہ میں قائم ہیں۔ فقط

کبوتروں کی اور معمولی ڈاک کا خریطہ جس میں ان ممالک کا نقشہ بنا کر اتصال دکھایا جاسکتا ہے اگر تیار ہو تو باعث دلچسپی ہوگا۔ مذکورہ بالا مقالے سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ برید کتنی منظم اور باقاعدہ تھی۔

(مجلہ عثمانیہ حیدرآباد دکن دسمبر ۱۹۲۸ء مارچ ۱۹۲۹ء)

پٹرول، گاس (گیس) اور ابتداے اسلام

اسلام سے قبل:

اگرچہ عنوان سے بے تعلق سا نظر آئیگا، لیکن یہ ذکر ضروری ہے کہ عربوں کا تعلق پٹرول اور مٹی کے تیل سے کچھ نہیں، تو ایک ہزار سال قبل اسلام سے نظر آتا ہے۔ چنانچہ سالومون (سلیمان) بن ایزاک (اسحاق) نے (جو فرانس کے علاقہ تروا Troyes میں ۱۰۴۰ء تا ۱۱۰۵ء زندہ رہا) اپنی مشہور شرح تورات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ جب حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے باپ سے جدا کرنا چاہا، تو انہیں ایک کاروان والوں کے ہاتھ جو مصر جا رہے تھے، بطور غلام فروخت کر دیا تھا۔ کتاب تکوین (۳۵:۳۷) میں صراحت ہے کہ یہ بنی اسماعیل یعنی عرب لوگ تھے اور خوشبودار چیزیں تجارت کے لیے لے جا رہے تھے۔ سالومون بن ایزاک اس کی شرح میں لکھتا ہے کہ ”عادۃً یہ لوگ صرف نفط (مٹی کا تیل یا ڈانبر) لے جایا کرتے تھے، جس کی بدولت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر اس مرتبہ وہ عطریات لے جا رہے تھے، تاکہ حضرت یوسف کو تکلیف نہ ہو۔“

قرآن میں:

۱۔ سلیمان علیہ السلام کے ذکر میں سورہ سبا (۱۲:۳۴) (بجائز نزول اٹھاؤناں کی

سورہ) میں بیان ہوا ہے ”وَأَسْلَمْنَا لَهُ الْفِطْرَ“ یعنی خدا نے ان کے لیے ”فطر“ کا چشمہ بہا دیا۔ اگرچہ قطر کے معنی پکھلائے ہوئے تانبے کے بھی ہوتے ہیں، لیکن اسے مذکورہ تحت قطر ان کا مترادف بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح تورات کی اوپر بیان کی ہوئی شرح معنی دار ہو جاتی ہے۔

۲۔ جہنم میں جو مختلف قسم کے عذاب ہونگے، ان کا ذکر سورہ ابراہیم (۵۰:۱۳) (بلحاظ نزول بہت رواں مکی سورۃ) میں یوں ہوا ہے: ”سَرَّابِيلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ“ یعنی ان کے گرتے قطر ان کے ہونگے۔ قطر ان ڈنبر کو کہتے ہیں، اور یہ لفظ یورپی زبانوں میں بھی داخل ہو گیا ہے (مثلاً فرانسیسی میں یہ Goudron ہو گیا ہے) جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عربی معاشیات و اقتصادیات میں اس کو اہمیت حاصل تھی اور یورپ میں یہ چیز عربی ممالک ہی سے درآمد ہوتی تھی۔

حدیث میں:

حدیث کی تقریباً سب کتابوں میں ذکر ہے کہ جب قبیلہ عبد القیس کے لوگ مدینہ آئے اور اسلام قبول کرنے کے بعد وطن واپس جانے لگے، تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تمہیں چار باتوں کی تاکید کرتا ہوں، اور چار باتوں سے روکتا ہوں۔ ان ممنوعات میں چار قسم کے شراب کے برتنوں کا ذکر ہے: دُبَاء، حَتَم، قَعِیر، مُقَعِر۔ ان میں سے آخری مُقَعِر اس برتن یا پیپے کو کہتے ہیں جس پر قار یعنی ڈنبر کی طلا کی گئی ہو، خاص کرداروں کے بند کرنے کے لیے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قبیلہ عبد القیس ”بحرین و عمان“ میں رہتا تھا، جو آج کل الحُفوف اور الاحساء کہلاتے ہیں اور سعودی عرب میں پٹرول کا مرکز ہیں۔

اس حدیث سے ثابت ہے کہ ڈنبر عہد نبوی میں بھی معلوم اور مستعمل تھا۔

خلافت راشدہ میں:

ابن سعد نے اپنی تاریخ ”الطبقات“ (۳ [حصہ اول]: ۲۶) میں لکھا ہے: حضرت علی کے قاتل ابن ملجم کو گرفتار کر لیا گیا تھا، اور وہ قید خانے میں تھا۔ جب حضرت

علی زخموں کے کاری ہونے سے فوت ہو گئے تو دفن کے بعد ان کے بیٹے امام حسن نے آدمی بھیجا کہ اسے قید خانے سے نکال لائے، تاکہ اس سے قصاص لیا جاسکے۔ لوگ دیکھنے کو جمع ہوئے اور نطق اور لکڑی کے پورے اور آگ لائے، اور کہا کہ ہم اسے آگ میں جھونکیں گے۔“ اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ ۴۰ھ میں نطق اتنی عام چیز تھی کہ اسے لوگ ہر وقت بازار میں خرید سکتے تھے۔

خلافت بنی اُمیہ میں:

”حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ کے زمانے میں ہم جہازوں میں سوار ہو کر گئے اور دشمن (بیزنطینی رومیوں یعنی یونانیوں) سے دو چار ہوئے تو ہم نے ان پر خمر قات پھینک مارے“ (شرح السیر الکبیر للسرحدی، طبع حیدرآباد دکن (۱۳۳۶ھ)، ۳: ۲۱۳): اگرچہ اس حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ یہ آتش زن مادہ (محرقة) کیا تھا، لیکن یونانی آگ اس زمانے کی ایک معروف چیز تھی اور پانی سے بھی نہیں بجھتی تھی۔

خلافت عباسیہ میں:

امام محمد شیبانی خلیفہ ہارون رشید کے قاضی القضاۃ تھے (یورپ میں شارلمان کے معاصر) اور ۱۸۹ھ میں رے (طهران) میں فوت اور دفن ہوئے۔ ان کی کتاب الاصل (جس کا دوسرا نام کتاب المبسوط بھی ہے) فقہ کی بہت ضخیم اور بڑی اہم کتاب ہے اور اب حیدرآباد دکن میں چھپ بھی گئی ہے۔ وہ اس کے باب الشروط میں ایک بڑی دلچسپ بات ضمناً بیان کرتے ہیں چونکہ یہ اہم بات ہے اس لیے ہم اصل اور ترجمہ دونوں درج کریں گے:

وإذا اشترى أرضاً فيها عيون	جب کوئی ایسی زمین خریدے، جس میں نطق اور گاس
النفط والغاز فالعين تدخل	کے چشمے ہوں، تو ہمارے (حق) مذہب میں چشمہ تو
فی الشراء عندنا، وما هو	خرید میں خود بخود داخل ہو جاتا ہے لیکن جو نطق اور
الحاصل من النفط و الغاز	گاس اس سے حاصل ہو، وہ بغیر ذکر کے خود بخود

داخل نہیں ہوتا کیونکہ یہاں حاصل ہونے والی چیز ایسی ہی ہے جیسے پودے زمین کے لیے۔ چونکہ چشمہ زمین کا جزو ہے، اس لیے بغیر ذکر کے معاہدے میں داخل ہو جاتا ہے، برخلاف پانی کے جو ابھی کنوئیں کے اندر ہی ہو (اور ڈول سے نکالا نہ گیا ہو) وہ زمین اور مکان کی خرید میں خود بخود داخل نہیں ہو جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ (کنوئیں میں سے کھینچ کر) حفاظت میں لینے سے پہلے پانی کسی کی ملوکہ چیز نہیں ہوتا، اس لیے خرید و فروخت میں وہ شامل نہیں ہوتا، چاہے ذکر ہو یا نہ ہو۔ نقطہ اور گاس اس کے برخلاف ہیں کیونکہ وہ ملوکہ مال ہوتے ہیں، جیسے نمک کی کان میں نمک، لیکن کچھ علمائے قانون ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ زمین فروخت ہو تو اس میں چشمہ بغیر ذکر کے داخل نہیں ہوتا کیونکہ زمین کے لفظ میں صرف وہ مقام شامل ہوتا ہے جس سے زراعت یا سکونت گاہ کے لیے استفادہ کیا جاسکتا ہو۔ اور چشمے میں ایسی کوئی چیز نہیں۔ اس لیے وہ معاہدے میں ذکر کے بغیر داخل نہیں ہوتا۔

اس اختلاف سے بچنے کے لیے (امام محمد نے) بیان کیا ہے کہ معاہدہ نامہ یوں لکھیے:

فلاں شخص سے فلاں زمین اور وہ چشمہ خریدے، جن

لايدخل إلا بذكره لأن
الحاصل فيه بمنزلة الربيع
للارض۔ وأما العين فهي
جزء من الارض، فتدخل في
العقد بدون ذكر و هذا
بخلاف الماء الذي في البئر
فانه لايدخل ذلك في شراء
الارض والدار۔ لأن الماء قبل
الاحراز لا يكون مملوكاً لأحد
فلایتنا وله البيع، ذكرأ ولم
يذكر، بخلاف النفط والغاز
فانه مال مملوك، بمنزلة
الملح في المملحة۔ ومن
العلماء من قال: العين
لا تدخل في بيع الارض بدون
الذكر لأن اسم الارض يتناول
الموضع الذي يمكن الانتقاء
به بالزراعة أو السكنى۔
والعين ليس من ذلك في
شئ، فلا تدخل في العقد
بدون الذكر۔

فللتحرز من هذا الخلاف
ذكر أنه يكتب:

”اشتري منه الارض التي يقال

لها كذا، والعيون التي فيها
الغاز والنفط حدود هذه
الارض التي فيها العيون-
اشترى منه هذه الارض
المحددة في كتابنا هذا،
والعيون التي فيها النفط

والغاز، وما في العيون من
النفط و الغاز محدودها

كلها۔“

مذکورہ بالا اقتباس کے لیے کتاب المبسوط للسرْحسی، جلد (۳۰) صفحہ (۱۹۰) بھی دیکھا جا
سکتا ہے۔

معدنی اور نباطی ماڈے:

ابوحنیفہ احمد بن داؤد دینوری نے بیان کیا ہے کہ ارز اور صنوبر کے درخت سے
زِفَت کا مادہ نکالا جاتا ہے، اور زیادہ تر کشتیوں کی طلاکاری کے لیے استعمال ہوتا ہے
کیونکہ قار (معدنی ڈانبر) سمندر کے پانی کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا بلکہ جھڑ جاتا ہے، مگر
زِفَت اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ رہا وہ زِفَت جو دواؤں میں ڈالا جاتا ہے، تو اس کا اس سے
کوئی تعلق نہیں، وہ زمین سے نکالا جاتا ہے۔ (دینوری کی کتاب النبات کا یہ اقتباس
الجامع الادویۃ المفردہ لابن سجون، مخطوطہ ڈبلن، اور کتاب الصيد نہ للبرونی، مخطوطہ،
بروصہ، ترکیا، سے لیا گیا ہے، اصل کتاب ناپید ہے)۔

نَظ و نَظ (نون کے زیر اور زیر دونوں سے) کھیل (یعنی ڈانبر) کو کہتے ہیں۔
ابوعبید کے مطابق نَظ ہر قسم کے قطران کو کہتے ہیں (نباتی ہو یا معدنی) لیکن ابوحنیفہ احمد بن
داؤد دینوری نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابوعبید کا قول فاسد ہے۔ اور بیان کیا
ہے کہ نَظ اور نَظ (زیر اور زیر دونوں سے) حُلابہ جبل یعنی پہاڑ کا دودھ ہے جو کنوئیں کی

گہرائی میں ملتا ہے، اور اس سے آگ جلائی جاتی ہے۔ زیر کے ساتھ نَفط کہنا زیادہ فصیح ہے۔ نفاط اور نفاط (ف) پر تشدید کے ساتھ اور تشدید کے بغیر (اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے نَفط نکالتے ہیں۔ نفاط اور نفاط (ف) پر تشدید کے ساتھ اور تشدید کے بغیر ایک قسم کی سرج (مشعل) ہے جس سے نَفط کو پھینکا جاتا ہے (یہ حوالہ لسان العرب اور تاج العروس میں مادہ نَفط کے تحت ملے گا)۔ دینوری کی وفات ۲۸۲ھ میں ہوئی۔

زہریلی گاس اور دھواں:

کتب خانہ عام مصر میں کتب فقہ حنفی نمبر (۱۰۸۰) میں ایک پرانا گنام عربی مخطوطہ ہے، جس کا نام ہے، ”رسالہ فی کیفیت الحرب والاسری والمرتدین“۔ اس کے ستائیسویں باب میں یہ دلچسپ جملہ ملتا ہے: جنگ میں تکلیف پہنچانا مثلاً آگ، دھوئیں، تیزاب اور بدبودار زہریلی گاس کا استعمال تاکہ استحکامات اور قلعوں کو خراب کریں اور دشمن میں دہشت پیدا کریں، جائز ہے۔

نَفط سازی کا طریقہ:

مدینہ منورہ کے مشہور کتب خانہ عارف حکمت بے میں ایک بہت پرانا عربی مخطوطہ ملا ہے، جس کا نام ہے: فی صناعت النَفط۔ یہ خالص فنی کتاب ہے کہ کس طرح مٹی اور بیکار ماڈوں کو پٹرول سے الگ کیا جاتا ہے اور اس کام میں کون سے کیمیاوی طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ چونکہ پایہ تخت ریاض میں سعودی وزارت تعلیمات اس پر کام کر رہی ہے اس لیے میں یہاں زیادہ تفصیل نہیں دے سکتا۔

خلاصہ:

یہ چند منتشر اور جستہ جستہ معلومات ہیں، جو یکجا کی گئی ہیں۔ ممکن ہے، ناظرین کو مزید حوالے بھی ملیں۔ علمی تعاون سے رفتہ رفتہ پٹرول کی تاریخ کے زنجیرے کی ایک کڑی مکمل ہو جائیگی۔

(نذریذی۔ مرتبہ مالک رام۔ مجلس نذریذی۔ نئی دہلی ۱۹۸۰ء)

مستشرقین

استانبول کی موتمر مستشرقین عالم

حال میں ترکی جانے کا اتفاق ہوا، خیال ہوا کہ اس علمی سفر کے حالات دلچسپی سے خالی نہ سمجھے جائیں گے۔ اس مقالے کے دو حصے ہیں:

(۱) موتمر مستشرقین کا حالیہ اجلاس (۲) ترکی کے کتب خانے ناگزیر وجوہ سے محض ایک اطلاع کے طور پر یہ سطریں تحریر ہیں:

یورپی جامعات میں مشرقی اور خاص کر اسلامی علوم کی تعلیم تو کئی سو سال سے ہو رہی ہے اور مشرقیات کی انجمنیں بھی کئی مقاموں پر ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے قائم ہیں، لیکن کوئی بین الممالک انجمن نسبتاً حالیہ چیز ہے اور پچاس سال سے بھی کم عرصہ ہوا کہ ”موتمر مستشرقین عالم“ کے نام سے ایک یورپی ادارہ وجود میں آیا۔ ہر تین چار سال

ا۔ ہمارے محترم اور فاضل دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب دارالمصنفین کے پرانے مخلص قدردان ہیں، وہ جہاں بھی رہتے ہیں اس کو نہیں بھولتے، چنانچہ پیرس جیسے دور دراز مقام سے معارف کے لیے وقت فوقتہ علمی سوغات بھیجتے رہتے ہیں۔ ابھی چند مہینے ہوئے، ان کا ایک علمی خط معارف میں شائع ہو چکا ہے، اب انہوں نے موتمر مستشرقین عالم منعقدہ استانبول کی مختصر روداد اور ترکی کے متعلق مفید معلومات قلمبند کر کے بھیجے ہیں۔ اس موتمر کا دعوت نامہ دارالمصنفین کے نام بھی آیا تھا، مگر اس غریب ادارہ میں اتنے کثیر مصارف برداشت کرنے کی طاقت کہاں ہے، اس لیے ڈاکٹر صاحب کی بھیجی ہوئی سوغات میں ناظرین معارف کو بھی شریک کیا جاتا ہے۔ ”م“

میں اس کا اجلاس ہوتا ہے، الجزائر کے بعد، یہ دوسری دفعہ ہے، کہ اس کا اجلاس گزشتہ ستمبر میں ایک اسلامی شہر (استانبول) میں ہوا۔ اس بائیسویں اجلاس میں ساری دنیا سے اہل علم جمع ہوئے اور ہر حیثیت سے یہ سب سے کامیاب اجلاس رہا۔ ۱۵ تا ۲۲ ستمبر ۱۹۵۱ء ایک ہفتے صبح اور شام ہر روز اس کی نشستیں ہوتی رہیں۔ کوئی تین سو کے اجتماع میں پاکستان سے تو صرف ایک شخص جامعہ پنجاب کے معین امیر آئے، لیکن حیدرآباد اور ہندوستان نے توقع سے زیادہ دلچسپی لی۔ جامعہ کلکتہ کے استاذ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سے ناظرین ناواقف نہیں، حکومت ہند کے پانچ نمائندوں میں یہ اکیلے مسلمان تھے۔ حیدرآباد سے ہر شخص اپنے مصارف سے شوق علم میں آیا تھا اور اس کی قدر بھی کی گئی، چنانچہ دو نشستوں کے صدر حیدرآبادی نامزد ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نظام الدین تو آئے لیکن پروفیسر محمد عبدالرحمن خان نہ آ سکے۔ اس کی بنا پر وہ صدارت نہ کر سکے، جامعہ عثمانیہ کے ڈاکٹر محمد غوث اور ڈاکٹر محمد یوسف الدین بھی آئے تھے۔ صدارت کے اعزاز مصر کے ڈاکٹر ابوبکر اور ڈاکٹر مراد کامل نیز ایران کے پروفیسر علی اصغر حکمت کو بھی عطا ہوئے تھے۔

مقالے توقع سے اتنے زیادہ آئے کہ متعدد شعبوں کو کئی کئی ذیلی شعبوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ چنانچہ اسلامیات کو ایک کی جگہ چار شعبوں میں بانٹا گیا۔ مزید براں مشرق بعید میں سے ملایا و انڈونیشیا کو الگ کر کے مستقل شعبہ بنانا پڑا، قدیم اناطولیا کو دو، ترکیات کو تین اور اسلامی فنون لطیفہ کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔

اجلاس مشترکہ یعنی جلسہ عام میں ڈاکٹر نظام الدین (حیدرآباد) نے یہ بتایا کہ عربی فارسی مخطوطات کی اشاعت میں مشرق اور مغرب کس طرح تعاون کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر زکی ولیدی طوغان (استانبول) نے کہا کہ قرون متوسطہ کے مسلمان مورخ کس قدر ناقدانہ رویہ رکھتے تھے اور ڈاکٹر کرامرس (لائڈن) نے بتایا کہ اسلامی عمرانیات میں عام عمرانیات کے علاوہ کیا خاص اور زائد ابواب ہوتے ہیں۔

یہ تو ممکن نہیں کہ جملہ مقالوں کی (جو عربی، ترکی، نیز یورپی زبانوں میں تھے) فہرست دی جائے، ہمالیہ تلے کے مسلمانوں کی دلچسپی کی چیزیں شمار سے باہر ہیں۔ اس

لیے مثنیٰ نمونہ از خروارے پر اکتفا کجائی ہے۔

- ۱۔ حران اور پرچہ کے آثار قدیمہ (پروفیسر لائڈن، انقرہ)
- ۲۔ سباد معین (یمین) کی تازہ کھدائیاں (البرائٹ - بالٹی مور)
- ۳۔ زمانہ جاہلیت کی یمنی عورت (بشٹین - آکسفورڈ)
- ۴۔ فنیقی حروف تہجی معین (یمین) سے لیے گئے (گیورمیکیف - بلغاریا، صوفیا)
- ۵۔ المدونہ میں کتاب الغصب (دے می لیا - روما)
- ۶۔ طوق الحماۃ لابن حزم کے مشرقی مصادر (گرامیا گومیسس - بحریت، اندلس)
- ۷۔ الحکمۃ العروسیہ لابن سینا (پادری قنواٹی - قاہرہ)
- ۸۔ جزیرہ مالطہ کی موجودہ زبان کا درجہ عربی بولیوں میں (کولین، پاریس)
- ۹۔ ہندو ثقافت کا اثر عربی ادبیات پر (راے چودھری کلکتہ)
- ۱۰۔ تاریخ ابن ایاس کے چند نو دستیاب شدہ اجزاء (محمد مصطفیٰ - قاہرہ)
- ۱۱۔ انقرہ کے مخطوطات (بکر صدیقی بایکل - انقرہ)
- ۱۲۔ جہرۃ الانساب لابن خرم شائع کردہ لیوٹی پرووان سال کی بے شمار غلطیاں،
(خلیل نیاج - استانبول)
- ۱۳۔ سفرنامہ ابن فضلان قدیم جرمن معلومات کے ماخذ کے طور پر،
(گراف، ہاڈماٹن برگ، جرمنی)
- ۱۴۔ اباضیوں کے ریت میں غائب شدہ شہر سیدراتہ کی دریافت
(میڈم فان برشم، جینیوا)
- ۱۵۔ خلفاء فاطمین کے آداب و مراسم (کانار الجوزائر)
- ۱۶۔ عماد الدین اصفہانی کی انفتح القسی (ماسے - پاریس)
- ۱۷۔ الحاکم کی رصد گاہ مصر (آیدین ساکلی - انقرہ)
- ۱۸۔ عربی و اسلامی طب (سارنیل - نیپلز)
- ۱۹۔ ابودلف کا رسالہ ثانیہ (مینورسکی، کیمبرج)
- ۲۰۔ ولی کشمیر میر سید علی ہمدانی (علی اصغر حکمت - طہران)

- ۲۱۔ فن تنقید کی ترقی میں قرآن کا حصہ (خلف اللہ - اسکندریہ)
- ۲۲۔ فقہ کی تاریخ (برون شوانگ - بورڈو، فرانس)
- ۲۳۔ اسلامی مشرق میں زراعت کا اثر زمین پر (ہسکے - استانبول)
- ۲۴۔ زانی کے مزینہ سے نکاح کی حرمت اسلام میں (شاخت، آکسفرڈ)
- ۲۵۔ ناصر خسرو کی جامع الکملین (گوربین - طہران)
- ۲۶۔ اسلام اور بنیادی حقوق انسانی (محمد غوث - حیدر آباد دکن)
- ۲۷۔ اسلامی قانون کی تاریخ پیدائش (گوکٹان - اسرائیل)
- ۲۸۔ مقدمہ ابن خلدون کے نئے صحیح ایڈیشن کی ضرورت (تاویت الطنجی، قاہرہ)
- ۲۹۔ اسلام اور سماجی بیمہ (محمد یوسف الدین - حیدر آباد دکن)
- ۳۰۔ فتوت تاریخ اسلام میں (ماسینون، پاریس)
- ۳۱۔ دیوان حافظ کا قدیم ترین نسخہ کلکتہ میں ہے (زبیر صدیقی - کلکتہ)
- ۳۲۔ قبلائی قان کا جاوا پر حملہ (داماے - انڈونیشیا)
- ۳۳۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کی ترکی مردم شماریاں (عمر لطفی برکان، استانبول)
- ۳۴۔ ویانا (آسٹریا) میں ۱۶۶۶ء کی ترکی جبری فوجی خدمت
- (ایسے بچے کی ویس - ویانا)
- ۳۵۔ انیسویں صدی کے آغاز میں کورینا یونانی کی جاسوسی ترکی میں، فرانسیسی وزیر خارجہ کی روشنی میں (ایضاً)
- ۳۶۔ جوامع التواریخ مولفہ رشید الدین خان کے حالات فرنگ کے مآخذ
- (یان اوتربشت، ہالینڈ)
- ۳۷۔ بی بی مریم کی تاریخ میں دوسری صدی عیسوی کا ایک ترکی قصیدہ
- (پسالتی - استانبول)
- ۳۸۔ قدیم چغتائی میں ایک ترجمہ قرآن مجید (فاخر عزہ - لندن)
- ۳۹۔ قرہ قویونلو اور آق قویونلو (مینورسکی - کیمبرج)
- ۴۰۔ ”سیاست نامہ“ کس حد تک اصلی ہے (یکٹی الخشاب - قاہرہ)

- ۴۱۔ پرانے ایران کا جاگیرداری نظام (ویڈن گرین - اسپالا - سویڈن)
- ۴۲۔ تالمود اور حدیث کی مماثلتیں (بانیت - اسرائیل)
- ۴۳۔ ایرانی سیاست اور یہود کی بابل سے واپسی (گالنگ - مائنس - جرمنی)
- ۴۴۔ بحریت کے پاس حال میں دستیاب شدہ قبل مسیح کا نسخہ توریت،
(فاندریلوک، ہنمیکین، ہالینڈ)
- ۴۵۔ آتھنس کی فاتح جامع مسجد (ماتیسکو - آتھنس)
- ۴۶۔ مسلمان مصوروں کی سوانح عمریاں مرتب کرنے کی ضرورت (مایر - اسرائیل)
- ۴۷۔ فاطمی دور کے منقش مٹی کے برتن (زکی حسن - قاہرہ)
- ۴۸۔ قدیم غزنی میں ترکی فنون لطیفہ (اینگ ہازوین - واشنگٹن)
- ۴۹۔ ترکی اثر مغلیہ فنون لطیفہ پر ہند میں (پلے براون - پاریس)
- ۵۰۔ استانبول کے قبرستانوں کے کتبے (معین اطابچ - استانبول)
- ۵۱۔ عربی خط کا ولولہ خیز درجہ فن لطیف میں (مدیہ - استانبول)
- ۵۲۔ ماخذ ہائے فقہ کا جدید مطالعہ (قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کے علاوہ دیگر
ایک درجن ماخذ راسخ العقیدہ فقہاء کے ہاں) (ناچیز راقم الحروف)
- مؤتمر نے متعدد قراردادیں بھی منظور کیں کہ مختلف حکومتوں سے خواہش کی
جائے کہ اپنے ہاں کے کتب خانہ ہائے عمومی کے مخطوطات کی فہرستیں شائع کریں اور فوٹو
لینے کے انتظامات کریں۔ مخطوطہ کتابوں کے علاوہ دستاویزوں کے مطالعہ پر اہل علم توجہ
کریں، اسلامیات کا خصوصی مطالعہ کرنے والوں کی ایک خصوصی انجمن بنائی جائے اور
آئندہ اجلاس انگلستان میں ہو، (جو تین یا چار سال بعد ہوگا)۔
- مؤتمر مستشرقین کے سلسلہ میں استانبول کے علاوہ درجن بھر دیگر ترکی شہروں میں
بھی علمی نمائشیں کی گئیں، جن میں قلمی کتابیں، تصویریں، قدیم آلات، وغیرہ وغیرہ
بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں جمع کی گئی تھیں۔

آئندہ سال ۱۳۷۲ھ ۱۹۵۲ء جمادی الآخرہ کو مولانا روم کی وفات پر پانچ صدیاں
گزر رہی ہیں اور ۱۶۵۳ عیسوی میں فتح قسطنطنیہ کی پانچ صد سالہ سالگرہ سرکاری طور پر

ترکی میں منانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ مکتوب مبارک نبوی بنام مقوقس موجود ہے اور عجائب خانہ توپ قبو سرائے میں کمرہ آثار مبارک میں ایک سنہری صندوق میں عزت و احترام سے محفوظ ہے۔

ترکی حکومت نے مہمانداری کے جو انتظامات کیے تھے، اس پر سارے یورپی و امریکی شرمندہ تھے کہ ان کے ہاں اس کا عشرِ عشر بھی نہیں ہوتا۔

مؤتمر کے شعبہ ہائے اسلامی نے جہاں اور قراردادیں منظور کیں، وہیں یہ بھی تھی کہ دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) کی خدمات کو وہ قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ روز افزوں پھلے پھولے گا اور اپنی خدمتِ علم کو سدا جاری رکھے گا۔

ترکی کے کتب خانے:

خدا نظر بد سے بچائے، عالم اسلامی میں کتب خانوں کے لحاظ سے ترکی کا درجہ اتنا بلند ہے کہ باقی سب اس کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ شاید یہ کہنا بھی ہر مبالغے سے خالی اور خالص صداقت ہے کہ ساری دنیا کی عربی، فارسی کی قلمی کتابیں ایک طرف ہوں اور صرف ترکی کی ایک طرف تو بھی ترکی کا پلہ بھاری رہے گا۔

۱۹۳۵ء کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ترکی کے چونسٹھ شہروں اور قصبوں میں ایسے عمومی کتب خانے ہیں جن میں مخطوطات موجود ہیں۔ اکیلے شہر استانبول میں ایک سو تین کتب خانے ہیں۔ حکومت اب ان سب کو یکجا کرتی جا رہی ہے۔ چنانچہ

۱۔ معارف: اس کے مقابلہ میں ہم ہندوستانیوں کی میزبانی کا حال یہ ہے کہ ابھی گزشتہ اکتوبر میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا تھا اور جس میں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ملکوں کے بعض نمائندے بھی آئے تھے، اس میں میزبانی کا جیسا انتظام تھا، اس کو دیکھ کر گردن شرم و ندامت سے جھک جاتی تھی کہ بیرونی ملکوں کے نمائندوں کا سوال تو الگ رہا، خود ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے بلند اور ستھری معاشرت کے لوگوں نے اہل لکھنؤ کی میزبانی اور سلیقہ و تمیز کے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی، مگر اس میں اہل لکھنؤ کا شکوہ بے کار ہے اس لیے کہ لکھنؤ جن لوگوں سے عبارت ہے وہ اس میں ذخیل ہی نہ تھے۔

مؤتمر مستشرقین ۱۹۵۱ء کے موقع پر جو رہبر مکاتب ہمیں تقسیم کیا گیا اسکی تحریر کے مطابق استانبول کے یہ ڈیڑھ سو سے زائد کتب خانے اب صرف اٹھارہ عمارتوں میں اکٹھے ہو گئے ہیں، اکیلے کتب خانہ سلیمانیہ میں اب ترین کتب خانے ہیں۔

انکی کتابوں کی صحیح تعداد بیان کرنی مختلف وجوہ سے مشکل ہے۔ ۱۹۳۵ء میں وزارت تعلیمات کی رپورٹ میں کوئی بیس ہزار ترکی، ایک لاکھ گیارہ ہزار عربی اور آٹھ ہزار فارسی قلمی کتابوں کا اندازہ کیا گیا تھا، اس فہرست میں انقرہ میں کوئی قلمی کتاب نہیں بتائی گئی ہے، (اور میں نے وہاں کے کتب خانہ عام میں آٹھ ہزار مخطوطات نیز جامعہ انقرہ کے شعبہ تاریخ و جغرافیہ میں ۱۷ ہزار مخطوطات خود دیکھے)۔ اسی طرح کتب خانہ جامعہ استانبول کو اس شمار سے خارج رکھا گیا تھا، وہاں اس وقت سترہ ہزار سات سو اڑتالیس (۱۷۷۳۸) مخطوطے ہیں اور جدید خریداری اور تحفوں کی وصولی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجموعہ رسائل کو شمار میں صرف ایک کتاب فرض کیا جاتا ہے اور بعض وقت ایک ایک جلد میں سو سو چھوٹے چھوٹے رسالے ہوتے ہیں اور یہ صورتیں نادر نہیں، جب ان میں نادر روزگار کتابیں ہوں۔

ان دو مرکزوں کے علاوہ بروصہ اور قونیہ میں سے (جہاں مولانا روم کا مزار ہے) ہر ایک میں پانچ پانچ چھ چھ ہزار مخطوطات ہیں۔ ان مقاموں کے علاوہ راقم کو افیون قرہ حصار، بالیکیسر، بنی شہر، چوروم، سکی شہر، قسطنو، قیصری، کوتاہیہ اور منسیا جانے کا موقع ملا، لیکن حسرت رہی کہ از میر (سمرنا) ادرنہ (اڈریانوپل) اماسیہ، چکیری، اسپارتا، عطیہ اور سمسون جانا نہ ہو سکا، جہاں ہر ایک میں ہزاروں مخطوطات ہیں۔ کیا عجب ہے کہ جہاں تعداد کم ہے، وہیں گودڑ میں لال چھپے ہوئے ہوں۔ خانگی ذخیروں کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ترکی جانے کا مقصد مؤتمر مستشرقین کی شرکت کے بعد چند معین مخطوطات سے استفادہ کرنا اور دینوری کی کتاب النبات کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں ان کی جانب رجوع کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو مہینوں کے قیام اور درجن بھر سے زائد مقاموں کے سفر کے باوجود بہت زیادہ کتابیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ فہرستیں دیکھیں، چند نام نوٹ کیے

اور اُن میں سے بھی چند منتخب کو منگوا کر ورق گردانی کی۔ بہر حال اپنی یادداشت میں سے چند کا ذکر ناظرین کے لیے کرتا ہوں۔

فقہ:

۱۔ کفایۃ المنتہی، مؤلفہ مرغینانی (صاحب ہدایہ) اس نادر روزگار کتاب کے نسخے جامعہ استانبول اور اباصوفیہ میں ہیں۔ یہ ہدایہ کے بعد کی تالیف ہے، لیکن توقع کے برخلاف زیادہ بڑی نہیں، چار سو سے بھی کم ورق ہیں، قامت کہتر ہو تو کیا ضروری ہے کہ قیمت بھی کمتر ہو۔

۲۔ التجنیس والمزید: مؤلفہ الفیاء استانبول، بروصہ، قونیہ وغیرہ میں متعدد نسخے ہیں۔

۳۔ کتاب الرسوم: مؤلفہ عبدالرحمن بن نصر بن عبداللہ (بروصہ و انقرہ) یہ فنِ حِصَب کی نظری نہیں، بلکہ عملی کتاب ہے اور ان تمام محاصل کا ذکر ہے، جو مختلف اہل پیشہ سے وصول کیے جاتے تھے، مثلاً شاہراہ، پل، غلہ فروش، نانباہی، قصاب، حلوائی، دوا فروش، عطّار، ماہی فروش، گوالے، بزاز، درزی، رنگریز، موچی، صراف، سنار، طبیب حیوانات، غلام جانور فروش، حمام، فصد کھولنے والے، طبیب مودب، مودب صبیان (استاذ) اہل ذمہ وغیرہ، ہر اہل پیشہ کی چالبازیوں اور اہل حِصَب کی نگرانی سے بھی بحث ہے۔

۴۔ نہایۃ المجتہد و کفایۃ المقتصد: مؤلفہ ابن رشد (قونیہ دو جلد) یہ گویا ہدایۃ المجتہد کا تکملہ ہے، اس نسخہ کی یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ وہ حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، نیز (روایۃ محمد بن علی بن محمد بن احمد ابن العربی الطائی الحاتمی عنہ اجازۃ و مناولۃ)

۵۔ اصول الفقہ: مؤلفہ موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی (قونیہ) حنبلی اصول فقہ پر نفیس کتاب ہے۔

۶۔ شرح القدوری للاقطع: التوفی ۷۴۷ھ دو جلد (قونیہ)

- ۷۔ آداب القضاۃ للخصاف (قونیہ)
 ۸۔ شرح مختصر الکرخی: مولفہ قدوری (بروصہ)
 ۹۔ کتاب التجرید: مولفہ قدوری وہبی، (استانبول)
قرآنیات:

- ۱۔ تفسیر بسیط للواحدی: (۱۰۰۵) ورق (قونیہ)
 ان کی تفسیر و چیز کے نسخے زیادہ ملتے ہیں مگر تفسیر بسیط بہت کیا ہے۔
 ۲۔ تفسیریات پرستہ رسائل کا ایک ضخیم مجموعہ (قونیہ)
 اہم تر رسالے یہ ہیں:
 ۱۔ ترتیب التیسیر فی قواعد علم التفسیر۔ بزمانہ الملک
 الطاہر حمق
 ۲۔ الناسخ والمنسوخ لابن سلامہ البغدادی المتوفی
 سنہ ۴۱۰ھ
 ۳۔ الاکلید للسیوطی
 ۴۔ احکام القرآن لسرح الدین درویش بن قابسم نقل
 سنہ ۸۹۰ھ
 ۵۔ تبیان مولفہ نووی
 ۶۔ الجواهر المصنوع للشعرانی۔
 ۷۔ اسباب النزول للواحدی
 ۸۔ تاویلات مشکل القرآن لابن قتیبہ
 ۹۔ التعریف للسهلی صاحب روض الانف
 ۱۰۔ بُرہان القرآن لحافیہ من الحجۃ البیان لمحمود بن
 حمزہ المقرئ الکنانی المتوفی سنہ ۵۰۰ھ
 ۱۱۔ المتشابهات للراغب الاصفہانی

- ۳۔ تفسیر امام الحرمین الجوینی (جامعۂ استانبول)
- ۴۔ احکام القرآن مؤلفہ بیضاوی، مشہور تفسیر بیضاوی کے مؤلف ہی کی تالیف (کو تاہیہ) دو جلدیں
- ۵۔ امثال القرآن مؤلفہ امام ماوردی (بروصہ)
- ۶۔ تفسیر ابن عربی (بالی کیسر) اسی (۸۰) جلدوں میں سے صرف ایک جلد۔

متفرقات:

- ۱۔ کتاب الذخائر والاحتف (افیون قرہ حصار) مختلف بادشاہوں وغیرہ نے جو تحفے بھیجے اس میں انکی دلچسپ تفصیل اور دوسرے معلومات ہیں۔
- ۲۔ معدن الجواہر (قونیہ) بصرہ اور جزائر طنج فارس کے حالات۔
- ۳۔ تاریخ صفد (جامعۂ استانبول) شہر صفد، صور، عکہ، ناصرہ، طبریہ، عسلیٹ وغیرہ کے حالات۔
- ۴۔ کتاب المفردات للادریسی (محمد فاتح استانبول) یہ مشہور مؤلف ادریسی کی جڑی بوٹیوں پر ایک اہم کتاب ہے۔
- ۵۔ کتاب الصید لللمیرونی (بروصہ) دواسازی پر کتاب۔
- ۶۔ کتاب الجفر لللمیرونی (قونیہ) علم جفر پر بیرونی جیسے شخص نے جو کچھ لکھا ہو، وہ لغویت نہیں ہو سکتی۔
- ۷۔ جواہر نامہ مؤلفہ نصیر الدین طوسی (انقرہ) فارسی، جواہر شناسی پر نفیس رسالہ ہے۔
- ۸۔ عجائب الدنیا مؤلفہ مسعودی (بروصہ)
- ۹۔ اخبار الزمان مؤلفہ مسعودی (قسطمونو) مسعودی کی کم چیزیں بچی ہیں۔
- ۱۰۔ غریب الحدیث مؤلفہ ابو عبیدہ القاسم بن سلام (چوروم)
- ۱۱۔ ۳۱۹ھ کا مخطوطہ ہے۔ ابتدائی چند ورق موجود نہیں ہیں اور بیشتر اجازتیں اور سماعتیں ہیں۔
- ۱۲۔ غریبی القرآن والسنتہ، مؤلفہ ابو عبیدہ (قونیہ)

۱۲۔ اخبار خالد بن ولید مؤلفہ محمد بن ابراہیم بن یوسف الحسنی نقل ۹۶۴ھ (قونیہ)

۱۳۔ مجموعہ (الف) کتاب المقصود والممد ودلابی العباس بن دلاؤد۔

(ب) کتاب المذکر والمؤث لابن حاتم البستانی (قونیہ)

۳۸۶ھ کا مخطوطہ ہے۔

۱۴۔ مولانا روم کے مزار پر شہر قونیہ میں جو عجائب خانہ کھولا گیا ہے، اس میں نہ صرف

مولینا کے استعلائی ملبوسات ہیں، بلکہ مثنوی شریف و متعلقات اور کتاب فیہ مافیہ کے قدیم ترین نسخے بھی ہیں، ان میں متعدد فارسی تراجم قرآن میں سے ایک پر ۱۰۳۰ھ درج ہے، گویا مولانا روم کی ولادت سے بھی ایک سال پہلے کا نسخہ ہے۔

۱۵۔ کتاب الحشائش بالتصویر (توپ قبوسرائے استانبول) نباتات کے خواص اور ان کی نہایت نفیس تصویریں ہیں۔

۱۶۔ مسالک الابصار مؤلفہ ابن فضل اللہ العمری (آیا صوفیا) اس کا ایک ٹکڑا چھپا ہے یہاں جلد (۲ تا ۲۷) ہیں۔ ہر فن کے معلومات کی انسائیکلو پیڈیا ہے، ایک باب ہندوستان پر بھی ہے، نیز اطباء کے حالات میں بھی ایک فصل ہندوستان پر ہے بعض ٹکڑے جامع استانبول و انقرہ میں بھی ہیں۔

۱۷۔ جوامع التواریخ مؤلفہ رشید الدین خان (توپ قبو استانبول)

بہت بڑی تقطیع اور نہایت نفیس تصویروں کی حامل اور تالیف کے صرف دس سال بعد کی نقل اور مکمل ہے، اس کا ہندو کشمیر و بدھ مت کا حصہ ہالینڈ کا پروفیسر یان شائع کرنے والا ہے۔

۱۸۔ کتاب المطر والرعد (کویرولو) استانبول

کاغذ پر تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی ہے، اسے پُر کرنے کے لیے عنوان سے غیر متعلقہ چیزیں بھی درج کرتا ہوں۔ میں نے ۱۹۳۲ء میں ترکی میں تین ماہ گزارے تھے۔ اس انیس سال میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کا اکثر حصہ خوشگوار ہے۔ مذہبیت بہت بڑھ گئی ہے اور الحمد للہ نماز کا شوق نوجوانوں میں زیادہ ہو گیا ہے۔ تین چار بڑے

شہروں کو چھوڑ کر باقی ملک میں شراب خانے ناپید ہیں، صنعت و زراعت میں خاص ترقی ہوئی ہے، لیکن بعض پہلو افسوسناک بھی ہیں۔ ملک کی آزادی اب باقی نہیں رہی اور ترکی وزراء اپنے ضمیر کے خلاف واشنگٹن کے حسب الحکم رائے دینے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ یہودی اثر ہر جگہ غالب ہے، کمال پاشا کے دور میں بھی یہودی وزراء ہی کارفرما تھے۔ ہمیں دور سے نام کی بنا پر اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ جاوید پاشا وزیر مالیات (جسے کمال پاشا کی جان کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں پھانسی دی گئی)، توفیق رشدی آراس (سابق وزیر خارجہ) خالدہ ادیب خانم! سب یہودی ہی تھے، یا ہیں، اب بھی ملک کی تجارت یہودیوں ہی کے ہاتھ میں ہے، دولت مند صرف وہی ہیں۔

چند ماہ ہوئے معارف میں میرا ایک خط چھاپا گیا تھا جس میں رسم الخط کے بعض مسائل سے بحث تھی۔ استانبول میں مشہور عربی لغت العباب مؤلفہ صفائی دیکھ رہا تھا کہ اس میں جا بجا معرب الفاظ کی اصل نظر سے گزری۔ مؤلف کے ہاتھ کے مخطوطے میں (گ) کو (ک) لکھا گیا ہے۔ ایسا ایک اقتباس جو کچھ اور تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے درج ذیل ہے:

جزیرہ قصیر خلیج فارس میں جزیرہ ہنگام کے قریب، مجھ (صفائی) سے وہاں ۱۱۲ھ میں شیخ جزیرہ ابراہیم ہنگام نے بیان کیا، کہ جزیرہ قصیر میں ابدال وابرار اور وہ لوگ رہتے ہیں جن سے روئے زمین کی کوئی چیز چھپی نہیں رہتی اور وہاں کوئی آبادی نہیں ہے، اگر کوئی جہاز وہاں لنگر ڈالے تو وہ لوگ دکھائی	”والقصیر..... جزیرة صغيرة عالية قريبة من جزيرة هنكام في بحر فارس قال الصفغاني مؤلف هذا الكتاب ذكر لي ابراهيم هنكام رحمة الله شيخ جزيرة هنكام بهاسنة اربع عشرة و ستة آن جزيرة القصير مقام الابدال والابرار ومن زويت له الارض،

۱۔ معارف: اگر اس سے مراد مشہور و معروف خالدہ ادیب خانم ہیں، جو چودہ برس پہلے ہندوستان آچکی ہیں تو یہ انکشاف بالکل نیا ہے، اس لیے کہ وہ تو بظاہر مسلمان تھیں، ممکن ہے سلاطین یہودی رہی ہوں یا اس نام کی کوئی اور خاتون ہوں۔

دیتے ہیں، پھر غائب ہو جاتے ہیں۔
 پھر شیخ نے اشارے سے بتایا، بڑی دیر
 کے بعد میں نے اسے دور سے دیکھا
 اگر میں اپنے کام کا مختار ہوتا، تو بادلوں
 کے ستونوں پر سوار ہو کر اور ہوا کے
 دامن میں چٹ کر وہاں جاتا، لیکن
 بغداد سے مجھے سفارت پر ہندوستان
 (سندھ) بھیجا گیا تھا اور سندھ اور
 سندھ اقرب نہیں ہیں۔

ولیس بها ساکن۔ ومن ارسى
 بها يراهم ويغيون... عنه۔
 و اشار لى اليها من ههنا
 فضالت فضاءت لى بعدا لى۔
 ولو املك زمام امرى لركبت
 اليها سواري الغمام وتشببت
 باذيال الرياح ولكنى كنت
 تحملت الرسالة الى الهند من
 بغداد وما ابعد السند من
 سنداد۔

(معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۲ء)

www.KitaboSunnat.com

کیمبرج کی موثر مستشرقین عالم

محترم جناب اڈیٹر صاحب معارف۔ اعظم گڑھ
سلام مسنون۔ معلوم نہیں تازہ موثر مستشرقین کی روداد آپ تک پہنچی یا نہیں
بصورت نفی مندرجہ ذیل تذکرہ شاید ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

تمہید و مبادیات:

اگرچہ بعض حالات نے مجھے موثر میں شرکت کے لیے کیمبرج جانے کا موقع نہ
دیا، لیکن مختلف لوگوں سے جو چشم دید حالات سنے اور موثر کے جو سرکاری نشریات دیکھے،
اُن کی روشنی میں یہ معلومات ناظرین کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔

موثر کا گزشتہ اجلاس استانبول میں ہوا تھا جس کی دور وندا دیں معارف میں
چھپ چکی ہیں۔ وہاں کی قرارداد کے مطابق تازہ اجلاس انگلستان میں ہوا۔ اس کی
دعوت رائل ایشیائٹک سوسائٹی نے دی تھی اور ملکہ برطانیہ نے سرپرستی قبول کی تھی اور
اس کے لیے کیمبرج کا انتخاب ہوا جس کی وجہ غالباً اس کا جامعاتی قرونِ متوسطہ کا ماحول
بھی ہے اور شہر کا حسن کیونکہ آسفر ڈاب ایک صنعتی شہر بن گیا ہے۔ جس کی پرانی ہیئت
بدل گئی ہے۔ یہ موثر کا تیسواں اجتماع تھا جو ۲۱ تا ۲۸ اگست ۱۹۵۴ء کو منعقد ہوا۔ آئندہ
اجلاس تین سال بعد جرمنی میں ہوگا۔

جو فرنگی استانبول کے اجتماع میں وہاں کی اسلامی مہمان نوازی دیکھ چکے تھے، وہ
کیمبرج کی ترقی یافتہ اور مہذب مہمان نوازی پر اگر زبان سے اعتراف نہ بھی کریں تو
دل میں ضرور شرمائے ہوں گے۔ کالجوں کے اقامت خانے رہائش کے لیے مفت تھے
اور اسی کے باورچی اور ملازم بھی تھے۔ پھر بھی قیام و طعام کا اقل ترین خرچ تیس شلنگ

روزانہ لیا گیا جو عام ہوٹلوں سے بھی گراں تھا۔

دعوت نامے میں سب سے پہلے یہ درج تھا کہ پروٹسٹنٹ، کیتھولک اور یہودی عبادت کا انتظام کن مقاموں پر کس کس وقت ہوگا۔ جب مومتر میں شرکت کرنے والے عربی نام والے صاحب بہادروں کو خود ہی فکر نہ ہو تو اسلام کو کون پوچھتا، جب مدعی خود ست ہو تو گواہ کیوں چست ہوگا؟

برسوں کی بے تعلقی کے بعد پہلی مرتبہ اس دفعہ روس سے بھی دس بارہ نمائندے آئے تھے۔ انتخاب اگرچہ ایسے لوگوں کا کیا گیا تھا، جو انگریزی اچھی جانتے تھے لیکن عصیت یا خودداری کہ انہوں نے اپنی مادری زبان ہی میں سارے مقالے سنائے مگر ان کی اس جدت کو اور لوگوں نے رشک کی نظر سے دیکھا کہ ان مقالوں کے انگریزی ترجمے بھی وہ طبع کرا کے ساتھ لائے تھے اور حاضرین میں مفت تقسیم کر دیے گئے تھے۔ عموماً ہر شعبے میں ان نمائندوں نے حصہ لیا، فانوسی تقریروں کے ذریعے مزید دلچسپی پیدا کی گئی، اگرچہ فنی نقطہ نظر سے ان رنگین فلموں کی سب نے داد دی۔ لیکن اس کا منشا چونکہ علم سے زیادہ دعایہ اور پروپیگنڈا تھا اس لیے ہر شخص کا رد عمل اس کے حوصلے کے مطابق تھا۔ ان میں سے ایک ”بزرگ“ کی تحقیق و استنباط یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اہل مکہ جس ”اللہ“ کی پوجا کرتے تھے وہ ایک بڑا سرمایہ دار تاجر سمجھا جاسکتا ہے۔ دوسرے ”بزرگ“ نے دو قدم آگے بڑھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ میلہ کذاب نے قرآن مجید کی نقالی کر کے اس کا منہ نہیں چڑایا تھا بلکہ اصل میں میلہ کذاب کے ”ادبی شہ پاروں“ کی نقالی کر کے پیغمبر اسلام نے قرآن مجید تیار کیا تھا۔ اگر خدا وندان ماسکو کا منشا صرف خدا پرستی اور ہر ایک خدا کو ماننے والے دین کی مخالفت ہو تو البتہ ان تحقیقاتوں کو کسی نہ کسی حد تک درست کہا بھی جاسکتا تھا، لیکن جو لوگ غیر جانبداری سے سیاسیات عالم کا مطالعہ کرتے ہیں اور جنہیں نہ روس سے دشمنی ہے اور نہ امریکہ سے کوئی خوش عقیدگی وہ اس طرح کی بواغبیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ روس کا یہ منشا تو سمجھ میں آتا ہے کہ سویٹ علاقہ میں بسنے والے سارے مسلمانوں کو دہریہ اور اشتراکی بنایا جائے۔ اسی طرح اس کی اس سیاست کو بھی با اصول قرار دے سکتے ہیں کہ اپنے خفیہ کارندوں کے ذریعہ وہ

ساری دنیا میں مذہب شکنی کے پرچار میں مشغول رہے لیکن حیرت اس پر ہوتی ہے کہ اپنے حریف امریکہ اور اس کے رفقاء کا اثر گھٹانے اور ان اسلامی ممالک کو جو اس وقت حریف کے زیرِ نگیں تو نہیں لیکن زیرِ اثر ضرور ہیں اپنا ہمنوا بنانے کی جب وہ کوشش کر رہا ہے اور اس کے لیے حج کو ہر سال سرکاری اہتمام سے چند افراد بھیجے جاتے ہیں اور قاہرہ کے سفارت خانے میں کثرت سے مسلمانوں کو مامور کر کے ان کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ پابندی سے نماز باجماعت مسجدوں میں پڑھا کریں ایسی حالت میں اپنے مخفی نمائندوں کے ذریعہ نہیں بلکہ علانیہ و مسلمہ سرکاری نمائندوں کے ذریعہ کیمبرج جیسے مقام پر ایسی حرکتیں کیوں کی جاتی ہیں جن سے روس کے حریفوں کو ایک مفت کا حربہ ہاتھ آتا ہے؟ یہ واقعہ ہے کہ آج کل سارے آزاد اسلامی ممالک امریکہ، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم وغیرہ سے نالاں ہیں۔ ان حالات میں روس کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ اپنے کو مظلوموں کا ہمدرد ظاہر ہی نہیں بلکہ ثابت بھی کرے۔ اس کے لیے ایک آدھ ووٹ اسرائیل کے خلاف کبھی کبھی دے دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی اعلان کردہ سرکاری پالیسی پر عمل کر کے (ثابت کرے کہ وہ) آزادی اور ناظر فداکاری کا حامی ہے اور یہ پالیسی عملاً اندرون ملک کے مسلمانوں کے ساتھ برتی جائے اور بیرون ملک ان حماقتوں کا سد باب کیا جائے جس کا کیمبرج میں مظاہرہ کیا گیا۔

تقسیم کار:

تقریباً نو سو نمائندوں کے اجتماع کے باعث کام کو بارہ شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس کی سرکاری ترتیب یہ تھی۔

- ۱۔ مصریات
- ۲۔ سامی لسانیات
- ۳۔ آشوریات
- ۴۔ ایران، آرمینیا، وسطی ایشیا
- ۵۔ آلتائی (ترکی) النہ
- ۶۔ ترکیات (تاریخ)
- ۷۔ ہندیات
- ۸۔ مشرق بعیدہ
- ۹۔ (الف) اسلام (النہ ادبیات و فنون لطیفہ)

(ب) اسلام (تاریخ و مذہب)

۱۰۔ مشرق و مغرب کا تماس، اور مشرقی ممالک کی عیسائیت

۱۱۔ افریقہ۔

معلوم نہیں اس تقسیم کی ترتیب کس اصول پر کی گئی، ہم کو بے وجہ بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔

منتخب مقالے:

نظام العمل میں مقالے جس ترتیب سے درج ہیں اس کو برقرار رکھتے ہوئے چند ایسے عنوانوں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو معارف کے ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ (رموز: گ انگریزی، ف فرانسیسی، ج جرمن)

۱۔ مسٹر غنیم (گ) سقارہ میں تیسرے مصری خانوادے کے نئے سیڑھی دارا ہرام کے ایک احاطے کی دریافت

۲۔ Baamgartel ع (گ) خانوادہ داریت سے قبل کا مصری فن تعمیر

۳۔ عبدالرحمن بدوی (گ) قدیم مصری اصول تعمیر کے متعلق بعض لسانیاتی شواہد

۴۔ yadin - y (گ) تیسرے الفیہ قبل مسیح کے آغاز پر فلسطین و مصر کے حربی

تعلقات

۵۔ مسٹر حسن (گ) ابوالہول کے رازنی کھدائیوں کی روشنی میں

۶۔ W.F. Albright بنی اسرائیل کے خروج مصر سے متعلق چند ملاحظات

۷۔ J. Rykman (ف) وسطی عرب کے شمودی کتبوں پر عارضی تبصرہ

۸۔ G.c.m. Rykman (ف) وسطی عرب میں ۱۵۵۱ء تا ۱۹۵۲ء میں چٹانوں پر

دستیاب شدہ سبائی کتبوں کی مختصر فہرست۔

۹۔ سینٹ جان عبداللہ فلسی (گ) سعودی عرب میں ۱۵۵۱ء تا ۱۹۵۲ء کے کتبات

کی تلاش کی مہم کا جغرافیائی اور عام تذکرہ۔

۱۰۔ ایضاً۔ ملکہ سبا کے ملک کی تلاش (ایک قلم)

- ۱۱۔ M. Fitegerald (گ) ہکسوس بادشاہوں کے قلعے اور جنگی رتھیں (حضرت یوسفؑ کے زمانے میں یہی شامی خانوادہ مصر پر حکمران تھا)
- ۱۲۔ H.Birkeland (گ) قدیم کلاسیکل عربی لہجے کا اتار چڑھاؤ (accent)
- ۱۳۔ J.Pirenne (ف) یونان اور سب کے تعلقات جنوبی عرب کی تاریخ اور واقعات کا زمانہ معین کرنے کی ایک نئی اساس۔
- ۱۴۔ W.Maxtix (گ) سامی النہ کے صیغہ امر کی اصلیت۔
- ۱۵۔ مسٹر مسقطی (گ) سامی النہ کا صیغہ جمع۔
- ۱۶۔ J.Sckirmann (گ) قرونِ متوسطہ کی عبرانی شاعری میں خوبصورت لڑکا (امرد پرستی)
- ۱۷۔ C.J.Edmands (گ) عراق کے اہل حق
- ۱۸۔ T.J. Billy (گ) ڈنمارک کی ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۴ء میں بحرین بھیجی ہوئی علمی مہم کا مختصر اور ابتدائی خاکہ
- ۱۹۔ Ericoceralli (گ) قرونِ متوسطہ کے مغربی افسانوی واقعات کا فارسی مخطوطات کے ایک نئے ذخیرے میں ذکر۔
- ۲۰۔ R.S.Tiehl اور F.Altheim (ج) بہرام چوہین کا افسانہ
- ۲۱۔ R.Firye (گ) کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن زجکو کا اندرز نامہ
- ۲۲۔ مسٹر مقبر (گ) ایران کی تازہ اثریاتی دریافتیں
- ۲۳۔ احمد آنش (ف) شاہنامہ فردوسی کی تکمیل کی تاریخ۔
- ۲۴۔ V.Minorsky (ف) اسلامی ایران کے جغرافیہ و تاریخ پر چند نشریات۔
- ۲۵۔ مسٹر تیمور (ج) سیواس میں ۱۳۲۲ء کا ایک عربی وتر کی وقف نامہ۔
- ۲۶۔ مسٹر منصور اوغلو (گ) قدیم اناطولی ترکی کے شخصی ناموں اور لقبوں پر چند ملاحظات۔
- ۲۷۔ احمد آمرے (ف) ترکی زبانوں اور انڈو یورپی زبانوں کے تعلقات۔ (اردو اور ترکی میں اتنی مشابہت ہے کہ اس کا لفظی ترجمہ گلابی اردو نہیں بلکہ فصیح اردو

(ہوتا ہے)

- ۲۸۔ عثمان طوران (گ) قرونِ متوسطہ کے ترکوں میں جہانگیری کا تصور۔
- ۲۹۔ فائق رزیت اونات (گ) مورخِ نثری کی حیات و تالیف پر جدید تحقیقاتیں۔
- ۳۰۔ خلیل ایٹالچی (گ) عثمانی سلاطین ترکی کی فتوحات اور مقامی امراء و معززین۔
- ۳۱۔ زکی ولیدی طوغان (ج) از کمبون کی رزمیہ نظم خان نامہ کی ممکنہ تاریخی اساس۔
- ۳۲۔ طیب گوکبلکین (ف) سلطان سلیمان قانونی کے عہد کے علاقہ رومیلیکی تنظیم اور اس کا نظم و نسق۔
- ۳۳۔ بکر صدیقی بانیکل (ج) سلاطین آل عثمان سے فیصلہ کن جنگ کے متعلق اوزون حسن کی تیاریاں اور جنگ کا آغاز۔
- ۳۴۔ Deny (ف) سترہویں صدی عیسوی کا ایک عالمِ ترکیات علی بابا البرٹ بابوٹی۔
- ۳۵۔ اولوجان چغتائی (گ) عثمانی سلاطین کی بیویاں
- ۳۶۔ احمد وانی (گ) تاریخِ ہند کا پس منظر آثارِ قدیمہ کی روشنی میں۔
- ۳۷۔ ASilva Regan (گ) پرنگلی دستاویز خانوں میں ہندی مواد۔
- ۳۸۔ Richard whitehead (گ) جہانگیر کے کتبوں پر منطقہ البروج کی علامتیں۔
- ۳۹۔ Alfxed Mastex (گ) ہندی اور اردو کی اصلیت اور اس کا آغاز۔
- ۴۰۔ F.P.Baxgeliax (گ) قصر الحمراء گیارہویں صدی عیسوی میں۔
- ۴۱۔ بیگم F.E.Day (گ) اموی ظروف اور برتن۔
- ۴۲۔ J.V.Macmalam (گ) ابتدائی اسلامی کے کمل؟
- ۴۳۔ ابو العلی عقیفی (گ) ابن عربی کی تالیفات۔
- ۴۴۔ ولید عرفات (گ) کتب سیرت میں منقولہ نظموں خصوصاً حسان بن ثابت کے اشعار کی صحت۔
- ۴۵۔ محمد خلف اللہ (گ) چوتھی صدی ہجری میں اعجاز قرآنی کا تصور۔
- ۴۶۔ مسٹر مرالی (ف) القرآن اور اس کی تالیف و نمائش الشعر۔
- ۴۷۔ L.A.Mayex (گ) اسلامی تعمیرات کے متعلق چند حقائق اور چند گتھیاں۔

- ۴۸۔ B.S. Rice (گ) عربی مخطوطات کے منقش سرورق کا ارتقاء۔
- ۴۹۔ van Berchene (ف) صحرائے الجزائر کے ریگ میں دفن شدہ شہر سدراتہ کی کھدائی کے دو مہموں کا نتیجہ۔
- ۵۰۔ J.Walker (گ) اموی اصلاحات سکہ سازی کے بعد کے اولین سکے۔
- ۵۱۔ J.Roboox (گ) اسناد اسلامی علم حدیث میں۔
- ۵۲۔ G.Vagda (ف) پاریس کے کتب خانہ عام کے چند عربی مخطوطات کے سماعت و اجازات
- ۵۳۔ G.Weil (گ) تخیل کے علم عروض کی کلید۔
- ۵۴۔ C.Caken (ف) بحر متوسط کے اسلامی ممالک کی معاشی اور سماجی تاریخ۔
- ۵۵۔ G.Wiet (ف) مملوک سلاطین کا ایک حکمنامہ مکہ معظمہ میں۔
- ۵۶۔ مسر مہدی (گ) ابن خلدون کے علم عمرانیات کی اساس قدیم کلاسیکل فلسفہ اور اسلامی فلسفہ میں۔
- ۵۷۔ M.Plessner (گ) طب اور سائنس پر عربی مخطوطوں کی ایک عالمگیر فہرست۔
- ۵۸۔ F.gabxieli (ف) جغرافیہ اور لیبی کے کامل نسخے کی اشاعت کی تجویز۔
- ۵۹۔ L.Massignon (گ) لیبی فاطمہ سے عورتوں کی عقیدت کا اصل منشاء۔
- ۶۰۔ مسر اور لیس (ف) زیری سلاطین کے زمانہ میں مالکیوں کا شیون سے مناقبہ گیارہویں صدی عیسوی میں (شمالی افریقہ میں)
- اس کی توقع کم ہے کہ یہ مقالے کبھی یکجا شائع ہوں گے۔ اکثر لوگ اپنے پسند کے رسالوں میں اپنا مضمون دے دیتے ہیں اور بعض کے چھپنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی وجہ ارباب موتمر کے پاس رقم کی کمی ہے۔ کیا ترقی یافتہ مغرب میں علم کی کساد بازاری اس سے کم ہے جس کی اہل مشرق کے متعلق شکایت ہوتی ہے؟
- شاید اس مختصر رپورٹ میں کسی کو کوئی کام کی چیز مل جائے مجھے خاص کر نمبر (۵۷) اور (۵۸) سے دلچسپی ہوئی۔
- (معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۵۴ء)

موتمر مستشرقین عالم کا اجلاس میونخ ۱۹۵۷ء

اس موتمر کا عموماً سہ سالہ اجتماع ہوتا ہے۔ استانبول اور کیمبرج کے اجلاسوں کی روداد سے معارف کے ناظرین واقف ہو چکے ہیں۔ اس کا چوبیسواں اجلاس ۲۸ اگست سے ۴ ستمبر تک میونخ (مغربی جرمنی) میں ہوا تھا۔ مدعوین میں تقریباً پندرہ سو فضلا تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ مٹھی بھر مسلمان بھی تھے لیکن الحمد للہ انہوں نے بہت اچھا اثر چھوڑا۔ ترک، تونس، شامی وغیرہ مختلف ملکوں کے مسلمانوں نے شعبہ وار اجلاسوں کی صدارت بھی کی۔ ہندی مسلمانوں میں دو ایک طالب علم جو یورپ میں موجود تھے، آگئے تھے۔ باقی سرکاری نمائندگی تھی جس کے لیے اب مسلمان چنے نہیں جاتے۔ آئندہ اجلاس ۱۹۶۰ء میں حکومت روس کی دعوت پر لینن گراڈ میں ہونا طے پایا ہے۔

موتمر سے خواہش کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے لیے (جن کی کوئی مسجد شہر میں نہیں ہے اور جن کو ہفتے میں ایک بار نہیں بلکہ روزانہ پانچ بار نماز پڑھنی پڑتی ہے) کانگریس کے احاطے میں کوئی کمرہ خاص کر دے۔ منتظمین نے اسے خوشی سے منظور کیا۔ موتمر کا کام اتنا وسیع ہے اور اس میں حصہ لینے والے اتنے زیادہ ہونے لگے ہیں کہ مقالوں کو چودہ شعبوں میں بانٹنا پڑا اور ان کے اجلاس بہ یک وقت ہوتے رہے۔ آدھے سے زیادہ کام اسلام اور مسلمانوں یا اسلامی علاقوں کے ساتھ خاص تھا جس سے دنیا میں ان کی اہمیت محسوس ہوتی ہے جس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا۔

(۱) مصریات

- (۲) خط سنجی اور مغربی ایشیا (عراق وغیرہ)
 (۳) توریت و یہودیت
 (۴) عیسائیت
 (۵) سامی السنہ
 (۶) اسلامی السنہ
 (۷) اسلامی تاریخ و فنون لطیفہ
 (۸) ترکیات
 (۹) ایرانی وقف قازیات
 (۱۰) ہندیات
 (۱۱) وسطی ایشیا
 (۱۲) چین و جاپان
 (۱۳) جنوبی و مشرقی ایشیا اندونیشیا
 (۱۴) افریقائی زبانیں

ان موضوعوں پر کوئی ساڑھے چار سو مقالے پڑھے گئے جن میں سے بعض میں فانوسی تصویریں بھی دکھائی گئیں، تقریریں صرف تین زبانوں میں منظور کی گئی تھیں، جرمن، فرانسی یا انگریزی۔ روسی نمائندوں نے اپنی تقریروں کو انگریزی میں چھاپ کر سب حاضرین میں تقسیم کرنے کی جدت کی تھی۔ یہ کام حکومتیں کر سکتی ہیں۔ کریماں را دست اندر درم نیست

یہ تو ممکن نہیں کہ سارے مقالوں کا خلاصہ دیا جائے محض عنوانات لکھنے کے لیے بھی کافی جگہ کی ضرورت ہے، اس لیے منتخب عنوانوں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

مصریات (۴۳ مقالے):

- ۱۔ سلیم حسن (قاہرہ) اوئاس میں جدید کھدائی
- ۲۔ دوڈ الف آتھین (فلاڈلفیا) طر حینہ میں کھدائی
- ۳۔ ژان درکوٹے (خرطوم) ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء میں سودان میں اثریاتی تحقیقات

- ۴۔ لیبیب حبشی (الاقصر) رعمیس دومہ کے زمانے میں مصر اور لیبیا کے تعلقات
 - ۵۔ حسن ثابت (خرطوم) سلطنت پتو کے خارجہ تعلقات
 - ۶۔ وی جے آذریف (موسکو) قدیم مصر کے معاشی اور ثقافتی اثرات باہمی بیرونی ممالک سے
- اشوریات اور مینگی خط (۵۵ مقالے):

- ۱۔ معزز چیغ (استانبول) استانبول کے عجائب خانے میں ۱۹۵۰ء کے بعد سے تحقیقاتی کام - حصہ اول
 - ۲۔ خدیجہ قزل آلی (استانبول) ایضاً - حصہ دوم
 - ۳۔ ای سے اشپازر (فلاڈلفیا) مسکین اشوری تمدن میں
 - ۴۔ سی جے گیاڈ (لندن) بنو تعد کی حکومت عرب میں
 - ۵۔ ژورژ رو (بصرہ) زیریں عراق کا قدیم جغرافیہ
 - ۶۔ سلیمان مصطفیٰ زبیں (تونس) قدیم مشرق قریبہ کے فنون لطیفہ کے بعض اثرات افریقہ کے اسلامی فنون لطیفہ میں
 - ۷۔ ڈبلیو ایف البرائٹ (بالٹی مور) قبل اسلام عرب کی سنہ وار تاریخ
- توریت اور یہودیات (۲ مقالے):

- ۱۔ ایس ایم عبدالعال (لیڈس) سامریوں کے عقائد و عبادات پر اسلامی اثرات
- ۲۔ الگوانڈر شرابیر (بوداپسٹ) ہنگری میں ترکی دور کے عبرانی دفتر عیسائی مشرقی اور بیزنطین (۷۱ مقالے):

- ۱۔ فریدون ویرتکین (استانبول) آلیکسی اور مانویل کومنین کے محلات کا صحیح محل وقوع
- ۲۔ سادی ابی جے (استانبول) خانوادہ پالیولوگ کے زمانے کا مذہبی فن تعمیر

سامیات (۲۳ مقالے):

- ۱۔ گونزاک ایکمان (بلجیئم) جنوبی عرب کے کتبوں میں آسمان و زمین کا ذکر
- ۲۔ توفیق ہند (اسٹراسبورگ) قبل اسلام کے ازلام کعبے میں
- ۳۔ ٹاکلین پیرٹین (بلجیئم) جنوب عرب کی تاریخ میں سلطنت قحان کا اختتام
- ۴۔ اسٹفان اسٹریلسین (وارسا) ایک یمنی الاصل حبشی روایت ”خط“ کے متعلق

اسلامیات، حصہ ادبیات (۳۴ مقالے):

- ۱۔ اڈالف گرومان (آسٹریا) قرآن کریم کے قدیم نسخوں کی تاریخ کا تعین
- ۲۔ صلاح الدین المنجد (قاہرہ) ادارہ مخطوطات عربی اور اس کی کارکردگی
- ۳۔ یحییٰ خشاب (قاہرہ) نظام الملک اور سیاست نامہ
- ۴۔ جورج قنواٹی (قاہرہ) قاضی عبد الجبار معتزلی کی المغنی فی اصول الدین
- ۵۔ آناری شمل (انقرہ) اقبال کا جاوید نامہ
- ۶۔ محمد طالبی (پاریس) قراءۃ بالالحن
- ۷۔ عابد مزالی (تونس) تفسیر یحییٰ بن سلام
- ۸۔ وی آئی بلیائف (موسکو) الادوارق للصولی کا مخطوطہ لینن گراڈ
- ۹۔ آردالتسر (آکسفورڈ) فارابی کی آراء المدینۃ الفاضلہ
- ۱۰۔ مادوازیل ڈالورینی (پاریس) الکندی کے دو غیر مطبوعہ رسالے
”علم مرایا اور سحر“ پر
- ۱۱۔ عباس زایات (جرمنی) ابو حیان توحیدی کا ایک نایاب واحد مخطوطہ
- ۱۲۔ ایلیل سسٹن (ایونیر) فارسی علم عروض
- ۱۳۔ باوزانی (روما) فارسی ادبیات میں ”ہندی انداز“
- ۱۴۔ محمد ابراہیم الکتانی (مراکش) المورد الاعلیٰ فی اختصار المحلی اور المقدح العلویٰ فی کمال المحلی
- ۱۵۔ فبلکس پریٹھا (مجریہ اسپین) مخطوطہ کتاب الطہریج نمبر ۲۲۳۴ عاطف آفندی

استانبول

۱۶۔ امجد طرابلسی (دمشق) زجر الناح لابی الطلاء المعری (از برٹش میوزیم)

۱۷۔ مجتبیٰ مینوی (طهران) کلیله و دمنہ کا اختصار از خلیفہ مامون

۱۸۔ ڈاکٹر فلووسی (بغداد) عراق کی جدید مختصر کہانیوں کے رجحانات

اسلامیات حصہ مذہب، تاریخ و فنون لطیفہ (۴۵ مقالے):

۱۔ صحیح لبیب (ہامبورگ) قرون متوسط کے مصر میں قرض دینے کے اصول

۲۔ وادید آیالون (اسرائیل) سلاطین مملوک کی بحری جنگیں

۳۔ صابر خان (کلکتہ) مسکو نے اپنی ہمعصر معاملات کن مصادر سے حاصل کیں

۴۔ انوار الحق (مدراں) اسلامی سیاسی تصورات کے اثرات قرون متوسط کے

یورپ پر

۵۔ ایکیناس خلیفہ (بیروت) ابن خلدون کا ایک غیر مطبوعہ رسالہ

۶۔ والٹر فضل (برکلے) ابن خلدون اور ثقافت مذہب

۷۔ علی زادہ (موسکو) رشید الدین خان کی جامع التواریخ۔

یہ عنوان دیا گیا تھا لیکن جو مقالہ پڑھا گیا اس کا عنوان تھا تیرہویں اور

چودھویں صدی عیسوی میں آذربائیجان کا نظام مالگزاری اراضی

۸۔ عثمان طوران (انقرہ) سلجوقی دور میں اسلام کی اشاعت

۹۔ مورلیس ڈمیائڈ (نیویارک) امریکی عجائب خانوں میں قدیم اسلامی ایرانی

برونز کے برتن

۱۰۔ عباس مزدہ (طهران) قدیم ایرانی کانچ کے برتن ۱۵۰۰ ق م تا ۱۵۸۰ء

۱۱۔ ارنست کیوٹل (برلن) برلین کے عجائب خانوں کی بعض نامعلوم تصویریں

۱۲۔ ڈی ایس رائیس (لندن) جامع مسجد حراں کے پتھروں میں اہل اسلام کے

بعض کتبات

۱۳۔ امیر مورلیس شہاب (بیروت) آنجارمین ایک اموی قبیلہ کی دریافت

- ۱۴۔ فواد سرگزین (استانبول) حدیث کی روایت کے بعض پہلو
 - ۱۵۔ اے جانس (جو گجارتا) اسلام جدید اندونیشیا میں
 - ۱۶۔ محمد حمید اللہ (پاریس) جمالیات اور فنون لطیفہ تعلیمات نبویؐ میں۔ اس کو میونخ کے ریڈیو نے ریکارڈ کر کے نشر کیا۔
 - ۱۷۔ سلیم بیراقدار و وچ (بلگراڈ) جنوبی سلاف ممالک میں مشرقی میراث فنون لطیفہ میں
 - ۱۸۔ صبح عبدالعال (کیسرج امریکا) حجاز میں پہلی صدی ہجری میں بڑی جاگیریں
 - ۱۹۔ ای اے بیلائف (موسکو) ساتویں صدی میں اسلامی فرقہ بندیاں
 - ۲۰۔ اذکتائی ارسلان آبا (استانبول) تبریز کے فن کار دربار استانبول میں
- ترکیات (۲۶ مقالے):

- ۱۔ احمد حمدی تانپنار (استانبول) ترکی شاعری میں مرثیہ
 - ۲۔ (جی لیشکے مونستر) وحید الدین محمد سادس
 - ۳۔ تی بیکل اوخلو (انقرہ) صلیحنامہ مدرس ۱۹۱۸ء کی ایک غیر مطبوعہ دستاویز
- ایران وقفقاز (۳۷ مقالے):

- ۱۔ اے جی مرزایف (موسکو) شہشاہ نامہ کا مولف
- ۲۔ محمد باقر (لاہور) ایرانی قاموسین
- ۳۔ علی سامی (شیراز) اصطر اور پسر گادہ
- ۴۔ بی جی غفوروف (ماسکو) سامانی خانوادے کا عروج و زوال
- ۵۔ نگل پاشا الفت (کابل) خوشحال کھٹک کی شاعری میں روزمرہ زندگی کے مناظر
- ۶۔ محمد مقری (پاریس) اہل حق کے ہاں حلول کا نظریہ
- ۷۔ عبدالغفور فرہادی رواں (کابل) مشرقی فارسی کے بعض پہلو
- ۸۔ میرنہم الدین (کابل) شیخ سعد الدین احمد انصاری کی سوانح عمری

- ۹۔ ملیحہ طارق آخیا (انقرہ) سعادت نامہ ناصر خسرو
 - ۱۰۔ ای ای ابرٹلس (موسکو) فردوسی اور سلطان محمود غزنوی
 - ۱۱۔ علی افندہ (طهران) ایران میں ادبی نشاۃ ثانیہ
- ہندیات (۳۱ مقالے):

- ۱۔ خواجہ احمد فاروقی (لندن) انیسویں صدی کی ہندی سماجی زندگی کے متعلق اردو فارسی معلومات
 - ۲۔ گل الوحید (کلکتہ) ہندوستان ہمیشہ غیر تبدیل پذیر ہی رہا
 - ۳۔ آربندہ باسو (ڈربام) جدید ہندی تصوف
 - ۴۔ جی ڈیریٹ (لندن) ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۶ء میں ہندو قانون کی تبدیلیاں
- ایشیا (۲۵ مقالے):

- ۱۔ علی توپچی باشی (پاریس) چندروسی نام جو آلتائی الاصل ہیں
 - ۲۔ خالدہ دولو (لندن) سقانی اور لطفی کا تقابل
 - ۳۔ سعادت چغتائی (انقرہ) بیطرۃ الواضح کا مخطوطہ
 - ۴۔ جعفر اونلو (استانبول) اناطولیہ اور روسی کی پر جدید تحقیقات
 - ۵۔ اے ایم بلننیکسی (موسکو) ساتویں اور آٹھویں صدی میں صغد
- چینیات (۳۳ مقالے):

- ۱۔ ایل سی گڈریج (نیویارک) عربوں کے شہر زیتون یعنی چو پرنبو پر نئی روشنی
- جاپان اور کوریا (۱۱ مقالے):
- ۱۔ ڈونالڈ شیوہلی (برکلی) سترہویں صدی کے جاپانی شہروں میں نانک
- جنوب مشرق ایشیا (۱۶ مقالے):

- ۱۔ جی ایف ہال (لندن) سفیر اور مستشرق
- ۲۔ ڈی آلیدا (لڑبن) جزیرہ تیمور کے فنون اور دستکاریاں

افریقیات (۲۸ مقالے):

- ۱۔ ایف ڈبلیو پارسن (لندن) حوسہ زبان کی صرف ونحو کے بعض پہلو
- عمومی اجتماعات میں تقریریں:

- ۱۔ کلوڈ شیفر (پاریس) راس شجرہ وغیرہ کی نئی کھدائی
- ۲۔ پروفیسر ارومان (استانبول) اناطولیا میں اسلامی فنون لطیفہ
- ۳۔ پرنس پیئر ڈنمارک کے علمی مشن افغانستان میں

متفرقات:

مؤتمر کی طرف سے متعدد تحریکیں بھی منظور ہوئیں۔ ان میں سے ایک قابل ذکر یہ ہے کہ عرب ممالک میں اعلیٰ معیار کے جو روز افزوں مخطوطے شائع ہو رہے ہیں ان کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور مشرق و مغرب میں اس سلسلے میں تعاون کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ غالباً پہلی مرتبہ مغرب نے مشرق کی ستائش کی ہے۔

جرمن انجمن مستشرقین کا مشہور رسالہ *ZmDQ* ایک سو سات برس سے جاری ہے۔ اس نے مؤتمر کے سلسلے میں ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے جس میں ایک مقالہ تھا ”جامعہ میونخ میں مشرقیات کی تعلیم کی صد سالہ سرگزشت“۔ ایک اور مقالہ عربی زبان کی لغتوں کے متعلق تھا۔ میونخ کے کتب خانوں اور عجائب خانوں نے بھی اپنے ذخائر پر معلومات کی ایک باتصویر کتاب شائع کر کے تقسیم کی۔ یورپ کے قدیم ترین عربی مطبوعات، قرآن وغیرہ کے قدیم مخطوطے میونخ میں اور اس طرح کے دوسرے معلومات ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ علاوہ دیگر معلومات مثلاً تصاویر، فنکارانہ مصنوعات، غیر اسلامی خاص کر یہودی چیزیں وغیرہ۔

غرض یہ اجتماع جس میں ہر مذہب و ملک کے لوگ، ہر رنگ اور ہر خیال کے افراد اور اہل علم کے علاوہ بہت سے تماشائی جمع ہوئے تھے، بہت دلچسپ تھا۔
(معارف اعظم گڑھ - مارچ ۱۹۵۸ء)

مؤتمر مستشرقینِ عالم کا پچیسواں اجلاس ماسکو

تمہید:

جیسا کہ تین سال قبل (معارف مارچ ۵۸ء) میونخ کے اجلاس کی روداد میں عرض کیا گیا تھا کہ اس اجلاس میں مستشرقین نے حکومت روس کی دعوت کو بغلبہ آرا منظور کیا تھا، چنانچہ یہ اجلاس ۱۶ تا ۱۹ اگست ۱۹۶۰ء کو ماسکو میں منعقد ہوا۔ اس کے مختصر حالات ناظرینِ معارف کی دلچسپی کا باعث ہو گئے۔

تاریخ:

۱۸۷۰ء میں جب بسمارک کے زمانے میں فرانس نے جرمنوں کے مقابلہ میں سخت ہزیمت اٹھائی تو صلح کے بعد فرانس نے سارے یورپ پر حکومت کرنے کے (نپولین والے) خواب کے بجائے مشرق کی فتح بہتر اور سہل تر خیال کی۔ اس مقصد کے لیے مشرق کے متعلق ہر قسم کے معلومات کی ضرورت تھی تاکہ فوجی فتح کے بعد تسلط قائم رکھنے میں سہولت ہو، چنانچہ ان فتوحات میں تنہا اجارہ داری کے بجائے ہزارہ ہی قابلِ عمل تھا، اس لیے سارے یورپ نے پورے مشرق کے متعلق ہر قسم کے معلومات فراہم کرنے میں تعاون کیا اور ۱۸۷۳ء میں پہلی مؤتمر مستشرقین اسی شکست خوردہ مقام پاریس میں منعقد ہوئی (جنگ ہٹلری کے بعد بھی پہلی مؤتمر پھر اسی شکست خوردہ پاریس

میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔

- اس کے بعد دوسرا اجلاس لندن ۱۸۷۴ء
- (۳) سٹ پٹرسبورگ (حال لینن گراڈ) ۱۸۷۶ء؛
- (۴) فلارنس (اطلی) ۱۸۷۸ء؛
- (۵) برلین (جرمنی) ۱۸۸۱ء؛
- (۶) لائیڈن (ہالینڈ) ۱۸۸۳ء؛
- (۷) ویانا (آسٹریا) ۱۸۸۶ء؛
- (۸) اسٹاکہولم وکریچیاٹا (سویڈن) تاروے، مشترکہ طور پر (۱۸۸۹ء؛
- (۹) لندن ۱۸۹۲ء؛
- (۱۰) جنیوا (سوئٹان) ۱۸۹۴ء؛
- (۱۱) پارلیس (فرانس) ۱۸۹۷ء؛
- (۱۲) روما (اطلی) ۱۸۹۹ء؛
- (۱۳) ہامبورگ (جرمنی) ۱۹۰۲ء؛
- (۱۴) الجزائر ۱۹۰۵ء؛
- (۱۵) کوپن ہاگن (ڈانمارک) ۱۹۰۸ء؛
- (۱۶) اٹینہ (آٹھنس، یونان) ۱۹۱۲ء؛
- (۱۷) آکسفورڈ (برطانیہ) ۱۹۲۸ء؛
- (۱۸) لائیڈن (ہالینڈ) ۱۹۳۱ء؛
- (۱۹) روما (اطلی) ۱۹۳۵ء؛
- (۲۰) بروسیلز (بلجیم) ۱۹۳۸ء؛
- (۲۱) پارلیس ۱۹۴۸ء؛
- (۲۲) استانبول (ترکی) ۱۹۵۱ء؛
- (۲۳) کیمبرج (برطانیہ) ۱۹۵۴ء؛
- (۲۴) میونخ (جرمنی) ۱۹۵۷ء؛

(۲۵) ماسکو (روس) ۱۹۶۰ء: آئندہ اجلاس غالباً ۳ سال بعد ہوگا۔

تمتہ تاریخ کے طور پر یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور فرانسیسی مولف موسیو بینازی نے اپنی کتاب ”فرانسیسی شمالی افریقہ خطرے میں“ لکھا ہے کہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی نے فرانس کے معدنیاتی علاقے الراس اور مورین چھین لیے تھے۔ اس لیے فرانس کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک دن بسمارک نے فرانسیسی سفیر سے کہا ”تونس ایک پکا ہوا میوہ ہے، تم نہ لو تو کوئی اور اسے توڑ لے گا۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں فرانس نے اس پر امن اور دوست ترکی صوبہ پر حملہ کر دیا مگر تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر سارے اسلامی ممالک پر فرنگی قبضہ ہو گیا اور اب خدا کی قدرت کرشمہ دکھا رہی ہے اس موثر کا مقصد اصلی ابتدا میں خواہ سیاسی رہا ہو مگر مستشرقین میں خالص علم دوستوں کی کمی نہیں۔

متفرقات:

۱۹۶۰ء کے آغاز ہی سے روسی اجلاس کی دعوتیں اور اسکے متعلق دوسری اطلاعاتیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور بہت سے لوگوں کو موثر سے زیادہ روس کے دیکھنے کی خواہش تھی اور یہ خیال تھا کہ سرمایہ پرستوں کی جہنم کی جگہ اشتراکی جنت میں ارزانی اور چیزوں کی افراط بہت زیادہ ہوگی، لیکن وہاں جا کر اچھے اچھے کھاتے پیتے لوگوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ قیام کے تین درجے تھے: درجہ اعلیٰ میں تیس (۳۰) ڈالر (ڈیڑھ سو روپیہ) روزانہ، درجہ متوسط میں ساڑھے ستاسی روپیہ روزانہ، اور درجہ ادنیٰ میں ساڑھے سڑسٹھ روپیہ روزانہ صرف قیام و طعام کا خرچ تھا۔ درجہ ادنیٰ میں دو دو تین تین آدمیوں کے لیے ایک کمرہ تھا۔ اسٹیشن سے ہوٹل اور واپسی کا ٹیکسی کا کرایہ پچاس روپیہ بتایا گیا تھا، اس کے باوجود میں نے ہمت کی تھی، لیکن بعد کے ایک اعلان میں بتایا گیا کہ ماسکو سے تاشقند، سمرقند، بخارا اور واپسی کا کرایہ کوئی بارہ سو روپے (ہوائی جہاز میں) ہوگا اور تاشقند میں ایک دن اور سمرقند و بخارا میں صرف چند چند گھنٹے قیام ہوگا تو بادلِ نخواستہ میں نے نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ”قل انتظاروا انا منتظرون“۔ اس لیے ذیل کے

معلومات مطبوعہ اعلانات پر مبنی ہیں۔
 حاضرین میں جو نظام نامہ تقسیم کیا گیا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ یونانی کیتھلک،
 پاپسٹ اور ارمنی عیسائیوں کے گرجے ماسکو میں کہاں کہاں واقع ہیں اور یہودی کتبے
 کہاں ہیں۔ مسلمانوں کے متعلق تھا کہ ۷ شارع یوہن پوزروف میں مسجد ہے جس میں جمعہ
 کی نماز ایک بجے ہوتی ہے۔ اس میں ایک تاریخی النسل عالم امام ہیں اور اچھی عربی
 بولتے ہیں۔ کئی سو آدمیوں کی اچھی خاصی جماعت ہو جاتی ہے۔

سیرودچپسی کی چیزوں میں متعدد میوزیم تھے جن میں سے ایک مشرقی ثقافتوں
 کے لیے مختص ہے۔ اشتراکی حکومت کو اس سے ذاتی دلچسپی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے
 کیا جاسکتا ہے کہ زار کی حکومت گردی کے صرف چند ماہ بعد اسے قائم کر دیا گیا۔
 مہمانوں کو ان عجائب خانوں کے علاوہ متعدد فلم، ناچ بھی مفت دکھائے گئے اور کریملن
 کے دارالامارۃ کی سیر بھی کرائی گئی۔

کانفرنس سے پہلے اخباروں، رسالوں میں مضامین چھپنے شروع ہو گئے تھے۔
 روسی اکیڈمی علوم کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ ”سوویرے مے نی ای دوستوک“
 (ہمعصر مشرق) نکلتا ہے۔ اسکی جولائی ۱۹۶۰ء کی پوری اشاعت موثر سے مخصوص تھی۔
 اسکے چند مضمون یہ ہیں:

از باوا جان غفوروف	”عالمگیر اجتماع مستشرقین“
از صباحت عظیم جان بیگم	”از بکستان میں مستشرقیت“
از گننام۔	”سوویت مستشرقیت“
تاجکستان کے دریائے وکس کا تالاب جو زیر تعمیر ہے اور جس سے تیرہ لاکھ ایکڑ	
از مینکوف	زمین زیر کاشت آجائیگی
از پوزرن ناظم عجائب خانہ ثقافت ہائے	”بابر نامہ با تصویر“
مشرق	
از گنی ایوا بیگم	”بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی نو دسالہ سالگرہ“
از تولن شسی ایف کرغیزی	”افغانستان میں“

”سامرہ کی کھنڈر دیواروں میں“ از ورمیائش
 ”لبنان کی سیر“ از کا تین
 ”ایران میں ارتجاعیت کا دور دورہ“ از دو مالوف
 ”برطانوی یورنیو کا انجام“ از ووتسکی
 ”مشرقی مطبوعات کا ذخیرہ“ از وائٹسٹائین
 ”سررستانی ایڈن کے اعتراف ہائے جرم“ از وونڈر فٹکی وغیرہ
 یہ سارے مضامین بالتصویر ہیں، خاصکر بابر نامے کی تصویریں ۴ صفحات
 میں بہت نفیس چھپی ہیں۔

وہیں سے ”پروٹیکسی ووستوکو ویدے نیا“ (مسائل معلومات مشرقی) نامی ایک
 ماہی رسالہ نکلتا ہے، اسکی جولائی ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں ۳۴۶ صفحے ہیں۔ یہ بھی روسی
 اکیڈمی علوم کی طرف سے چھپتا ہے۔ اس کے سرورق پر پہلی سطر میں کچھ چینی عبارت
 ہے، دوسری سطر دیوناگری خط میں اور تیسری سطر میں عربی خط میں ”مسائل الاستشراق“
 لکھا ہے۔ اسکے بہت سے مضامین دلچسپی کے قابل ہیں۔ مثلاً

सायना - सायना - सायना

ہندوستان میں حکومتی سرمایہ داری، ایران و افغانستان کی سیاست خارجہ اور معاشی
 ترقی، پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر ترکی کی کسانوں کی بغاوت۔ الروض
 المعطار لابن عبدالمعظم الحمیری کا مخطوطہ مدینہ منورہ اور اس میں مشرقی وسطی و شمالی یورپ کا
 تذکرہ۔ ایرانی رزمیہ نظموں کا اثر بعض روسی شاعروں پر۔ ہندی آریائی زبانوں میں بعض
 الفاظ کی ساخت۔ موثر مستشرقین عالم کے دونوں (تیسرے اور پچیسویں) اجلاس کی عہد
 آفریں اہمیت، ترکمان اشعار کی ایک نادر بیاض۔ ابوالفرج ہارون کی کتاب الکافی (فی النخو
 العمرانی) کی اہمیت۔ بہرام چوہین اور اسکی تاریخ کے ماخذوں کا تقابل۔ لینن گراڈ کی
 اکیڈمی علوم کا شعبہ مشرق قدیم۔ چکوسلواکیہ میں ۱۹۵۹ء میں مستشرقیت۔ سید حبیب احمد
 وفا ایک انقلاب پسند شاعر اور عالم۔ ان کے علاوہ اور مضمون بھی ذکر کے قابل ہیں۔
 سردیو چکلو نے ایک مقالہ میں بتایا ہے کہ اجنبی زبانوں کے الفاظ و اصوات کا

تلفظ روسی خط میں کس طرح دیا جائے اور اس سلسلے میں عربی، اردو، ہندی، فارسی، ترکی، پشتو، منگولی، جاپانی اور کسی قدر چینی کا بھی ذکر ہے۔ (یہ امر واضح رہے کہ روسی میں ٹ، ع، غ، ج، ق، ذ، ص، ض، ط، ظ، نون غنہ تو کیا ج، ہ بھی نہیں ہیں۔ میرے نام جو دعوت نامہ آیا تھا اس پر پتا میں ”موخام مادخای ودل لائخ“ لکھا ہوا تھا۔

پیٹراچیک نے برکسلاوا (واقع چکوسلواکیا) کے مخطوطات عربی پر ایک مقالہ میں بتایا ہے کہ اس میں بوسینا (یوگوسلاویا) کے مسلمانوں کی تاریخ پر بعض اہم و مفید کتابیں اور دستاویز موجود ہیں اور ان مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست تیار کر لی گئی ہے۔ اس مضمون میں اسکے علاوہ جن مخطوطوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

روضات الجنات فی اصول الاعتقادات

از ہارالروضات

نور البقین

عقیدۃ اہل السنۃ

مفتاح العلوم للبحر جانی

کافیۃ لابن حاجب

مرقاۃ الوصول الملائخ

آداب الحجۃ للابھری

الذکر فی زیادۃ اہل مقابر

تبشیر الغزوات فی سبیل اللہ

تیرہ صفحے کے ایک طویل مقالے میں جرمن شاعر گوئٹے کے ”مغربی مشرقی دیوان“ کے اقتباسات دیکر انکی نئی (اشتراکی) تعبیر کی گئی ہے۔ اس دیوان سے سراقبال مرحوم بہت متاثر تھے اور بجا طور پر تھے۔ اس میں شاعر نے مسلمانوں اور خاص کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی توصیف کی ہے۔ وہ ایک پورا دیوان ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھنا چاہتا تھا لیکن حالات نے موقع نہ دیا۔ اس نے ایسی بہت سی نظمیں اور تشریحی یادداشتیں اپنی زندگی ہی میں شائع کیں۔ ایک نظم کو اس نے چھپائے رکھا تھا جو

اس کے مرنے کے بعد اس کے کاغذوں میں ملی، اسے بھی اس کے ورثہ نے شائع کیا۔ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی اہمیت و افادیت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ گوئے اس زمانہ (۱۷۹۱ء تا ۱۸۳۲ء) کا شخص ہے جب یورپی زبانوں میں اسلام اور سیرت پاک پر صحیح اور اچھی کتابیں گویا لکھی ہی نہیں گئی تھیں۔ اس لیے اسکو اس کے خیالات و رجحانات کے باعث اس کے عہد اور اپنے ماحول کا باغی سمجھا جاتا تھا۔

بونگار ویوین نے مشہور سنسکرت کتاب ارتھاشاستر مولفہ کا ڈیلیا کے تازہ شائع شدہ روسی ترجمے پر سولہ صفحے کی تنقید کی ہے۔ یہ کتاب اصول حکمرانی اور محصول اور ٹیکس کے مسائل پر ہے۔ اس کا انگریزی اور جرمن ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا مصنف اور ماکیا ویلی اطالوی مصنف ”پرنس“ اخلاق و انصاف پر حکمران کے ذاتی مفاد کو مرنج سمجھتے ہیں۔ کنفوشس نے بھی چینی میں اس موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس کے ترجمے موجود ہیں۔ امام ماوردی کی احکام السلطانیہ اور ان کے معاصر حنبلی امام ابو یعلی الفراء کی اسی نام کی کتاب احکام سلطانیہ چھپ چکی ہیں، اول الذکر کا تو جامعہ عثمانیہ نے اردو ترجمہ بھی چھاپا تھا۔ کاش کوئی علوم سیاسہ کا ماہر (مثلاً پروفیسر ہارون خاں شروانی) ان کتابوں کا تقابلی مطالعہ کر ڈالتے فالحمق یعلو ولا یعلی علیہ۔ ابو یعلی نے مصارف زکوٰۃ پر جو بحث کی ہے اس پر عرش عرش کرنا پڑتا ہے۔

بعض مہمان بھی کارگزاری دکھانے میں پیچھے نہ رہے۔ مثلاً چکوسلوواکیا کی طرف سے مہمانوں میں دو کتابیں تقسیم کی گئیں۔ ایک انگریزی کا پندرہ روزہ اخبار ”نیو اورینٹ“ اس کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ دوسری فرانسیسی میں ”مستشرقیت چکوسلوواکیا میں“۔ اس میں عربیات، ایرانیات، مصریات، چینیات، ہندیات وغیرہ پر مستقل باب ہے۔ اس کے علاوہ چکوسلوواکی کتابوں اور عالموں کے حالات اور تعلیم گاہوں کی موجودہ حالت کا ذکر ہے۔ عربیات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ۱۶۱۳ء میں جہاں ”تردید قرآن“ کے نام سے ایک کتاب چھپی تھی جس میں ضمناً قرآنی آیات کا چکوسلوواکی زبان میں ترجمہ تھا۔ یہ قدیم ترین چکوسلوواکی ترجمہ قرآن ہے۔

نظم و نسق:

مؤتمر کا افتتاح نائب وزیر اعظم میکویان نے کیا جو علمی سے زیادہ سیاسی نقطہ نظر کا حامل تھا۔ لیکن مؤتمر کی صدارت روس کے ممتاز عالم اور بلند مرتبہ عہدہ دار باوا جان غفوروف نے کی (جن کے ایک مضمون کا اوپر ذکر آیا ہے)۔ انکی مادری زبان فارسی ہے۔ تین سال قبل مؤتمر میونخ میں جو روسی وفد آیا تھا اسکے گمراہ اور صدر بھی یہی تھے۔ اگرچہ دو ہزار مرد اور عورتیں مؤتمر میں شریک ہوئے لیکن مقالوں کا اعلان صرف (۷۶۶) افراد کے متعلق تھا۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ماسکونہ جاسکے۔ مثلاً! یہ ناچیز، ایسے لوگوں کی تعداد کافی تھی، لیکن جو مقالے پیش ہوئے انکی تعداد بھی کئی سو تھی جنکو انیس شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

- (۱) مصریات
- (۲) اشوریات و بابلیات
- (۳) سامی السنہ، عبرانی، بابلی
- (۴) خطبات
- (۵) بیزنطیات
- (۶) عرب ممالک (صدر نشین زاہدوف، ۴۳ مقالے)
- (۷) عربی زبان (۴۵ مقالے)
- (۸) ایرانیات (صدر نشین علی زادہ)
- (۸ الف) افغانیات
- (۹) فارسی زبان
- (۱۰) وسط ایشیا (صدر نشین مومنوف)
- (۱۱) ترکیات و منگولیات (صدر نشین عظیموف)
- (۱۲) تاریخ ترکی
- (۱۳) قفقازیات (صدر نشین محمدوف)

- (۱۳) ہندیات
 (۱۵) جنوب مشرقی ایشیا (انڈونیشیا وغیرہ)
 (۱۶) چدیات (مگر خود چین سے کوئی شخص نہ آیا کیونکہ چینی
 اپنے کو عالمگیر قوم سمجھتے ہیں، محض مشرقی نہیں)

(۱۷) کوریا

(۱۸) منگولیا

(۱۹) سیاہ افریقا

اس تقسیم میں بائبل کے لیے تو ایک شعبہ رکھا گیا تھا لیکن اسلام کے لیے نہیں۔
 یہ مقالے عربی، روسی، جرمن، فرانسیسی یا انگریزی میں تھے۔ ان سات آٹھ سو مقالوں
 میں سے صرف ان چند کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے معارف کو دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن مجھے
 یہ علم نہیں کہ ان میں سے کتنے واقعی پڑھے گئے۔

مقالے:

- (۱) اے ملامت (اسرائیل) حضرت سلیمان کے تعلقات مصر سے
- (۲) اے آلٹ ران (امریکہ) یہودی اسلامی مباحثے کا ذکر الباقلائی کے ہاں
- (۳) ایریل بارسا (امریکہ) یہودی خاندان میں میمون کی طبابت اور انکا طب
 عربی کو یورپ پہنچانا
- (۴) محمد احمد حسین (قاہرہ) حروب صلیبیہ میں استعماری عنصر
- (۵) امین الخولی (قاہرہ) دریائے نیل اور دریائے والگا (روس) کے تعلقات
- (۶) محمد الفاسی امیر جامعہ رباط (مراکش) مراکشی مخطوطات
- (۷) لوی ماسین یوں (فرانس) عرب شہروں کی تشکیل
- (۸) تی لیوسکی (پولینڈ) شمالی افریقہ کے اباضی (خوارج) تاجر قرون متوسطہ کے
 سوڈان میں
- (۹) کلود کاہن (فرانس) وقف کی حقیقت و آغاز

- (۱۰) ڈیوڈ نیوبل بارپور (برطانیہ) انگلستان کے بادشاہ جان کی سفارت مراکش کے ”میرالومین“ (امیرالمومنین) کے نام
- (۱۱) سلیمان مصطفیٰ زین (تونس) مغرب اقصیٰ کی اسلامی معماری میں محراب
- (۱۲) اولیگ گرابر (امریکہ) مقامات حریری کا بالتصویر نسخہ
- (۱۳) ڈی ایس رالین (برطانیہ) خزان میں جولائی تا اگست ۱۹۵۹ء میں اثریاتی کھدائی۔
- (۱۴) جارج وکنس (کنیڈا) نصیر الدین طوسی کا تذکرہ سقوط بغداد
- (۱۵) جے کرامرس (جرمنی) ابو عبیدہ، ابن درید اور غلام ثعلب کے بعض نو دریافت شدہ مخطوطے
- (۱۶) جارج اسکالون (قاہرہ) قرون متوسطہ کے اسلامی فن حرب کے ماخذ ہائے معلومات
- (۱۷) نابیہ ایبوٹ (امریکہ) عربی بروی (پاپیروس) اور ابتدائے اسلام کی کتب حدیث
- (۱۸) محمد حمید اللہ (فرانس) تقویم ہجری (اس میں امام بیہقی کے ایک مخطوطے کی اساس پر بتایا گیا ہے کہ ابتدائے اسلام کے مولفوں کے ہاں اس تقویم کا شمار بیعت عقبہ یعنی ۱ قبل ہجرت سے یکم محرم ۱۰ ہجری سے نیز ربیع الاول ۱۰ ہجری کے بعد کے آغاز سنہ یعنی یکم محرم ۲۰ ہجری سے غرض تین مختلف سنہ پائے جاتے تھے۔ روایتوں میں سنین کے اختلاف کا اصل باعث یہی معلوم ہوتا ہے، مثلاً غزوہ بنی المصطلق کی تاریخ موسیٰ بن عقبہ کے ہاں شعبان ۴۰ ہجری ہے تو ابن اسحاق کے ہاں شعبان ۳۹ ہ اور واقدی کے ہاں شعبان ۳۵ ہ۔ نہ کہیں جھوٹ ہے نہ سہو بلکہ طریق شمار کا فرق ہے اور بس۔ ایسی اور بھی مثالیں دی گئی ہیں اور زمانہ جاہلیت کے سال کیسے (اور نسی) پر بھی بعض نامہ معروف و نظرانہ از حقائق کو اجاگر کیا گیا ہے۔
- (۱۹) مجید خدوری (عیسائی ہیں، امریکہ) الرسالۃ مؤلفہ امام شافعی

- (۲۰) مادام کراچ کوفسکی (روس) سولہویں صدی کے بعض نادر مخطوطات قرآن
- (۲۱) ڈی ایم ڈنلاپ (برطانیہ) لزبن کی اکیڈمی، علوم (پرتگال) کے عربی مخطوطات
- (۲۲) آرار تالیز (فرانس) عربی صرف و نحو اور اس کا اثر تفسیر قرآن پر
- (۲۳) ٹی شو موفسکی (روس) پندرہویں صدی عیسوی کا ایک عربی دائرۃ المعارف بحریہ۔ [غالباً ابن ماجد اسد البحر کے رسائل کے متعلق]
- (۲۴) سید مہدی روحانی (ایرانی مقیم فرانس) کیا فلسفے کا آغاز ایران سے نہیں ہوا؟
- (۲۵) محمد عبد اللہ شعبان (امریکہ) الفتوح لابن اعثم من خراسان کا ذکر
- (۲۶) احمد علی کوہزاد (افغانستان) تاریخ افغانستان پر انیسویں صدی عیسوی کے بعض مخطوطات
- (۲۷) آیسو بومباچی (اطلی) غزنوی حکمران مسعود اول کا تخت
- (۲۸) عبد الغنی مرزایف (روس) صفوی دور کے فارسی ادبیات کا نیا ماخذ (اس میں محمد بدیع ابن محمد شریف ملیح التولد ۱۰۵۳ھ کی مذکر الاصحاب کے روس میں سات نسخے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے)۔
- (۲۹) یوزیف ایلغباین (برطانیہ) برٹش میوزیم میں بلوچی مخطوطے
- (۳۰) محمد نظام الدین (حیدر آباد دکن) البیرونی کے کارنامے سائنس میں
- (۳۱) ہیروئلڈ لامب (برطانیہ) سمرقند میں تیموری عہد کے اواخر کے تبدیل پذیر ثقافتی اثرات
- (۳۲) اے مختاروف (روس) زرفشاں دریا کے بالائی حصے میں بابر کے نام کا ایک کتبہ۔
- (۳۳) اومیا کوف (روس) پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز پر وسطی ایشیا کے مغربی یورپ سے تعلقات
- (۳۴) جود الماس۔ قصہ یوسف مؤلفہ علی، بلغاری تاتاریوں کا ایک علمی کارنامہ
- (۳۵) عمر لطفی بارکان (ترکی) مسجد سلیمانیه استنبول اور اس کے اوقاف کی تعمیر

نو کا انتظام۔

- (۳۶) جی۔شکے (جرمنی) اتاترک نے جمہوریت کا منصوبہ کب تیار کیا؟
- (۳۷) عزیز احمد (مقیم لندن) سید احمد خاں و جمال الدین افغانی کا اثر جدید ہندی مسلمانوں کے تصورات سیاسی پر۔
- (۳۸) شیخ عنایت اللہ (پاکستان) عربوں کا عمل و دخل افریقا میں۔

(معارف اعظم گڑھ - نومبر ۱۹۶۰ء)

موتمر مستشرقین عالم امریکہ میں

تمہید:

مجھے خیال پڑتا ہے کہ معارف نے سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں ”اٹھارہویں موتمر مستشرقین عالم، ترجمہ از فریج کلیب ارسلان“ کے عنوان سے اس ادارے کی سرگرمیوں سے اپنے ناظرین کو روشناس کرایا تھا، یہ میری طالب علمی اور نوجوانی کا زمانہ تھا، اس کے بعد سے بارہا اس موتمر کے اجلاسوں کی کارروائی پیش کی جاتی رہی، گزشتہ اجلاس تو دہلی میں ہونے کی وجہ سے اہل ہند اب اس سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔

اب کی دفعہ، ستائیسواں اجلاس امریکہ کی دعوت پر چیکین یونیورسٹی میں ہوا ہے جو آن آر بور نامی شہر میں ممالک متحدہ اور کنیڈا کی سرحد پر واقع ہے، اس بلد الجامعہ کا مطاربس میں ایک گھنٹے کے سفر پر شہر ڈیٹرائٹ میں واقع ہے جو موٹر سازی کا مرکز اور ابھی چند روز قبل گورے کالے ہنگامے میں اس بُری طرح تباہ ہوا ہے کہ اربوں روپے کی جائیداد آتشزدگی کے جنون کی نذر ہوئی ہے۔

مجھے اس سب سے ”مہذب“ ملک کا انتظام پسند نہ آیا، اگر شخصی مسئلے کو نظر انداز بھی کر دوں کہ جامعہ چیکین کا دعوتی ہونے کے باوجود مجھے ویزا ملنے میں چھ ہفتے کا انتظار کرنا پڑا (اور سفر سے اڑتالیس (۳۸) گھنٹے پہلے تک خبر نہ تھی کہ اجازت ملے گی بھی یا نہیں) یہ امر قابل ذکر ہے کہ موتمر کا افتتاحی اجلاس ۱۳ اگست کو ہو گیا، اور ہمیں دعوت دہندہ

جامعہ کی طرف سے مہیا کیے ہوئے خصوصی طیارے میں اس اجلاس کے ختم ہونے کے بعد آدھی رات کو پہنچایا گیا۔ (حالانکہ ابتدائی اطلاع یہ تھی کہ ہم اجلاس سے قبل کی رات کو پہنچیں گے، پھر بلا اطلاع ہوائی کمپنی نے تاریخ بدل دی) اسی طرح پاریس سے دو خصوصی طیارے مقرر کیے گئے، پھر بکثرت لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی کہ جگہ نہ ہونے کے باعث ان کو طیارے میں نشست نہیں مل سکتی اور بالآخر روانہ صرف ایک طیارہ ہوا! یہ ہے مشے نمونہ از خردارے، خیر۔

ہمارے پان امریکن کمپنی کے طیارے میں ایک سو ساٹھ مسافر تھے، یہ طیارہ پاریس سے شام کے ساڑھے پانچ بجے اڑا، (پاریس میں ان دنوں آٹھ بجے غروب آفتاب ہوتا ہے) چونکہ مغرب کی سمت میں جا رہے تھے، اور طیارے کی رفتار چھ سو میل فی گھنٹہ اور بلندی ماؤنٹ ایوریسٹ سے بھی اونچی تینتیس ہزار فٹ پر تھی، نتیجہ یہ ہے کہ آفتاب نے ڈوبنے کا گویا نام ہی نہ لیا، جب ہماری گھڑیوں میں ”آدھی رات“ کے بعد دو بجے تھے کہ طیارے میں سے سورج ڈوبتا نظر آیا، اگر کوئی شخص روزہ سے ہوتا تو سحری کے بعد افطار تک چوبیس گھنٹے ہو جاتے، (اگر افطار مقامی غروب کے حساب سے کیا جائے) مزید آدھ گھنٹہ بعد مطار پر اترے تو معلوم ہوا کہ مقامی وقت مغرب کے ساڑھے نو بجے ہیں، واپسی میں مشرق کی طرف پرواز کرنی ہے، اس لیے رات کے دس بجے اڑنے پر دو تین گھنٹے بعد آفتاب طلوع ہو جاتا ہے، اور کل دس گھنٹوں کی پرواز کے بعد امریکا کے حساب سے تو رات ہی کو، لیکن پاریس میں دوپہر سے کچھ پہلے پہنچتے ہیں، نماز اور روزے کے اوقات کا کوئی حل ہمارے فقہاء کو نکالنا ہو گا۔

جاتے وقت مختلف جزیروں وغیرہ کے علاوہ ایک مرتبہ ہماری توجہ اس پر منعطف کرائی گئی کہ ہمارے نیچے سمندر میں چار آکسمرگ (برف کے پہاڑ) تیر رہے ہیں کوئی چھ میل کی بلندی پر سے یہ ایک متوسط قد و قامت کے جہاز کی طرح نظر آ رہے تھے، اور سفید چمک رہے تھے۔

سفر اگرچہ پاریس سے شروع ہوا لیکن سارے مسافر فرانس کے باشندے نہ تھے، ان میں مختلف ملکوں کے فرنگیوں کے علاوہ متعدد ہندوستانی (جن میں ایک گروے

لباس میں بدھ مت کے لاما بھی تھے، (مصری،، لبنانی، مراکشی وغیرہ بھی سوار تھے۔
جامعہ چیکین:

جامعہ چیکین جو شہر آن آر بور میں واقع ہے، ممالک متحدہ امریکہ کی قدیم اور بڑی جامعات میں سے ایک ہے اور موثر مستشرقین عالم کے اجلاس کے لیے اس کا انتخاب بتاتا ہے کہ ملک میں اس کا کیا پایہ ہے، یہاں کچھ نہیں تو سو سال سے علوم مشرقیہ سے دلچسپی لی جا رہی ہے، وہاں کے ذیل کے شعبے اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

- (۱) مشرق قریبہ کی زبانیں اور ادبیات، جو عملاً عربی اسلام کے متعلق ہے اور مراکش سے بغداد تک کے رقبہ کی قدامت و معاشرت پر حادی ہے۔
- (۲) جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسائل کا مرکز، ایران، افغانستان، براعظم ہند، ملایا اور انڈونیشیا کے ذریعے سے عجمی اسلام سے اختصاص رکھتا ہے۔
- (۳) روسی اور مشرقی یورپ کے مسائل کا مرکز ضمناً ہی سہی ترکی اسلام سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ قانون، موسیقی، جغرافیہ و خرائط (نقشہ ہائے ممالک) حتیٰ کہ نباتات، اور آبی وسائل (پھل، پھول) وغیرہ کے شعبوں میں بھی مسلمانوں کے وطن سے بڑی بحث ہوتی ہے، مثال کے طور پر ڈاکٹر اسٹیوارٹ نے چالیس (۴۰) سال تک راویلنڈی کے گورڈون کالج میں نباتات کا پروفیسر رہنے کے بعد اپنی آخری زندگی چیکین ہی میں شعبہ نباتات میں گزاری اور وہاں کے ذخیرہ نباتات کو ہمالیہ اور ہمالیہ تلے کے بے شمار پودوں کے اضافے سے ترقی دی۔

یہاں کا شعبہ تعلیمات و تقابلی طریقہ تدریس بھی قابل ذکر ہے، اس کی بہ کثرت سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ بمبئی اور بڑودہ کے اساتذہ تعلیمات چیکین بلائے گئے، اور ان کی جگہ چیکین کے اساتذہ بمبئی اور بڑودہ میں کام کرنے لگے، اس طرح کا کام لبنان اور ازبکستان جیسے اسلامی علاقوں میں بھی ہوا، ازبکستان کے متعلق شائع شدہ رپورٹوں سے واضح ہے کہ روسیوں نے وہاں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی

ہے، اور اہل ملک وہاں بیسویں صدی کی صنعت اور آلات وغیرہ اور نیز زراعت میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ اسے انقلاب انگیز کہا جاسکتا ہے۔ اس شعبے کی سرگرمیوں کا فٹا زیادہ تر بیرونی ممالک کے متعلق معلومات جمع کرنا ہے، جسے کوئی چاہے تو جاسوسی کہہ سکتا ہے۔

یہاں کے عجائب خانوں اور کتب خانوں میں بھی اسلامیات کا کافی ذخیرہ ہے۔ اگرچہ مخطوطات میں کوئی خاص نواور نہیں ملتے ہیں، یہاں کی انجمن شریات (ایسوی ایشن فار ایشین اسٹڈیز) بھی قابل ذکر ہے جو خود بھی کتب و رسائل چھاپتی ہے، اور تنگدست علماء کو تالیفیں چھاپنے میں مالی مدد بھی کرتی ہے اور آخر میں یہاں کے مسلمان طلبہ کی ایک بڑی انجمن ہے، اس کے پاس ایک بڑی عمارت ہے، جس میں ایک مسجد بھی ہے۔

شرکاءے موتمر:

تقریباً پچاس ملکوں سے کوئی ڈھائی ہزار عورت مرد اہل علم نے شرکت کی اطلاع دی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے، کتنے لوگ حقیقت میں آئے، مثلاً فہرست میں لبنان سے صلاح الدین السجد کا ذکر تھا، مگر وہ نظر نہ آئے، دارالمصنفین کے فاضل و عزیز محترم مولوی صباح الدین کا اور میرا مقالہ دونوں ایک ہی وقت میں تھے میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ تشریف لائے یا نہیں، جم غفیر میں وہ نظر تو نہ آئے، ممالک متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں متوطن یا ملازم مسلمانوں میں اب کافی اہل علم نظر آتے ہیں، مثلاً کینیڈا سے آنے والوں میں عزیز احمد، محمد انوار الحق اور ایک احمقانہ نام والے ”عبدل ایس سیرت“ (شاید عبدالسلام کی خرابی ہے) فہرست میں نظر آئے، انوار الحق صاحب مدراس کے مشہور ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے فرزند ہیں، جب ولایت میں تعلیم پا رہے تھے تو بڑی داڑھی کیساتھ باپ کے ہو بہو تھے، کینیڈا میں اُن کی بیوی پروفیسر ہیں، اور یہ خود تعلیم پا رہے ہیں۔ انگلستان سے آنے والوں کی فہرست میں میاں محمد سعید کا ذکر ملا، فرانس سے کچھ

۱۔ اپنا مقالہ بھیج دیا تھا خود نہیں گئے تھے۔ (معارف)

نہیں تو نصف درجن مسلمان آئے، لیکن ان سارے فرنگستانی مسلمانوں میں تو مسلم میرے علم میں نہ آئے، صرف ایک جرمن کے متعلق نجی اطلاع ہے کہ وہ کبھی کبھی جمعہ اور عیدین میں نماز میں شرکت کے لیے آ جاتے ہیں، اگرچہ اپنے اسلام کا انہوں نے کبھی زبان سے اقرار نہیں کیا ہے، البتہ ایک فرانسیسی خاتون نے اقرار کیا کہ وہ مسلمان ہو چکی ہیں۔

پاکستان سے تو خیر مسلمان ہی آ سکتے ہیں، لیکن ہندوستان سے دلی اور علی گڑھ وغیرہ سے کئی مسلمان آئے تھے اور ملاقات بھی ہوئی، بمبئی کے ڈاکٹر حسین ہمدانی مرحوم کے فرزند عباس ہمدانی بھی اپنی بیوی کے ساتھ آئے تھے، موروثی شغف فاطمیات کے متعلق جاری ہے۔

حیرت اس پر ہوئی کہ مالیزیا سے آنے والوں کی کافی اچھی فہرست میں سب کے سب چینی تھے، ایک بھی مسلمان کا نام نظر نہ آیا اور اس پر حیرت تو نہیں دل کی سوزش ضرور ہوئی کہ حالیہ ہنگاموں سے قبل کے اسرائیل میں لاکھوں ہی مسلمان تھے، لیکن ان میں سے کوئی علماء کی صف میں نظر نہیں آتا کہ موثر مستشرقین کے لیے آئے، ان بیچاروں کا روزگار تو خاکروبی اور حمالی رہ گیا ہے، اللہ ان پر رحم فرمائے۔

روس کی سیاست میں بھی کافی انقلاب ہو گیا ہے اور وہاں کے بڑے سرکاری وفد میں بہ کثرت اسلامی نام ملے اور ان کے القاب میں ”روسی اکاڈمی علوم کا رکن“ بتاتا ہے کہ بڑے پائے کے لوگ ہیں، البتہ اکثر کے مقالوں میں عصر جدید کا عنصر زیادہ تھا، گویا ”علم کی خاطر علم“ سے کہیں زیادہ سیاست اور ملکی پالیسی کی خدمت پیش نظر معلوم ہوئی، مگر دم آخر روس نے حالیہ فلسطینی جنگ کے باعث موثر کا مقاطعہ کیا اور روس سے کوئی نہیں آیا۔

یہ بات اتنی بُری نہیں جتنی کانفرنس کے سربراہ آوردہ اور کرتا دھرتا، ”برادران یوسف“ کا یہ رجحان کہ مسلمانوں کو تاریخ میں ظالم ہونا عربوں اور ترکوں کے جھگڑے کو تازہ اور تیز کرنا اور یہ سب بلاؤں مقدسہ کی تازہ تحیس کی ادا مت کی کوشش ہیں۔

مہمان نوازی کا انتظام:

امریکی مہمان نوازی واقعی یورپ کے مقابل بہت بہتر رہی۔ جامعہ کے طلبہ کے گھر میں جتنے لوگ سما سکتے تھے، (اور کئی سولوگ وہاں رہ سکتے ہیں)، اُن کو رہائش اور خوراک مفت رہی اور ٹیکن سے واشنگٹن اور نیویارک نہ صرف مفت لیجایا اور وہاں پھرایا گیا، بلکہ وہاں کا ہفتہ بھر کا قیام بہت اچھے ہوٹلوں میں مفت ہی رہا، (بجز خوراک کے) حسب معمول ضیافتیں، ریسپن، ٹیکن کے گورنر کی آمد اور خیر مقدمی تقریر، اقوام متحدہ کی طرف سے بھی خیر مقدم عمل میں آئے۔

لیکن شروع میں کہا گیا تھا کہ موتمر کے انعقاد کے وقت سارے مقالوں کے خلاصے، ایک ایک صفحے پر، کتابی صورت میں چھاپ کر مفت بانٹے جائیں گے، تاکہ ارکان اُن کا سرسری مطالعہ کر کے جس مقالے کو چاہیں اپنی شرکت کے لیے منتخب کر سکیں اور یہ کہ کامل مقالے بعد میں چھاپے جائیں گے اور موتمر کے ارکان کو حسب عادت مفت مہیا کیے جائیں گے، پھر جب اجلاس شروع ہوا تو اطلاع دی گئی کہ بیچارہ امریکا اتنا غریب ہے کہ مقالوں کے خلاصے چھاپ نہ سکا اور سارے مقالوں کو بھی چھاپنے سے قاصر ہے، صرف ایک ایک صفحے کے خلاصے آئندہ اجلاس تک چھاپ کر شائع کیے جائیں گے اور اگر کوئی صاحب اپنا مقالہ یا اس کا ملخص کہیں اور چھاپ لیں، تو پھر ”بخوشی“ اس کا خلاصہ بھی اس روڈاد کی جلد سے حذف کر کے وہاں صرف حوالہ دیدیا جائے گا، کہ فلاں جگہ چھپا ہے۔

وجہ؟ بتایا گیا کہ مصارف طباعت زیادہ ہیں اور یہ امریکہ کی استطاعت سے باہر ہیں۔ قبل اس کے کہ موتمر کے مقالوں کا ذکر کروں، امریکہ میں اسلام کے متعلق کچھ مشاہدات عرض کروں گا۔

امریکہ میں اسلام:

ممالک متحدہ امریکہ میں کہتے ہیں کہ دو ہزار جامعات ہیں، سرکاری بھی، نجی لوگوں کی بھی۔ مجھے شروع میں یقین نہ آیا، لیکن جب یہ دیکھا ایک شہر واشنگٹن میں جس

کی آبادی آٹھ لاکھ سے بھی کم ہے، پانچ یونیورسٹیاں ہیں، تو دو ہزار کی تعداد کو قرین قیاس ماننا پڑا۔ امریکہ میں یہ قانون ہے کہ طلبہ کے ہر گروہ کو دینی اور ثقافتی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، چنانچہ جس جامعہ میں مسلمان طلبہ ہوں وہاں انجمن طلبہ کے مکان میں ایک کمرہ مسلمانوں کو بھی ملتا ہے جسے وہ عام طور پر نماز گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، آن آر بور کی جامعہ ٹیکسن میں سات آٹھ مسلمان طلبہ معلوم ہوئے، یہ اپنی ”مسجد“ میں جمعہ کی نماز بھی پڑھتے ہیں اور باری باری سے ہر طالب علم خطیب و امام بنتا ہے۔ یہاں اور کینیڈا میں بہ کثرت جامعات میں مسلمان اساتذہ بھی نظر آتے ہیں۔

مسلمان طلبہ کی تعداد کم ہے اور سارے ملک میں منتشر ہیں۔ اس کا درماں یہ کیا گیا ہے کہ ”وفاقی مسلم طلبہ ممالک متحدہ و کینیڈا“ کے نام سے ایک مرکزی انجمن بنائی گئی ہے اور ہر سال اس کا کسی نہ کسی جامعہ میں اجلاس ہوتا ہے۔ امریکہ کی آب و ہوا میں عملیت و حرکت ہے، الحمد للہ یہ انجمن بھی کافی کار گزار ہے، مالی وسائل بھی ہیں، کتابیں رسالے بھی چھپتے ہیں۔ ان انجمنوں کے سربراہ یا تو عرب طلبہ ہوتے ہیں، (زیادہ تر شامی) یا پھر ہمالیہ تلے کے براعظم کے دیگر ممالک کے مسلمان طلبہ، خاص کر سیاہ فام طلبہ بھی کم نظر آتے ہیں۔

امریکہ میں گوری ماؤں کے بچے کم ہوتے ہیں، کالی رعیت کی تعداد قدرتی طور پر بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، چھ سات بچے، اوسط تعداد ہیں۔ گوروں کالوں کی کنکشن کی تہ میں ایک راز یہ بھی ہے، اسی لیے حکومت سارے وسائل سے کوشش کر رہی ہے کہ باہر سے آنے والے صرف گورے ہوں اور بہ کثرت ہوں، جب انسان صریح نا انصافی کرتا ہے، تو قدرت بالواسطہ کوئی اور تدبیر کر لیتی ہے۔

ہر فرنگی ملک کی طرح امریکہ میں بھی اسلام اب کافی تیزی سے پھیل رہا ہے، صوبہ ٹیکسن ہی میں پانچ مسجدیں ہیں، خاص کر شہر ڈیٹرائٹ کی مسجد میں کچھ نہیں تو دو ہزار کی جماعت ہو سکتی ہے۔

گوروں کالوں کی کنکشن دو دھاری تلوار ہے، اس سے کالوں کو عیسائیت سے نفرت اور اسلام کی طرف کشش بڑھ رہی ہے۔ امریکہ میں کچھ نہیں تو پندرہ فی صد آبادی

سیاہ قام ہے (یعنی صوبوں میں ان کی اکثریت بھی ہے، چمکیں میں وہ تہائی تک پہنچ گئے ہیں) ان سیاہ قاموں کو ایک زمانے میں جبراً عیسائی بنا لیا گیا تھا اب ان میں سے دو تہائی دوبارہ مسلمان ہو گئے ہیں، لیکن نسلی جھگڑوں کے باعث بارہا کالے مسلمانوں کی انجمنوں بلکہ مسجدوں میں بھی گورے مسلمانوں کا داخلہ بند ہے، گورے مسلمانوں میں بھی مماثل برائی نظر آتی ہے اور اس کا حل اس وقت تک مشکل ہے جب تک کہ نسلی کشمکش کا سیاسی حل نہ نکل آئے۔ اس حل میں اسلام بیشک ہاتھ بٹا رہا ہے لیکن نسلی کشمکش صحیح اسلام کے پھیلنے میں ایک رکاوٹ بھی بن گئی ہے۔

امریکہ بڑا کٹر دین پرست عیسائی ملک ہے۔ عیسائیت کی تبلیغ پر جتنی دولت وہ صرف کرتا ہے وہ سبق آموز ہے۔ اپنے قیام کے زمانہ میں واشنگٹن اور نیویارک میں میں نے دیکھا کہ ہوٹلوں کے ہر ہر کمرے میں میز کے خانے میں جہاں کچھ اشیائیں کافد لفافے اور اشتہار ہوتے ہیں، وہیں بائبل کا ایک نسخہ بھی ہوتا ہے کہ مسافر اس کا مطالعہ کرے، عموماً امریکی بائبلوں کے شروع میں ایک انڈکس (اشاریہ) بھی ہوتا ہے کہ عیسائیت کی اچھی تعلیمات کن کن صفحات میں ہیں، موثر مستشرقین کے ارکان کو ایک رات ایک فلم بتایا گیا ”یمن، حضرموت اور مسقط عمان کے آثار قدیمہ“ ان کھنڈروں کو کھودنے والوں کے ساتھ بتایا گیا کہ ہمیشہ مشنری ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں اور وہ مقامی آبادی کا مفت علاج بھی کرتے ہیں اور ان کو باور کراتے ہیں یہ طباعتی علم و حکمت عیسائی مذہب کی وجہ سے ہے، (اور غالباً انفرادی تبلیغ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ بیماری مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے۔)

نیویارک میں مسلمانوں کے متعدد بلکہ بہ کثرت ادارے ہیں، ”اسلامک سنٹر“ جزیرہ مانہٹن میں دریا کنارے پُر فضا مقام پر ہے اور اس کا امام ازہر (مصر) کی طرف سے آتا ہے، ڈاکٹر محمد عبدالرؤف ازہر کے بھی تعلیم یافتہ ہیں اور کیسبرج ولندن کے بھی سند یافتہ، وہ ہر دلعزیز ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ آج کل عید کی نماز کسی ہوٹل کے بڑے ہال میں پڑھی جاتی ہے، لیکن اب ایک مسجد کے لیے زمین خریدنے کا انتظام ہو گیا ہے، ”اسلامک مشن“ بروکلین کے محلہ میں ہے، جسے ایک مغربی مہاجر (بہ ظاہر طرابلس

الغرب والے) اپنے مصارف پر چلا رہے ہیں۔ کئی منزلہ مکان ہے جس میں ایک بڑی مسجد بھی ہے، ایک ماہوار رسالہ بھی نکالتے ہیں، کہہ رہے تھے کہ پچپن (۵۵) سال سے مقیم ہوں، جب یہاں آیا تو نسلی کشمکش اتنی شدید تھی کہ ایک دن برسرِ راہ میری ہر چیز لوٹ لی گئی اور تنگ دھڑنگ ایک میل پیدل چل کر گھر واپس آیا اور پولیس نے دخل دہی غیر ضروری خیال کی، کوئی پچاسی (۸۵) سالہ یہ شیخ اب بھی تنومند اور سرگرمی سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

فرانس میں اسلام زیادہ تر تصوف کی راہ سے پھیل رہا ہے تو امریکہ میں میرے ملاقاتیوں کے بیان کے مطابق عقل کی راہ سے، لیکن ہر جگہ ناصح بے عمل سے زیادہ مضمر کوئی مبلغ نہیں پایا گیا۔

امریکہ میں عجائب خانوں اور کتب خانوں میں اسلامی چیزوں کی کمی نہیں اور وہاں ہر چیز بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، واشنگٹن میں ”لابریری آف دی کانگریس“ کہنے کو تو پارلیمنٹ کا جز اور ارکان پارلیمنٹ کے استفادہ کے لیے ہے، لیکن وہ ہر شخص کے لیے کھلی ہوئی ہے، وہاں اب کتابوں، رسالوں وغیرہ کی تعداد چون (۵۳) ملین سے کچھ زائد (ساڑھے پانچ کروڑ) ہو گئی ہے! وہ (۲) وسیع عمارتیں ناکافی ثابت ہو گئی ہیں، اب ایک تیسری بڑی عمارت بن رہی ہے، اس میں اردو کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تراجم قرآن مجید کے سلسلے میں یہاں کچھ تلاش کی تو انڈونیشیا، بنگال وغیرہ کے متعدد تازہ ترین تراجم کا پتا چلا، جن سے میں واقف نہ تھا۔ واشنگٹن کی مسجد جسے مسلمان ممالک کے سفیر چلاتے ہیں، بہت خوبصورت ہے، ساتھ ہی ایک مختصر دارالمطالعہ بھی ہے۔ پارلیس کی طرح یہاں بھی مسلمانوں سے زیادہ سیاح تفریح کے لیے آتے ہیں۔

امریکہ میں یہودیوں سے نفرت بڑی شدید ہے (لیکن وہ تجارت، صنعت، صحافت وغیرہ پر چھائے ہوئے ہیں) اور امریکہ اُن کی تائید بہ ظاہر اس لیے کر رہا ہے کہ وہ امریکہ چھوڑ کر فلسطین یا کہیں اور جا بیسں اور ان سے پیچھا چھوٹے۔ ایک عجیب و غریب معاملہ یہ مشاہدے میں آیا کہ امریکہ والوں کو یا تو سیاست و

دفتریت سے دلچسپی ہے یا تجارت سے۔ کم ہی لوگ اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں، اساتذہ اور بڑے انجینئر بہ کثرت باہر کے مستعار یا تازہ وارد لوگ ہیں، بیرونی زبانوں کے لیے ہی نہیں عام علوم کے لیے بھی مختلف ممالک کے مسلمان اساتذہ جا بجا جامعات میں ملتے ہیں، (ہندو بھی ہیں) یہ چیز ممالک متحدہ امریکہ میں بھی ہے، کینیڈا میں بھی، جنوبی امریکہ میں بھی۔ آزاد پیشوں میں ڈاکٹروں کی بھی بڑی مانگ ہے اور ان میں بھی بہت سے مسلمان نظر آتے ہیں۔

مؤتمر مستشرقین کی علمی کارکردگی:

سٹائیسویں بین الممالک مؤتمر مستشرقین اگست ۱۹۶۷ء کی (۱۳) سے (۱۹) تک شہر آن آرپوز میں منعقد ہوئی، چونکہ کوئی ڈھائی ہزار اہل علم کا مجمع ہو گیا تھا، اس لیے تقسیم کار کی ضرورت تھی، یہ تقسیم کچھ زیادہ علمی نہ تھی، بلکہ بے تکنی سی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ:

شعبہ (۱) مشرق قریبہ (۲) مشرق قریبہ اور عالم اسلامی (۳) جنوبی ایشیا قدیم زمانے میں (۴) جنوبی ایشیا جدید زمانے میں (۵) جنوب مشرقی ایشیا (۶) چین قدیم (۷) چین جدید (۸) جاپان (۹) کوریا (۱۰) وسطی ایشیا اور آلتائی (ترکی) امور (۱۱) اجتماعی مباحث، (آبادی، فنون لطیفہ، دفتریت، مغربی تہذیب کا اثر مشرقی قوموں پر، موسیقی، قدیم امریکہ کا تعلق مشرق سے، کتب خانے، زراعت کی اصلاح مشرق میں، ادبیات میں انقلابی رجحانات، مشرقی علوم کے مطالعے کے ادارے مختلف ممالک میں وغیرہ)۔

ان میں سے نمبر ۲ اور نمبر ۱۰ کو غالباً سیاسی مصلحت سے جدا کیا گیا تھا، حتیٰ کہ ان کے اجلاس بھی الگ الگ عمارتوں میں رکھے گئے، جن میں باہم میل بھر کا فاصلہ تھا، نمبر ۳ میں ہندوستان اور نمبر ۴ میں انڈونیشیا و ملایا سے بھی اسلام کو گہرا تعلق ہے، مگر انہیں الگ کیا گیا تھا۔ اسلام کی اہمیت گھٹانے کی اس کوشش میں اس کی اہمیت بڑھ ہی گئی کہ ایک کی جگہ کئی شعبوں میں زیادہ تر اسلام ہی کا ذکر تھا۔

یہی نہیں ہر شعبے کے ذیلی شعبے بھی تھے اور سب بہ یک وقت جمع ہوتے تھے، مثلاً شعبہ دوم کو بتیس (۳۲) ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم لوگوں کے مقالے کوئی شخص سن سکتا تھا۔

اسلامیات پر مقالے مسلمانوں ہی نے نہیں غیر مسلم اہل علم نے بھی پڑھے، ایک ہزار نہیں تو کئی سو مقالے اسلامی دلچسپی کے تھے، سب کی تفصیل افسوس ہے کہ ممکن نہیں، کچھ مقالے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تھے، تو کچھ مسلمانوں کی تاریخ و تمدن کے متعلق، اسی طرح مسلمانوں کی بستیوں اور ملکوں کی پرانی تاریخ پر، حتیٰ کہ جس چیز کو مثلاً خالص یہودی تصور کیا جاتا ہے، اس سے بھی مسلمانوں کو گہرا تعلق ہے، مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے نظم و نسق کی بعض تفصیلیں۔

نمونہ از خروارے چند، مقالوں کے عنوانوں کا ذکر کرتا ہوں، خدا ہی بہتر جانتا ہے، یہ کب اور کہاں چھپیں گے۔

شعبہ اول:

- (۱) معزز جیگ (ترکی): استانبول کے عجائب خانوں میں مسماری کتبوں کا ذخیرہ
- (۲) مائل روٹن (امریکا): وریاؤں کا اثر عراقی تمدن پر
- (۳) ماری لویز بول (ڈانمارک) خربہ صیلون میں ڈانمارکی آثار قدیمہ کی کھدائیاں
- (۴) ماری لویز، شومون (فرانس): ساسانی دور کے ماتحت بادشاہ و حکمران حیرہ وغیرہ میں

- (۵) صبری تبریزی: شیطان اور شرابی خرافات میں
- (۶) نیڈلر (کینیڈا): وادی حلفاء کے قریب جبل شیخ سلیمان کی چٹانوں پر چند قدیم کندہ تصویریں

- (۷) فرکوٹر (فرانس): نویہ میں فرانسیسیوں کی آثار قدیمہ کی کھدائیاں
- (۸) پائر (انگلستان): عربوں کی تاریخ نویسی قبل اسلام میں
- (۹) رابرٹ اسمتھ (امریکہ): بفل (اردن) میں آثار قدیمہ کی کھدائیاں
- (۱۰) ہیشمان (فرانس): حضرت عزیر اور قرآنی آیت

قالت اليهود عزيزين ابن الله“

شعبہ دوم:

- (۱) سید حسین نصر (ایران): شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی کی کتابیں
- (۲) برمان (امریکہ): ارسطو کی کتاب اخلاق کا اثر قدیم عربی کتب فلسفہ پر
- (۳) اینڈرلیس (جرمنی): یونانی سے عربی میں ترجمہ اور عربی اصطلاحات فلسفہ
- (۴) تحسین یازجی (ترکی): عبداللہ انصاری کی ایک ”گمنام تالیف“
- (۵) محمد باقر (پاکستان): قدیم زمانے میں فارسی کی ترقی، ہمالیہ تلے کے براعظم میں
- (۶) احمد برکات (سوئٹزرلینڈ): ہندوؤں کا حصہ فارسی نثر نگاری میں
- (۷) ثاقب (بلجیم): عربی معاہدات لسانیاتی نقطہ نظر سے
- (۸) نہاد جتین (ترکی): زوزنی کی حماسۃ الظرفاء
- (۹) ہارزیکس (جرمنی): ثعلب کی کتاب قواعد الشعراء
- (۱۰) صلاح الدین البھیری (مصر): الناصرداؤد کے خطوط
- (۱۱) لوئی گاروے (فرانس): وحی کا اثر اخلاق اور سیاست پر
- (۱۲) لیون (انگلستان): مسلمانوں کے شہر ساتویں سے بارہویں صدی ہجری تک
- (۱۳) کیڈی (امریکہ): جمال الدین افغانی کا اثر حالیہ اسلامی بیداری پر
- (۱۴) سعید رمضان (سوئٹزرلینڈ): اسلام اور عربوں کی (جاہلانہ) قوم پرستی
- (۱۵) ؟ (چکوسلواکیا): صدر الدین یعنی کی تالیفیں
- (۱۶) محمد خلف اللہ احمد (مصر): فصیح عربی کا اثر جدید عربوں کی زندگی اور فکر پر
- (۱۷) ام ملکوف (فرانس): ترکی کی پیشہ ورانہ انجمنیں آخنی
- (۱۸) فاروق سومر (ترکی): میمنجی قبیلے کے سردار کی یادداشت
- (۱۹) مرزا قدیر بیگ (کینیڈا): ابن عربی پر مجدد الف ثانی کی تنقید
- (۲۰) سلمان تیمی (عراق): خلافت کا اسلامی تصور
- (۲۱) عمر لطفی برکان (ترکی): ترکی میں سولہویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں

کچھ معاشی و سماجی بحران

(۲۲) کاہن (فرانس): قرونِ متوسطہ کے اختتام پر اسلامی معاشیات کی برتری

یورپی معاشیات پر

(۲۳) سائی مکارم (امریکہ): الحاکم بامر اللہ

(۲۴) ایس اے علی (ہندوستان): ابوالفیض فیضی کی ایک کم معروف فارسی لغت

(۲۵) عبدالقادر قرہ خان (ترکی): سلطان سلیمان کے زمانہ کی ترکی شاعری

(۲۶) ہائند (اسرائیل): ترکی کتبِ فتاویٰ

(۲۷) روبوفسکی (ہنگری): لطافت نامہ بخمدی

(۲۸) نہباد کیسکلک (ترکی): ابن عربی کی تازہ دریافت تالیف بلخہ الحکمہ

(۲۹) جارج مقدسی (امریکہ): جنلی مذہب اور تصوف

(۳۰) احمد بن محمد ابراہیم (سنگاپور): سنگاپور میں مسلمانوں کے قانون شخصی

میں تبدیلیاں

(۳۱) محمود الحسن صدیقی (مکسیکو): قدیم اسماعیلی تبلیغی سرگرمی سندھ میں

(۳۲) نبی بخش قاضی (پاکستان): احمد رومی کی دقائِق الطریق

(۳۳) ہانس کروڑے (جامعہ عثمانیہ): جھنڈا اسلامی فوج میں (لواء اور رایہ میں فرق)

(۳۴) ناچیز محمد حمید اللہ (فرانس): نسبی، ہجری سنہ اور ہجری و عیسوی تاریخوں کے

تطابق پر ایک نئی جنتری کی تالیف کی ضرورت۔ اسکی تائید میں کانگریس نے

بالا اتفاق ایک قرارداد منظور کی اور تسلیم کیا کہ موجودہ جنتریاں ناقابلِ اعتماد ہیں۔

شعبہ چہارم:

(۱) ڈاکٹر برنشراف (جرمنی): ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں حیدر آباد دکن کا

ایک شہر دائرہ انتخاب

(۲) سی ام نعیم (امریکہ): ہندوستانی پاکستانی کشمکش کا اثر اردو زبان اور ادب پر

(۳) رفیق الرحمن (امریکہ): بنیادی حکومتِ عوام کا پاکستانی نظام اور پانچاقتی

راج کا مندی نظام۔

شعبہ وہم:

- (۱) زکی ولیدی طوغان (ترکی): برمکیوں کی اصل
- (۲) امل خانم (ترکی): وسط ایشیا کی قدیم ترین ترکی مسجد میں فنِ معماری کی خصوصیتیں۔
- (۳) ماتراں (فرانس): الجزائر میں ترکی دور کے نظم و نسق کی خصوصیتیں

اختتامی جملہ:

اس ختم نہ ہونے والی فہرست کو ختم کر کے صرف یہ عرض کروں گا کہ آئندہ اجلاس کے لیے جو تین سال بعد ہوگا کوئی مقام طے نہ ہوا، ارجنٹائن کی دعوت آئی تھی، مسئلہ مجلس انتظامی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

(معارف اعظم گڑھ - نومبر ۱۹۶۷ء)

تلخیص و تبصرہ اٹھارہویں موتمر مستشرقین لائڈن

”چند ماہ گذرے لیڈن (ہالینڈ) میں مستشرقین کی اٹھارہویں کانفرس منعقد ہوئی تھی۔ اس کے کچھ حالات مشہور شامی اہل قلم امیر کلیب ارسلان نے اپنے فرانسیسی ماہنامے میں (جوناسیون عرب کے نام سے جینوا سے شائع ہوتا ہے) ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں لکھے ہیں۔ اس کی تلخیص ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ کہا جاسکتا ہے کہ آجکل لائڈن شرقیاتی علوم کا مرکز ہے۔ شاید یہی وہ یورپی شہر ہے جہاں اسلامی معاملات اور خاص کر عربی تمدن سے بہت دلچسپی لی جاتی ہے۔ وہاں سے نہایت نادر عربی مخطوطے چھپ کر شائع ہوتے رہے ہیں اور عربی علوم کا سنجیدہ مطالعہ وہاں بہت طویل عرصہ سے جاری ہے۔ ہالینڈ عام طور پر اور لائڈن خاص طور پر ہمارے تمدن سے جو دلچسپی لے رہا ہے، وہ ہم سے خراج تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتا۔

ہالینڈ نے مشرقی امور سے اپنی متواتر دلچسپی کا تازہ مظاہرہ اس طرح کیا ہے کہ لائڈن میں مستشرقین کی اٹھارہویں موتمر کا انتظام کیا گیا۔ یہ موتمر مختصر سادہ الفاظ میں کامیاب رہی اور جس عظیم و عتیق تمدن کے نام سے وہ منسوب ہے اس کے شایان

۱۔ اورینٹلسٹ کے لیے جامعہ عثمانیہ کے اصول پر شرقیاتی مرادف ہو سکتا ہے جو مشرق کی بہ نسبت زیادہ قابل اعتناء بھی ہے۔

شان ثابت ہوئی اگرچہ یورپی صحافت آجکل موجودہ تباہ کن اقتصادی سوالات اور تخفیف اسلحہ کے مسائل میں مصروف ہے اس لیے موٹر لائڈن کے حالات کی اتنی اشاعت نہیں ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ معززین کی ایک اعزازی کمیٹی بھی اس کے لیے منتخب ہوئی تھی۔ مجلس اسمبلی کے لیے بیس نہایت مشہور اساتذہ چنے گئے تھے اور ایک شعبہ اطلاعات قائم کیا گیا تھا۔

موٹر کو نو شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

- ۱۔ اسلام
 - ۲۔ سامی اقوام والہ
 - ۳۔ اشوریات
 - ۴۔ مصریات
 - ۵۔ داخلی و وسطی ایشیا
 - ۶۔ مشرق اقصیٰ اور جزائر شرق الہند
 - ۷۔ ہندیات
 - ۸۔ عہد نامہ قدیم (تورات) اور یہودیت
 - ۹۔ پاپیریات (یعنی قدیم مصری کاغذ پاپیروس کے تحریرات سے متعلقہ امور)
- موٹر کا افتتاح یکشنبہ ۶ ستمبر کو ہوا۔ آٹھ سو نمائندے دنیا کے مختلف ممالک سے آئے تھے جن میں ہر دو صنف کے افراد شامل تھے۔ پروفیسر اسنوک ہرگروینے نے موٹر کا افتتاح کیا۔ اس نے شرقیاتی علوم سے دلچسپی کی عظیم الشان ترقی کا ذکر کیا اور کہا ۱۸۸۳ء میں لائڈن میں چھٹی موٹر منعقد ہوئی تھی۔ اس میں (۲۱۸) سے زیادہ نمائندے نہ تھے مگر اب اس اجلاس میں آٹھ سو سے زائد نمائندے شامل ہوئے ہیں جن میں زنانہ نمائندگی بھی بہت اچھی ہوئی ہے۔
- موسیو تراپاسترا ہالینڈ کے وزیر تعلیم نے ایک مقالہ سنایا۔ اس میں ولندیزی شرقیات کی تاریخ بتائی اس نے کہا:

”یہ ملک ہمیشہ سے مشرقی امور میں دلچسپی لیتا رہا ہے اور اس

اہمیت کو خوب سمجھتا ہے جو ایشیاء اور یورپ کے باہمی تفاہم کو حاصل ہے۔ اس نے آخر جب جزائر الکابل کے بڑے حصے پر تسلط حاصل کیا تو اسی بنا پر اس کے سیاسی اور معاشی مفاد سے اس ملک میں ہماری سرگرمیوں کو بے انتہا بڑھانا اور ترقی دینا پڑا۔ یہ صحیح نہیں جیسا بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ایشیائی مقبوضات سے ہالینڈ کا اصلی مقصد سوائے تجارتی نفع کے اور کچھ نہیں۔ اس کے برخلاف ہالینڈ کی اولین کوشش رہی ہے کہ ان دور دراز ممالک میں عیسائیت کی خوبیوں اور فائدوں کی تبلیغ کرے۔“

وزیر تعلیم ہالینڈ کا یہ اعلان اپنے ملک کی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے شرقیاتی موثر میں انتہائی صداقت اور پوری صفائی و وضاحت سے تھا جس میں یہ کوشش نہ تھی کہ غیر مسلموں کو مذہبی معاملات میں ہالینڈ کی انتہائی بے پروائی دکھائی جائے جس طرح بعض دیگر استعماری سلطنتیں کرتی ہیں کہ محض نمائش کے لیے مذہبی معاملات میں انتہائی آزادی اور مکمل بے اعتنائی ظاہر کرتی ہیں مگر چند خاص و مسلسل ذرائع سے اس بات کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتیں کہ اپنی نوآبادیوں کے مسلمان اور دیگر اقوام کو عیسائی بنالیں برخلاف اس کے ہالینڈ کو اقرار ہے اور وہ اس خواہش پر فخر بھی کرتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنی نوآبادیوں میں عیسائیت کے پھیلانے کی کوشش کریگا۔ ولندیزی وزیر کا یہ اعلان ہم پوری طمانیت کے ساتھ بہ طور ثبوت ان مشرقی لوگوں کے لیے درج کرتے ہیں جو یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ بڑی یورپی سلطنتوں کی پالیسی میں مذہبی رجحانات کو دخل نہیں ہوتا خاص کر ترقی یافتہ سلطنتوں میں..... اور آج اسی بنا پر مشرقی قومیں مذہب و سیاست اور مذہب و حکومت کی آمیزش کو اپنی روشن خیالی سے قومی و وطنی خدمت کے لیے ایک بد نما داغ سمجھ رہی ہیں۔

لیکن ہذا کیلنسی وزیر تعلیم ہالینڈ، ہالینڈ کے ان تبلیغی مشنوں کی کوششوں کے نتائج کو مستشرقین کی کانفرنس میں فخر سے پیش کرتے ہیں جس کے ذریعہ بحر الکابل کی

ولندیزی نوآبادیوں میں ایک ناقابل یقین سرگرمی اور جوشِ عمل سے (جسکی پشت پناہی کے لیے ہر قسم کے ذرائع لاکھوں آدمی اور کروڑوں فلورین (سکے) ہیں) ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کو جن کا بڑا حصہ تہیوں اور مفلسوں پر مشتمل تھا، عیسائی بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ گویہ تعداد ایک صفر ہے، اور ملکہ ہالینڈ کی ساڑھے چھ کروڑ (شرق الہند) مسلم رعایا کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی لیکن ساتھ ہی یہ کامیابی ناقابل تردید اہمیت رکھتی ہے۔ مگر کیا اسکی بنا پر ہالینڈ کو تاریک خیال، قدامت پرست اور مذہبی دیوانے کا خطاب دیا جاسکتا ہے؟ لائڈن کی شرقیاتی موتمر میں علاوہ افتتاحی استقبال کے دیگر ضیافتیں بھی ہوئیں۔ حکومت ہالینڈ نے اس کے اعزاز میں شہر لاہائی (ہیک) کے ریدرتسال میں ایک شاندار پُر شوکت استقبال کیا۔ وہاں وزیر مستعمرات نے تقریر کی اور نمائندگان موتمر کو خوش آمدید کہا۔ نور دوک میں ہوٹس تر دین ہوٹل میں جملہ نمائندوں کو شب کے کھانے (ڈنر) پر مدعو کیا گیا۔ اشفاٹ گئے ہورت سال مین ۱۲ ستمبر کو اختتامی جلسہ ہوا اور یہ اعلان کیا گیا کہ اس شرقیاتی موتمر کا انیسواں اجلاس روما (اٹلی) میں تین یا چار سال بعد ہوگا۔

موتمر کے شعبہ اسلام میں غالباً سب سے زیادہ ارکان تھے جو (۸۰) اور (۱۰۰) کے مابین تھے۔ اس میں پڑھے ہوئے مقالے بھی نہایت محنت اور قابلیت سے لکھے گئے تھے۔

اس شعبے میں جن عربوں نے مقالے سناے وہ یہ ہیں:

(۱) شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق (مصر) انہوں نے لفظ ”اسلام“ اس کے ابتدائی مفہوم اور اس (مفہوم) کی ترقی و وسعت پر بحث کی۔ اس مقالے نے بڑی دلچسپی پیدا کی۔ اس میں اس بات کی کوئی کمی نہ تھی کہ دندان شکن دلائل سے چند شرقیاتوں کے اس خیال کی تردید کی جائے کہ اسلام قلب کو مس نہیں کرتا اور وہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ چند رسی قوانین کو ملحوظ اور زیرِ عمل رکھا جائے۔

آپ نے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کو شہادت میں پیش کرتے ہوئے بتایا کہ قوانین کی صرف سختی کے ساتھ پابندی سے کسی کو اسلام میں نجات نہیں ملتی جب تک

کہ اس کے ساتھ نیت نہ ہو، اور خدمتِ خلق اور خیرات و مبرات کے بغیر محض رسوم بیکار ہیں۔ مشہور شریعتی گونت سی ہر نے اپنی نہایت قابل دید تصنیف میں جو ”عقائد و قوانین اسلام“ پر ہے اپنی پوری قوتِ بیانیہ اور طاقتِ منطقیہ سے اسی (غلط) خیال کو پیش کی اور ابھارا تھا.....“

(۲) یمن کے علامہ ہمدانی نے آخری خلفائے فاطمیہ کے عہد کے عربی ادبیات پر مقالہ پڑھا۔

(۳) مشہور مصری عالم احمد پاشا تیمور مرحوم کے فرزند تیمور بک نے ادبیاتِ جدیدہ پر مضمون سنایا۔

(۴) ڈاکٹر طہ حسین نے عربی بلاغت اور اُس کے یونان سے تعلق پر تقریر کی۔ باوجود آپ کی فصاحت و بلاغت کے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یونانی کتابوں کے تراجم سے پہلے بھی عربوں میں بلاغت کا وجود تھا۔

(۵) علامہ محمد ترکی (تونس کے نمائندے) نے اپنی نوعیت کا نہایت اہم مضمون ”عربی خطاطی اور ابنِ مقلہ پر پڑھا۔

(۶) اور خود امیرِ شکیب ارسلان نے ”تاریخ اور مختلف عربی بولیوں کا تعلق“ پر مضمون پڑھا۔ یہ مضمون اسی زیرِ نظر پرچے میں شائع ہو گیا ہے۔

(۷) حافظِ عصفی پاشا مصری سفیر لندن نے جدید عربی حروفِ کبیرہ پر مقالہ پڑھا جو اسے مجواز شاہ فواد کی نسبت سے حروفِ تاج کہلاتے ہیں

شاہ فواد نے عربی میں ان حروفِ تاج سے ”کمپیل لیٹر“ کو رواج دینا چاہا ہے، کہ جس طرح انگریزی و دیگر لاطینی خطوں میں اسماء و اعلام اور ہر جملے کے پہلے لفظ کا پہلا حرف امتیاز کی خاطر بڑا لکھا جاتا ہے وہی طریقہ عربی میں بھی رائج ہو جائے۔ چنانچہ ایک انعامی مقابلے کے نتائج کو مصری وزارتِ تعلیم نے بعدِ ترمیم مناسب نہ صرف شائع کیا ہے بلکہ جدید اطلاعات کے بموجب مدارس کی درسی کتابیں اسی خط میں چھپ رہی ہیں اور جملہ دفاتر و محکمہ جات سرکاری میں اسکا جبری نفاذ عمل میں آچکا ہے۔ اس کے متعلق سرکاری رسالے سے جس کا نام ”حروفِ التاج و علاماتِ الزّیم و مواضع

ادب

گارساں دتاسی

اردو کی قدر فرانس میں ہوئی تھی۔ اب فرانس کی قدر دنیائے اردو میں ہو رہی ہے۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ ۱۸۲۸ء میں جامعہ پیرس کے مدرسہ السنۂ شرقیہ میں اردو کی تدریس کا انتظام شروع ہوا اور پورے پچاس سال ۱۸۷۸ء تک اس کی ذمہ داری پروفیسر GARCIN DE TASSY جس کا صحیح تلفظ گارسین دتاسی ہے، کے سپرد رہی۔ تازہ معلومات حاصل کرنے کے وسائل بڑھے تو اس نے اردو ادبیات کی روزمرہ ہر جہتی ترقیوں پر سالانہ تبصرے کرنے شروع کیے۔ تبصرے کیا کیے، زبان اور اہل زبان کی جیتی جاگتی تصویر کھینچنے اور نشوونما کا فلم لینے کی کامیاب کوشش کی۔ ہموطنوں میں اس کی قدر نہ ہوئی (بات یہ ہے ہندیات سے مراد فرنگیوں میں برہمنی دیومالا ہوتا ہے)۔ گارسین دتاسی نے ہمالیہ تلے کے براعظم میں بتوں اور بت پرستوں کی جگہ بت شکنوں سے نہ صرف دلچسپی لی بلکہ صاف صاف اور علی الاعلان آخر الذکر کو اول الذکر پر ترجیح دی۔ یونانی و رومی دیومالاجن کی گھٹی میں ہو وہ اس ”جرم“ کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ زندہ مشاہیر کی ہمعصر قاموس ہائے اعلام میں تو ان کا پانچ سات سطری ذکر ہو جاتا تھا اب تو وہ اس کا بھی مستحق نہیں سمجھا جاتا۔

گارسین دتاسی کو سرسید سے بڑی عقیدت تھی اور علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم (موجودہ مسلم یونیورسٹی) ان کا مرکز آمال تھا۔ حق بہ حقدار کہنا چاہیے کہ جامعۂ علی گڑھ کی استادِ اردو سیدہ ثریا سلطانہ (حال: بیگم حسین) کچھ عرصہ ہوا پاریس آئیں اور ”گارسین دتاسی کی حیات اور کارنامہ علمی کا جائزہ“ لکھ کر درجہ اعلیٰ کے ساتھ ڈی لٹ کی ڈگری حاصل

ہئی۔ اور جب اپنی تحقیقات کے سلسلے میں سیکڑوں میل کا سفر کر کے گاریس دتاسی کی قبر پر بھی پہنچیں تو زبان حال سے ضرور یہ سنا ہوگا

اِس کار از تو آید و خواباں چنیں کند

سیدہ ثریا کا مقالہ فرانسیسی میں ہے اور چھپ بھی گیا ہے۔ یہاں زیادہ تر اسی

سے استفادہ کر رہا ہوں۔

مولف کے حالات:

فقید اردو عبدالحق مرحوم نے طبع اول کے وقت اس کتاب پر پُر مغز دیباچہ لکھتے ہوئے مولف کے کچھ حالات دیے ہیں۔ سیدہ ثریا سلطانہ کی جستجو سے اب بہت سے نئے معلومات بھی حاصل ہو گئے ہیں۔

جنوبی فرانس میں مرسے ایلیا کے نام سے ایک مشہور عالم بندرگاہ ہے، جسے انگریز ماریٹز کہتے ہیں تو خود اہل فرانس ”مارسے ای“ پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہزاروں برس ہوئے، اسے فینیقیوں نے آباد کیا تھا اور انہی کا دیا ہوا نام اب تک چلا آ رہا ہے (اس نام کے معنی ہیں: بندرگاہ خدا) معلوم نہیں ہمارے مولف کا خاندان وہاں کب سے بس رہا تھا۔ لیکن اس کا دادا ژاں ژوزلف گارسیں JEAN JOSEPH GARCIN وہاں ایک تاجر تھا تو باپ ژوزلف ژاک JAUQUES گارسیں دلائی کرتا تھا۔ اس نے ۱۱ جنوری ۱۹۳۷ء کو خاندان تاسی کی ایک خاتون کلیر ورتینی تاسی CLAIRE VIRGINE TASSY سے شادی کی (جو شاید اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی) تو دونوں خاندانوں کا نام برقرار رکھنے کے لیے بچوں کا نام گارسیں دتاسی رکھا جانے لگا۔

ہمارا مولف ۲۰ جنوری ۱۹۳۷ء کو مرسے ایلیا میں پیدا ہوا اور اس کا نام یوں رکھا

گیا: ژوزلف ایلودور ساژلیس ورتیو گارسیں دتاسی (JOSEPH-ELIODORE-SAGESSE-VERTU GARCIN DE TASSY) اس کا ایک بھائی ژوریف تیوفیل بھی پیدا ہوا۔

وہ (۲۳) سال کی عمر تک مرسے ایلیا ہی میں رہا۔ مغلیہ ہندوستان کی ثروت اور سلاطین ترکی کی سطوت اس زمانے میں ہر نوجوان فرنگی کو ان ممالک کے خواب دکھایا

کرتی تھی۔ (شاید ۱۸۳۰ء کے حملہ جزائر کی تیاری میں) مرسی ایلیا میں عربی کی تعلیم کا انتظام تھا جس سے تاجر بھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس زمانے میں ایک مصری (عالمًا قبلی عیسائی) جبریل طویل اس خدمت پر مامور تھا۔ (جیسا کہ ۱۸۷۳ء کے مقالے میں بیان ہوا) ایک اور مصری عیسائی رافائیل موناخس بھی وہیں تھا (معلوم نہیں کس سلسلے میں، لیکن بعد میں یہ پیرس میں سلویمستر دسای SILVESTRE DE SACY کے تحت مددگار پروفیسر عربی بنا) گارسیس دتاسی بیان کرتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں اس نے ان دونوں سے عربی پڑھنی شروع کی۔ تین سال بعد اس شوق کی مزید تکمیل کے لیے پیرس روانہ ہو کر وہاں جامعہ میں شرکت کی۔ سلویمستر دسای مدرسہ السنہ شرقیہ کا ناظم تھا۔ گارسیس دتاسی نے عربی، فارسی اور ترکی کی تعلیم پائی اور اسی پر اپنی تعلیم ختم کی۔

ختم تعلیم ۱۸۲۲ء میں وہ (امتحان اور سند سے آزاد) مشہور درسگاہ کولیوڈ فرانس COLLEGE DE FRANCE میں سکریٹری کی انتظامی خدمت پر مامور ہوا۔ اور اسی سال ۵ دسمبر کو ماری فیلیپیتے سوفی سیسے MARIE-FELICITE-SOPE SAISSET سے شادی کی جو ایک بڑے خاندان کی لڑکی تھی۔ علاقہ اود کے جاگیردار فابر COMTE FABRE D'AUDE کی رشتہ دار جیسا کہ اس نے ۱۸۷۳ء کے مقالے کے ضمیمے میں وضاحت کی ہے۔ (اولاد نہ ہوئی اور بادن سال کی رفاقت کے بعد بڑھاپے میں وہ اسے داغ مفارقت دے گئی) بعد ازاں کولیوڈ فرانس میں وہ فارسی کے پروفیسر کی نیابت بھی کرتا تھا (جیسا کہ ۱۸۷۳ء کے مقالے میں اس نے بیان کیا ہے۔ مگر تاریخ نہیں بتائی ہے)۔

اس زمانے میں فرانس میں شرقیات سے بڑی دلچسپی لی جا رہی تھی چنانچہ اسی ۱۸۲۲ء میں پیرس کی مشہور انجمن مستشرقین ”سوسیتے آزیاتیک“ SOCIETE ASIATIQUE قائم کی گئی۔ گارسیس دتاسی اس کا شریک معتمد اور کتب خانہ دار بنا۔

سلویمستر دسای نابغہ عصر عالم بھی تھا اور علم دوست بھی۔ استادوں اور کتابوں کے بغیر اس نے جس طرح عربی سیکھی اس پر آدمی ششدر رہ جاتا ہے۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور انتھک محنت کے باوجود وہ آخر انسان تھا جو کام خود نہ کر سکتا تھا اسکے لیے وہ موزوں افراد کو مامور کر کے ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے

میں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو ہندوستانی مقبوضات سے نکال باہر کر دیا تھا لیکن سلویسٹر دسائی نے اردو کی اہمیت بھانپ لی (غالباً وہ انگریزوں کی اس سیاست سے واقف تھا کہ اہل ہند کو ان کی ثقافتی و سرکاری زبان یعنی فارسی سے توڑ کر قوم پرستی کی آڑ میں ملکی زبان پر لگایا جائے جس میں ان کا کوئی دینی لٹریچر نہ ہو اور قصہ کہانیوں اور شاعری کی حوصلہ افزائی کر کے عیسائیت کے لیے راہ ہموار کی جائے، اسی لیے اس نے اپنے شاگرد رشید گارسیں دتاسی سے خواہش کی کہ دنیائے اسلام کی ہونے والی بڑی زبان کو سیکھے۔)

وہ انگلستان گیا۔ عربی، فارسی اور ترکی کی واقفیت کے باعث اردو آسانی سے اور جلد سیکھ لی۔ جب ۱۸۲۸ء میں اردو کی پروفیسری قائم ہوئی تو یہ گارسیں دتاسی کے سوا کس کو مل سکتی تھی! اردو کی پروفیسری سلویسٹر دسائی کے اثر اور رسوخ سے قائم ہوئی تو ملک میں بڑا داویلا مچا۔ اخبار میں مضمون نکلے۔ پمفلٹ چھپے۔ معترضین کے دلائل کا لب لباب دیوشوم (DUCHAUME) کے پمفلٹ میں ملتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ مسلمان کسی طرح عیسائیت قبول نہیں کرتے۔ پھر ان کی زبان پر پیسہ اور محنت کیوں اکارت صرف ہوں؟ سنسکرت کی سرپرستی موزوں تر ہے۔“ ہاتھی جاتا، کتا بھونکتا۔ دو سال کے تجربے کے بعد یہ نئی کرسی مستقل کر دی گئی اور گارسیں دتاسی نے تن من دھن سے کام کر کے وہ شہرت پیدا کی کہ یورپ کے اور ممالک ہی نہیں، خود انگلستان سے طلبہ آتے اور اس کی شاگردی اپنے لیے ضروری سمجھتے۔

اپنے ۱۸۷۷ء کے مقالے میں وہ بیان کرتا ہے کہ جیسے ہی ۱۸۱۷ء میں وہ پاریس آیا تو پروفیسر لانگلیس (LANGLES) کے ”متمول کتب خانے میں میں نے ہندوستانی زبان کی اولین کتابیں دیکھیں،“ افسوس کی آرائش محفل کا نام ساٹھ سال کے بعد بھی اس کے حافظے میں تازہ رہا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے ملک میں سیاسی انقلاب ہوا اور جمہوریت قائم ہوئی۔ اس کی خونریزیاں کیا کم تھیں کہ ۱۸۷۷ء میں جرمنی نے حملہ کر کے نپولین کی فتوحات کا کہنا چاہیے کہ انتقام لیا۔ یہ سارا زمانہ علمی ترقی کا بھی ہے، ملکی بد امنی کا بھی۔ گارسیں

دتاسی کے جاننے والوں کے جاننے والے ابھی پارلیس میں موجود ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ گارسیں دتاسی ایک کم گو، خشک اور سب سے الگ تھلگ رہنے والا شخص تھا۔ اسے کتاب کا کیڑا بھی کہہ سکتے ہیں۔ سفید خوبصورت داڑھی اس کی وجاہت میں اضافہ کرتی تھی۔ اس کی صحت بھی اچھی تھی۔ چنانچہ چوراسی سال کی عمر میں بھی وہ پابندی سے اپنا تدریسی کام انجام دیا کرتا تھا اس زمانے میں وظیفہ معمری کا رواج نہ تھا اس لیے مرتے دم تک وہ اپنی خدمت پر مامور رہا۔

سیاست میں دخل نہ دینے کے باعث اس کی ہر زمانے میں عزت رہی۔ طالب علمی کے اختتام پر اس نے ایک عربی کتاب کا ترجمہ شائع کیا تو سلویسٹر دتاسی کی پیشکش پر اسے ۱۸۲۱ء میں شاہ فرانس کے حضور میں باریابی ہوئی جمہوری دور میں اسے ۱۸۳۷ء میں ”جمعیت اعزازی“ LEGION D'HONNEUR میں شامل کیا گیا۔ شرقیات اور نسلیات اس کے دو خصوصی موضوع تھے۔ ان دونوں کی انجمنوں میں وہ شریک رہا اور دونوں کا نائب صدر منتخب ہوا۔ جنگ جرمنی میں محاصرہ پارلیس کے وقت پایہ تخت شہر کاں CAEN میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گارسیں دتاسی بھی وہیں چلا گیا تھا۔ وہاں کی اکاڈمی کا بھی وہ اعزازی رکن بنا۔

بیرونی ممالک میں سے برصغیر کا ہم الگ ذکر کریں گے سینٹ پیٹربورگ (روس)، برلین (جرمنی) میونخ (باویریا) ویانا (آسٹریا) فلارنس (اطلی)، اسپالا (سویڈن)، کی علمی اکاڈمیوں اور امریکن اورینٹل سوسائٹی نے اسے اپنا اعزازی رکن بنایا۔ پرتگالی اور سویڈن کی حکومتوں نے اسے اعزازی تمغے دیے۔ انگریزوں نے بھی سی ایس آئی (ستارہ ہند کا کمانڈر) کا خطاب دیا۔ اور اس کی ”تاریخ ادبیات ہند“ تیار ہوئی تو اس کی پہلی جلد فرانسیسی ہی میں ملکہ وکٹوریہ نے اپنے نام سے معنون کر کے چھپوائی۔

دنیا سے تعلقات:

گارسیں دتاسی کو پاکستان یا بھارت آنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھنے اور اردو بولنے والے مسافروں میں سے کوئی پیرس میں اس سے ملنے آئے تو ان

سے بات چیت کرنے کے سوا اسے کسی اور راست تعلق کا موقع نہ ملا۔ پھر کے چھاپے کا اثر ہے کہ بارہا وہ غلط تلفظ کا ارتکاب کرتا ہے اسے چونکہ کوئی سیاسی دلچسپی نہ تھی اس لیے انگریزوں نے اس کے کام میں روڑے نہ اٹکائے اور بہ کثرت اہل ہند سے اس کی مراسلت کا سلسلہ قائم ہو گیا، جو اسے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ تھا۔

تقابلی مطالعہ کے کچھ امکانات ہیں اور اس پر توجہ مفید ہوگی۔ مثلاً وہ جن ہندی سیاحوں سے ملاقات کا ذکر کرتا ہے، ان میں سے بعض کے سفر نامے موجود ہیں۔ جسٹس امیر علی مرحوم جب تعلیم کے لیے نوجوانی میں ولایت آئے تو اس سے بھی ملے، جہاں گارسیں دتاسی ان کی بڑی تعریف اپنے مقالے میں کرتا ہے، وہیں امیر علی کی خود نوشتہ سوانح عمری میں (جو حیدر آباد دکن کے اسلامک کلچر میں چھپی) اس ملاقات کا ذکر ہے۔ ایسی چیزیں دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کی البتہ کم توقع ہے کہ پاکستان یا ہندوستان میں گارسیں دتاسی کے خطوط کسی گھرانے میں محفوظ ہوں، لیکن ناممکن نہیں۔ سرسید اور ان کے بیٹے سید محمود کے ہاں کی چیزیں غالباً ساری کی ساری تلف نہیں ہوئی ہوگی۔ گارسیں دتاسی کی تحفہ روانہ کردہ کتابوں کا تو پتا چلتا ہے کہ وہ علی گڑھ میں ہیں۔

اس کی قدر دنیاۓ اردو میں البتہ نئی نہیں ہے۔ اس کے ہمعصروں نے بھی اسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ خود اس نے اپنے مقالوں میں ذکر کیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کی علمی انجمنوں نے اسے اعزازی رکن بنایا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ ۱۸۷۰ء میں انجمن تہذیب لکھنؤ کا ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۲ء میں مظفر پور (بہار) کی علمی انجمن یا لٹریری سوسائٹی کا، ۱۸۷۳ء میں سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا حوالہ دیتا ہے۔ پاکستان کے سلسلے میں ۱۸۶۶ء اور ۱۸۷۳ء میں لاہور کی انجمن اور یونیورسٹی کا ذکر ہے جو ذرا تفصیل کا مستحق ہے۔ انگریزی دور کے آغاز میں ان کے زیر تسلط علاقے میں جا بجا علمی انجمنیں نظر

آتی ہیں۔ جن میں انگریز افسر بھی شریک رہتے ہیں۔ یہ اچھی خاصی اکاڈیمیاں تھیں اور اگر باقی رہتیں تو مماثل مغربی انجمنوں سے کم نہ ہوتیں۔ انگریزوں نے خاص کر تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھی۔ ویسے تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ لیکن ان کا خیال درست تھا کہ بچے کو جیسی تعلیم دی جائے گی وہ اسی رنگ میں رنگا جائے گا۔ مقامی صنعت و دستکاری

کو ہزار وسائل سے تباہ کرنے کے بعد زراعت و تجارت کو چھوڑ کر گزر اوقات کا ذریعہ سرکاری ملازمت ہے۔ اس کے لیے سرکاری مدارس کی سند ضروری قرار دی گئی۔ سرکاری مدارس سے اول تو دینیات کی تعلیم کو یکسر خارج کیا گیا، پھر مدارس زیادہ تر مشنریوں کے سپرد کیے گئے۔ جن کے ہاں عیسائیت کی تعلیم لازمی تھی۔ مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں ۱۸۵۶ء ہی میں یونیورسٹیاں قائم کر دی گئیں۔ اور ہوشیاری سے ہر جامعہ سے ملحق بیسیوں کالج کھولے گئے۔ ان میں بعض کا نام بھی کرپن کالج تھا کام تو سب ہی کا انگریزیت میں رچانا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نتائج خاطر خواہ نہ نکلے۔ مسلمان تو کیا ہندو بھی عیسائیت پر مائل نہ ہوئے۔ بت پرستی اور ذات پات کی جکڑ بندیوں میں پھنسا ہوا ہندو مت انگریزوں کے لیے اس لیے بھی کوئی حریف نہ تھا کہ اس میں تبلیغ نہیں۔ زیادہ ضرورت مسلمانوں پر توجہ کرنے کی تھی۔ ایک تو انہی سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی۔ اس لیے ان پر نگرانی ضروری تھی ایک اعادہ حکومت کی کوشش نہ کریں۔ دوسرے تیرہ سو سال کی شاندار تاریخ کے باعث اسلام کا عالم گیر مذہب عیسائیت کا نہ صرف سب سے بڑا حریف تھا بلکہ ساز و سامان بھی رکھتا تھا۔ ترکی اور ایران بڑی سلطنتیں تھیں اور پہلی مرتبہ ایک بڑی اسلامی مملکت (براعظم ہند) عیسائیوں کے ہاتھ آئی تھی۔ اس لئے ہر قسم کے تجربے ہو رہے تھے کہ کس طرح اس کو اپنے ماضی اور اپنی ثقافتی میراث سے کاٹ کر ہمیشہ کے لیے وفادار رعیت بنایا جائے۔ اندلس میں عیسائی حکومت کے قیام پر مسلمانوں کا یا تو قتل عام کیا گیا۔ یا ان کو جلاوطن کیا گیا۔ اس سے ملک کو کچھ اتنا معاشی اور تمدنی نقصان پہنچا کہ اس کی تقلید اگر ممکن بھی ہو تو مناسب نہ تھی۔ ۱۸۳۰ء میں فرانس نے ترکی صوبہ الجزائر پر حملہ کیا اور رفتہ رفتہ سارے ملک پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے سپہ سالار اور الجزائر کے گورنر مارشل بیوژد (BUGEAUD) کا قول مشہور ہے۔ ”مسلمان اور عیسائی دو اس قدر مختلف ذہنیتوں کے مالک ہیں کہ اگر ان میں سے ایک ایک کا سر کاٹ کر کسی دیگ میں ایک سو سال تک ان کو جوش دیا جائے تو بھی دونوں سروں سے دو مختلف قسم کا شور با نکلتا رہے گا جو ایک دوسرے سے امتزاج نہ پیدا کر سکے گا۔“

انگریزوں نے کہا کہ ہمت نہ ہارنی چاہیے۔ انہیں ایک نئی تدبیر ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کو اسلام کی تعلیم تو دی جائے لیکن یہ تعلیم عیسائی دیں۔ شاید اس طرح مسلمانوں کو یقین ہو جائے گا کہ غلط بود ہرچہ ماہنداشیتم، اسلام اصل میں ایک غلط اور بگڑا ہوا مذہب ہے۔ تدبیر میں جدت بھی تھی ذہانت بھی لیکن بعض ارباب اقتدار کو ہچکچاہٹ تھی۔ انہیں یقین نہ تھا کہ عیسائی یا یہودی استاد اس کی صلاحیت رکھتے ہوں کہ اسلام کا غلط ہونا ثابت کر دیں۔ بلکہ خوف تھا کہ اسلام کی ترقی ہی کے سامان نہ ہوں اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تعلیم سے اسلام خارج ہی رہے۔ آراء کی اس کشمکش میں بہ ظاہر طے یہ ہوا کہ چھوٹے پیمانے پر تجربہ کر کے دیکھا جائے۔

اس کا ذکر ۱۸۶۶ء کے مقالے میں ہے کہ لاہور میں ایک ”مشرقی یونیورسٹی“ قائم کی جائے۔ ڈاکٹر لائٹ نر (LEITNER) نے ”انجمن اشاعت مطالب مفیدہ“ کے نام سے لاہور میں ایک اکاڈمی قائم کی (جس کا گارسیں دتاسی کو بھی اعزازی ممبر بنایا گیا) پھر علوم مشرقیہ کی ایک یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی۔ گارسیں دتاسی لکھتا ہے کہ اس کے ”تجاویز اول“ اس کے پاس آئی ہیں اور یہ کہ اسے اس یونیورسٹی کا اعزازی پروفیسر بھی نامزد کیا گیا ہے۔ اس شاندار تجویز میں سے صرف لاہور کا اور نیٹل کالج باقی رہا۔ اور جلدی ہی لارڈ مکالے نے ذریعہ تعلیم کو انگریزی قرار دلانے میں کامیابی حاصل کی تو لاہور کی ”اور نیٹل یونیورسٹی“ یا ”یونیورسٹی آف انڈیا“ کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اس کی تالیفیں:

ڈاکٹر ثریا سلطانہ بیگم ۲ نے بڑی تلاش کے بعد گارسیں دتاسی کی (۱۵۵) کتابوں اور مقالوں کا پتا چلایا ہے۔ اس تعداد میں (۷۲) تنقیدیں ہیں جو مختلف کتابوں پر کی گئی ہیں (۶) وفات نامے ہیں۔ باقی (۷۷) میں سے کچھ کتابیں ہیں، اور بڑا حصہ علمی رسائل میں چھپے ہوئے مضامین۔

یہ فہرست خاصی مکمل ہے۔ ممکن ہے دو ایک کا مزید اضافہ کیا جاسکے۔ مثلاً ۱۸۷۱ء کے مقالے میں وہ لکھتا ہے کہ اس نے لندن کے اخبار ”انڈین میل“ کے نام

۲۵ مارچ کو لفظ ”شہنشاہ“ کے مفہوم اور تاریخ کے متعلق ایک خط لکھا ہے (کہ ملکہ وکٹوریا کے اس خطاب کو اختیار کرنے کی تجویز تھی) اسی طرح اس کے ۱۸۷۱ء کے مقالے کی فرانسیسی اصل کے سرورق پر اس کی جن کتابوں کا بطور اشتہار ذکر ہے، اس میں میجر آر ڈبلیو برڈ R.W. BIRD کی ۱۸۵۷ء میں لندن میں چھپی ہوئی انگریزی کتاب کا ترجمہ LA SPOILIATION D'BUDH (یعنی اودھ کی لوٹ مار) بھی مذکور ہے۔ یا یہ کہ ۱۸۶۷ء کے مقالے میں وہ بیان کرتا ہے کہ مس کارپنٹر کی کتاب SIX MONTHS IN INDIA (”ہندوستان میں چھ ماہ“) کی تنقید و تحلیل اس نے REVUE ORIENTALE نامی رسالے میں چھاپی ہے۔

ڈاکٹر ثریا سلطانہ بیگم کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ گارسیں دتاسی کو اگرچہ بہت سی زبانیں آتی تھیں (اردو، عربی، فارسی، ترکی، یونانی، لاطینی، جرمن، انگریزی وغیرہ) لیکن لکھا اس نے صرف اپنی مادری زبان فرانسیسی میں، چاہے وہ ترجمے ہوں یا تالیفیں۔ ممکن ہے اوپر جس خط موسومہ انڈین میل کا ذکر آیا وہ انگریزی میں لکھا گیا ہو۔ اسی طرح ۱۸۷۵ء کے مقالے کے باب ششم کی نظم شاید اس نے انگریزی ہی میں لکھی ہو۔

کتاب ہذا:

مجھے دیگر تالیفوں سے یہاں بحث کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض کا اردو ترجمہ بھی ہوا ہے۔ موجودہ کتب کے کچھ اجزاء اولاً رسالہ اردو میں چھپے تھے پھر بعد میں کتابی صورت میں ”خطبات“ اور ”مقالات“ دو ناموں کے تحت اسے تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ طبع ثانی کے وقت من و عن دوبارہ چھاپنے کی جگہ اصل فرانسیسی سے مقابلہ اور نظر ثانی کا فیصلہ کیا گیا اور یہ کام اس ناچیز کے سپرد کیا گیا۔ کام بڑا تھا لیکن میں نے بساط بھر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ میں اولاً ان فاضل شخصیتوں کی محنت کا اعتراف کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا ترجمہ اچھا ہے۔ خاص کر مجھے سید راس مسعود

مرحوم کی حد تک حیرت ہی ہے۔ ان کی ساری عمر اعلیٰ عہدوں کی مشغولیت میں گزری مگر ان کے ترجمہ کردہ اجزاء کیا بہ لحاظ فرنیچ دانی کے، کیا بہ لحاظ موزوں اردو الفاظ کے انتخاب کے مجھے سب سے بہتر نظر آئے۔ کسی لفظ کو چھوڑے بغیر مکمل ترجمہ کرنے کی بھی انہی نے سب سے زیادہ پابندی رکھی۔

دوسرے شرکائے کار کے ترجمے بھی اچھے ہیں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اگر کہیں کوئی لفظ، کچھ جملہ کسی انسانی سہو سے ترجمے میں چھوٹ گیا تو اس کی تلافی کروں۔ بعض صورتوں میں پرانا ترجمہ مفہوم کا اجمالی ذکر کرتا تھا۔ میں نے مکمل لفظی ترجمہ دینے کی خواہش میں اس کو بدلنے کی جسارت کی ہے۔ کہیں کہیں میں نے حواشی میں تشریح و توضیح یا تصحیح کی کوشش کی ہے غرض کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی گئی ہے جس میں مترجم یا نظر ثانی کرنے والے کی چیزیں مولف کی طرف منسوب ہو جائیں۔ جن حواشی میں کوئی نام (مترجم، ایڈیٹر وغیرہ) نہیں ہے وہ سب گارسیں دتاسی ہی کے ہیں چونکہ اس کا منشا محض خدمتِ علم ہے اس لیے میں نے ان ساری ”تبدیلیوں“ کی جرأت اس امید کے تحت کی ہے کہ سارے ہی متعلقہ لوگ، مولف، مترجمین اور سرپرست اسے پسند فرمائیں گے۔ افسوس زیادہ تر اس کا ہے کہ اصل سرپرست یعنی بابائے اردو اس کام کی تکمیل تک ہم میں نہ رہے۔ غفر اللہ۔ ان کی سرپرستی کے بغیر یہ گنجینہ شاید ابھی راز نہاں ہی رہتا۔

یہ کتاب ۱۸۵۰ء کے حالات سے شروع ہوتی ہے اس کے سات سال بعد سلطنتِ مغلیہ پر جو انقلاب آیا، اکیس بے شمار علمی خزانے برباد ہو گئے۔ اس زمانے کی بہت سی چیزوں کی حد تک یہ کتاب گویا واحد ذریعہ معلومات ہے۔ انگریزی دور کے آغاز کی بہت سی چیزیں خاص کر اردو اخبار بھی ہمارے اسلاف کی بے توجہی سے ناپید ہیں۔ اکتے دکتے نمبر کہیں ہیں تو وہ کثیر معلومات جو اس کتاب میں ہیں ان کے ماخذ اب بالکل تلف ہو چکے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں تو خود انگلستان کے بہت سے کتب خانے بمباری میں تباہ ہو گئے۔

اس کتاب کا ایک پہلو بڑا سبق آموز ہے۔ اور وہ انگریزوں کی مذہبی سیاست۔ اس طرح کی کچھ چیزیں میں نے پروفیسر محمد شفیع مرحوم کی خدمت میں پیش کیے ہوئے

”ارمغان“ مطبوعہ لاہور میں اپنے مضمون میں نمایاں کی ہیں۔ یہاں مزید معلومات ملتی ہیں کہ ظاہری غیر جانبداری اور مذہب سے سرکاری بے تعلقی کے باوجود فرنگی حکومت نے ملک کو عیسائی بنانے کی کس کس طرح کوشش کی؟ کیوں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے میں عام طور پر دینی کتابیں رکھی جاتی تھیں گولڈن ٹریڈری کی نظمیں ہوں یا ملٹن کی، بنیان کے ناول ہوں یا میری گوریلی کے، شروع میں تو جبر بھی کیا گیا، مسجدیں اور تعلیمی اوقاف ضبط کیے گئے۔ سرکاری مدرسے کھولنے کی جگہ مشنریوں کو اسکول اور کالج کھولنے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ سرولیم میور نے علی گڑھ کالج کے معائنے کے وقت جو تقریر کی (اور جو اس کتاب میں بھی درج ہے) اس سیاست کا اچھا خلاصہ ہے اور قانونی یا ڈپلوماٹک الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیا ہے۔ اس کام میں سارے یورپ نے ہاتھ بٹایا۔ سوزر لینڈ، جرمنی وغیرہ کے قابل سے قابل مشنری وہاں بلائے گئے۔ فرانسیسی مشنری بھی کم نہ رہے۔ چونکہ گارسین دتاسی کو اس مقصد سے عشق تھا، اس لیے اس نے اتنے کثیر معلومات جمع کر دیے ہیں کہ کہیں اور یکجا نہیں ملتے۔ غرض ہمالیہ تلے کے براعظم میں ترویج عیسائیت کی تاریخ کا یہ قیمتی ماخذ ہے۔

اس سے بھی عجیب یہ کہ جو عیسائی اور خود حاکم طبقے کے انگریز اس محکوم ملک میں مسلمان ہو جاتے تھے، ان کا خاصا تفصیلی ذکر اس کتاب میں ملتا ہے۔ ملک کے بے شمار سماجی، علمی اور دیگر معلومات بھی اس میں ہیں اور صرف اسی میں ملتے ہیں۔ اسی لیے میں عرض کروں گا کہ محترم ناشر اس ضخیم کتاب کا ایک اچھا اور مفصل اشاریہ بھی بنائیں اور شاید بہتر ہو کہ ساری کتاب ایک ہی نام سے چھپے، یہ نہیں کہ کچھ جلدیں ”خطبات“ کہلائیں اور کچھ ”مقالات“۔

یہ اسلاف کی سرگزشت ہے۔ خوش قسمت صرف وہ اخلاف ہوں گے جو ان گزشتہ تجربوں سے سبق لیں۔ آخر میں انجمن ترقی اردو کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اس کام سے نوازا۔ شادم کہ کارے کر دم۔

پارلیس، ربیع الآخر ۱۳۸۳ھ

حواشی

۱۔ گارسیں دتاسی کی وفات پر یہ پروفیسری برخواست ہوگئی۔ اب دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر اس کا مکرر انتظام ہوا ہے۔ فرنگی طلبہ اور طالبات کی خاصی تعداد اسے اختیار کرتی ہے۔

۲۔ توقع ہے کہ فاضل مولفہ اپنا مقالہ نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ جلد اردو میں منتقل کر دیں گی۔ اس دلچسپ کتاب میں اولاً ایک تاریخی تمہید ہے کہ میگاس تھینیس ہے لیکر گارسیں دتاسی تک ہندیات سے یورپ خاص کر فرانس، میں کیا دلچسپی لی گئی (مختلف یورپی زبانوں میں اردو کی صرف نحو، لغت وغیرہ کی تدریسی کتابیں بھی) اور ضمنیہ اجاگر کیا ہے کہ البیرونی وغیرہ مسلمانوں ہی کے کارنامے زیادہ اہم رہے ہیں۔ گارسیں دتاسی کی سوانح عمری کے بعد اس کی ساری مطبوعہ تحریروں پر، کتابیں ہوں یا مقالے، تبصرہ کیا گیا ہے۔ زیر ترجمہ ”خطبات و مقالات“ پر بھی دس بارہ صفحات میں بحث ہے۔ آخر میں گارسیں دتاسی کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط بھی پہلی دفعہ شائع کیے ہیں جن سے ان کے اخلاق و کردار کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

ماہ نامہ قومی زبان - کراچی - جنوری ۱۹۶۳ء

دانٹے کی نظم طربیہ ربانی کے

معراج نبوی سے ماخوذ ہونے کی چند نئی اور قطعی شہادتیں

آلی گئے ری دانٹے اٹلی کا مشہور شاعر گزرا ہے۔ وہ ۱۲۶۵ء میں اب سے کوئی سات سو برس پہلے شہر فلارنس میں پیدا ہوا۔ اپنی اس ننھی سی شہری مملکت کی سیاسیات میں اس نے کافی حصہ لیا۔ اسے بارہا سفیر بنا کر بھی بھیجا جاتا رہا۔ وہ فلارنس کے چھ صدر پادریوں میں سے ایک تھا۔ اس کا تعلق گوری جماعت سے تھا۔ جب کالی جماعت برسر اقتدار آئی تو اسے جلاوطن کیا گیا۔ کچھ دن پارلیس میں گزار کر وہ راوینا (اٹلی) چلا گیا اور وہیں ۱۳۲۱ء میں وفات پائی۔ نو عمری ہی سے وہ چھوٹی بڑی غزلیں لکھتا اور فولکو پورتیاری کی بیٹی بیاتریکس سے اپنے عشق کا اظہار کرتا رہا۔ پھر اس نے ”نئی زندگی“ نامی نظم لکھی لیکن وہ زیادہ تر اپنی عجیب و غریب نظم طربیہ ربانی کے باعث مشہور اور اطالوی شاعری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے جنت، دوزخ اور برزخ تینوں مقاموں کی سیر کی ہے اور وہاں والوں کے دنیوی زندگی کے حالات اور ربانی سزا و جزا کا نقشہ کھینچا ہے۔ لوگ اس کے خیالات اور معلومات کے باعث اس کو بدعتیگی سمجھتے تھے لیکن اگر ہم اس کی نظم کا وہ حصہ جہاں خاش بدعتی، دانٹے نے ختم المرسلین علیہ السلام کو تفرقہ پروری کے الزام میں اپنے دوزخ میں دکھایا ہے اصلی ہے اور کسی بد نصیب نے بعد میں جعل سازی اور الحاق نہیں کیا ہے تو دانٹے کا اسلام اس سے زیادہ مضحکہ خیز ہو جاتا ہے جتنا نیولین اور قیصر ولہلم کا سیاسی اسلام یا گوئے کا اسلام کو اس کے لفظی معنوں میں اپنے لیے استعمال۔

دانٹے کی تصویر جنت و دوزخ کے عیسائی ماخذ نہیں ملتے۔ اس کا ربط ایک حد تک ابو العلاء المعری کی کتاب الغفران جیسی طنزیہ اور لہذا نہ کتاب سے کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں بہت زیادہ مشابہت معراج نبوی کے تذکرے سے ہے۔ قصہ معراج کی چوری اس کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنا اور اسے اپنی نظم طریبہ ربانی کا پلاٹ بنانا اب زیادہ قرین قیاس سمجھا جاتا ہے۔

۱۹۱۹ء میں اپنی مستشرق پادری آسین پالاسیوس نے اسی آخر الذکر نظریے کو اپنی معرکہ آرا ضخیم کتاب ۱۔ مطبوعہ بحریط (میڈرڈ) میں پیش کیا تھا۔ جس کا خلاصہ حیدرآباد دکن کے مرحوم مجلہ مکتبہ میں بالاقساط اردو زبان میں بھی چھپا تھا۔ ابھی ابھی اپنی اور اطالوی زبان میں دو کتابیں چھپی ہیں ان میں اسی موضوع پر بعض تازہ تحقیقات کا ذکر ہے۔ ان کا خلاصہ ایک فرانسیسی اخبار کے واسطے سے پیش ہے۔ شاید ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔

جوں ہی واقعہ اسراء و معراج کو دانٹے کی نظم طریبہ ربانی کا ماخذ قرار دیتے ہوئے اپنی پادری پالاسیوس نے اپنی کتاب شائع کی، اس کی تائید و تردید میں نشریات کا سیلاب امنڈ آیا اور نہ صرف سپین اور اٹلی میں بلکہ سارے یورپ و امریکہ میں مباحثہ چھڑ گیا۔ انگلستان میں زیادہ تر سردمہری سے کام لیا گیا۔ فرانس میں خاص کر آندرے بلسور (Andre Bellessort) اور لوی ٹیلے (Louis Gilet) نے پادری پالاسیوس کی پرزور تائید کی۔ لوی ٹیلے نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ دانٹے کے متعلقہ ادبیات میں یہ کتاب سب سے زیادہ اہم ہے اور واحد تالیف ہے جس سے اس شاعر کو سمجھنے میں ایک قدم آگے بڑھ سکا ہے۔

کچھ اور لوگ محتاط سے رہے۔ اطالوی مستشرق گابریلی (G. gabrielli) نے ایک طویل یادداشت شائع کی جس کا عنوان *Intorno alle foxtiorientali della Divina comedia* (یعنی طریبہ ربانی کے مشرقی ماخذوں پر تبصرہ) تھا۔ اس میں اس نے دو قسم کے اعتراض

۱۔ *La escatologia Musalmanna en la comedy* یعنی طریبہ ربانی تین مسلمانوں کے تصورات مابعد الیات مؤلفہ Miguel Asin palacion تین سوزاند صفحوں میں شائع کیا تھا۔

اٹھائے جن کو مخالفین کی ٹولی لے اڑی اور جوش و خروش دکھانے لگی۔ پہلے یہ کہ طریقہ ربانی میں اور معراج محمدی کی مختلف روایتوں میں باہمی مماثلت محض سطحی ہے اور دوسرے یہ کہ دانستے کو عربی یقیناً نہیں آتی تھی اور یہ ثابت کرنا ناممکن ہے کہ دانستے نے مسلمانوں کے ادبیات باعد الہیات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا موقع پایا تھا۔

۱۹۲۱ء میں دانستے کی چھ سوویں برسی دھوم دھام سے منائی گئی تو فرانس نے بھی اپنے ہاں اس کا اہتمام کیا۔ اس کی مجلس انتظامی ایک رسالہ بھی شائع کرتی رہی جس کا نام Bulletin du gomite cathoique ixaneaise pour lacelebration du sixieme centenaire de la Mort de Dante تھا۔ اس کے مدیران ہنری کوشین (Henry Cochine) اور آندرے پے راتے (Andre Perate) تھے۔ اس رسالے میں پادری مان دونے (Mandonnet.o.P) نے ایک مضمون میں بتایا تھا کہ قصہ معراج محمدی کے ایک حصہ کا ترجمہ دانستے کی زندگی میں لاطینی میں پادری ریکولدو دامونستے کروچے (Ricoedo da Monte-Croce) مبلغ نے کر کے اپنی تالیف legem saracenorum (یعنی مسلمانوں کے قانون کی تردید) میں شائع کیا تھا۔ طریقہ ربانی اور اس دو بینگی فرقے کے پادری ریکولدو کی تالیف میں مماثلت اتنی دور کی تھی کہ پادری مان دونے نے Bere Mandonnet کو بھی لکھنا پڑا تھا کہ دانستے کے لیے یہ بات آسان تھی کہ مزید مفید اور ضروری معلومات خانقاہ سینٹ ماریہ جدید کے مبلغ ریکولدو سے بالمشافہ حاصل کرے۔ بداہتہ یہ مفروضہ ایسا تھا کہ دل کو نہ لگا اور گابریلی (Gabrielli) کا آخری اعتراض اپنی پوری قوت کے ساتھ برقرار رہا۔

اب اس اعتراض کا قطعی ازالہ دو تازہ تالیفوں نے کر دیا ہے جو کم و بیش ایک ہی ساتھ شائع ہوئی ہیں پہلی اطالوی میں ہے دوسری اسپینی میں۔

1. E. Cerulli, Il libro della Scala et la questione delle fontiaraba spagnole della divina comedia"
2. J. Maner Sendino, la Escala de Makoma

۱۔ اے جے رلی کی اطالوی کتاب کتاب معراج اور طریقہ ربانی کے عربی و اسپینی ماخذوں کا مسئلہ

۲۔ مونوزسیندینو کی اپنی کتاب، معراج محمد،

یہ دونوں کتابیں ایک ہی موضوع سے بحث کرتی ہیں۔ یعنی ایک عربی کتاب کے دو ترجمے دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک لاطینی میں دوسرا فرانسیسی میں، بادشاہ اذفونش (الفونسو) عقلمند کے حکم سے یہ کام شہر اشبیلیہ میں بونا ونٹورے (Bonaventare) نامی ایک شخص نے (جو غالباً سین کارہنے والا تھا) انجام دیا تھا۔ اگرچہ براہ راست عربی سے نہیں بلکہ اس ترجمے سے جو عربی سے قسطلی زبان میں ایک یہودی طبیب ابراہیم الفقیم کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا۔ یہ تینوں ترجمے (قسطلی، لاطینی، فرانسیسی) ایک ہی سال ۱۲۶۲ء میں ہوئے ہیں۔

یعنی دانتے کی پیدائش سے بھی ایک سال قبل

فرانسیسی ترجمے کا نام le livre de l'eskiele makomet (یعنی کتاب معراج محمد)

ہے اور مترجم بونا ونٹورے (Banaventure) ذیلی عنوان کے طور پر لکھتا ہے۔

Ciest le livreque home appeleen asrxazinois halmaereig que voltant dire en francois come monteren alt

یعنی یہ کتاب اس موضوع پر ہے جسے سارا قینی یعنی عربی زبان میں ہلریگ (المعراج) کی خرابی کہتے ہیں۔ جس کے معنی فرانسیسی میں ہوں گے بلندی پر چڑھنا۔

ہلریگ (یعنی المعراج) کے ابتدائی معنی سیڑھی کے ہیں اور اصطلاحی معنی بلندی پر جانے کے ہیں۔ خاص کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر مراد ہے جس میں آپ حضرت جبریلؑ کے ہمراہ عالم بالا اور عالم مابعد السموات کی سیر کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

معراج نبوی کے تین بڑے حصے یا منزلیں ہیں پہلے اسراء یعنی رات کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جانا جو زمینی سفر ہے، دوسرے معراج یعنی عالم بالا کو پرواز اور تیسرے گویا ان دونوں کو ملا کر ایک ہی قصہ قرار دینا۔

مذکورہ بالا قسطلی، لاطینی اور فرانسیسی ترجموں کی موجودگی سے اس کا امکان پوری طرح پیدا ہو جاتا ہے کہ دانتے نے مسلمانوں کے تصورات مابعد السموات سے واقفیت حاصل کر لی ہو لیکن اس نے مذکورہ تین ترجموں میں سے کسی ایک کو یا ان کے کسی لاطینی یا

اطالوی خلاصے کو واقعی پڑھا بھی تھا یا نہیں یہ ایک الگ اور پیچیدہ سوال ہے اور یقیناً اس پر بہت سی سیاہی خاص کر اٹلی میں بے گئی تاکہ اپنے قومی شاعر کے شہ کار کو بیرونی خاکوں کا مرہون منت قرار پائے۔ دانٹینی (یعنی دانٹے سے متعلقہ مباحث میں مشغول لوگ) ایک بے چین و بے قرار گروہ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی خوب ہی بن آئے گی اور موافق و مخالف خوب ہی لکھا بولا جائے گا، بہر حال مذکورہ بالا ترجمہ قصہ معراج اور طریبہ ربانی کے تفصیلی اور دقیقہ رس مقابلے کے بغیر کوئی چیز استناد کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی۔

ایک چیز البتہ ابھی سے ذہن میں آتی ہے جب دانٹے اپنی سیر عالم آخرت کے سلسلہ میں برزخ یا اعراف (Purgatorg) پر پہنچتا ہے تو وہاں کا محافظ فرشتہ اپنی تلوار کی نوک سے شاعر کی پیشانی پر سات ”گ“ کے نشان بناتا ہے اس سے مقصد یہ تھا کہ سات گناہ ہائے کبیرہ کا اسے کفارہ ادا کرنا ہے جس کے لیے برزخ کی مقدس پہاڑی کی ساتویں کنگنیوں (Cornices) پر حاضر ہو کر اپنا تزکیہ عمل میں لائے۔ جیسے جیسے پہاڑی کے ان ساتوں دائروں میں سے ایک ایک کر کے باہر نکلتا ویسے ویسے ”گ“ کا ایک ایک نشان اس کی پیشانی سے مٹا جاتا اور سیاح اپنے کوسک سے سیک تر محسوس کرتا

دانٹے کی ایچ کا کامل احترام کرنے والے بھی اسے بالکل کمزور نہیں تو کافی مسکین قسم کا تصور قرار دیتے تھے۔ اب سات ”گ“ معراج محمدی کے قصہ میں بھی ملتے ہیں۔

طریبہ ربانی کے ماخذوں کی بحث سے قطع نظر بھی چیرلی (Ceralli) اور مونوز سیندینو (Manoz sendino) ہر دو کی کتابوں سے ہمیں اس امر کے متعلق تازہ معلومات حاصل ہوتے ہیں کہ قرونِ متوسطہ میں عیسائی دنیا عالم عربی کے متعلق کیا معلومات رکھتی تھی۔ ان معلومات کے حصول کا ذریعہ کیا تھا اور یہ کہ بادشاہ اذفونش عظمند (الفونسو) کے دربار میں اسلام کے متعلق کیا دلچسپی لی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر برونیو لاطینی (Brunetto latini) ۱۲۶۰ء میں قسطنطنیہ میں فرانس کا سفیر تھا وہاں سے واپسی پر اس نے (livre dou tresox) (خزانے کی کتاب) لکھی اور ۱۲۶۳ء میں معراج محمدی پر ایک ہی کتاب کے تین تین زبانوں میں ترجمے ہوتے ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ۔ اپریل ۱۹۵۱ء)

فرانسیسی زبان کی پیدائش میں عربی کا حصہ

یہ ایک محض گمان، استنباط اور نظریہ ہے، اور وہ بھی تحقیق کے ابتدائی مدارج میں۔ شروع میں کچھ تمہید کی ضرورت بھی معلوم ہوتی ہے۔

”يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ“ (قرآن ۱۳/۱۳) رعد اللہ کی حمد کے ذریعے سے تسبیح کرتا ہے) اور ”وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يَسْبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ“ (۴۴/۱۷): کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی، اس کے حمد کے ذریعے سے تسبیح میں مشغول نہ ہو۔ لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے) اور مماثل آیات سے قطع نظر کریں، تو جمادات اور نباتات میں بھی اپنی مرضی سے چیخنے، آواز نکالنے کی قدرت نظر نہیں آتی۔ یہ صرف حیوانات سے مخصوص امر ہے۔ اور حیوانوں میں انسان ان کی سب سے زیادہ قابلیت رکھتا ہے۔ مکمل الصوت آلات نے پتا چلایا کہ مچھلیاں سب جانوروں سے زیادہ ثرائی ہیں۔ اور اب پتا چلنے لگا ہے کہ جانوروں کی بھی ”بولیاں“ پائی جاتی ہیں اور ان سے نکلنے والی آوازیں خوشی، ڈر اور مختلف حالتوں میں یکساں نہیں، بلکہ الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس لیے اب ہمارے زمانے میں قرآن مجید (سورہ ۱۶/۲-۱۸) کے ذکر کردہ ”منطق الطیر“ (پرندوں کی بولی) اور ”قالت نملة“ (ایک چیونٹی بولی) پر صرف اعتقاد کے لیے اعتقاد رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے (سورہ ۱۴/۷۱) ”خلقکم اطواراً“ (یعنی خدا) نے تم کو ارتقاء در ارتقاء سے پیدا کیا ہے) سے استنباط کیا جائے تو شاید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ابتداء صرف فطری صلاحیت سے مفرد آوازیں نکلتی رہی ہوگی، پھر رفتہ رفتہ مرکب آوازیں اور آوازوں کے مجموعے انسان نے اپنی مختلف ضرورتوں کے لیے استعمال کرنے شروع کیے، ایک آواز یا ایک مجموعہ ایک غرض کے لیے، اور دوسرا دوسری غرض کے لیے۔

شاید قرآن (سورہ ۳۱/۳-۳۲) میں اسی کی طرف اشارہ ہے: ”اور خدا نے آدم کو سارے نام سکھائے پھر ان (موسم) چیزوں کو فرشتوں کو دکھا کر پوچھا کہ تم مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انہوں نے کہا تجھی کو پاکی سزاوار ہے، ہمیں کوئی علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، تو ہی علیم و با حکمت ہے، پھر اس نے فرمایا: اے آدم، ان (فرشتوں) کو ان (چیزوں) کے نام بتا۔ جب اس نے ان کے نام بتائے تو فرمایا کہ“ نام سے مختلف چیزوں اور مفہوموں میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی حضرت آدم نے کیا۔ یہ قصہ بائبل میں بھی ہے (کتاب پیدائش ۲/۱۹-۲۰) اور وہاں چیزوں کو نام حضرت آدم دیتے ہیں۔ (ناموں کی اہمیت کنفوشس کی کتابوں میں ہے لیکن ان تفصیلات سے ہم اپنے موضوع سے دور ہو جائیں گے۔

کسی چیز، کسی فعل، کسی مفہوم کے بعد ماضی، حال اور مستقبل، نیز امر و نہی میں امتیاز کی ضرورت پیش آئی ہوگی اور اس طرح زبان وجود میں آئی ہوگی جس میں شروع میں تعداد الفاظ محدود رہی، پھر رفتہ رفتہ ہر نسل میں اضافہ ہوتا رہا ہوگا۔ پیٹھے اور اختصاص کے وجود میں آنے پر انفرادی معلومات میں فرق بھی ناگزیر تھا۔

ایک ہی جوڑے، آدم اور حوا، سے ایک نہیں متعدد زبانوں کا وجود میں آنا اور ان میں اتنا فرق ہونا کہ ایک کی زبان دوسرے کو بالکل سمجھ میں نہ آئے، یہ ہر زمانے میں ایک اچنبھا ہی رہا ہے۔ بائبل کی کتاب پیدائش (۱۱/۱-۹) کا بیان ہے کہ طوفان نوح تک سارے انسانوں کی ایک ہی زبان تھی۔ پھر جو لوگ غرق ہونے سے بچے تھے وہ ملک شام کی طرف گئے اور وہاں پختہ ایٹنوں سے ایک شہر بنانا شروع کیا اور اس میں

ایک منارہ بھی بنانا چاہا جو اتنا بلند ہو کہ آسمان تک پہنچ جائے۔ (شاید منشا یہ تھا کہ خدا کو دیکھیں) یہ بات خدا کو پسند نہ آئی، اور وہ آسمان سے نیچے اتر کر اس مقام کو آیا اور ان لوگوں کو سارے کرہ ارض پر منتشر کر دیا جس کے باعث ان کی زبان ایک نہ رہی اور اس مقام کو بابل کا نام دیا گیا جس کے معنی ہیں زبانوں کا مختلف ہو جانا، نت نئی زبانوں کا پیدا ہونا۔ اس قصے کی کوئی تائید، کوئی ذکر نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ لیکن قرآن (سورہ ۲۳/۳۰) میں ایک بڑا عمیق المعنی جملہ آیا ہے: ”اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا فرق ایک ایسی چیز ہے جس میں اہل علم کو (خدا کی) عجائبات ملیں گی۔“ مجھے پتا نہیں کہ آیا ہندو ادبیات (منسکرت) میں اس سلسلے میں کچھ بیان ہوا ہے یا نہیں۔ بہر حال قرآن کے نزول کے زمانے میں جو حالت تھی، وہ آج بھی ہے اور اگر بدلی ہے تو صرف یہ کہ مصنوعی (اور بہتر) زبان بنانے کی دو کوششیں یورپ میں ہوئیں: ایک وولاپوک (Volapuk) جسے جان مارٹن شلایر (J.M. Schleyer) نے ۱۸۴۷ء میں ایجاد کیا، اور دوسری لیسپرانتو Esperanto جو گویا اس کی اصلاح تھی، یہ ڈاکٹر تسامن ہوف (Zamenhof) نے بین الاقوام روابط میں سہولت پیدا کرنے کے لیے بنائی۔ گرتے پڑتے یہ دونوں بھی اب تک باقی ہیں ان کو بولنے والی کوئی قوم تو نہیں بنی، لیکن بولنے سمجھنے والے افراد ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا میں مختلف زبانیں ہی نہیں، کم و بیش فرق رکھنے والی شاخیں (dialect) اور ذیلی شاخیں (Patois) بھی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ہندوستانی زبان میں اردو اور دکنی کا فرق۔ یہ فرق روز افزوں ہیں اور ساری دنیا میں۔ ہمارے جو ہم وطن بھائی بہن مثلاً انگلستان میں جا بے ہیں اور اس پر ایک نسل گزر گئی ہے تو ان کا مشاہدہ اور ان کا بیان ہے کہ انگریزی زبان ان کی آنکھوں کے سامنے اتنی تیزی سے بدلی اور بدل رہی ہے کہ وہاں کے عیسائی فرنگیوں کے اپنے بچے بھی اب مثلاً بائبل میں مستعمل انگریزی کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔

زبانوں کے اختلاف، اور نئی زبانوں کی پیدائش کے اسباب اور طریقوں کے متعلق جہاں تک ہمارا علم اب تک پہنچ سکا ہے، وہ ایک لمبی داستان ہے۔ ہماری آنکھوں

کے سامنے کی دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

۱۔ چند سال قبل جنوبی افریقا کے شہر جوہانس بورگ جانے کا موقع ملا تھا۔ وہاں میاں نامی ایک بہت محیر اور علم دوست خاندان رہتا ہے۔ ان کے ہاں کے کتب خانے میں ایک کتاب دیکھی جو وہاں کے گوروں ہی میں سے ایک کی لکھی ہوئی ہے۔ مؤلف کہتا ہے کہ جب ہالینڈی لوگوں کا ملک پر تسلط ہوا تو نوآباد کاری کے لیے طرح طرح سے مزدور اور غلام وہاں لائے جاتے رہے اور ان سے نوآباد کاری کے کٹھن کام لیے جاتے رہے۔ ان مزدوروں اور غلاموں کو ہالینڈی زبان سیکھنی پڑی جسے وہ بگاڑ کر اور غلط سلط بولتے رہے اور ہالینڈی صرف ونحو کے قواعد کو آسان بنا کر گفتگو کرتے رہے۔ انگریز آئے، تو ان بد نصیب ”غلاموں“، یعنی بنگالیوں، ملا باریوں، ملا یا و جاوا والوں، عرب، حبشی لوگوں کی تعداد چونکہ گوروں سے بہت زیادہ ہو گئی تھی اس لیے فصیح ہالینڈی کی جگہ بگڑی ہوئی، غلاموں میں بولی جانے والی ہالینڈی اتنی مروّج تھی کہ گورے بھی اسی کو بولنے پر مجبور تھے کہ اپنے مزدوروں سے بات کر سکیں۔ پھر انگریزوں سے نفرت کے باعث ان ہالینڈی گوروں نے مقامی بگڑی ہوئی ہالینڈی میں لکھنا پڑھنا بھی روز افزوں شروع کیا۔ لیکن ان گوروں سے بہت قبل مقامی مسلمان اس کو لکھنے پڑھنے میں برتنے لگے تھے۔ اور اسے افریقانیہ کا نام دیتے تھے۔ اور زیر ذکر کتاب کا مؤلف لکھتا ہے کہ موجودہ افریکانس (افریقانیہ) زبان کے قدیم ترین دستیاب شدہ نمونے عربی خط میں مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور یہ اسلامی کتابیں (اسلام کے متعلق) ہیں۔ غرض عربی اور حبشی زبانوں کا ہالینڈی زبان پر جو اثر پڑا، اس سے افریقانیہ زبان پیدا ہوئی اور وہ اب جمہوریہ جنوبی افریقا کی سرکاری زبان ہے۔

۲۔ اگر جنوبی افریقا کے ایک حصے پر ہالینڈ کا قبضہ ہوا، تو ایک دوسرے حصے پر فرانس کا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ایک جگہ غلاموں اور مزدوروں کو ہالینڈی بولنی ہوتی تھی تو دوسری جگہ فرانسیسی۔ نتیجہ دونوں جگہ ایک ہی ہوا یعنی ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔

فرانسیسی علاقے کی زبان کو کریول Kreol کہتے ہیں اور اس میں بھی اب کافی لٹریچر پیدا ہو چکا ہے، اگرچہ افریقانیہ کے مقابلے میں، جس میں قرآن مجید کے کامل تراجم بھی ہو چکے ہیں، ان دونوں نئی زبانوں، (افریقانیہ اور کریول) کا اثر محدود رہا اور اصل ہالینڈی اور فرانسیسی زبانیں جو ہالینڈ اور فرانس میں بولی جاتی تھیں متاثر نہ ہوئیں۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہالینڈ اور فرانس میں وہ لوگ مفقود سے تھے جو افریقانیہ اور کریول بولتے ہوں۔

یہ حالیہ مثالیں غالباً ہمیں قدیم تر زمانے کے واقعات کو سمجھنے میں مدد دیں گی۔

لاطینی زبان کے پرہیز اڑنا:

کوئی ہزار سال کی بات ہے کہ لاطینی زبان، جو یورپ کے بڑے حصوں میں رومی فتوحات کے باعث پھیل گئی تھی، ختم ہو جاتی ہے اور اس کی مقامی بولیاں مستقل زبانیں بن جاتی ہیں۔ ہمارا اشارہ اپنی، اطالوی اور فرانسیسی کی طرف ہے۔ اور ان نئی زبانوں کی تولید ہی کے متعلق ہمارا نظریہ ہے کہ وہ عربی کے باعث ہوا۔

لیکن دوسری تفصیلیں یا دلیلیں دینے سے قبل خود عربی زبان کی ایک اہم خصوصیت کو نمایاں کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دنیا میں عام طور پر زبانوں میں اندرونی ارتقاء مسلسل ہوتا رہتا ہے اور کہتے ہیں پانچ سو سال بعد وہ زبان ناقابل فہم ہو جاتی ہے۔ مثلاً مشہور انگریز شاعر چاسر (Chaucer) (ت ۱۴۰۰ء) کی نظموں کو اس کے جنم بھوم لندن میں اب کوئی انگریز سمجھ نہیں سکتا۔ بجز پرانی انگریزی کے متخصص اساتذہ کے۔ یہی حال فرانسیسی، جرمنی، روسی وغیرہ کا ہے۔ اس کا تاریخ عالم میں واحد استثناء عربی زبان ہے، اور یقیناً قرآن کی برکت سے گزشتہ پندرہ سو سال سے نہ عربی صرف ونحو بدلی ہے، نہ الفاظ کے معنی حتیٰ کہ تلفظ میں بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اگر آج رسول اللہ زندہ ہوں تو عربی راڈیو اور عربی اخباروں کو اسی آسانی سے سمجھ سکیں گے جس طرح آپ اپنے ہم عصر عربوں کو سمجھ سکتے تھے، یا ہم قرآن وحدیث کو سمجھ سکتے ہیں۔ دونوں زبانوں کی زبانوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں ہے۔ عربی کو مقامی بولیوں میں چاہے فرق ہو لیکن

عربوں کی لکھنے پڑھنے کی علمی زبان ہر جگہ یکساں ہے۔ اگر عربی میں یہ استحکام نہ ہوتا تو پھر رحمان و رحیم خدا کو ضرورت پیش آتی کہ ایک نیا پیغمبر بھیجے اور قرآن ایک نئی زبان میں نازل کرے۔

یہ تھی وہ عربی زبان جو اپنی سیاسی اور عسکری قوت کے اوج عروج کے زمانے میں لاطینی سے مڈبھیڑ ہوئی۔

مسلمان حضرت عثمان کی خلافت کے زمانے (۳۵ھ) میں اندلس میں داخل ہوئے۔ پھر رفتہ رفتہ سارے پرتگال اور اسپین پر بھی قبضہ کیا اور اٹلی اور جنوبی فرانس کے بڑے حصے پر بھی۔ اسپین میں وہ کوئی آٹھ سو سال حکومت کرتے رہے۔ اٹلی میں خاص کر صقلیہ میں بھی وہ بہت دن رہے۔ خود جنوبی فرانس میں ایک خود مختار اسلامی حکومت سوا سو، ڈیڑھ سو سال تک برقرار رہی، اور اس زمانے کے مسلمان حکمران کے دیے ہوئے جاگیروں کے پروانے تک تاحال محفوظ ہیں۔

اسپین کے متعلق شاید یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ وہاں کے لاکھوں نو مسلم اسپینی، اسپینی زبان بولتے رہے جو عربی سے ظاہر ہے کہ بہت متاثر تھے اور عرب اس زبان کو انجمیادو سے موسوم کرتے تھے جو الاعمیہ کی خرابی تھی (اسپینی میں حرف ج کا تلفظ رخ ہوتا ہے، جبرالٹر کو وہ آج بھی خبرالٹر بولتے ہیں) اور یہ انجمیادو عربی خط میں لکھی جاتی تھی۔ اس میں قرآن کے ترجمے بھی ہیں، طب وغیرہ دنیوی علوم کی کتابیں بھی۔ اور ان کے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں قلمی نسخے آج بھی مجرط (میڈرڈ)، ایسکوریال وغیرہ میں محفوظ و موجود ہیں۔ عربی خط والی پرتگالی کا بھی یہی حال ہے۔

عربی کا اثر خاص کر فرانسیسی پر:

لاطینی زبان اٹلی میں نہیں، اسپین اور فرانس میں بھی مروج تھی اور وہاں وہ علمی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔

عرب ان ملکوں میں پہنچے اور طویل عرصہ سکونت پذیر رہے تو لازماً لاطینی بولنے پر مجبور ہوئے۔ ان اجنبیوں کے منہ میں لاطینی زبان وہ نہ رہ سکی جو فرنگی علماء میں مروج

تھی۔ اگر عربوں نے اسے بگاڑا تو یہ اسے سہل تر بنانے کے لیے تھا، اور کچھ اپنی عربی زبان کی خصوصیتیں بھی اس عربائی ہوئی لاطینی میں داخل کیں اور یہ ”بگڑی ہوئی“ لاطینی زبان برقرار بھی رہی اور پھلتی پھولتی بھی گئی۔ اور اس طرح اسپینی، اطالوی اور فرانسیسی زبانیں پیدا ہوئیں۔

یہاں مجھے نہ اس سے بحث ہے اور نہ دلچسپی کہ فرانسیسی زبان میں کتنے عربی لفظ ہیں۔ الفاظ مستعار لینے سے زبان نہیں بدلتی، بلکہ وہ مستعار لفظ ہی مستعار لینے والی زبان کے قواعد اور عام ماحول کے تابع ہو جاتا ہے۔ یہ زندہ اور موجود زبانوں میں بھی ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ ابھی حال میں روسیوں نے ایک گولا پھینکا جو زمین کے اطراف میں گردش کرنے لگا، اور انہوں نے اسے اسپوٹنک کا نام دیا۔ فوراً یہ لفظ دنیا کی ساری زبانوں میں داخل ہو گیا، جیسا کہ سابق میں ٹیلیفون، گراموفون وغیرہ لفظوں کے سلسلے میں ہوا تھا۔ مجھے بحث ان چیزوں سے ہے جو کسی زیر پیدائش زبان میں باہر سے آتے اور اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ بحث ابھی اپنے آغاز میں ہے اس لیے زیادہ مثالوں کی توقع نہ کی جانی چاہیے۔ بہر حال سب لوگ جانتے ہیں کہ لاطینی زبان میں علامت معرفہ نہیں ہے (اُردو میں بھی نہیں)، انگریزی میں ہے یعنی THE، جس کے استعمال سے کوئی چیز غیر محدود نہیں رہتی معین ہو جاتی ہے۔ غرض علامت تعریف لاطینی میں نہیں لیکن اس کی تینوں بیٹیوں فرانسیسی، اطالوی اور اسپینی میں ہے۔ عربی میں ال (مثلاً الاسلام) ہے، تو اطالوی میں IL (Islam)، اسپینی میں EL (Islam) اور فرانسیسی میں:

✽ حرف علت سے شروع ہونے والے اسم پر علامت تعریف لگائیں تو (l) مثلاً (l' Islam) (مماثل چیز عربی میں ہے کہ الف لام تعریف سے پہلے مثلاً! ”ب“ ہو تو علامت تعریف کا الف گر جاتا ہے اور صرف لام رہ جاتا ہے۔ مثلاً بالاسلام کا تلفظ بن اسلام ہوگا، ”ب ال اسلام نہیں۔

✽ حرف صحیح سے شروع ہونے والے الفاظ کو معرفہ بنانا

چاہیں تو مذکر اسم کے لیے واحد کی صورت میں IE، مونث کی صورت میں IA، مذکر و مونث دونوں کی جمع کی صورت میں IES ہوتا ہے۔ (یہ نزاکتیں عربی میں نہیں ہیں)۔

✽ علامت تعریف سے پہلے لفظ A (یعنی ”اوپر“) ہو تو ALE کی جگہ AU (یعنی فلاں چیز کے اوپر) ہو جاتا ہے۔ اس کی متوازی چیز عربی میں شمسی و قمری حروف سے شروع ہونے والے لفظ پر الف لام تعریف آئے تو لام کا تلفظ کچھ اور ہو جاتا ہے۔ مثلاً الاسلام (آل اسلام) لیکن السلام (آس سلام)۔

بہر حال لاطینی زبان میں علامت تعریف نہیں تھی، اس کی اولاد میں وہ آگئی ہے۔ عربی (آل)، اسپینی (EL)، اطالوی (IL)، فرانسیسی (la) یہ معنی خیز ہے۔

ایک دوسری چیز جو اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اردو ہی کی طرح لاطینی میں فعل جملے کے آخر میں آتا ہے، عربی میں فعل، فاعل شروع میں ہوتے ہیں، اس کے بعد مفعول و متعلقات آتے ہیں، فرانسیسی وغیرہ لاطینی زاد زبانوں میں لاطینی قاعدے کی جگہ عربی کے قاعدے پر عمل ہوتا ہے۔ موروٹی چیز کو بدلنے پر مجبور کرنے کے لیے کوئی طاقتور بیرونی چیز کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک اور چیز کا بھی یہاں ذکر کرتا ہوں: لاطینی زبان میں (ج) کی آواز نہیں ہے، اس کی جگہ (ی) ہوتی ہے۔ اطالوی میں تو فرق نہیں ہو سکا۔ فرانسیسی میں (ژ) ہو گیا جو شمالی افریقا کی عربی زبانوں کا لہجہ ہے اور وہ عرب (ج) کا (ژ) تلفظ کرتے ہیں۔ لبنان میں بھی وہی حال ہے، اور اس فرق کو ظاہر کرنے کے لیے فرانسیسی میں (ا) کے ساتھ (i) کا اضافہ ہوا۔ اسپینی میں بھی یہی ہوا، لیکن وہاں (ج) کا تلفظ (خ) ہوتا ہے۔ جبرالٹر کو وہ خبرالٹر کہتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حرف (ج) کا تلفظ مختلف عرب قبائل میں بھی مختلف ہوتا ہے۔ مصر میں وہ (گ) ہوتا ہے (گمال عبدالناصر) یمن میں وہ (ی) ہوتا ہے (بحجی کا تلفظ ممحی) حجاز میں (ج) اور لبنان اور شمالی افریقا میں (ژ)،

اور مشرقی افریقا میں (خ)۔ آخری لیکن بہت اہم چیز یہ ہے کہ علامت تعریف کا قدیم ترین معلوم استعمال فرانسیسی زبان میں Cantilene de Saint-Eulalie میں ہے جو ۸۸۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی، جیسا کہ فرنج اکیڈمی سے مجھے معلوم ہوا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب مسلمان اسپین، اٹلی اور فرانس میں تھے۔

جس زمانے میں اسپین ہی نہیں، جنوبی فرانس اور اٹلی میں بھی مسلمانوں کی حکمرانی تھی، اسی زمانے میں وہ سوئٹزرلینڈ کے بعض علاقوں میں بھی تسلط رکھتے تھے، جیسا کہ ہمارے مرحوم پروفیسر ہارون خان شروانی کی تالیفوں سے علم دوست طبقہ خوب واقف ہے۔ تلاش پر پتا چلا کہ سوئٹزرلینڈ کی ایک مقامی زبان رومانش (Romansch) بھی ہے اور وہ بھی لاطینی کی ہی پجی ہے۔ اور اس رومانش میں بھی (اپنی ماں لاطینی کے برخلاف) لفظ کو معرفہ بنانے کے لیے ایک لفظ استعمال کرنا ہوتا ہے جو (Il) ہے۔ دوسرے الفاظ میں رومانش زبان کی ساخت میں بھی عربی کا اثر پڑا ہے۔

ایک ذیلی امر جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ شمالی افریقا (مراکش، الجزائر، تونس) میں بولی جانے والی عربی میں علامت تعریف (ال) میں سے الف گر جاتا ہے۔ آج بھی مثلاً مراکش کے شہر الاغادات کو لکھتے اور بولتے Alghauat ہیں۔ ایک موجودہ عالم کا نام لکھتے اور بولتے Larbi ہیں، جو اصل میں ”العربی“ ہے۔ ایک اور فاضل Lahbabi ہیں جس سے مراد الحبابی ہوتا ہے۔ ایسی ہزاروں بلکہ اُن گنت مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جو عرب جنوبی فرانس میں آئے اور انہوں نے وہاں کی مروجہ لاطینی کو متاثر کیا، وہ بھی اپنی زبان میں علامت معرفہ کے ”ال“ میں سے الف گرا دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی میں علامت تعریف آئی تو وہ (IE) یا (L) بنی، اور اسپینی، اطالوی اور رومانش کی طرح (IL) یا (EL) نہ بنی۔ یہ حال اس زمانے کی لاطینی بولیاں عربی سے متاثر ہوئیں، اور ان کی صرف ونحو میں جن عربی چیزوں کا اضافہ ہوا، ان میں الف لام تعریف سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اور اب اسی پر ختم کرتا ہوں، واللہ اعلم بالصواب۔

(نذر مختار۔ مرتب مالک رام۔ مجلس نذر مختار۔ نئی دہلی ۱۹۸۸ء)

ادیبوں سے دُہائی!

ایک ادب شناس کے ہاتھوں چند ہندوستانی الفاظ کی
تختہ مشق بننے پر فریاد!

ہر زبان میں بہت سے ایسے لفظ ہوتے ہیں جو مختلف حالات میں غیر ممالک سے آکر اس زبان کی سرزمین میں بس جاتے ہیں۔ ”حقوق شہریت“ حاصل کرنے کے باوجود بھی اکثر ”غیر ملکی لفظ“ اپنی صورت شکل اور اپنے لہجے یا تلفظ کے باعث فوراً پہچان لیے جاتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی لغتوں میں ”غیر ملکی متوطن“ لفظوں کا ”شجرہ نسب“ بھی محفوظ رکھا جاتا ہے اور ان کی اس قدر سرگزشت بھی کہ وہ لفظ اپنے ”وطن“ میں کیا رنگ روپ اور مفہوم رکھتا تھا۔ وطن سے سیدھا ہمارے ہاں چلا آیا یا کہیں اور بھی آب و دانے کی کشش میں ٹھوکریں کھانی پڑیں اور اس کے رنگ روپ اور مفہوم پر اس سفر میں کیا کیا اثر پڑا۔



ہمارے پاس ابھی بزم ہائے موسیقی اور اجتماع ہائے سماجی سے اتنی فرصت کہاں کہ ادب دان و ادب آموز اس طرف توجہ کریں۔ اسی طرح شعر و سخن کی ظاہری چمک دمک پر سر دھننے کا ملک میں اتنا زور ہے کہ الفاظ کی نقاب کشائی کی طرف زبان و دان کو بھلا کیوں توجہ ہونے لگی۔ اسی لیے ایک ادب نا شناس کی ادیبوں کی خدمت میں بے ادبی اگر کسی معذرت کی متقاضی بھی ہو تو شہاب کے کوچہ سے کسی بسل کی آواز پر کسی راہ رو نیم

حکیم بلکہ اناڑی کا دوڑ جانا بھی ثواب کا کام ہونا چاہیے۔ اگر وہ خود کو کئی درماں نہ کر سکے تو کسی کو بلا تو سکتا ہے۔



ہندوستانی زبان کے کسی حقہ نواز (یا محقق) سے پوچھو کہ فقرہ کس زبان کا لفظ ہے تو وہ فقرہ کے قاف کا نہایت متانت سے تلفظ کرتے ہوئے اور الہ آباد میں مقیم ایک حیدر آبادی ”مورخ الفاظ“ سے استشہاد کرتے ہوئے بزرگانہ انداز میں ارشاد فرمائیں گے ”ہاں؟ آپ کو معلوم نہیں کہ یہ عربی لفظ ہے اور فارسی سے ہمارے پاس آیا ہے! بیچارہ عین وقاف کے تلفظ سے مرعوب ہونے والا ہے، بے زبان دکنی، زبان وراز اور چرب زبان مدعیان ”اہل زبانیت“ سے کہاں بحث کر سکتا لیکن اگر اللہ نے کسی کے سر میں بھیج دیا ہو، اور وہ ایک نہیں صرف ایک درجن زبانیں سیکھ لے تو پھر وہ بھلا ان یک لسان اہل زبانوں کی کیا پروا کرے۔



یہ کوئی مخران نہیں بلکہ اس لفظ کے حسب و نسب سے ایک واقف کا بیان ہے کہ لفظ فقرہ بدوی سے زرتشتی نہیں بنا بلکہ ایران ہی سے عرب آیا اور واپسی میں حاجی کی جو وضع بنائی تو سگے رشتہ دار بھی ان حضرات کو نہیں پہچان سکے اور وہ اسی سے خوش ہے۔ سینے یہ سفید پوش اور سفید رُو فقرہ صاحب کو جو اپنا نام فقرہ بتا کر نخرے کیا کرتے ہیں، ان کا نام ان کے والدین نے پہلوی میں ”نک رتہ“ رکھا تھا جس کو شاہ پہلوی کے ہمعصر نکرده (نہیں کیا ہوا) کہتے ہیں۔ اصل میں چاندی دو طرح کی ہوتی ہے ایک ”بنائی ہوئی“ یعنی سکہ اور ”دوسری نہیں بنائی ہوئی“ یعنی خالص چاندی اسی آخر الذکر کو ”نکرہ“ کہتے تھے۔ جس کو عربوں نے فقرہ لکھنا اور کہنا شروع کیا مگر اس سے مراد خالص ”اور نہ

بنائی ہوئی“ چاندی ہی ہوتی رہی چنانچہ فقہ کی مستند کتاب ہدایہ میں ”نقرة فضة“ کا محاورہ بھی کتاب البیوع میں برتا گیا ہے۔ ”فضہ“ بھی چاندی کو کہتے ہیں اور اس محاورہ کے معنی فقط یہ ہوں گے کہ خالص اور ”نکرہ“ چاندی۔ الفاظ کی ہجرت اور غیر مما لک میں جا کر اپنی اصل کو بھلا دینا جب آدمیوں میں ہوتا ہے تو پھر ان ”لب زادوں“ کو کیوں برا کہا جائے؟!



الفاظ کی اس ہجرت کے سلسلہ میں خود لفظ ”ہجرت“ کی بھی کچھ خبر لینی چاہیے۔ انسانوں کی نہیں بلکہ انسانوں کی آوازوں کی (جس کو الفاظ کہتے ہیں)۔ تاریخ سے دلچسپی اور واقفیت رکھنے والوں کا بیان ہے کہ عرب کے جنوب میں پرانے زمانہ میں ایک قوم بستی تھی جو ایک بولی بھی بولتی تھی۔ اسی کے کچھ لوگ ترک وطن کر کے مغرب میں گئے اور حبشہ میں بس گئے اور کچھ لوگ مشرق میں گئے اور بحرین وغیرہ میں بس گئے۔ انہی لوگوں کی بولی میں لفظ ”ہجر“ شہر کو کہتے تھے۔ چنانچہ حبشی زبان میں یہ لفظ پایا جاتا ہے اور بحرین کے قدیم پایہ تخت کا نام بھی ہجر ہے۔..... جس طرح مصر، قاہرہ، مدینہ، بلدہ، حیدرآباد، ہذا البلد الامین میں بیان شدہ بلد اور شہر روما کا معروف حرف URBS اُربس وغیرہ میں سے ہر لفظ کے معنی شہر ہی کے ہیں۔

قدیم مشہور لغت نویس الازہری کا بیان لسان العرب نامی لغت میں ملتا ہے کہ خود عربی میں بھی ابتداءً اس لفظ ہجر کا یہی مفہوم تھا۔ چنانچہ ہاجر (مصدر مہاجر ت و ہجرة) کے معنی ہیں خانہ بدوشی کو ترک کر کے کسی شہر میں جا بسنا یہی تہذیب کی علامت تھی۔ غالباً اسی لیے مسلمانوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ترک وطن کو بخیاں ادب ”ہجرت“ سے موسوم کیا کہ بری جگہ کو چھوڑ کر اچھی اور مہذب جگہ جا بسے۔ کس کو گمان اور اندازہ ہوگا کہ ایسا ہوا؟

پیارے سلیم مرحوم نے برق سے برقانا اور نرم سے نرمانا کا مصدر بنا لیا تو گڑگا جمنی لوگوں کے نزدیک ہندوستان کی ناکہ کھینچ گئی۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ عربوں نے ”گمان“ سے ”گمن“، ”تو نہیں البتہ“ ”غمن، گمن، گمنین“ بنا لیا..... آپ بھی روز کسی نہ کسی چیز کا تخمینہ کرتے ہوں گے۔

اسی طرح ”اندازہ“ سے ہندس یہندس ہندسہ فہو مہندس کر لیا۔ پیارے ہندی بہت دن سے اکڑ رہے تھے کہ علم ”ہندسہ“ کا نام بتاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی ایجاد تھی مگر واقعے اور قیاس میں وہی فرق ہوتا ہے جو تاریخ اور کہانی میں یا یورپ اور ایشیاء میں یا مغرب اور مشرق میں۔



ہاں بھلا آپ جانتے ہیں یہ یورپ اور ایشیاء کے الفاظ بھی آپ کے رشتہ دار ہیں؟ اب رشتے کا ہے کو یاد رہیں گے، ہم ٹھہرے صاحب بہادر اور یہ لوگ پیچارے دقیانوسی وضع کے۔ مگر پھر بھی عَلِمُ الشَّمْسِ خَيْرٌ مِنْ جَهْلِهِ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یورپ اور مغرب ایک ہی صاحب کا نام ہے جو کبھی داڑھی کے ساتھ مونچھ بھی منڈا کر سوٹ بھی پہن لیتے ہیں (اور بعض مقرر ان کی صورت سے دھوکا کھا کر اپنی تقریر میں ”جٹلمین“ سے پہلے ”لیڈرز“ کا لفظ بھی بڑھا لیتے ہیں اور کبھی مونچھوں کے ساتھ داڑھی بھی بڑھا کر جبہ پوشی بھی اختیار کر لیتے ہیں آپ شاید سمجھے نہیں؟ سنئے!

پرانے زمانے میں بائبل میں کچھ انسان نما جانور بستے تھے۔ (ہم بھی جانور ہی ہیں) وہ ان علاقوں کو جدھر آفتاب ڈوبتا تھا۔ شامیش اور پاکہتے تھے۔ عربی دان سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ الفاظ بگڑی ہوئی عربی میں ”شمس“ اور ”غروب“ ہیں۔ مطلب تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ بگڑی ہوئی عربی نہیں بلکہ بابلی زبان ہے جو بقول یورودیوں کے موجودہ عربی کی ماں ہی نہیں بلکہ نانی ہے۔ بابلی زبان میں ”غ“ نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس کا تلفظ ”الف“ ہی کرتے تھے۔ اور ”ب“ کو ”پ“ کہتے تھے..... آخر جانور ہی تو تھے۔

اسی طرح وہ ممالک جو آفتاب کے نکلنے کے رخ میں تھے، بابلیوں کی زبان میں ”شامیش آسیا“ کہلاتے تھے اسی آسیا اور یا کو انگریزوں کے بچوں نے ایشیاء اور یورپ کر دیا۔ ہم تو مقلد ہی ٹھہرے۔ یہ لفظ آسیا بھی جس کے معنی اٹھنے اور نکلنے کے ہیں۔ عربی میں پایا جاتا ہے اور عبرانی میں بھی چنانچہ آسی (سواسا) کے معنی ہیں۔ غم کو اٹھانا تسلی دینا، موسیٰ کے معنی بھی آپ جانتے ہوں گے۔ پانی میں سے نکالا ہوا ”مو“ اور ”ماء“ یعنی پانی ایک ہی لفظ ہیں۔ ہوں گے!



اچھا اب ان خشک باتوں کو جانے دیجیے اس سے تو خود اور نگ آباد کے لغت نویسوں کو بھی دلچسپی نہ ہوگی۔ ہاں ایک پیٹلی کا حل ہم آپ کو بتا دیتے ہیں کسی اُردو یا ہندوستانی کے مدعی مہارت پر ہاتھ صاف کر لینا۔

پوچھیے کیا ہماری زبان میں بھی جرمن اور فرنیچ کی طرح ایسے الفاظ ہیں جن کو مذکر پڑھیں تو الگ معنی ہوں اور مونث پڑھیں تو الگ؟

اگر وہ کہیں کہ نہیں تو پھر اپنا مندرجہ ذیل منتر پڑھنا شروع کر دیجیے:

گدھے کا کان نمک کی کان

پھولوں کا ہار انگریز کھلاڑیوں کی ہار اور ہماری جیت

قبر کا تعویذ گلہ کی تعویذ

اگر اس پر ناک بھوں چڑھائیں تو:.....

پنجابی کا ناک اور لکھنوی کی ناک

کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیجیے اور کہیے:

ہاتھ ملانا یا رکیوں کیسی کمی!

(ماہ نامہ شہاب - حیدر آباد دکن اکتوبر ۱۹۳۶ء)

حیدرآباد کی ایک تعلیمی جوبلی

مملکت آصفیہ کی موجودہ درسگاہوں میں سب سے قدیم سرکاری ادارہ دارالعلوم ہے جس کے قیام پر ۱۳۶۲ھ میں ۹۰ سال گزر چکے۔ یہ درس گاہ ملک کے نظام تعلیم کا مرکز رہی ہے اور اسی کے حصہ اعلیٰ نے پچیس سال ہوئے جامعہ عثمانیہ کا قالب اختیار کیا اور دارالعلوم کالج کو وہاں شعبہ دینیات قرار دیگر اولاً شعبہ فنون کا اور پھر رفتہ رفتہ سائنس، انجینئری، تعلیم المعلمین، طب، کلکاری وغیرہ کا اضافہ عمل میں آتا رہا۔

شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کے طلبہ جو بجا طور پر اپنے آپ کو جامعہ عثمانیہ کے سب سے قدیم اور سب سے اہم جزو کا نام لیوا سمجھتے ہیں، ہر سال اپنی درسگاہ کا یوم تاسیس مناتے ہیں۔ سال حال کی تعطیلات عید الاضحیٰ میں طلبہ قدیم و جدید نے اہل ملک کی ہمدردی و اشتراک عمل سے اپنی درسگاہ کا نو دسالہ جشن بڑی شان سے منایا۔ اس کا مختصر تذکرہ ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیے پیش کیا جاتا ہے:

خانوادہ آصفی کو تعلیم سے جو خصوصی دلچسپی ہے اس کا مظاہرہ اس جشن میں اس طرح ہوا کہ سلطان العلوم آصف جاہ سابع نے اپنے بھائی شہزادہ بسالت جاہ بہادر کو اس امر پر مامور فرمایا کہ جشن دارالعلوم کا افتتاح فرمائیں۔ شہزادہ موصوف نے علوم اسلامیہ اور ثقافت اسلامیہ کی عالمگیر اہمیت اور اس سے اہل زمانہ کی مجرمانہ غفلت پر مؤثر الفاظ میں توجہ مبذول کرائی اور فرمایا کہ حیدرآباد جو ہند میں اسلامی تحریکوں کا مرکز ہے اس بارے میں جو بھی اقدام کرے، وہ ضروری و بروقت بھی ہے اور اس کے شایان شان

بھی۔ اس جشن کے متعدد اجزاء وشعبے تھے۔

۱۔ خطبات علمیہ۔ اس میں تاریخ تعلیم اسلامی، تاریخ دارالعلوم، جامعہ عثمانیہ کے قیام کی اندرونی سرگزشت، شعبہ دینیات، جامعہ عثمانیہ کی پچیس سالہ کوشش، جدید طرز سے علوم اسلامیہ کی تحقیق و تعلیم وغیرہ شامل تھے۔ یہیں وزیر تعلیم کی زبانی حکومت آصفی کے اس ارادے کا نیم سرکاری اعلان ہوا کہ جملہ مسلم طلبہ کے لیے عربی لازم کر دینا حکومت کے پیش نظر ہے۔

۲۔ محفل عربی۔ ایک خصوصی نشست میں صرف عربی تقریروں، مقالوں اور نظموں کا انتظام کیا گیا تھا جو انتہائی کامیاب رہا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ نئی پود میں بھی بحمد اللہ عربی تعلیم کافی پائی جاتی ہے۔

۳۔ مظاہرہ تجوید کی خصوصی نشست، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں میں اپنے اس خاص فن کا ذوق روز افزوں ہے، فن تجوید پر بعض دلچسپ مقالوں کے ضمن میں قرأتوں کے مختلف اقسام کے عملی مظاہرے بھی کیے گئے، مثلاً قرأت سبعہ، قرأت عشرہ وغیرہ۔

۴۔ فارسی مشاعرہ۔ اس میں طرحی مصرع یہ تھا:

این چنین دارالعلومے کے دکن پیدا کند

سلطان الشعراء حضرت آصفیہ سابع نے بھی طرحی مصرع پر ایک غزل سرفراز فرمائی تھی۔

۵۔ فانوسی تقریروں میں ایک تقریر مناظر حجاز و بیت المقدس پر تھی اور دوسری دکن کی اسلامی تہذیب پر۔ دونوں بڑی سبق آموز اور دلچسپ رہیں۔

۶۔ نمائش ثقافت اسلامیہ، یہ نمائش پورے جشن کی جان تھی، صرف ایک ہفتہ کھلی رہنے کے باوجود ہزار ہا آدمیوں نے اس کا معائنہ کیا، جس میں ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے، آخری دنوں میں واقعہ نمائش گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔ پانچ پانچ ہزار اشخاص روزانہ آتے تھے۔

حال میں مدراس کی نمائش، کے حالات معارف میں چھپ چکے ہیں۔ حیدر آباد

کی نمائش بھی انہی کارکنوں کے زیرِ انتظام ہوئی۔ اس لیے اس کی تکرار کے بجائے اس نقش ثانی کی صرف بعض خصوصیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس نمائش میں فلکیات کا شعبہ زیادہ مکمل اور دلچسپ تھا۔ قسم قسم کی دھوپ گھڑیاں، دیسی ساخت کی قدیم دور بین جس کی سند سے معلوم ہوتا تھا کہ نواب آصف الدولہ حکمرانِ اودھ نے کسی کو عطا کی تھی، مختلف نمونوں کے اسطرلاب اربع لجیب، فلکیات میں مسلمانوں کی تحقیقاتوں کے حالات (مثلاً آفتاب کے داغ، قطر زمین کی پیمائش، انعطافِ شعاع، مدوجز کے وجوہ وغیرہ) جلی خط میں نمایاں کیے گئے تھے۔ ایک بہت بڑے نقشے میں کرہٴ سماوی اور ستارے بنائے گئے تھے اور ہر ستارے کا عربی اور انگریزی نام بھی لکھا تھا، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پانچاویں فی صدی نام عربی ہی کے مغربی زبانوں میں برقرار ہیں صرف تلفظ بگڑ گیا ہے۔

جغرافیہ میں ادریسی وغیرہ کے نقشہ ہائے عالم، علم ملاجی میں قسم قسم کے عربی جہازوں کے نقشے دلچسپ چیز تھے۔

مخطوطات کا شعبہ بہت اہم تھا، نادر کتب میں صحیفہٴ ہمام بن منبہ التونی ۱۳ھ خاص چیز تھی، اس کے علاوہ انجیل کا عادل شاہی دور کا فارسی ترجمہ جو ایک مسلمان عالم نے کیا تھا، پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے لکھے ہوئے نسخے، یاقوت مستعصمی، عماد، میر علی وغیرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں اور قرآن مجید، داراشکوہ و عالمگیر کے مخطوطہ قرآن، حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کے قرآن کا فوٹو جو ترکی حکومت نے شائع کیا تھا، حافظ ابن حجر وغیرہ مشاہیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں، ابن القیم کی نادر روزگار تالیف احکام اہل الذمہ (جلد اول چھ سو صفحوں میں تھی، اس کے اجزائے مابعد کا پتا نہیں)۔

سکوں میں بنی امیہ سے لے کر اب تک کے تقریباً ہر اہم اسلامی حکمران خانوادے کی نمائندگی ہوئی تھی۔ سبکتگین، بلبن، تغلق، شیرشاہ سوری، احمد شاہ ابدالی، بچہ سقہ، نادر خان و ظاہر خان نیز مختلف ممالک اسلامی (جاوا، مشرقی افریقہ، زنجبار، مسقط، عمان وغیرہ) وغیرہ وغیرہ کے سکے تھے۔

سیرۃ النبی کا شعبہ زیادہ اہم تھا، سو ڈیڑھ سو مقامات کے فوٹوؤں کے ذریعہ

ولادت باسعادت سے وفات تک کے حالات نمایاں کیے گئے تھے۔ اس میں غارِ حرا، غارِ ثور، بدر و طائف، اُحد و خندق، مناظرِ حج اور دیارِ حبیب کے فوٹو تھے۔

تاریخِ اسلام کے نقشے بھی دلچسپ تھے، عہدِ نبوی و خلافت راشدہ کے فتوحات کا پانچ رنگی نقشہ عالم، تیرہ سو سالہ فتوحاتِ اسلامی کا دس رنگی نقشہ، دنیا کی موجودہ اسلامی آبادیوں کا تفصیلی نقشہ تین رنگوں میں مع اعداد و شمار۔

اسلحہ کا شعبہ بھی اہم تھا۔ قسم قسم کی تلواریں اور دیگر اسلحے جن کے کام و استعمال کا ذکر ان کے نام تک سے اب نئی نسل بے خبر ہو گئی ہے۔ فاروقی سلاطین کی توپیں، اورنگ زیب وغیرہ کی تلواریں، حروبِ صلیبیہ کے زمانے کی تلوار، بہادر شاہ کی تلوار، آہن راجہ وغیرہ۔

تصادیر کے ذخیرہ نے قدیم و جدید استادوں کا بڑا جگہا پیدا کر دیا تھا جو خاص کر دکن کی تاریخی شخصیتوں کا مکمل مرقع کہا جاسکتا ہے۔

دکن کی ڈیڑھ دو صدی پہلے کی امیرانہ زندگی کے سامان، سنہری قالین، چاندی کی جڑاؤ کرسیاں، صوفے، میزیں وغیرہ۔

اس نمائش نے نوجوانوں میں ایک لہر دوڑا دی ہے اور انہیں اپنے گھروں کے سامانوں کی اہمیت کی جانب متوجہ کر دیا ہے کہ وہ کتنے ہی بوسیدہ اور خراب کیوں نہ ہوں، نہایت قیمتی اور قابلِ تحفظ ہیں۔

توقع ہے کہ یہ نمائش ان شاء اللہ جلد ایک معرضِ ثقافت اسلامیہ کی صورت میں مستقل میوزیم کی حیثیت اختیار کر لے گی، جس میں منظم اور باقاعدہ طور سے سامان تیار اور فراہم کر کے جمع کیا جایا کریگا جو تاریخ و تمدنِ اسلامی کے لیے ایک درس گاہ بن جائے گا، ابھی تو یہ خانگی کوششیں ہیں خدا کرے پروان چڑھیں۔

خطباتِ علمیہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مقالہ ”اصول فقہ“ پر رکھا گیا تھا، مگر موصوف کی آمد کی تاریخ میں خانگی وجہ سے تبدیلی ہو گئی۔ اس مقالہ کو رومداد جشن میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جشن کی طرف سے تذکرہ دارالعلوم کے نام سے ضخیم کتاب شائع ہو چکی ہے اور

سامان نمائش کی مفصل فہرست مشاعرے اور خطباتِ علمیہ کی طباعت کا کام شروع ہو چکا ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ برطانوی ہند کی قدیم ترین جامعات کلکتہ، مدراس، بمبئی کے قیام سے بھی ایک سال قبل دارالعلوم حیدرآباد کا افتتاح ہوا تھا اور غالباً ہندوستان کے غیر سرکاری اسلامی مدارس میں بھی اب کوئی اتنا قدیم موجود نہیں ہے۔
وللہ عاقبۃ الامور۔

(معارف اعظم گڑھ - فروری ۱۹۴۴ء)

سود

انجمن ہائے قرضہ بے سودی

”سودی مذہبی حرمت سے قطع نظر خالص دنیاوی حیثیت سے بھی سودی قرضوں نے مسرف مسلمانوں کو جس نوبت تک پہنچا دیا، اُسکے نتائج بالکل ظاہر ہیں، بعض کوتاہ نظر مسلمانوں نے مسلمانوں کو تباہ کن سودی قرضوں سے روکنے کے بجائے شرعی حیلوں سے سود کے جواز اور اس کی ترویج کو مسلمانوں کے اقتصادی زوال کا علاج تجویز کیا ہے، حالانکہ قوموں کی اقتصادی ترقی کا مدار سود خوری پر نہیں، بلکہ صنعت و حرفت اور تجارت کی اشاعت و ترقی پر ہے۔ گو بیشتر مسلمانوں کی تباہی کا سبب ان کا اسراف ہے، لیکن بعض حالات میں واقعی اور ناگزیر ضروریات ناچار مسلمانوں کو سودی قرض لینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس مجبوری کے پیش نظر خلافت راشدہ کے دور میں بیت المال سے حاجتمند مسلمانوں کی امداد اور ان کے قرضوں کا انتظام تھا، لیکن آج اس قسم کا کوئی اجتماعی نظام نہیں ہے اور بہت سے مسلمان ضروریات کے موقع پر سودی قرض لینے کیلئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ سب سے اول اس ضرورت کا احساس حیدرآباد میں کیا گیا، اور آج سے پچاس ساٹھ برس پیشتر وہاں بے سود کے قرض دینے والی انجمنیں قائم ہوئیں، یہ انجمنیں اتنی کامیاب ہوئیں کہ اب حکومت نے بھی

ان کی جانب سرپرستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ ذاکر حمید اللہ صاحب صدیقی نے ان انجمنوں کی روداد ہمارے پاس اشاعت کیلئے بھیجی، چونکہ اس کا تعلق عام مسلمانوں کے مفاد اور وقت کے ایک اہم مسئلہ سے ہے اور اس سے ان انجمنوں کے نظام اور ان کی کارگزاری پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کو عام مسلمانوں کے سبق کیلئے شائع کیا جاتا ہے۔ ”م“

رسالہ معارف جہاں علوم اسلامی کی بے بہا خدمت انجام دے رہا ہے، وہیں معاشرہ مسلمانان کی اصلاح میں بھی اسکی کارگزاری کچھ کم نہیں ہے، اسی آخر الذکر قسم کا ایک امر ناظرین سے عرض کرنا ہے۔

دنیاۓ اسلام میں ہر جگہ اور ہند میں خاص طور پر مسلمان افلاس اور فضول خرچی میں شہرت رکھتے ہیں، نتیجہ قرض داری ہے، وہ قرضداری جس سے مسلمان کم از کم پانچ دفعہ روزانہ نماز میں

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْمَآثِمِ وَالْمَغْرَمِ
خدایا۔ میں تیرے ہاں گناہ اور قرض سے پناہ چاہتا ہوں۔

کے الفاظ میں اظہار بیزاری کرتا ہے، لیکن یہ اظہار بیزاری بھی صرف لفظی ہو گیا ہے، عمل سے کوسوں دور ہے۔

انسانی معاشرے میں باہمی احتیاج قدیم سے ہے، اور انہی احتیاجوں میں سے ایک رقم کی عارضی ضرورت بھی ہے، کسی کے پاس فالتو رقم ہوتی ہے، اور کسی کو اس کا احتیاج، عام حالتوں میں یہ معقول تو ہے کہ فاضل رقم والا، اپنی قرض دہی سے کچھ نفع حاصل کرے، لیکن انسانیت بھی کوئی چیز ہے، اخلاقی فاضلہ کا بھی کچھ پاس ہونا چاہیے، بے بس محتاج کی امداد اس کا ہم جنس انسان نہ کرے تو پھر مخلوقات میں کس سے آس رکھی جاسکتی ہے؟!

یہی وجہ ہے کہ قدیم سے ہر مہذب مذہب نے ہر جگہ سود خواری کی ممانعت کی، اسلام نے تو اسے خدا و رسول سے اعلان جنگ کا لرزہ خیز نام دیا ہے۔

یہ سب سہی لیکن دنیا میں جب تک انسان کو آزادی ہے اس کی کم توقع کی جاسکتی ہے کہ تکلیف وہ نیکی پر بطور اکثر عامل ہو، اپنا روپیہ چاہے فالتو ہی ہو، دوسرے کو بے سودی قرض دے دینا، اور اس طرح ایک جو حکم مول لینا واقعی ایک تکلیف دہ نیکی ہی ہے، حکومت کے سوا عوام میں ایسے شاذ ہی ملیں گے، جو بے سودی قرض دے سکیں۔

اور تمام تمدنوں نے سود کی ممانعت جس حد تک کی ہو، لیکن اس کے اصل باعث پر توجہ نہ کی اسلام ہی وہ واحد تمدن ہے جس نے سود کی ممانعت کے ساتھ ساتھ اس کے استیصال کے وسائل مہیا کئے اور جیسا کہ عرض ہوا، قرضہ دینا اور سود سے دست برداری گوارا کرنا صرف کسی حکومت ہی کے لئے علی العموم آسان ہے، افراد عوام کے لئے نہیں، چنانچہ قرآن مجید نے اسے حکومت کے فرائض میں داخل کیا، اور حکم دیا کہ سرکاری آمدنی کا ایک حصہ قرضداروں کی اعانت کے لئے اٹھا رکھا جائے:

أَمَّا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ

عَلَيْهَا وَالْمَوْلَفَةُ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ

‘الْآيَةُ’

بے شک زکوٰۃ وغیرہ کی سرکاری آمدنیاں فقیروں مسکینوں، وصول کنندہ افروں، مولفہ القلوب، غلامی و قید سے رہائی اور قرضداروں کے لئے ہیں۔

چونکہ آیت کے شروع ہی میں فقراء و مساکین آچکے ہیں، اس لئے ان قرضداروں سے مراد نان شبینہ کے محتاج و فقیر نہیں ہو سکتے، بلکہ وہی کھاتے پیتے لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں عارضی طور پر قرض کی شدید ضرورت ہو گئی ہو۔

یہ امر قابل عرض ہے کہ اس آیت میں ”زکوٰۃ“ کی جگہ ”صدقات“ کا لفظ

استعمال کیا گیا ہے جو زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے، جس کی تشریح و تفصیل یہاں شاید غیر ضروری ہوگی۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں سرکاری خزانہ سے اہل حاجت مسلمان قرض حاصل کیا کرتے تھے، خود خلیفۃ المسلمین ضرورت کے وقت بیت المال سے قرض لیتے تھے، اور جب سالانہ یا ششماہی تنخواہ دیوان سے ملتی تھی تو اس کو ادا کر دیتے تھے۔

یہ سرکاری انتظام اگر جاری رکھا جاتا تو دنیاے اسلام میں سود خواری باقی ہی نہیں رہتی، حالیہ زمانوں میں اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ حکومتیں اتنی رعایا پروری کریں۔ مملکت اسلامیہ دکن صانہا اللہ عن الشمرور والفتن سے حالیہ زمانہ میں جہاں متعدد اصلاحی اقدام ہوئے ہیں، وہیں انجمن ہائے قرضہ بے سودی بھی ہیں، ان کی کچھ تفصیل یہاں پیش کرنے کی اجازت چاہی جاتی ہے۔

ابھی برطانوی ہند میں کوپریٹیو کی سودی انجمنیں قائم بھی نہ ہوئی تھیں کہ اس سے ایک نسل پہلے (اب سے پچپن، ساٹھ سال قبل) شہر حیدرآباد کے ایک دردمند مشائخ نے انجمن مؤید الاخوان قائم کی جو بانی انجمن کے لائق بیٹے مولانا سید محمد بادشاہ حسینی معتد مجلس علمائے دکن کی وجہ سے اب تک جاری اور روز افزوں ترقی کر رہی ہے اس انجمن کا اصول یہ رہا، کہ لوگ چرم قربانی اور دیگر خیراتی رقمیں اس ادارے کو دیدیا کریں، چھوٹی ابتداء کے باوجود اس انجمن نے اب دس پندہ ہزار کا سرمایہ جمع کر لیا ہے، اور اب تک پانچ چھ لاکھ روپیہ بے سودی قرض دے چکی ہے، یہ چھوٹی انجمن ہے لیکن والفضل للمقدم۔

اس اثناء میں مملکت آصفیہ میں اور بھی درجنوں انجمنیں بے سودی قرض کے لئے وقتاً فوقتاً قائم ہوئیں جن میں متعدد اب بھی باقی ہیں۔

انہی میں سے ایک کا تفصیلی ذکر کرنا مقصود ہے۔ محکمہ بندوبست و داخلہ حقوق اراضی (ٹل منٹ و لینڈ رکارڈ) کی انجمن امداد باہمی قرضہ بلا سودی نے چند ماہ ہوئے اپنا بیسواں سالانہ جلسہ کیا، اس میں بیان ہوا کہ بیس سال میں اس نے ایک لاکھ روپیہ

سے زیادہ کا سرمایہ جمع کر لیا ہے جس سے اب ماہانہ پانچ چھ ہزار کے جدید قرضے دیے جا رہے ہیں، اس کا اصول امداد باہمی ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ مثلاً دس آدمیوں نے ایک انجمن قائم کی۔ اور اس کا سو روپیہ کی مالیت کا ایک ایک حصہ خرید لیا، اور وعدہ کیا کہ ماہانہ ایک ایک روپیہ کی قسط ادا کی جائیگی، تا آنکہ سوا آٹھ سال میں پوری رقم ادا ہو جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے مہینے میں دس شرکاء سے دس روپے وصول ہوتے ہیں جو ایک یا زائد شرکاء کو قرض میں دیے جاتے ہیں، ادائی مثلاً بیس ماہ میں رکھی جائے تو ماہانہ آٹھ آنے قسط قرضہ میں وصول ہوتے، دوسرے ماہ میں دس روپے مزید رقم حصص میں اور آٹھ آنے قسط قرضہ میں وصول ہوتے ہیں، تیسرے ماہ علاوہ رقم حصص کے ساڑھے دس روپیہ کی قسط قرضہ آٹھ آنے سے کچھ زائد وصول ہوتی ہے اور اس طرح ہر ماہ آمدنی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ سوا آٹھ سال کے اختتام پر دس ہی غریب آدمیوں سے ہزار روپے جمع ہو جاتے ہیں جو شرکاء میں قرض کی صورت میں پھیلے ہوئے اور گشت کرتے رہتے ہیں اور محض اقساط قرضہ سے ماہ بہ ماہ اتنی رقم جمع ہو جاتی ہے کہ ضرورت مند شرکاء کی ضرورت پوری ہو جائے۔

نئے شرکاء بڑھتے رہتے ہیں، وفات وغیرہ سے کچھ خارج بھی ہوتے اور اپنی رقیں واپس بھی لیتے رہتے ہیں، لیکن اگر کارکن امانت دار ہوں تو انجمن کی ساکھ اور اس کا کاروبار پھیلتا جاتا ہے۔

انجمن کے لئے بھی کھاتوں اور کاغذ سیاہی وغیرہ کی ضرورت رہتی ہے، اس کی فراہمی کا انتظام یہ ہوتا ہے کہ شرکاء مثلاً ایک پائی ماہانہ مد محفوظ و صادر کے لئے ادا کرتے ہیں اور درخواست قرضہ پر بھی ایک آنہ یا مناسب محصول لگایا جاتا ہے، یہ رقم اتنی ہو جاتی ہے کہ کاروبار کے پھیلنے پر محاسب کی تنخواہ وغیرہ بھی ادا ہو سکتی ہے اور مد محفوظ قابل بازیافت رقموں کے لئے بھی کام دیتی ہے۔ مثلاً کسی کی وفات ہو گئی اور اس کی جمع سے زیادہ قرض وصول طلب ہے، اور اس کی ضمانت بھی اتفاقاً کافی ہوئی گئی ہے وغیرہ۔

ضمانت شخصی بھی ہوتی ہے اور مالی بھی، شخصی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک یا زائد

۱۔ اس وقت کا سکد رائج الوقت (مرتب)

اشخاص اقرار کرتے ہیں کہ قرض گیرندہ اگر رقم ادا نہ کرے تو وہ اپنی ذات و جائیداد سے ادا کر دیں گے، مالی ضمانت میں زیور، جائیداد غیر منقولہ وغیرہ ہوتے ہیں اور عموماً قرض کی مقدار سے ڈیوڑھی مالیت کے سامان قبول کئے جاتے ہیں تاکہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے جو کھم نہ رہے۔

قرض کی مقدار پر بھی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ایک حصہ لینے والا مثلاً زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو روپے تک قرض لے سکتا ہے اسی طرح ڈیڑھ سو کا حق ہونے کے باوجود کم آمدنی رکھنے مثلاً چہر اسی ہونے کی صورت میں احتیاطاً اسکی مقدار گھٹا سکتی ہے وغیرہ۔

اگر وقت واحد میں بہت سے قرض خواہ ہو جاتے ہیں تو درخواست کے تقدم، ضرورت کی شدت اور گنجائش کا لحاظ کیا جاتا ہے، عموماً مجلس انتظامی ہر مہینہ جلسہ کر کے طے کرتی ہے کہ اس مہینہ میں کن کن لوگوں کو کتنا قرض دیا جائے اس میں اگر بے جا پاسداری نہ ہو تو سب خوش رہتے ہیں۔

یہ اور دیگر انتظامی امور تجربے سے بھی معلوم ہو جاتے ہیں، تجربہ کار انجمنوں کے قواعد سے بھی علم ہو سکتا ہے۔ دفتر بندوبست کی مذکورہ انجمن میں اس وقت ایک ہزار شرکاء ہیں، ان میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، انجمن کے اخراجات کے باوجود بچت کے ذرائع سے اب اس کا محفوظ سرمایہ تین ہزار روپے کا ہو گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنا خرچ آمدنی سے زیادہ رکھے اور کمی کی تلافی قرضے سے کرتا رہے تو لقمان کی حکمت بھی اس کی مدد نہیں کر سکے گی اور وہ جلد یا بدیر تباہ ہو جائے گا، انجمن ہائے قرضہ حسنہ کا مقصد صرف ان لوگوں کی مدد ہے جن کے آمد و خرچ میں توازن ہو، لیکن اگر وقتی طور سے ان کو اتنی رقم کی ضرورت ہو جائے جو ان کی آمدنی سے فوری طور پر بچائی نہیں جاسکتی تو ان کو قرض دیا جائے۔

مسلمانان ہند سے اسراف کی عادت کو چھڑانے اور آمد و خرچ میں توازن پیدا کرنے کے لئے بہت سے ذیلی و تکمیلی وسائل کی حاجت ہے (علاوہ انجمن ہائے قرضہ حسنہ کے) فضول مراسم کا ترک کرنا، غیر ضروری مصارف میں تخفیف بلکہ ان کا ختم کرنا،

اور جیسا کہ مجلس علمائے دکن نے تجویز کیا ہے، اگر کوئی شخص اپنی سکت سے زیادہ محض دکھاوے کے لئے دھوم دھام سے کوئی تقریب کرے اور اس کے لئے سودی قرض حاصل کرے تو ایسی تقریب کا بائیکاٹ کرنا چاہئے۔ ہو سکے تو مجموعہ تعزیرات میں ترمیم کر کے مسرفانہ مراسم انجام دینے والوں اور قرض لے کر بیجا و غیر ضروری امور کی تکمیل کرانے والوں کو قابل دست اندازی جرم کا مرتکب اور قابل سزا قرار دینا ہوگا۔

بہر حال انجمن ہائے امداد باہمی بھی قرضہ بلا سودی نے حیدرآباد میں کافی مفید کام انجام دیا ہے اور اب وہ روز افزون وسعت حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ ساٹھ سال کا طویل اور جہادی دور ختم ہو گیا ہے، اب حکومت بھی ان کی سرپرستی کر رہی ہے۔ چنانچہ حکومت حیدرآباد نے حال میں لکھا ہے کہ ”حکومت سرکاری مالی دلچسپی کے ساتھ محکمہ بندوبست کے ملازمین کی انجمن کی ترقی کو نوٹ کرتی ہے اور اس انجمن کی خصوصیت یعنی کاروبار کے لیے سودی ہونے کے متعلق دیگر دفاتر کی انجمنوں کو بھی ترغیب دلاتی ہے، کیونکہ انجمن قرضہ امداد باہمی کا صحیح مقصد یہی ہے کہ کفایت شعاری کی حوصلہ افزائی اور اپنے ارکان کی خدمت ہو نہ کہ نفع اندوزی عمل میں لائی جائے۔“

(معارف اعظم گڑھ - مارچ ۱۹۴۴ء)

مکاتیب

(۱)

پاریس
۱۳ شوال المکرم ۱۳۷۰ھ

محترم جناب شاہ صاحب

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل شام کی ڈاک میں جون ۱۵ء کا معارف ملا، مسرت سے ورق گردانی کی، اردو املا کی تاریخ پر ایک عمدہ مضمون نظر سے گزرا، اس سے کئی وجوہ سے مجھے دلچسپی ہوئی، بلکہ عرصہ سے تمنا تھی کہ کوئی باہمت اہل علم ادھر توجہ کریں، موجودہ مضمون ”تقابلی المالیات“ کے لیے اردو دانوں کے حلقے سے باہر بھی خوش آمدید سمجھا جائیگا، اور میں یہاں ادارہ السنہ شرقیہ میں اسے روشناس کراؤں گا۔

لیکن یہ ایک وسیع مضمون ہے اور نہ صرف یہ کہ فاضل مقالہ نگار کو اپنی تلاش جاری رکھنی چاہیے، بلکہ ضرورت ہے کہ دیگر اہل علم بھی اپنے معلومات اور اپنی تحقیقات کے نتائج سے اس بحث کی تکمیل میں حصہ لیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ املاء کے ارتقاء میں تین پہلو خاص کر مؤثر ہوتے ہیں:

ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ سابق پروفیسر قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ دارالمصنفین اور معارف کے مخلص قدردانوں میں ہیں، وہ جہاں بھی رہتے ہیں معارف کو نہیں بھولتے چنانچہ وہ آجکل بیئرس میں ہیں وہاں بھی اس کو منگاتے ہیں، اردو املاء اور رسم الخط سے ان کو خاص دلچسپی ہے۔ اس پر انہوں نے کچھ کام بھی کیا ہے، اس لیے انہوں نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب لکچرار اردو کالج کراچی کے مضمون ”اردو املاء کی تاریخ“ کو بہت پسند کیا اور اس کے متعلق بعض مفید مشورے بھی دیے ہیں۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہم ان کا خط شائع کرتے ہیں۔ ”م“

۱۔ پہلے یہ کہ جب کوئی ”بولی“ (یعنی غیر علمی محض بولی جانے والی زبان) پہلے پہل ”لکھی“ (یعنی تحریری زبان) بنتی ہے، تو کچھ تو صحیح تلفظ کی تلاش میں ”مشق و خطا“ کو ناگزیر دخل ہوتا، اور ہمیں اختلافات املا سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور کچھ گاؤں گاؤں کی بولی الگ ہونے اور تلفظ میں باہم اختلاف ہونے کے باعث مختلف اہل قلم کے ہاں نہ صرف مختلف ادوار میں بلکہ خود ہم عصروں میں املا کی حد تک فرق ہوتا ہے اور دھتہ رفتہ بقائے اصلح کے طور پر کسی ایک جگہ کی بولی سب پر غالب آ جاتی ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ خود تلفظ میں مختلف اسباب سے ارتقاء یا فرق پیدا ہو جاتا ہے، بیرونی اقوام سے تماس، خاص کر غیر زبان بولنے والوں کے تلفظ کو بھی اس میں دخل ہوتا ہے، اول الذکر امر کے سلسلہ میں سہولت پسندی بھی ایک خاص رجحان ہے اسلیے اردو ہی نہیں ساری دنیا کی زبانوں میں (ھ) کی آواز غائب ہوتی جا رہی ہے مثلاً انگریزی میں اب (honour) کو ہانز کوئی نہیں کہتا۔ اگرچہ انگریزی میں اب بھی (H) کا تلفظ بہت کچھ باقی ہے، فرانسیسی میں اب (H) کا لکھنا تو بدستور ہے، مگر بولنا یا پڑھنا اب ساری زبان سے غائب ہو گیا ہے۔ اطالیوں نے تو حد کر دی ہے کہ اپنے حروف ہجا سے (H) کو حذف ہی کر دیا ہے۔ یہ چیز اردو میں بھی نمایاں ہے اور ہائے مخلوط کی مثالوں سے اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے مثلاً ساتھی میں تو ہ بولا جاتا ہے لیکن ہاتھ کا تلفظ اب عملاً صرف ہات رہ گیا ہے، ثانی الذکر کے سلسلہ میں شاید علاقہ بڑاڑ کا برار بن جانا انگریزی اثر کا نمونہ سمجھا جاسکتا ہے۔

۳۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی لکھی جانے والی زبان اپنا رسم الخط کسی نوبت پر بدل ڈالے تو نئے خط میں املا کو معین ہوتے ہوتے کافی عرصہ لگتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ترکی زبان اس کا ایک دلچسپ نمونہ ہے اور گزشتہ پچیس تیس سال میں نہ صرف املا میں بار بار تبدیلی ہوتی رہی ہے بلکہ خود تلفظ پر بھی اثر پڑ رہا ہے۔ اگر پرانے ترکی (عربی) خط میں چھوٹے حروف علت (زبر زیر پیش)

نہ ہونے سے تلفظ متاثر ہو رہا تھا تو اب لمبے حروفِ علت (آ، ای، او) غائب ہیں۔ علیٰ اور عالی ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں۔

اس سے قطع نظر غیر زبانوں کے الفاظ و اصوات کی تحریر ایک مستقل مسئلہ ہے۔ عربی زبان میں (پ ٹ چ ڈ ژگ) جن سے ہمیں روزمرہ سابقہ ہے نہیں ہیں، جب ہم نے اپنی بولی کو عربی خط میں لکھنا شروع کیا، تو یہ نئے حروف ایک دن میں نہ تو سو جھ سکتے تھے، اور نہ مقبول و مروج ہی ہو سکتے تھے۔

شاید محترم مقالہ نگار کو اس سے دلچسپی ہوگی، اکبری دور کے ایک ملیاری مؤلف زین الدین المعمری نے جب عربی میں تحفۃ الجاہدین فی اخبار الہتر گالین لکھی، تو انہوں نے بھی ملیار کے شہروں اور آدمیوں کے ناموں میں (ڈ) اور (ژ) وغیرہ کو (د) اور (ر) ہی لکھا، جیسا اس کتاب کے مخطوطوں میں نظر آتا ہے۔ اور لزبن کے مطبوعہ اڈیشن میں بھی اسکو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

ممکن ہے اہل علم اس کام کو بھی آگے بڑھائیں، جس میں ناچیز نے بھی حصہ لیا ہے، اور جس میں اس کی تلاش عمل میں لائی گئی ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں عربی خط میں لکھی جانے والی زبانوں میں مختلف غیر عربی آوازوں (پ ٹ ٹ وغیرہ) کو ادا کرنے کے لیے کیا نئے حروف یا علامتیں ایجاد کیں اور آیا ایک ہی آواز کے لیے مختلف مقاموں پر مختلف حروف تو نہیں برتے جاتے، اور ممکن ہو تو اس میں اتحاد و ہم آہنگی کا انتظام کیا جائے۔

جون کا معارف تو مل گیا، لیکن اپریل اور مئی کے پرچے غائب ہیں، جون کے پرچے میں جوشما ہی فہرست ہے، اس سے تو معلوم ہوا کہ دانستے کی نظم ”طربیہ ربانی“ کا مضمون جو بھیجا گیا تھا، وہ شاید اپریل میں چھپ بھی گیا، لیکن دیکھنے سے تاحال محروم رہا، معلوم نہیں ڈاک کے ان ڈاکوؤں کا کیا علاج ہے۔

مخلص

محمد حمید اللہ

معارف اعظم گڑھ۔ اگست ۱۹۵۱ء

اتوار ۱۲ ربیع الاول ۸۰ھ پارلیس

مخدوم و محترم سلام مسنون

رسالہ معارف کی جلد (۸۵) میں فاضل محترم اطہر مبارکپوری نے مسلسل دو قسطوں میں ”عرب و ہند کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات“ کے عنوان سے جدید دریافت و شائع شدہ نادر کتاب الذخائر والنہج للقاضی الرشید بن الزبیر پر تبصرہ فرمایا اور اقتباسات کا ترجمہ کیا ہے، فاضل مقالہ نگار کی دو چیزوں پر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ القاضی الرشید نامعروف نہیں ہے بلکہ محترم پروفیسر عبدالعزیز مبینی صاحب نے اس کا حال کئی کتابوں میں پایا ہے قصہ یہ ہے کہ ابن خلکان اور یاقوت نے جس القاضی الرشید کا ذکر کیا ہے اسکی وفات ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ میں ہوئی ہے اور ہماری کتاب کی اندرونی شہادت یہ ہے کہ اس کا مؤلف اس سے تقریباً ایک صدی قبل فوت ہو چکا ہے۔ ابن خلکان میں القاضی الرشید بن القاضی الرشید بن القاضی الرشید کا ذکر ہے میرا گمان ہے کہ ہماری کتاب پوتے کی نہیں بلکہ دادا کی ہے (لیکن دادا کے حالات نہیں ملتے) کتاب میں میرے دیباچے کے الفاظ کا یہی منشا ہے۔

اسی طرح وہ راجہ دھمی یا راجہ دھمی پر قطعی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہاں سے کیا پڑھنا چاہیے اور وہ کون ہے۔ میں نے بہ کثرت تحقیقی مقالوں کے حوالے دیے ہیں کہ وہ فضلا بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے اور نہیں بتا سکے کہ اس معرب لفظ کی اصل کیا ہے اور اس کا کس تاریخی شخص پر اطلاق ہونا چاہیے؟ اگر محترم مبارکپوری صاحب ان سارے مقالوں کو پڑھ کر ان کے دلائل کی تنقید کر کے کوئی فیصلہ صادر فرمائیں تو علم کی بڑی خدمت

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس خط میں قاضی رشید کے بارہ میں جس التباس کا اظہار کیا ہے اور اسکی تحقیق کی جانب قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کو توجہ دلائی ہے۔ اتفاق سے قاضی صاحب اس خط کی اشاعت سے پہلے ہی اسکے متعلق اپنی تحقیق لکھ چکے تھے جس کو اس کے ساتھ ہی اس نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔.....م'

ہوگی اور ایک دیرینہ بحث ختم ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ محض دعویٰ کافی نہیں، دلائل کی ضرورت ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی مرسلہ ایک پارہ تحریر کی مجھے حال میں کترن ملی ہے۔ مخدوم محترم فرماتے ہیں کہ مجھ ناچیز کی فرانسیسی سیرت نبویہ کا اردو ترجمہ ہونا چاہیے۔ یہ میری عزت افزائی ہے، لیکن ناظرین معارف سے عرض ہے کہ (۱) اگر مولف اپنی تحریروں کا ترجمہ بھی خود کرنے لگے تو اس کے تکمیل طلب اور تدوین شدنی کاموں کو کون تمام کرے؟ یوں بھی (۲) اس کتاب کا بڑا حصہ میرے ان مضامین کی نظر ثانی پر مشتمل ہے جو معارف وغیرہ میں چھپے ہیں اور پھر ”عہد نبوی کا نظام حکمرانی“ اور ”رسول اکرم کی سیاسی زندگی“ نامی کتابوں میں داخل ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں نظر ثانی اور ترمیم بھی ہوئی ہے اور بعض نئے ابواب کا بھی اضافہ ہوا ہے مثلاً فینانس، نظام فوج، ارتقاء سرحدات، مملکت و تقسیم صوبہ جات و اضلاع وغیرہ۔ کتاب بڑی تقطیع کے کوئی آٹھ سو صفحوں میں چھپی ہے۔ اس ضخیم ترجمے کے کام کو بہر حال کوئی انجام دینا چاہے تو میں یہ مدد ضرور دے سکتا ہوں کہ (بشرط حیات و صحت) ترجمے کی نظر ثانی کر کے یہ بتا سکوں کہ آیا کہیں مضمون سمجھنے میں کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔ ویسے متعدد تالیفوں کا کام فی الوقت جاری ہے اور ان کو چھوڑ کر ترجمے میں لگنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ چند سال قبل رسالہ معارف نے مجھ سے پوچھا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے کے نسخہ قرآن کی موجودگی کی کیا حقیقت ہے؟ اس پر میرا جواب بھی چھپا تھا کہ اس کا عکس لیکر زار روس نے چھاپا تھا اب سکی کچھ مزید تفصیلیں بھی ملی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس کا نسخہ برٹش میوزیم میں نہیں (جیسا کہ میں نے لکھا تھا) بلکہ ڈرہام یونیورسٹی میں ہے، میں نے اس کا میکروفلم منگایا ہے اگر آئے تو ان شاء اللہ کچھ تفصیل آئندہ عرض کر سکوں گا۔

مؤثر مستشرقین ماسکو پر ایک تبصرہ ارسال خدمت ہے۔

فقط نیاز مند محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۶۰ء)

پاریس-۲۳ اگست

محترمی! زاد مجدکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ وبرکاتہ

تہذیب جدید کا کرشمہ ہے کہ مئی ۱۹۷۲ء کا رسالہ معارف اب اگست کے آخر میں آیا ہے۔ اس میں امیہ بن ابی الصلت پر مقالہ شوق سے پڑھا۔ اگرچہ آخر میں ”باقی“ لکھا ہے لیکن اس کا کسے یقین کہ اسے دیکھنے کا موقع ضرور ملے گا۔ اسی لیے دو چیزیں جو ذہن میں گزریں، فوراً عرض کرتا ہوں۔

مقالہ کے شروع ہی میں (یعنی صفحہ ۳۲۵ کے حاشیے میں) لکھا ہے کہ زید ابن عمرو بن نفیل ”بعثت نبوی سے ۷۵ سال پہلے ہی مر گیا“ کیا ہند سے میں طباعتی غلطی ہے؟ یا مقالہ نگار نے تحقیق کے بعد لکھا ہے؟

بعثت نبوی چالیس سالہ عمر میں ہوئی۔ لہذا امیہ کو ولادت با سعادت نبوی سے پینتیس سال پہلے مر چکا ہونا چاہیے، لیکن میرے سامنے اس وقت الروض الانف للسہیلی (طبع اول) ہے، اس میں جلد اول کے صفحہ (۱۳۶) پر ہے:

روى البخارى عن ان	امام بخاری نے فلاں فلاں سے
النبي صلى الله عليه وسلم	روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے
لقى زيد بن عمرو بن نفيل	بلدح [پہاڑ] کے زیرین حصے میں
بأسفل بلدح قبل ان ينزل	زید سے ملاقات فرمائی اور اس وقت
على النبي عليه السلام	تک آپ پر وحی نازل نہ ہوئی تھی
الوحي الخ	 وغیرہ۔

اسی طرح سیرۃ رسول اللہ لابن ہشام میں ہے (طبع یورپ) اس کے صفحہ (۱۳۸ تا ۱۳۹) پر اس کی موت کے ذکر میں ہے کہ وہ دین حق کی تلاش میں موصل تک گیا، پھر شام آیا تو میفعہ کے مشہور راہب نے اس سے کہا، ”تو اسے یہاں کہاں ڈھونڈ

رہا ہے، وہ تو تیرے ہی ملک میں مبعوث ہوگا، اور اب اس کا وقت آچکا ہے۔ اس پر وہ تیزی سے مکہ واپس ہوا، مگر راستے میں قبیلہ لُحْم کے لٹیروں نے اسے مار ڈالا۔۔۔۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زید کی وفات بعثت نبوی کے بعد ہوئی۔

دوسرا قابل توجہ امر یہ ہے کہ بلاذری کی کتاب انساب الاشراف (مخطوطہ ہائے استانبول و رباط) کے اس حصہ میں جواب تک غیر مطبوعہ ہے، امیہ بن ابی الصلت کی سوانح عمری بھی ہے۔ اس میں یہ جملہ ہے:

وکان یہودیاً وہ یہودی تھا،

اس توضیح کے بعد اس کے اشعار میں توحید، فرشتوں وغیرہ کا ذکر آئے تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ قبیلہ لُحْم سے اس کا تعلق موالات کا ہوگا، نسل کا نہیں۔ خدا کرے آں محترم اب خیر و عافیت سے ہوں۔

نیازمند
محمد حمید اللہ
(معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۷۷ء)

(۴)

پیرس، ۲۶/رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون: عید مبارک

ابھی ابھی جولائی کا معارف پہنچا، ممنون ہوا۔

اس کے صفحہ ۱۷، ۱۸ میں ”عبداللہ بن عمرؓ“ غلط ہے، یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں، مرحوم شاہ معین الدین احمد صاحب نے یہ غلطی نہیں کی ہوگی۔
مرحوم کے بیان پر کہ ”بے شک ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

کتابت حدیث کی ممانعت کی تھی،، فاضل معاصر محمد مصطفیٰ الاعظمی کی یہ تحقیق ناظرین کی خدمت میں پیش کیے جانے کے قابل ہے کہ ممانعت کا حکم رسول اکرمؐ سے صحیح حدیثوں میں کہیں ثابت نہیں، صرف ایک حدیث حضرت ابوسعید الخدریؓ کی ہے، جو صحیح مسلم میں داخل ہوگئی ہے، لیکن ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بیان کیا ہے کہ امام بخاریؒ نے اسے بھی رد کر دیا اور خیال ظاہر کیا کہ یہ حضرت ابوسعید الخدریؓ کی ذاتی رائے ہے جو کسی غلطی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہوگئی ہے۔

اس خبر سے بھی مسرت ہوئی کہ سیرت شامی چھپ رہی ہے۔ خدا جلد مکمل کرائے۔

نیاز مند

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ - اگست ۱۹۸۱ء)

جولائی ۸۱ء کے معارف کے صفحہ ۱۸۷ پر کتابت کی غلطی کی وجہ سے حضرت ”عبداللہ بن عمروؓ“ کے بجائے عبداللہ بن عمرؓ چھپ گیا ہے، ہم جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس غلطی کی طرف مندرجہ بالا مکتوب لکھ کر توجہ دلائی، اس میں اور بھی ایک مفید بات لکھی ہے جو امید ہے کہ ناظرین کے لیے باعث دلچسپی ہوگی۔

(۵)

پیرس ۲۶ جمادی الآخر ۱۴۰۳ھ

مخدوم ومحترم زاد مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی شام کی ڈاک میں نوازش نامہ ملا، اور سرفراز کیا، چالیس پینتالیس سال ہو گئے، آپ سے دارالمصنفین میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، اور آپ کی نوازش اور مہمان نوازی بھولی نہیں، تب کی ملنساری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ہر وقت کی ہے، عظمکم اللہ وعافاکم،

آپ کی فرمائش سرائیکھوں پر، لیکن مستشرقین کی شکایت کے ادارے سے اس ناچیز کو بالکل اتفاق نہیں، اگر محترم علی میاں نے مجھ سے اس پر پیشگی گفتگو کی ہوتی تو میں ادب سے عرض کرتا کہ ایسا نہ کریں؛ ان میں سے ہر فرد پیشہ و رعنا اور دشمنی نہیں رکھتا اور جو اکا دکا رکھتا ہے، وہ اس طرح کی کانفرنسوں اور شکایت ناموں سے شدید تر دشمنی دکھانے لگتا ہے، (جیسا کہ کچھ دنوں سے یہاں نظر آ رہا ہے)۔

ہم اپنے بچوں کو انہی کے ہاں بھیجتے ہیں، اور اُن کے پُرزہ کاغذ (ڈاکٹری کی سند) پر اتراتے ہیں، پھر انہی کی شکایت کریں؟ اخلاق تو اس کی اجازت نہیں دیتے، وہ مسلمان نہیں ہیں، اُن سے توقع کرنا کہ وہ سو فی صد ہماری باتوں کی داد دیں، یہ عبث ہے۔ اُن کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں، اور تنقیدیں نہیں کرتے۔

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ وہ عام طور پر عدا اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے، وہ مخلص ہوتے ہیں، یعنی اپنے علم اور اپنی فہم کے مطابق تاثر لیتے اور بتاتے ہیں، اور گالی گلوچ کے ساتھ نہیں، خالص علمی انداز میں ان کو ان کی غلطیاں بتائیں تو عام طور پر فوراً مان لیتے ہیں۔ ایک تجربہ عرض کرتا ہوں، شاخت آنجمانی سے آپ ناواقف نہیں، ایک مرتبہ انقرہ میں امام سرخی کا جشن منایا گیا، پہلے شاخت صاحب کی تقریر تھی، پھر میری باری آئی۔ انہوں نے اپنی رائے بیان کی، اس سے پیشگی واقف ہوئے بغیر میں نے ان

چیزوں کی تردید کی، جشن کے صدر نے بعد میں مجھ سے بیان کیا کہ شاخت نے اپنی پڑھی ہوئی تقریر واپس مانگ لی اور بہت سے ترمیموں کے بعد دی، کہ آپ اسے چھاپ سکتے ہیں، یہی تجربہ مجھے اٹلی کے سب سے بڑے مستشرق ”لیوی ولا ویدا“ سے رہا۔ جزیہ اور ذمیوں سے دگنی چنگی کی وجہ سے میری بحث پڑھ کر مجھے خط لکھا، کہ تمہاری ان دلیلوں پر تو کوئی یہودی ربی بھی زبان نہیں کھول سکے گا۔

غرض اس ناچیز کی رائے میں ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان کی غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دور کریں ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لے کر، زیر بحث مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود ہی دُور ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز محنت چاہتی ہے تو زیادہ صحیح اور زیادہ مفید ہوگا۔

معارف میں ”خطبات بہاول پور“ کی تحلیل دیکھی، تمنا تو تنقید و تصحیح کی تھی، معلوم نہیں اس کا ۲۲ صفحوں کا غلط نامہ آپ کو ملا یا نہیں، کئی دفعہ کافروں کو بھی ”حضرت..... رضی اللہ عنہ“ لکھ ڈالا ہے۔

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں۔ حال میں سلمان صاحب یہاں آئے تھے، دعوت دی ہے، شاید آئندہ ماہ ڈربن جا کر دوبارہ ملاقات کر سکوں۔

نیاز مند

حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۸۳ء)

(۶)

پاریس ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ دوشنبہ

مخدوم و محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی ہفتے ہوئے عنایت نامہ مل گیا اور سرفراز کیا تھا۔ ”جشن سلیمانی“ کی آخری معلوم تجویز کے انجام کے انتظار میں جواب میں تاخیر ہوئی۔ معاف فرمائیں۔

کیا ایسے جشن شرعاً جائز ہیں؟

آج کل کے بحران فکری میں بعض مسلمان اور تو خود جشن میلاد نبویؐ کو بھی حرام قرار دے رہے ہیں اور واحد استدلال یہ کہ رسول اکرمؐ نے اس کا حکم نہ دیا، (جس میں ”خلق عظیم“ ہو تو کیا اس کی تواضع اجازت دے سکتی ہے، کہ وہ ایسا حکم خود اپنے متعلق دے؟) مگر یہ بھولے اس بات کو بھولتے ہیں کہ خود خدا نے اپنے حبیب کا یہ جشن شروع فرمایا اور ہمیں اطلاع دی کہ

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

اور مزید برآں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپؐ کے واسطے سے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ”وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ“ کیا اس سے بڑھ کر کوئی نعمت خداوندی ہو سکتی ہے کہ کسی امت اور نوع انسانی کے کسی معاشرے میں کوئی نبی بھیجے؟

حدیث صحیح ہے کہ ”العلماء ورثة الانبياء“ اس تحدیثِ نعمت کا موضوع بننے کا استحقاق کسی نبی کے بعد سب سے پہلے علمائے امت کو حاصل ہو گا۔ اور تحدیثِ نعمت کے طریقے غیر محدود ہو سکتے ہیں۔

جشن سلیمانی:

عصر حاضر میں، خاص کر ہمالیہ تلے کے براعظم اور اردو زبان میں مرحوم سید سلیمان ندویؒ نے دین اور علم کی اتنی خدمت کی ہے کہ اس کے مماثل کسی اور نے شاذ ہی کی۔ ان کے مستفیدین اور انکا احترام کرنے والے شکرگزار دیگر مقاموں کی طرح پارلیس میں بھی بہ کثرت ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرحوم نے ایک بار اس سرزمین فرنگ کو اپنی آمد سے شرف بھی بخشا تھا، یہ بھی معلوم ہوگا کہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے سے جامعہ پارلیس میں اردو کی تعلیم کی کرسی قائم ہے اور گارسس دتاسی سے لے کر اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، (پارلیس میں اردو کی کرسی کے قیام کا فرانسیسی فرمان شاہی مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۸۳۰ء کا موجود ہے۔)

جشن صد سالہ:

مولانا مرحوم کی ولادت دہسہ میں، خاندانی روایات کے مطابق، جمعہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کو ہوئی اور ان کے دادا کی طرف ایک تاریخی قطعہ منسوب ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں۔

بگفتا کہ بے داد شد مصرعے شدہ مہر تاباں ز برج کمال

اس کی معادل تاریخ نہ معلوم کس نے (سہو) ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء بتائی اور وہ یہاں تک پھیلی کہ مرحوم کے مراد تک پر کندہ کرا دی گئی۔

فرنگیوں نے دو تین سو سال سے تقابلی جدولیس شائع کرنی شروع کی ہیں جن میں بھری اور عیسوی معادل تاریخیں درج ہوتی، اور آسانی سے ڈھونڈھی جاسکتی ہیں۔ ایسی قدیم ترین کتاب لاطینی میں ہے اور اب ہر بڑی فرنگی زبان میں موجود ہے اور اسی کی نقل عربی اور اردو (اور شاید فارسی اور ترکی میں بھی) میں ہوئی اور ان ساری غلطیوں کی حامل جو فرنگی جدولوں میں ہیں۔

بات یہ ہے کہ ان میں گزشتہ چودہ سو سال کے ہر مہینے کی رویت ہلال کو حساب

کر کے معلوم کرنے کی جگہ ایک من گھڑت اصول فرض کر لیا ہے کہ محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ، رجب، رمضان اور ذی القعدہ ہمیشہ ہمیشہ تیسے ہوتے ہیں اور صفر، ربیع الآخر، جمادی الآخرہ، شعبان اور شوال ہمیشہ اسیسے ہوتے ہیں، اور ذی الحجہ حسب حساب کبھی اسیسہ اور کبھی تیسہ ہوتا ہے۔

بچہ بچہ بھی جانتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے، رمضان مثلاً کبھی اسیسہ ہوتا ہے تو کبھی تیسہ، کبھی کئی مہینے مسلسل اسیسے اور کبھی مسلسل کئی مہینے تیسے بھی ہوتے ہیں۔

ان حالات میں ان فرنگی جدولوں پر کامل اعتماد نہیں ہو سکتا، ایک، دو یا تین دن کا فرق ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابھی نیچے مرحوم کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں عرض ہوگا۔

بہر حال ان فرنگی جدولوں کے مطابق جمعہ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ کی معادل تاریخ جمعہ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۴ء ہے (۲۲ نومبر نہیں)۔ تاریخ وفات اتوار ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو ہوئی جو پاکستانی رویت ہلال کے مطابق ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ تھی، (لیکن فرنگی جدولوں کے مطابق اتوار کو ۱۵ ربیع الاول تھی، اور ۱۴ کو سنچر کا دن تھا)۔

افسوس ہے کہ ۱۳۰۲ھ میں کسی کو خیال نہ آیا کہ مرحوم کی ولادت کا صد سالہ جشن منایا جائے۔ اب فرنگی صدی کے سوا چارہ نہیں۔

پارلیس کی تقریبیں:

۱۔ حکومت فرانس نے ابھی کوئی سال ڈیڑھ سال سے سیاسی مصلحت کے تحت سرکاری ٹیلی وژن میں ہر اتوار کی صبح کونو سے سوانو بجے تک پندہ منٹ مستقل طور پر ”اسلامی اشاعت“ (Emission Islamique) کے لیے دے رکھے ہیں، اس کا سہرا مستشرق پروفیسر ٹراک برک (Jaques Berque) کے سر ہے، جو صدر جمہوریہ موسیو میترا کے پرانے شخصی دوست ہیں، اس کی سربراہی کے لیے مقامی مسلمانوں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے، میں نے اسکے صدر اور معتمد سے عرض کیا کہ ایک اشاعت مرحوم سید سلیمانؒ کے لیے مختص کی جائے، انہیں کچھ تفصیلیں بھی دیں کہ مرحوم کا علمی کارنامہ کیا ہے، اور ٹیلی وژن کی ضرورتوں سے مرحوم کے مزار کے کچھ فوٹو (جو مولانا غلام محمد صاحب کراچی

کا تحفہ تھے) نیز مرحوم کی چند کتابوں کے سرورق کے عکوس بھی مہیا کیے، یہ عرض قبول کی گئی، اور اتوار ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو یہ اشاعت عمل میں آئی، اس میں مطلوبہ دو ایکٹروں میں ایک پروفیسر عبدالغفور فرہادی رواں صاحب (سابق وزیر و سفیر افغانستان) تھے، اور دوسرے سالار الدین محمد صاحب تھے، جو کتب خانہ السنۃ شرقیہ میں ایک فہرست نگار ہیں اور کاریکال کے باشندے۔

۲۔ اسی دن دوپہر کو پارلیس کے محلہ اسلامن گراڈ کی مسجد میں بھی یہ جشن ہوا، جو نمبر ۳۹ شارع طنجہ پر واقع ہے اور وسعت کے لحاظ سے یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے کہ کوئی تین ہزار آدمی بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ پارلیس میں رابطۃ الطلاب الاسلامیین ایک انجمن ہے، جو تیس اکتیس سال سے قائم ہے، وہ ہر اتوار کو ایک لکچر کراتی ہے عربی میں ہو تو اس کا فی الفور فرانسیسی ترجمہ ہوتا ہے، فرانسیسی میں ہو تو عربی ترجمہ۔ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند، اولاً قرآن خوانی اور فاتحہ ہوئی۔ پھر میں نے تقریباً دو گھنٹے اپنے معلومات فرانسیسی میں برجستہ عرض کیے، جن کا آدھا وقت عربی ترجمے میں صرف ہوا، اس کے بعد حاضرین نے جو بہت متاثر تھے، سوالات بھی کیے، اور تو شکس چاہیں۔ ا

۳۔ اس کے چند دن بعد دسمبر کے آغاز میں، اس کے لیے یہاں کی ”ترکی“ مسجد میں ہندی پاکستانی جلسہ ہوا۔ انگلستان میں عالمگیر اسلامی مشن نامی ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے، اس کی ایک شاخ پارلیس میں بھی دو چار سال سے قائم ہے۔ ان احباب کو یاد دلانا پڑا کہ سلیمان ندویؒ کون تھے، کب تھے، پھر ان کی فرمائش کی تعمیل کرنی پڑی، اولاً آدھ گھنٹہ حاضرین نے قرآن خوانی کی، پھر وہاں اردو میں اس موضوع پر لکچر ہوا۔

۴۔ اب پارلیس میں ایک جگہ تیرہ یونیورسٹیاں قائم ہو گئی ہیں، ان میں سے ایک میں اردو کے استاد محمد عبدالماجد صاحب ہیں، انہوں نے جامعہ میں اس تقریب کا اہتمام کیا اور ۱۲ دسمبر کو ٹھیک صد سالہ سالگرہ کے دن ان کے شعبے میں فرانسیسی تقریریں ہوئیں، خود ان کی بھی اور ایک میری بھی۔ میں نے خاص کر اس پر زور دیا کہ مرحوم کے ہاں اچھ بہت تھی اور نئے نئے نادر موضوعوں پر کام کرتے تھے، مثلاً قدیم مسلمانوں کے ہاں

اندھوں کا خط، جغرافیہ قرآن، تحریری تدوین حدیث، انجیل برنابا، نظریہ ارتقاء، ملک حبشہ میں ایک اسلامی مملکت، روس میں اسلامیات کی تعلیم، جاپان کا نظام تعلیم وغیرہ وغیرہ، زمانہ طالب علمی میں سیرت عائشہؓ لکھی جو بعد میں اب تک بلا ترمیم شائع ہوتی رہی ہے، اور بڑی مستند کتاب ہے، انہیں اسلامی دستور سے بھی دلچسپی تھی۔ مسئلہ خلافت کے سلسلے میں ہندوستانی وفد میں لندن بھی گئے اور مکہ معظمہ کی کانفرنس میں بھی شریک رہے۔ وہ عربی کے خطیب تھے، انگریزی ہی نہیں عبرانی بھی جانتے تھے۔ کتابیں دس بیس لکھیں تو مقالے سیکڑوں۔ وسعت قلب کا یہ عالم تھا کہ خفی تھے، لیکن سوانح عمری لکھی تو امام مالکؒ کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبیؐ کی پانچ جلدیں ہیں، جو اردو زبان کا مایہ ناز ہیں، ہنوز ناتمام ہی تھی کہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

۵۔ پاریس میں جامعات کے ساتھ ایک مستقل ادارہ ہے ”بین الممالک معاملات کی تحقیق“، اس میں معلومات اور دستاویزیں جمع کی جاتی ہیں، اس نے بھی مرحوم سے دلچسپی لی ہے اور توقع ہے کہ آئندہ چند ہفتوں یا مہینوں میں اس کے ہاں بھی معادلہ کچروں میں (جو ہر پیر کو ہوتے ہیں) ایک سید صاحب مرحوم کی تقریب کے لیے بھی ہوگا۔ واللہ المستعان۔

(ڈاکٹر) محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ - مارچ ۱۹۸۵ء)

۵ جنوری ۱۹۸۶ء

مخدوم و محترم مد فیہکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل شام ستمبر ۱۹۸۵ء کا معارف ملا۔ رات کو ورق گردانی کی، سب ہی مضامین دلچسپ ہیں۔ بارک اللہ۔

(۱) درافت کا مضمون ابھی مکمل نہیں ہوا ہے، احتیاطاً ایک چیز کا ذکر کرتا ہوں۔ گوئن برگ (فوت ۱۳۶۸ء) فن طباعت کا موجد مانا جاتا ہے۔ حال میں مجھے پتا چلا کہ پانا (آسٹریا) کے کتب خانہ عام میں ایک کلا قرآن مجید کا موجود ہے۔ جو گوئن برگ سے پانچ سو سال قبل سلجوتی دور میں (غالباً مصر میں) چھپا ہے۔ اور یہ تاریخ فرنگی محققوں نے بیان کی ہے۔ آسٹریا کو فوراً خط لکھ کر اس کا فوٹو منگایا۔ واقعی قابل دید اور قابل ذکر چیز ہے۔ میں اسے اپنے فرانسیسی مقالے ”تاریخ خط عربی“ میں چھاپ بھی رہا ہوں۔ اطلاعاً عرض ہے۔

(۲) یہ سب جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ سے واپسی پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسایہ سلاطین کو تبلیغی خط لکھے۔ یہ خط ۱۱ھ کے اواخر کا واقعہ ہے، اس میں دو نکتوں کو توجہ دلانے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(الف) اس پر سال رواں میں ۱۴۰۰ سال گزر رہے ہیں۔

(ب) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ایک وقت تین براعظموں پر اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو وسعت دی، یورپی حکمران ہرقل، ایشیائی حکمران کسریٰ پرویز اور افریقی حکمران اصحمہ نجاشی کو خط لکھے۔

(۳) شاید یہ بھی کہ صلح حدیبیہ کو قرآن مجید نے فتح مبین اور نصر عزیز کا نام دیا ہے، حضرت عمرؓ جیسا فرد بھی اس وقت اس کو سمجھ نہ سکا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر تشویش سے پوچھا تھا۔ یہ اہانت آمیز صلح کیوں؟ حضورؐ نے راز کو فاش

کرنا نہ چاہا، امام شمس الائمہ سرخسی نے اپنی کتاب المبسوط اور شرح السیر الکبیر میں اسکا راز بتایا ہے کہ یہ خیبر کی مجوزہ مہم کے وقت قریش کی غیر جانبداری و ناظرنداری کے حصول کے لیے تھا۔

ناچیز

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ - فروری ۱۹۸۶ء)

(۸)

مخدوم و محترم طول اللہ عمر کم و کثر فینا امثالکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کرم نامہ ملا۔ سرفراز کیا۔ یہ معلوم کر کے دلی صدمہ ہوا کہ نصیب دشمنان آپ کی صحت اچھی نہیں ہے اور آنکھوں پر عمل جراحی ہوا ہے۔ خدا جلد صحت کامل عطا فرمائے۔
میں معارف کا ادنیٰ ناظر ہوں۔ دل میں اس کا احترام بہت ہے، چونکہ وہ مرجع انام ہے اور لوگ اب بھی، آئندہ بھی اس سے استناد کریں گے۔ اس لیے کبھی کوئی بات کھٹکتے تو اطلاع دیتا ہوں کہ میری غلطی سے آپ مجھے آگاہ فرمادیں۔ اور بس۔
حفظکم اللہ وعافاکم

نیاز مند دیرینہ

محمد حمید اللہ، پیرس

۱۰ جمادی الآخرہ ۱۴۰۷ھ

(معارف اعظم گڑھ - مارچ ۱۹۸۷ء)

پاریس - یکم رمضان ۱۴۰۷ھ

مخدوم و محترم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

موقر رسالہ معارف کا شمارہ جنوری ۱۹۸۷ء ابھی ابھی آیا تو ورق گردانی سے استفادہ کیا۔ خاص کر پروفیسر عبدالرحمن مومن صاحب کا مضمون بہت ٹھوس ہے۔ اسی شمارے میں صفحہ ۴۸ پر درج ہوا کہ:

”حمید اللہ صاحب نے مجموعۃ الوثائق السیاسیہ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عمرو بن حزم کے صاحبزادے کی ولادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے دو برس قبل ہوئی تھی۔ یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ مورخین بالاتفاق یہ تحریر کرتے ہیں کہ آپ کو ۱۰ھ میں نجران کا عامل بنا کر بھیجا گیا تھا اور بچے کی ولادت نجران میں ہی ہوئی تھی۔“

ہوگا۔ لیکن مورخین کا ”الاتفاق“ تحریر کرنا اس لیے صحیح نہیں کہ میں نے ابن عبدالبر کی الاستیعاب کی ایک روایت یہاں نقل کی، اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔

صاحب مقالہ اگر الوثائق السیاسیہ کا پانچواں ایڈیشن سامنے رکھتے تو ان کے مضمون کے لیے مزید معلومات بھی ملتیں۔ وہ کراچی کے رسالہ ہمدرد اسلامیکس جلد ۵، شمارہ ۳-۱۹۸۲ء ص ۶۳ اور وہاں بالقصور مضمون سے بھی ناواقف نظر آتے ہیں۔ اسی طرح الاکوع الحوالی کی تالیف الوثائق السیاسیہ البیہیہ، طبع بغداد ۱۹۷۶ء ان کے لیے مفید ہو۔

ناجیز

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ - مئی ۱۹۸۷ء)

۱۳ صفر ۱۴۰۸ھ

مخدوم و محترم زاد فیہکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کرم نامے نے سرفراز کیا۔ حفظکم اللہ و عافاکم
معارف کی میرے دل میں بہت عزت ہے، وہ ہمارے تاریخ حال کا مستقبل
میں ایک وثیقہ، ایک ماخذ ہوگا۔ اسی لیے اس کے مندرجات کے متعلق آپ کو اکثر
تکلیف دیتا، بلکہ دل دکھاتا رہتا ہوں۔ التجا ہے کہ یہ قصور معاف کر دیں کہ مقصد رنجیدہ
کرنا بالکل نہیں۔

اس وقت اگست ۱۹۸۷ء کا معارف مکرر دیکھ رہا ہوں، معلوم نہیں عماد الدین
خلیل صاحب کا قصور ہے، یا فاضل مترجم کا کہ صفحہ ۹۳ پر بواتیہ لکھا ہے، کیا ہم یہ نام بھی
بھول گئے ہیں؟ Poitiers جس کا اردو تلفظ ہوگا پواتیہ۔ اسی طرح صفحات ۹۳، ۹۴، ۹۵
کے حواشی میں محمد اسد لیوپولڈ ویلس چپا ہے، یہ Weiss وایس ہونا چاہیے۔ (آسٹریا کی
یعنی جرمن زبان کا نام ہے) وہی لفظ جو انگریزی میں White / سفید ہو گیا ہے (صفحہ ۱۰۲
پر فرانسیسی نو مسلم Etienne Dinet کا نام استین ڈینید کو میں ”اے تھین دینے“ لکھوں گا۔
صفحہ ۱۰۳ پر اطالوی کیتانی Caetani کا تلفظ کاے تانی ہے اسی صفحے پر ہالینڈی ہیر گرنجہ
Hurgranje کا تلفظ میں نے خود ان کی زبان سے، ان کے گھر میں، ان کی بیوی اور بیٹی کی
موجودگی میں ہو کر دینے سنا ہے، ہالینڈی میں (G) کا تلفظ (خ) اور (j) کا (ی) ہوتا
ہے، آخر میں صفحہ ۱۰۶ پر فہاوزن جو جرمن ہے، (Wellhausen) اردو میں ویلہاوزن ہونا
چاہیے، اس میں (W) انگریزی کے (V) کی طرح ہے، لیکن جو اردو میں نہیں پایا جاتا ہے
قریب تر آواز اردو میں (واو) کی سی ہے۔

آپ دلی تشریف لے گئے تھے، محترم کرم فرما مالک رام صاحب ایک نیا
ارمغان نکالنے والے تھے، معلوم نہیں آپ کو خبر ہے یا نہیں، اور یہ کہ وہ کس مرحلے میں؟

(لکھ دیا جواب کا انتظار نہیں اس کی زحمت نہ فرمائیں) ڈاکٹر زور مرحوم کے متعلق عرض کرونگا کہ انہیں اللہ جنت نصیب کرے، رفیق تو تھے، لیکن ان کے اختصاص یعنی اردو ادب سے مجھے لگاؤ نہ رہا، اس لیے واقفیت بھی کم ہے، آپ کا فرمانا سر آنکھوں پر۔ ایک محدث ابو محمد عبداللہ بن محمد بن زیاد السندی کے حالات کی سخت تلاش ہے، بہ ظاہر چوٹی صدی ہجری کے ہیں، ابن حجر کے یہاں بھی ذکر نہیں ملا، اسلام آباد سے بھی نفی میں جواب آیا ہے۔ واللہ المستعان۔ حفظکم اللہ وعافاکم۔

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ۔ دسمبر ۱۹۸۷ء)

(۱۱)

پاریس، فرانس

۳۰ جولائی ۱۹۸۸ء، ۱۶ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ

مکرم و محترم معنا اللہ بطول حیاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جولائی کا شمارہ جولائی ہی میں پہنچ گیا، ممنون و مسرور بھی ہوا اور ششدر بھی، جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ شاید جلد بازی کے باعث مجھ سے ہی غلطی ہوئی تھی، مگر غلطی کی اصلاح ہو جائے تو اچھا ہے،

صفحہ ۵۶/۱۵ میں چھپا ہے ”ہے کے غزوہ خندق“ یہ ”خیبر“ ہونا چاہیے۔

صفحہ ۵۹/۱۵ ”اُن دن“ کیا یہ ”اُن دنوں“ نہیں ہونا چاہیے؟

صفحہ ۶۰/۱۵: ”اس سے انتقام لینے کا حکم دیا“ واضح نہیں، کہنا یہ ہے:

”اس کا انتقام لینے کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔“

نیا زمند: م ح ۱

(معارف اعظم گڑھ۔ اگست ۱۹۸۸ء)

پاریس، فرانس

۱۳ محرم ۱۴۰۹ھ

مخدوم و محترم زاد فیہمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہفتہ عشرہ ہو گیا، کرم نامہ ملا تھا، عمر کا بہانہ بناؤں تو بھی قصور وار بہر حال ہوں کہ جواب فوراً نہیں دیا، والعذر عند کرام الناس مأمول، معاف فرمادیں۔

آپ کو زحمت دی تھی، دلی شکریہ کہ آپ تصحیح شائع فرما رہے ہیں، ہمارے آثار قلمیہ کی عمر ہم سے زیادہ ہوتی ہے، الا ماشاء اللہ، معارف ایک مستند رسالہ ہے، اس میں سہو ای سہی، غلطی ہوئی ہو تو اس کی تصحیح ایک علمی فریضہ ہے، علمی رسالوں کے نئے سے زیادہ پرانے نمبروں سے اہل علم استفادہ کرتے ہیں۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ جب بھی کوئی اپنی دانست میں اہم چیز ذہن میں آتی ہے تو میں معارف ہی کا توسط ڈھونڈتا ہوں، میرے تجربے میں عنوان کام کا تین چوتھائی حصہ ہوتا ہے، مواد کا جمع کرنا بیس فی صد اور تدوین پانچ فی صد، لیکن عنوان حسب طلب ذہن میں نہیں آتا یہ بہانہ نہیں حقیقت ہے، اور کیا عرض کروں؟

حفظکم اللہ وعافاکم

(م ح)

مکر۔ ان دنوں اتفاقاً دسمبر ۱۹۵۹ء کا معارف ہاتھ میں پڑا، اس میں اس ناچیز کے فرانسیسی ترجمہ قرآن کی تاریخ بھی ہے، وہ پہلا ایڈیشن تھا، آپ کو یہ سن کر مسرت ہو گی کہ اب ۱۹۸۸ء میں الحمد للہ اس کا پندرہواں ایڈیشن مطبع میں ہے۔ اس دفعہ ناشر اس کے ایک لاکھ نسخے نکالنا چاہتا ہے۔ مانگ بہت ہو گئی ہے، خاص کر سیاہ افریقہ میں۔

(معارف اعظم گڑھ - اکتوبر ۱۹۸۸ء)

۱۔ ان سطروں کی کتابت ہو چکی تھی کہ مکتوب نگار کا اس پر مقالہ بھی آگیا جو ان شاء اللہ آئندہ شمارہ میں شائع ہوگا۔

منگل ۱۹ رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ

مخدوم و محترم محمد عارف عمری صاحب زاد فیہکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپریل رواں کے معارف میں عبد بن حمیدؒ پر آں محترم کا مقالہ پڑھا۔ ماشاء اللہ

حق تحقیق ادا کیا گیا ہے۔ جزاکم اللہ فی الدارين خیرا۔!

کیا یہ ناچیز آں محترم کو ایک زحمت دے سکتا ہے؟

استانبول میں ایک مخطوطہ ہے کتاب السرد والفرد فی صحائف الاخبار

ونسخها من سید المرسلین، مما الفہ ابو الخیر احمد بن اسمعیل القزوینی۔

یہ کوئی ۵۰۰ھ کے ایک نامعلوم مولف ہیں اور اپنی اسناد میں ایک ابو محمد عبد اللہ بن محمد

بن زیاد السندی کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا خاص کر آخر الذکر کا آپ کو کوئی پتا چلتا ہے؟

کتاب کے آغاز میں ہے:

اخبرنا ابو محمد الموفق بن سعید الموفق

النيسابوري بقراأتی عليه فی جمادی الاولى سنة

اربع وثلاثین و خمسمائة وأبو نصر محمد بن

۱۔ ایک ادنیٰ طالب علم کے حقیر مضمون کی ڈاکٹر صاحب جیسے تبحر عالم اور نامور فاضل کی یہ تحسین یقیناً انکی

عالی ظرفی اور اپنے خوردوں کی حوصلہ افزائی ہے، اس سے پہلے بھی دسمبر ۸۷ھ کے معارف میں ابو

محمد عبد اللہ بن محمد بن زیاد کے متعلق ان کا گرامی نامہ شائع ہوا تھا، اور اب انہوں نے اس کے متعلق

اس ناچیز کو بھی تحریر فرمایا ہے۔

تلاش و جستجو کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر مخطوطہ میں کاتب نے

أَلْسِمُذَنی کو السندی لکھ دیا ہے، اسی وجہ سے کتابوں میں ان کا ذکر نہ مل سکا۔ ابو محمد بن عبد اللہ بن

زیاد السندی درست نہیں ہے، صحیح ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن علی بن زیاد أَلْسِمُذَنی ہے، انہوں نے

عبد اللہ بن محمد بن شیر دین سے اور ان سے عبد الرحمن بن حمدان التصوی نے روایت کی ہے، انکے مزید

حالات کے لیے (کتاب الانساب علامہ سمعانی، جلد ۷ ص ۲۱۶، ۲۱۷ مطبوعہ دائرة المعارف

حیدرآباد) اور (المشعبہ فی اسماء الرجال، امام ذہبی ص ۲۷۴، ۲۷۵ مطبوعہ لائبنڈن) دیکھی جاسکتی ہے۔

(محمد عارف عمری)

عبد اللہ الارغیانی فی کتابہ قال انا ابو علی الحسن بن ابی القاسم محمد بن محمد بن حمویہ الصفار فی ذی القعدة سنة ست وستین واربعمائه، انا ابو سعد عبدالرحمن بن حمدان بن محمد نصر وی سنة خمس وعشرین واربعمائه، نا ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن زیاد السمدی فی رجب سنة ست وستین وثلاثمائه، نا الفقیہ العامل ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن عبدالرحمن بن شبرویہ المدینی وجدی لامی ابو محمد احمد بن ابراہیم بن عبد اللہ بن ابی نصر، قالنا نا ابو یعقوب اسحق بن ابراہیم بن مخلد الحنظلی المروزی، انا عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الصنعانی، نا معمر، نا ہمام بن منبہ، قال هذا ما حدثنا ابو ہریرة من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.....

نا چیز ح

(معارف اعظم گڑھ - مئی ۱۹۸۹ء)

بقیہ صفحہ گذشتہ:

تلاش و جستجو کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر مخطوط میں کاتب نے اَلْبِسْمِذیٰ کو اسندی لکھ دیا ہے، اسی وجہ سے کتابوں میں ان کا ذکر نہ مل سکا۔ ابو محمد بن عبد اللہ بن زیاد اسندی درست نہیں ہے، صحیح ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن علی بن زیاد اَلْبِسْمِذیٰ ہے، انہوں نے عبد اللہ بن محمد بن شیرویہ سے اور ان سے عبدالرحمن بن حمدان انصروی نے روایت کی ہے، انکے مزید حالات کے لیے (کتاب الانساب علامہ سمعانی، جلد ۷ ص ۲۱۶، ۲۱۷ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد) اور (المشتبہ فی اسماء الرجال، امام ذہبی ص ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۷۶ مطبوعہ لائینڈن) دیکھی جاسکتی ہے۔ (محمد عارف عمری)

محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی معذرت

محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا شمار دور حاضر کے نامور مسلم محققین میں ہوتا ہے انہوں نے حیدر آباد دکن سے علمی و تحقیقی زندگی کا آغاز کیا اور اب کافی عرصہ سے پیرس میں مقیم ہیں۔ مختلف جراند و رسائل میں ان کے علمی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

گزشتہ سال ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے عربی جریہ ”الدراسات الاسلامیہ“ کے کسی شمارہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے اس مسئلہ پر بحث کی کہ جب قرآن کریم نے بیک وقت چار سے زیادہ شادیوں کی ممانعت کر دی ہے تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں کیوں تھیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ قرآن کریم کا یہ حکم نازل ہونے کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پانچ بیویوں کو حقوق زوجیت سے الگ کر کے ”اعزازی بیویوں“ کی حیثیت دے دی تھی اس پر پاکستان کے دینی حلقوں میں ہجمن پیدا ہوا۔ مختلف رسائل و جراند نے اس پر قلم اٹھایا اور اہل علم نے اس نکتہ کو مسترد کر دیا۔ ”الشریعہ“ میں بھی پروفیسر عبدالرحیم ریحانی صاحب کا ایک مضمون شائع کیا گیا جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس تحقیق کو رد کرتے ہوئے لکھا کہ بیک وقت چار سے زیادہ بیویوں کا ہونا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا ایک مفصل و ضاحتی مکتوب موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے اپنے سابقہ موقف کا اعادہ کرتے ہوئے اس پر دلائل دیے ہیں۔ یہ مکتوب بھی ”الشریعہ“ میں شائع کر دیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ اس پر مولانا قاضی محمد رولیس خان ایوبی کا تحقیقی مضمون شائع کیا جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس موقف پر ماہنامہ صدائے اسلام پشاور نے بھی

احتجاج کیا تھا۔ جس پر انہوں نے صدائے اسلام کے مدیر کے نام ایک مکتوب میں اپنے موقف سے رجوع اور معذرت کا اظہار کیا ہے۔ یہ مکتوب ذیل میں درج کیا جا رہا ہے اور اسکے ساتھ بحث کو ختم کیا جاتا ہے کیونکہ اس مکتوب کے بعد بحث کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کے ساتھ ہی ہم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اہل علم کی روایت کو نبھاتے ہوئے اپنی غلطی کے اعتراف میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کی جس سے ان کے علمی وقار اور احترام میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ اپنا علمی سفر جاری رکھنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ آمین یا الہ العالمین۔ (ادارہ)

(۱۴)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا خط

باسمہ تعالیٰ حامداً ومصلیاً

محترم جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ صدائے اسلام پشاور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! آپ کے موقر رسالے سے بد قسمتی ہے فرانس جیسے دور دراز ملک میں واقف نہ ہو سکا تھا۔ اب ایک دوست نے اس کے جولائی ۱۹۰ء کے چند اوراق بھیج کر میری توجہ اس کی طرف منعطف کرائی ہے۔ فوراً آپ کو یہ عریفہ بھیج رہا ہوں۔ کامل پتا پاس نہ ہونے سے معلوم نہیں پہنچے گا یا نہیں۔

میری عمر پچاسی سال سے متجاوز ہو گئی کہ (محرم ۱۳۳۶ھ کی ولادت ہے) اس لیے یقیناً عقل بھی سٹھیا گئی ہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی میں نیک نیتی سے جو مضمون لکھا تھا وہ غلط ہو سکتا ہے کہ انسان ہوں الحق یعلو ولا یعلیٰ علیہ حق بات کا بول بالا ہو سکتا ہے انسانوں کا نہیں۔ آپ کے ناظرین میری نہیں اہل علم کے فیصلے کی تعظیم کریں۔

۱۔ ڈاکٹر صاحب کو ذہول ہوا۔ عمر ۸۵ سال نہیں بلکہ ۷۵ سال بنتی ہے۔ (۱۳۱۱ھ-۱۳۳۶ھ)

(م-ع-م-ج)

فرنگستان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جہاں آئے دن اعتراض ہوتے رہتے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ اور مثال کہ قرآن مجید نے چار پر بیویوں کی تحدید کی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نو بیویاں تھیں۔ اعتراض معقول نظر آتا ہے اس لیے جواب کی ضرورت ہے۔ اگر یہ خصائص نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو سر آنکھوں پر، اگر نہیں تو مسکت جواب کی ضرورت ہے۔ اتفاق سے تفسیر طبری وغیرہ پرانی مستند کتابوں میں ایک جواب ملا جس میں رسول اکرم کی توہین بالکل نہیں بالکل یہ کہ رسول اکرم احکام خداوندی کی تعلیم بھی کرتے تھے اور تعمیل بھی فرماتے تھے۔ اگر میرا مطالعہ ناقص اور میرا استنباط غلط ہے تو میں اللہ کے پاس معافی مانگتا ہوں۔ میں نے الدراسات الاسلامیہ میں عربی میں مضمون اسی لیے لکھا ہے کہ وہ عوام نہیں بلکہ اہل علم کے مطالعہ میں آتا ہے۔

محمد حمید اللہ

(بشکریہ ماہنامہ صدائے اسلام پشاور جنوری ۱۹۹۱ء)

(ماہ نامہ الشریعہ گوجرانوالہ - مارچ ۱۹۹۱ء)

(۱۵)

باسمہ تعالیٰ حامداً ومصلیاً

۲۸/ صفر ۱۴۱۳ھ / اگست ۱۹۹۲ء

مخدوم ومحترم زاد مجدکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

معارف کا تازہ شمارہ ۱۵۰/۲ آج پہنچا۔ ممنون ہوا۔ اور کام چھوڑ کر اسے پڑھا

اور مستفید ہوا۔

۱۔ اس کے صفحہ ۱۵۵ پر ”تیونس“ کی توقع نہیں تھی، آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ شاید وہاں انگریزی کا تلفظ یوں ہی ہوتا ہو۔ لفظ تونس ہے۔ بر موقع بھی لوگ تونس ہی کہتے ہیں۔

۲۔ صفحہ ۱۵۴ میں یہ اضافہ کروں گا کہ ہجرہ کا نسل اسلام آباد نے جن ایک سواہم کتابوں کے چھاپنے کا فیصلہ کیا ہے، ان میں نمبر (۲) پر القزوینی کی کتاب السردوالفرد ہے۔ شاید ابھی وہاں نہیں آئی ہے، یہ حدیث کی اہم اور شاید قدیم ترین کتاب ہے۔ اس میں چند صحابہ کی تالیفیں یکجا کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت جعفر بن نسطور الرومی ہیں جو نظر آتا ہے کہ غزوہ تبوک کے وقت تبوک میں مسلمان ہوئے، ان کے مزید کوئی حالات باوجود تلاش اب تک نہ ملے، شاید آپ کو کچھ پتا ہو۔

۳۔ صفحہ ۱۵۴ تا ۱۵۵ پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تفسیر کے ابتدائی حصے کے کوالالپور میں چھپنے کا ذکر ملا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں یہ جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر عبد اللطیف مرحوم کی کتاب کی مکرر طباعت ہے۔ حیدر آباد میں ایک عبد اللطیف ٹرسٹ بھی ہے۔ ان کی شاید ساری ہی تفسیر انگریزی میں حیدر آباد دکن میں چھپی ہے، ملیشیا میں طبع ثانی ہے۔

ناچیز

محمد حمید اللہ

(معارف اعظم گڑھ - اکتوبر ۱۹۹۲ء)

(۱۶)

پارلیس ۱۱ مئی ۱۹۹۳ء

مخدوم و محترم اڈیٹر صاحب رسالہ معارف زاد مجد کم

سلام مسنون

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ بمبئی کے فضیلت مآب پروفیسر عبدالرحمن مومن

صاحب نے آپ کو کتاب السردوالفردمولفہ ابوالخیر قزوینی پر ایک مضمون بھیجا ہے۔ اگر وہ مضمون چھپ رہا ہے تو معارف کے اسی شمارے میں مناسب معلوم ہو تو منسلک تحریر بھی شامل فرمادیں۔ ممنون ہوں گا۔ ”ح“

پارلیس میں ایک فاضل ایرانی رہتے ہیں۔ انہوں نے زحمت فرما کر میرے ایک خط کے جواب میں مندرجہ ذیل اطلاع دی ہے۔ خدا انہیں جزائے خیر دے:

”ابوالخیر احمد بن اسماعیل بن یوسف الطالقانی القزوینی۔ طالقان ایک بہت چھوٹا شہر ہے جو تہران کے قریب ہے۔ اس مولف کا لقب رضی الدین ہے یہ ایک جلیل القدر شافعی عالم تھے، بہت بڑے حفاظ قرآن میں سے تھے، زبردست خطیب بھی تھے۔ ۵۹۰ھ قمری میں وفات پائی۔ حنبلی فقیہ عبدالرحمن بن علی بن الجوزی النعمانی جمال الدین ابوالفرج کے معاصر تھے۔ بعض وقت بغداد جا کر مجلس وعظ منعقد کرتے جس میں خلیفہ وقت بھی (جو بظاہر ابوالعباس الناصر الدین اللہ احمد بن مستنصر تھا) ان کی مجلس وعظ میں آتا اور پس پردہ بیٹھا کرتا۔ اس میں عوام کا بڑا اثر دام ہوا کرتا۔ بہت جلیل القدر عالم تھے۔ حدیث، تفسیر، قراءت اور دیگر علوم منقولہ میں بہت بلند درجہ رکھتے تھے اور صاحب تالیفات تھے۔ مخفی نہ رہے کہ ہمارے ہاں ابوالخیر نای گیارہ فاضل گزرے ہیں:

- ۱۔ احمد ابوالخیر بن علی معروف بہ نجاشی
- ۲۔ ابوالخیر جواد معروف بہ ابوالخیر حماد
- ۳۔ ابوالخیر حسن معروف بہ ابن خمار
- ۴۔ ابوالخیر عاشق معروف بہ ابوالخیر عاشق
- ۵۔ ابوالخیر عبد معروف بہ بیضاوی
- ۶۔ ابوالخیر فضل اللہ معروف بہ ابوسعید فضل اللہ
- ۷۔ ابوالخیر محمد بن عبد اللہ معروف بہ مروزی

- ۸۔ ابوالخیر محمد بن عبدالرحمن معروف بہ سخاوی
 ۹۔ ابوالخیر محمد بن محمد بن علی معروف بہ جردی
 ۱۰۔ ابوالخیر بن مصطفیٰ طاش کوبری زادہ
 ۱۱۔ زیر بحث کتاب السرد والفرک کا مولف
 ”ضرورت پر مزید تفصیل دے سکتا ہوں۔“

خادم ”ح“
 (معارف اعظم گڑھ - جولائی ۱۹۹۴ء)

(۱۷)

پیرس، فرانس
 ۲۹ ستمبر ۱۹۹۴ء

مخدوم و محترم زاد مجدکم و عم فیہکم!

سلام مسنون و رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ابھی ابھی معارف کا تازہ شمارہ بابت ماہ مئی ۱۹۹۴ء ملا۔ ممنون بھی ہوا اور سرفراز بھی۔ اگر کسی اور سے کام بننا تو آپ کو زحمت نہ دیتا۔ آپ نے ایک نئے (ہندی) ترجمہ قرآن مجید کا ذکر فرمایا ہے۔ کیا اس محترم اطلاع دے سکتے ہیں کہ سورۃ المنافقون ۶۳/۴ کی آیت کانہم خشب مسندۃ کا اس میں کیا ترجمہ ہوا ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کے ترجمے دل کو نہیں لگتے۔ دیوار پر جھکائے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں کو منافقین سے کیا مشابہت ہے؟ مجھے پسند وہ ترجمہ ہے جو تاج العروس نے ”سند“ کے مادے میں دیا کہ وہ مالدار لوگوں کا شاندار لباس ہے نہ کہ استناد، جھکانا۔

حفظکم اللہ و عافاکم

خادم: الفقیر الی اللہ: ح

(معارف اعظم گڑھ - اکتوبر ۱۹۹۴ء)

۱۔ ترجمہ کا جو حصہ خدا بخش لائبریری سے شائع ہوا ہے اس میں سورۃ منافقون کا ترجمہ درج نہیں ہے۔ (معارف)

(۱۸)

4. R. Tournon,

75 Paris vi

۸ شعبان ۱۳۹۱ھ

محترمی زاد مجدکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ وبرکاتہ میں سفر پر تھا، واپسی پر عنایت نامہ ملا، دانی صاحب کا مضمون نقل کرنے کی آپ نے زحمت فرمائی۔ جزاکم اللہ خیرا۔
اس مضمون میں کوئی نئی چیز نہ ملی۔

راجہ کا نام زہمی / دہمی اور اس کا تلفظ نیز اس کی ہندی اصل کے متعلق علاوہ اور امور کے ان عربی کتابوں کے مخطوطوں کا مقابلہ ضروری ہے جن میں یہ نام آیا ہے۔ اولاً وہ حوالے جمع کیے جائیں جن میں یہ نام ہے، پھر ان کتابوں کے مخطوطوں کو دیکھا جائے۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور کسی نے اب تک کیا بھی نہیں۔
بہر حال نوازش پر دل سے ممنون ہوں۔

الفقیر الی اللہ

محمد حمید اللہ

(ماہ نامہ تعمیر افکار کراچی - مارچ - اپریل - مئی ۲۰۰۳ء)

(بیاد پروفیسر سید محمد سلیم)

(۱۹)

۲/ ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

”میں انقرہ آیا ہوا ہوں کہ کل یہاں مشہور حنفی امام سرخسی کی ۴۸۳ھ میں وفات پر نو سو سال گزرنے کی یادگار منائی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی اجتماع ہے۔ یاد ہوگا کہ امام سرخسی کو حکمران وقت نے کسی وجہ سے قید کر دیا تھا جہاں وہ سالہا سال (شاید پندرہ سال) صابر و شاکر رہے اور قید میں بھی طلبہ کو درس املا کراتے رہے۔ زمانہ قید کے اس املا کی یادگار

کتاب الميسوط : ۳۰ جلد (کوئی سات ہزار بڑی تقطیع کے صفحے)

شرح السیر الکبیر : ۴ جلد (ڈیڑھ ہزار صفحے)

اصول الفقہ : ۲ جلد (ہزار صفحے)

شرح زیادات الزیادات

ہیں اور چھپ چکی ہیں۔ اُسی زمانے کی کئی اور کتابیں تھیں جو اب ناپید ہو گئی ہیں۔ اس تقریب پر ایک نمائش بھی کی جا رہی ہے جس میں صرف سرخسی کے مخطوطات جمع کیے گئے ہیں جو ایک سو کے قریب ہیں۔ قدیم ترین مخطوطہ چھٹی صدی کا ہے۔

گزشتہ سال بھی ایک تقریب ہوئی تھی اور استانبول میں ابو حنیفہ دینوری جو مشہور نباتاتی گزرا ہے، اس کی وفات پر گیارہ سو سال گزرے تھے۔ اس کے سلسلے میں

بھی کتب نباتات کی ایک نمائش کی گئی تھی۔ کئی درجن باتصویر قلمی کتابیں بھی اس میں دیکھنے میں آئی تھیں۔ جن میں قدیم اسلامی مصوروں کی بنائی ہوئی نباتاتی رنگین تصویریں تھیں۔

چار سال بعد اولین نزول وحی پر چودہ سو سال گزر رہے ہیں۔ ترکی بھائیوں نے اُس کو موزوں طور پر منانے کی تیاری شروع کر دی ہے۔“

www.KitaboSunnat.com

(محمد حمید اللہ)

تبصرہ:

ترکی لیڈروں نے تو بہت چاہا کہ اسلام اور اس کے متعلقات سے اپنا پیچھا چھڑا لیں۔ لیکن اسلام اور اسلامیات خود ہی اس آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں اور کسی فلسفی، مہندس، شاعر، مورخ و ادیب کی علمی یادگاروں تک تو خیر لیکن دینی شخصیتوں اور مذہبیات کی یادگاروں کے منانے میں تو یقیناً فخر ملت اور ہمارے سابق ہم وطن ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بھی سعی و تحریک کو بڑا دخل ہوگا۔ اختیاری ہجرت کی سعادت صحیح معنی میں جو انہیں حاصل ہوئی، وہ نادر اہی کسی کے نصیب میں آتی ہے۔ اس خوش نصیبی پر وہ اپنے ہمہ وقتی قلمی اور لسانی جہاد سے برابر اضافہ ہی کرتے رہتے ہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء۔

(بہتہ وار صدق جدید لکھنؤ کلیم می ۱۹۶۳ء)

المکتبۃ الرسالۃ

۹۹۔۔۔ جے ماڈل ٹاؤن۔ ۱۱۔ بور

لمبر..... ۱۶۸۰۹۰

مآخذ و مراجع

- ۱۔ محمد حمید اللہ ڈاکٹر خطبات بہاول پور
ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۹۷ء
- ۲۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی دارالاشاعت، کراچی ۱۹۶۸ء
- ۳۔ محمد راشد شیخ ڈاکٹر محمد حمید اللہ
المیزان پبلشرز، فیصل آباد ۲۰۰۳ء
- ۴۔ قاسم محمود سید ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی بہترین تحریریں
بیکن بکس لاہور/ملتان ۲۰۰۳ء
- ۵۔ سہ ماہی مجلہ عثمانیہ کراچی۔ اپریل تا جون ۱۹۹۷ء
- ۶۔ ماہ نامہ دعوت دعوت اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی
اسلام آباد۔ مارچ ۲۰۰۳ء
- ۷۔ سہ ماہی فکر و نظر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد
اپریل تا ستمبر ۲۰۰۳ء
- ۸۔ ششماہی معارف اسلامی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
جولائی ۲۰۰۳ء تا جون ۲۰۰۴ء
- ۹۔ روزنامہ منصف حیدر آباد (دکن) مورخہ ۱۷ ستمبر ۲۰۰۳ء

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سیرت پاک)

تحریر ڈاکٹر محمد حمید اللہ ترجمہ: پروفیسر خالد پرویز

عالمی شہرت یافتہ عالم دین ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی تمام تر زندگی کے مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ اس کتاب میں سمودیا ہے۔ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی جسے پروفیسر خالد پرویز نے انتہائی سلیس، سادہ اور وضاحتی انداز میں اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ سینکڑوں کتابوں کی ایک کتاب۔ ہر قاری کے لیے یکساں مفید۔

دنیا کا قدیم ترین پہلا دستیاب شدہ مجموعہ حدیث

صحیفہ ہمام بن منبہ عن ابی ہریرہؓ

تحقیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہ ترجمین: پروفیسر خالد پرویز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ حافظ الحدیث بھی تھے اور محافظ الحدیث بھی۔ آپؓ نے اپنے ایک شاگرد ہمام بن منبہ کے لیے ایک مجموعہ حدیث مرتب کیا تھا جو من و عن محفوظ رہا۔ عالمی شہرت یافتہ عالم دین ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس مجموعہ کو تلاش کیا، ایڈٹ کیا اور ساتھ ہی تاریخ و تدوین حدیث سے متعلق بیش بہا تفصیلات بھی بیان کر دیں۔ پروفیسر خالد پرویز نے ہر حدیث کا عنوان حاشیہ، انگریزی ترجمہ، حضرت ابو ہریرہؓ کی شخصیت کے ساتھ اردو انگریزی میں دیباچہ تحریر کر کے اس کی تزئین کی ہے جس سے اس کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ مستند مجموعہ اس دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ پہلی تین صدیوں تک تدوین حدیث کا کام انجام ہی نہیں پایا تھا۔

بیکن بکس

• قدانی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-7351662

• گلشت، ملتان فون: 061-520790, 520791

E-mail: beaiconbookspakistan@hotmail.com



ISBN 969534032-8



480

9 789695 340325